قصص الاولین مواعظ الآخرین

پہلے لوگوں کے واقعات بعد والوں کے لئے نصیحت ہیں

مسمیٰ

(مصباح التواریخ)

جناب مولانا عبدالمعید صاحب سنبھلی قاسمی

استاذ عربی مدرسہ ناشر العلوم

وخطیب مرکز والی مسجد سرائے ترین سنبھل

محلہ جھجران، سرائے ترین سنبھل، ضلع مرادآباد PIN:244303

قصص الاولین مواعظ الآخرین

پہلے لوگوں کے واقعات بعد والوں کے لئے نصیحت ہیں

تاریخ سنبھل

مسمیٰ

(مصباح التواریخ)

تالیف

جناب مولانا عبدالمعید صاحب سنبھلی قاسمی

استاذ عربی مدرسہ ناشر العلوم

وخطیب مرکز والی مسجد سرائے ترین سنبھل

مکتبہ طیبہ

محلہ جھجھران، سرائے ترین سنبھل، ضلع مراد آباد PIN:244303

تفصیلات

نام کتاب: تاریخ سنبھل

مؤلف: مولانا عبدالمعید صاحب سنبھلی قاسمی

باہتمام: محمد طیب سنبھلی

کمپیوٹر کتابت: دیوبند کمپیوٹر دیوبند

سنہ طباعت: ۱۴۲۳ھ مطابق 2002

مطبع:

ناشر

مکتبہ طیبہ

نزد مرکز والی مسجد سرائے ترین سنبھل ضلع مرادآباد

فہرست مضامین "تاریخ سنبھل"

تأثرات

حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مدظلہ صدر مفتی دار العلوم دیو بند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم وبعد:

یہ ایک حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی تخم ریزی رہتی دنیا تک باقی رہنے والی ہے اور آپ کے دست مبارک کا لگایا باغ قیامت تک قائم رہنے والا ہے اس لئے آپ کے روشن کیے ہوئے چراغوں کا سلسلہ متعدی ایک مشعل سے دوسری مشعل اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوتا رہا اور ہر زمانہ میں ہر ملک میں اور ہر بستی میں اپنی ضیا پاشیوں سے مخلوق کی رہبری کرتا رہا اور آپ کی نیابت میں نبوت کے فرائض یعنی دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتا رہا۔

گویا ایک ہرے بھرے باغ میں ہزاروں قسم کے پھول ہیں جن میں ہر ایک کا رنگ دوسرے سے جدا اور ہر ایک کی بو دوسرے سے الگ ہے اگر بلبل گلاب کے پتوں پر جاں نثار ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پھول پھول ہی نہیں یا ان کی عمدہ خوشبو چھپانے کی قابل نہیں اس طرح امت محمدیہ کے ہزاروں اور لاکھوں سرداران ملت اہل علم وفضل اور اولیاء اللہ میں ہر ایک جدا جدا دلربائی لے کر آیا ہے ان کے شیریں تذکروں میں قدرت نے ایسی حلاوت اور کشش عطا فرمائی ہے جو یقیناً افسردہ دلوں کو تازگی بخشتی ہے ان کی مقدس زندگی کے حالات کے مطالعہ سے توجہ الی اللہ کی رغبت اور شوق پیدا ہوتا ہے. جس قدر بھی نائبین رسالت گذرے ہیں وہ سب ہمارے سر کا تاج اور مقتدا و پیشوا ہیں ان کے حالات وواقعات اور کارناموں سے روح کو فرحت پہنچتی ہے اور دینی برکات حاصل ہوتی ہیں اگر یہ کہا جائے کہ مقدس گروہ کائنات عالم کی بقاء کا سبب بنے ہوئے ہیں تو اس میں شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

زیر نظر کتاب تاریخ سنبھل جو وہاں کے اکابر و اسلاف کے اہم حالات واقعات زندگی علمی خدمات نیز وہاں کی اہم سیاسی شخصیات وہاں کے مشہور مقامات کی تاریخ پر مشتمل ہے اس کتاب میں پہلے شہر سنبھل کی جغرافیائی تمدنی سیاسی تاریخ ہے راجاؤں اور

مسلم بادشاہوں کے دور حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے سنبھل بہت پہلے راجاؤں اور بادشاہوں کا دار السلطنت رہا ہے لیکن جب سلطان ناصر الدین کا دور آیا تو اس نے دہلی کو دار السلطنت بنالیا۔ سنبھل ضلع مراد آباد میں ایک بہت قدیم اور مشہور قصبہ ہے جہاں بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے اس سرزمین نے بہت سے نامور علماء صلحاء اور اولیاء کو جنم دیا قدیم زمانے میں بہت سے راجاؤں اور مسلم بادشاہوں نے وہاں حکومت کی محیر العقول کارنامے انجام دیئے یہ کتاب وہاں کی شخصیات کے نقوش زندگی کی ایک تاریخی دستاویز ہے اور قارئین کے لئے دعوت فکر وعمل ہے۔

عرصہ ہوا خاکسار نے اس کتاب کے مؤلف جناب مولانا عبد المعید صاحب سنبھلی کو توجہ دلائی تھی کہ آپ ماشاء اللہ جوان اور محنتی ہیں تالیف وتصنیف کا ذوق رکھتے ہیں آپ کا قصبہ بہت قدیم اور تاریخی قصبہ رہا ہے وہاں بڑے باکمال اہل علم وفضل پیدا ہوئے ہیں بہت سے اہل اللہ بھی گذرے ہیں مگر ان کی دینی علمی و اصلاحی خدمات مشہور نہیں اسلئے آپ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور ان حضرات کی خدمات کو یکجا مرتب فرمائیں تو یہ دین وملت کی تاریخی سماجی اہم خدمت ہوگی۔

مولانا موصوف نے میری درخواست پر لبیک کہا اور اپنی مشغولیات کے باوجود اس خدمت کیلئے کمربستہ ہوگئے اور اس خدمت کو دین وملت کی حفاظت کا کام سمجھ کر انجام دینا شروع کردیا آپ کو معلوم ہے کہ دور قدیم کے اکابر واسلاف کے حالات وواقعات اور ان کی دینی وعملی روحانی اخلاقی خدمات سماجی معاشرتی اصلاحات غرض ان کی زندگی کی سرگزشت تیار کرنا یہ اتنا ہی اہم کام ہے جتنا کہ چیونٹیوں کے منہ سے بکھرے ہوئے شکر کے دانوں کو چننا مشکل اور اہم ہے۔

مولانا نے بڑے عزم وحوصلہ کے ساتھ اپنی پوری توجہ اس کام پر مرکوز کردی اور بڑے ذوق وشوق کے ساتھ لائبریریوں کی سیر، کتابوں کا انتخاب ان کی فراہمی غور وفکر اور مطالعہ کرنا شروع کردیا اور الحمد للہ غیر معمولی کاوش کے بعد سنبھل کی بہت سی اہم شخصیات اور پاک طینت نقوش کے حالات زندگی ان کی علمی ودینی خدمات کو جمع کردیا ہے اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس زرین خدمت کو قبول فرمائے اور انھیں پوری امت مسلمہ کی طرف سے بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے آمین، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ فقط

حبیب الرحمٰن خیرآبادی عفا اللہ عنہ خادم دار العلوم دیوبند دار الافتاء ۱۱ر شعبان ۱۴۱۵ھ

حضرت مولانا برہان الدین صاحب کا ارسال کردہ مکتوب:

تاریخ ۷/۲/۱۰ھ مطابق ۸۹/۹/۱۹ء

مکرم ومحترم مولانا عبدالمعید صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

مزاج شریف آپ کا مکتوب ملا جس سے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تاریخ سنبھل کی ترتیب وتدوین میں ہمہ تن مشغول اور گویا کہ ہم سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، اس لئے ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی ہر طرح مدد فرمائے اور یہ اہم کام پایہ تکمیل تک پہنچے اور آپ کی مساعی مشکور ومثمر ہوں۔

فقط والسلام

احقر محمد برہان الدین

مکتوب دوم

بتاریخ ۲۳/۲/۱۵ھ مطابق ۹۴/۸/۲ء

مکرمی مولانا عبدالمعید صاحب زید کرمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف: کل صبح مولوی خورشید انور ندوی سلمہ نے آپ کا مرسلہ پیکٹ پہنچایا، جس میں آپ کا مکتوب اور تاریخ سنبھل کے کچھ اجزا اور فہرست ملی، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تاریخ کے طبع ہو کر منظر عام پر آنے کے اسباب فراہم کرے پھر اسے قبول ومقبول بنائے۔ والسلام آپ کی خدمت میں ایک حقیری رقم مبلغ ایک سو روپے اس عریضہ کے ساتھ بھیجی جارہی ہے۔

محمد برہان الدین

تاثرات حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً وبعدہٗ

تاریخ سے موجودہ اور گزشتہ قوموں، خاندانوں اور مخصوص اشخاص کے حالات نیز مقامات کا علم ہوتا ہے۔ اس فائدے کے تحت زیرِ نظر کتاب "تاریخ سنبھل" وجود میں آئی۔ وطنِ عزیز "سنبھل" ضلع مرادآباد۔ یوپی کا ایک مردم خیز خطہ اور نہایت قدیم تاریخی شہر ہے۔ کتنے ہی آفتاب و ماہتاب کا یہ مشرق و مغرب ہے۔ کاروانِ فکر و فن یہاں فروکش ہوا۔ صلحاء و مشائخ خیمہ زن ہوئے۔ علماء نے مسندِ درس بچھائی۔ نواب و راجاؤں کے قلعے، ان کی جلوہ آرائیوں و رعنائیوں کا پتہ دے رہے ہیں۔ کتنے ہی کھنڈرات اپنے مکینوں پر ماتم کناں ہیں۔ دسیوں بزرگ اس سرزمین میں محوِ خواب ہیں۔ شاہوں کا یہاں دور دورہ رہا ہے۔ شہزادہ ہمایوں اپنے سایۂ ہما سے اس پر سایہ فگن رہا ہے۔ عظیم شخصیتیں یہاں پروان چڑھیں۔ قرآن پاک کی اردو ترجمانی میں یہ گوئے سبقت لے گیا۔ قرآن مجید کے اردو تراجم میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اولیت کا شرف شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کو حاصل ہے۔ انھوں نے ۱۱۸۵ھ میں تفسیر مرادیہ کے ساتھ قرآن مجید کے پارہ ۳۰ کا ترجمہ کیا۔ (جائزہ تراجم قرآنی ص۱)

یہ کتاب ان سب اشیاء کی نمایاں جھلک آپ کو دکھائے گی۔ اس تاریخی مجموعے میں اہم شخصیات اور مشاہیر کا مفصل سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز مخصوص مقامات کا بھی تذکرہ ہے۔ بندہ نے کتاب پر جستہ جستہ نظر ڈالی۔ محترم مولانا عبدالمعید صاحب سنبھلی قاسمی مدظلہ نے صاف ستھری اور سادہ زبان اسلوب میں بڑا وقیع مواد جمع کر دیا ہے۔ اشخاص کے ذکر میں بھی حسبِ حیثیت مناسب طرز اختیار کیا گیا ہے کہ کسی کی شخصیت مجروح نہ ہونے پائے اور کسی کے بیانِ

حال میں ادب واحترام کا دامن قلم سے نہ چھوٹے ۔درحقیقت کسی کتاب کی ترتیب بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے خاص کر تاریخ کے موضوع پر کہ جسمیں اوقات کی تعیین کے ساتھ علم جغرافیہ، تقویم، (جنتری) اور علم طبقات الارض وغیرہ سے بھی مدد لی جاتی ہے، یہ دقت طلب محنت ہے بلکہ جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔

مصنف محترم میری اپنی معلومات کے مطابق برسہابرس سے وطن کی خاک چھاننے میں مصروف تھے، کاروان تحقیق وتدقیق انکا رواں دواں تھا، آں موصوف نے سنبھل کی پھیلی ہوئی متفرق آبادی کی جادہ پیمائی کر کے قدیمی وعلمی خاندانوں کا پتہ لگایا دستاویزات وغیرہ کے ذریعہ تحقیقات کرنے میں جانفشانی سے کام لیا، ادھر سنبھل کی تاریخ پر کوئی مستقل جامع کتاب نایاب، چنانچہ مصادر ومراجع میں سینکڑوں کتب کو کھنگالا، منتشر رسائل کی چھان پھٹک کی اوران آثار ورسوم کو پڑھا، سنا اور دیکھا جن سے کسی قوم کی تاریخ بنتی ہے خواہ وہ آثار مکتوبہ (مختلف تحریریں، رجسٹر محکمہ جات، معاہدات، فیصلے وغیرہ) ہوں یا آثار منقولہ (مذہبی وغیر مذہبی حکایات ،کہاوتیں، اشعار، آباء واجداد سے سینہ بہ سینہ روائتیں) ہوں یا آثار قدیمہ (عبادت گاہیں، قلعے، میکل، کتبے وقبے وغیرہ) جناب مؤلف نے مطالعہ، اور تحقیق وتفتیش کے بعد ان سب کو ایک متوازن کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے جولائق صد تحسین کارنامہ ہے، اس پر وہ ارباب علم خاص کر اہل وطن کی طرف سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ کانٹوں کے درمیان بکھرے ہوئے پھولوں کو چن کر ایک مہکتا ہوا گلدستہ تیار کر دیا جس کی بوئے خوش ملت کے مشام جاں کو صدیوں معطر کرتی رہے گی۔ موصوف محترم نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہی سے اہم تدریسی ذمہ داریوں کے باوجود قلم سے اپنا رشتہ برابر قائم رکھا اور "توبہ کیا ہے؟" "تاریخ ٹانڈہ" جیسی گراں قدر کتابیں لکھیں جو قدر ومنزلت کے ہاتھوں لی گئیں ۔امید کہ یہ کتاب بھی ذوق وشوق کی نظر سے پڑھی جائے گی۔

فجزاه الله تعالىٰ عنی وعن جمیع اهل العلم، اٰمین۔ یارب العالمین۔

عبدالخالق سنبھلی مدرس دارالعلوم دیوبند۔ ۲؍۷؍۱۴۱۰ھ

پیش لفظ

(از پروفیسر نثار احمد فاروقی)

ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، ادبی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی تاریخ لکھنے کیلئے، ہمیں بڑے شہروں سے اتنا مواد نہیں مل سکتا جتنا چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بکھرا ہوا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ زمانۂ وسطی میں اہل علم اور صاحبان ہنر زیادہ تر چھوٹے قصبات اور شہروں کو اپنا مسکن بناتے تھے، اس لئے کہ وہاں سیاسی شورش زیادہ نہیں ہوتی تھی اور وہ سکون خاطر سے اپنے علمی کاموں میں یا اپنے ہنر کے تقاضوں کی تکمیل میں مصروف رہ سکتے تھے۔ ایسے کتنے ہی قصبات ہیں جو ہماری تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً: بلگرام، مارہرہ، امروہہ، سنبھل، کاکوری وغیرہ۔ سنبھل کی تاریخ بھی ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کا نام اصل میں شمبھوالیہ (یعنی شمبھو کا استھان) تھا، جو کثرتِ استعمال سے سنبھل ہوگیا۔ آج یہ ضلع مرادآباد کا ایک قصبہ ہے، مگر اس کا رقبہ اور آبادی بہت سے اضلاع سے کہیں زیادہ ہے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے قدیم تاریخوں اور پرانی دستاویزوں میں "سرکار سنبھل" لکھا گیا ہے۔ شاہان لودی کے عہد میں اس کو خاص سیاسی اور ثقافتی اہمیت حاصل تھی۔ مغلوں کے دور میں بھی، عہد ہمایوں تک، سنبھل کی امتیازی حیثیت برقرار رہی، پھر رفتہ رفتہ اس کی وہ اہمیت ختم ہوگئی۔ یہاں آج بھی آثار قدیمہ ہیں جو سنبھل کی عظمت پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔ قدیم عمارتوں کے کتبات ہیں جو ہمیں تاریخ کی رفتار کو سمجھنے میں غیر معمولی مدد دے سکتے ہیں۔ ابتدائی دور سے لے کر آج تک اس شہر نے علم و ہنر کے ہر میدان میں ممتاز شخصیات کو پیدا کیا ہے، جن میں شیخ حاتم سنبھلی اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے خلیفہ مولانا تاج الدین سنبھلی (جو ۱۰۴۰ھ/۳۱-۱۶۳۰ء میں مکہ مکرمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی چہار شنبہ ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۰۵۱ھ/۲۱۔ ۱۶۴۱ء) جیسے برگزیدہ صوفیہ بھی ہیں، دانشور علماء اور ممتاز اساتذہ، غیر معمولی صلاحیت والے فنکار اور صناع بھی ہیں، شعراء، مصنفین اور اہل قلم بھی۔ ان میں صاحب کتاب "اسراریہ"

(سالِ اختتامِ تالیف ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء) سید کمال سنبھلی (ولادت ۱۴/ربیع الاول ۱۰۱۱ھ/ ۲۶/نومبر ۱۹۸۹ء) جیسے مورخ بھی ہیں، اور میر حسین دوست سنبھلی جیسے تذکرہ نگار بھی۔ حاذق طبیب بھی ہیں اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک بڑی بڑی قربانیاں دینے والے مجاہدین اور سیاسی رہنما بھی۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں حضرت خواجہ باقی باللہ (وفات: ۲۵۔ جمادی الثانیہ ۱۰۱۲ھ/۳۰۔ نومبر ۱۶۰۳ء) کے فرزند خواجہ خرد (ولادت ۶۔ رجب ۱۰۱۰ھ/۳۱۔ دسمبر ۱۶۰۱ء۔ وفات ۲۵۔ جمادی الاولی ۱۰۷۴ھ / ۲۵۔ دسمبر ۱۶۶۳ء) کئی بار تشریف لائے ہیں، اپنے انتقال سے ایک سال قبل ۱۰۷۳ھ میں وہ سنبھل آئے تھے۔ سید کمال سنبھلی کہتے ہیں:

''میرے شیخ (خواجہ خرد) اس سال (۱۰۷۳ھ) میں سنبھل تشریف لائے تھے۔ ایک ماہ اور ایک روز غریب خانہ پر قیام فرمایا۔ سنبھل سے واپسی پر دہلی میں شیخ منور بن شیخ عنایت اللہ (جو کہ جوان صالح اور شیخ الہدیٰ کے پوتوں میں سے ہیں) کے گھر میں رات کو فروکش ہوئے۔ اتفاقاً اس رات کو زینے کی کجی کی بنا پر ان کے پاؤں کو صدمہ پہنچا، اور اس رات کو خواجہ کلاں (ان کے برادر بزرگ) چل بسے۔ بنابریں میرے شیخ نے مجھ کو ایک مکتوب گرامی میں یہ جملہ تحریر فرمایا: ''سبحان اللہ ہم پائے مرا شکستند و ہم بازوے مرا''
یعنی قضا و قدر نے میری ٹانگ بھی توڑ دی اور میرا بازو بھی توڑ دیا''

(اسراریہ بحوالہ تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ از مولانا نسیم احمد فریدی ۹

یہاں دہلی کی سیاسی شورش سے امان پانے کیلئے ممتاز نقشبندی بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ (شہادت ۱۰/محرم ۱۱۹۵ھ/۶/جنوری ۱۷۸۱ء) نے بھی کچھ مدت تک قیام کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سلسلۂ چشتیہ کے شیخ کبیر حضرت خواجہ شاہ عبدالہادیؒ (وفات ۴۔ رمضان ۱۱۹۰ھ/۱۶۔ اکتوبر ۱۷۷۶ء) نے اپنی مبارک زندگی کا بڑا حصہ سنبھل اور اس کے اطراف کے دیہات میں عبادت و ریاضت کرتے ہوئے گذارا تھا۔ آج بھی موضع براہی میں ان کی خانقاہ کے آثار موجود ہیں، اور ان کے پوتے حضرت شاہ دوست محمد (وفات ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) کا مزار بھی ہے، جہاں آس پاس کے علاقے سے ہزاروں

مسلمان اور غیر مسلم حصول برکت کے لئے حاضری دیتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے پہلے سجادہ نشین حضرت شاہ عبدالباریؒ چشتی (وفات ۱۱رشعبان ۱۲۲۶ھ/ ۳۰راگست ۱۸۱۱ء) پھر ان کے فرزند اور سجادہ نشین دوم حضرت شاہ رحمٰن بخش (۱۸رمحرم ۱۲۸۰ھ/ ۴رجولائی ۱۸۶۳ء) ان کے فرزند سجادہ نشین سوم حضرت شاہ غلام مصطفٰےؒ (یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ/ ۲۱راکتوبر ۱۸۹۵ء) اسی طرح ان کے فرزند سجادہ نشین چہارم حضرت حاجی شاہ محمد ابراہیم (وفات ۶رصفر ۱۳۴۳ھ/ ۱۴ردسمبر ۱۹۱۵ء) پھر سجادہ نشین پنجم حضرت شاہ سلیمان احمد چشتیؒ (وفات ۲۳ررجب ۱۳۸۱ھ ریکم جنوری ۱۹۶۲ء) ان سب بزرگوں کا یہ معمول رہا کہ وہ موسم گرما اور برسات کے چھ ماہ امروہہ کی خانقاہ میں گذارتے تھے اور باقی ایام سنبھل کے قریب موضع براہی میں بسر کرتے تھے۔ یہ حضرات نہ صرف اس علاقے کے محنت مزدوری کرنے والے، ناخواندہ ودرماندہ باشندوں کی اصلاح اور تربیت کرتے تھے، بلکہ ان کا علاج معالجہ اور ان کیلئے دعاء اور تعویذ وعملیات وغیرہ سے بھی امداد واعانت کرتے تھے۔ اور یہ ان بزرگوں کا ذریعۂ معاش یا کسب زر کا حیلہ نہیں تھا۔ سب کچھ خالصۃً لوجہ اللہ ہوتا تھا اور آج بھی ان کی اولاد اپنے بزرگوں کی اس روایت کو باقی رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرتی ہے۔

سنبھل میں علم وفضل کی روایت بھی نہایت مستحکم رہی ہے۔ سید کمال سنبھلی کی فارسی تالیف ''اسراریہ'' جو بدقسمتی سے آج تک شائع نہیں ہو سکی، تاریخ اور تذکرے کی بہت اہم اور بیش قیمت معلومات سے بھرپور کتاب ہے۔ اس سے اس عہد کے کتنے ہی بزرگوں کے وہ حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جو کسی دوسرے ماخذ میں نہیں ملتے۔ اب فارسی سمجھنے والے تو کہاں رہے، اگر اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہی ہو جائے تو ہماری تاریخ کے مصادر میں ایک نہایت وقیع اضافہ ہوگا۔ سید کمال سنبھلی اصل میں امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ امن بدر چشتی کی اولاد میں ہیں۔ ان کے اجداد نے سنبھل کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ عہد اکبری کا مشہور مورخ عبدالقادر بدایونیؒ ان سے امروہہ میں ملا ہے اور اپنی کتاب ''منتخب التواریخ'' میں ان کا تذکرہ بڑی عقیدت سے لکھتا ہے۔

اردو میں قرآن کریم کی پہلی تفسیر ''مرادیہ'' بھی سنبھل کے عالم درویش مراد اللہ سنبھلی

نے لکھی تھی، جس کا تاریخی نام "خدائی نعمت" ہے اس سے ۱۱۷۶ھ/۶۲-۱۷ء برآمد ہوتے ہیں۔ مراد اللہ سنبھلی حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مرید و مجاز تھے۔ حضرت مرزا صاحب نے انہیں اس تفسیر کو مکمل کرنے سے روک دیا ورنہ یہ سلیس و با محاورہ اردو میں ایک بے مثال کام ہوتا۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مریدوں اور عقیدت مندوں میں اس علاقے کے روہیلہ سرداروں کے علاوہ عوام کی بھی بڑی تعداد تھی۔ مرزا صاحبؒ یہاں تشریف لاتے رہتے تھے۔ ان کا سنبھل کا آخری سفر غالباً ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں ہوا تھا۔ اس بار وہ حضرت شاہ عبد الہادیؒ سے ملنے کیلئے موضع براہی میں بھی تشریف لائے تھے۔ جس کا حال حضرت شاہ عبد الہادیؒ کے حالات و ملفوظات میں سید نثار علی بخاری بریلویؒ کی تالیف "مفتاح الخزاین" سے معلوم ہوتا ہے، کتاب کا یہ نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء برآمد ہوتے ہیں۔

سنبھل میں شعر و ادب کا چرچا بھی ہر زمانے میں رہا ہے۔ اس شہر کے سخنوروں کا حال تذکروں میں مل جاتا ہے۔ حسین دوست سنبھلی کا تذکرہ شعرائے فارسی کے قدیم تذکروں میں سے ایک ہے اور اس سے بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نواب علی محمد خاں (بانی ریاست رام پور وفات ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) کے فرزند نواب محمد یار خاں امیر کو ٹانڈے کا علاقہ ملا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنے دربار میں شاعروں اور فنکاروں کی ایک کہکشاں سجا رکھی تھی۔ جس میں قائم چاندپوری (وفات ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) اور غلام ہمدانی مصحفی امروہوی (وفات ۱۲۴۰ھ/۲۵-۱۸۲۴ء) بھیؔ تھے، ان کو حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی نے ہی بلوایا تھا۔ پچھلی صدی کے نصف اول میں داغ دہلوی کے تلامذہ میں باغ سنبھلی کا نام بہت نمایاں تھا۔

صنعت و حرفت میں بھی سنبھل کے لوگ ہر زمانے میں آگے رہے ہیں۔ سینگ سے کنگھیاں اور بید وغیرہ بنانے میں تو یہ شہر منفرد رہا ہے۔

تاریخ نویسی کے فن کو مسلمانوں نے دنیا سے روشناس کرایا، اس کے اصول و ضوابط بنائے اور ترقی دی۔ پہلے زمانے کے علماء یک فنے نہیں ہوتے تھے۔ وہ منقولات میں مہارت کے ساتھ معقولات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح وہ تاریخ کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے جسے اب ہمارے مدارس نے اپنے نصاب سے خارج کر کے غلطی کی ہے۔ مذہب

اور اصول عقائد کو بھی تاریخ کے فریم میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے ان محرکات وعوامل کا علم حاصل ہوتا ہے جو مسلکوں میں اختلاف کا سبب بن جاتے ہیں۔ علمائے متقدمین کے اسی تاریخی شعور کی وجہ سے پہلے زمانے میں عمومی تاریخوں کے علاوہ کسی مخصوص فرقے یا مسلک کی، یا کسی خاص شہر یا قصبے کی تاریخیں بھی خوب لکھی گئیں۔ اب یہ ذوق مردہ وافسردہ ہو چکا ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ کی قدر و قیمت اور اہمیت وافادیت کو نہ سمجھیں گے تو ہمارے ساتھ ہمارے اسلاف کا جمع کیا ہوا علمی وثقافتی سرمایہ بھی دفن ہو جائے گا یا وقت کے سیلاب میں بہہ جائے گا۔ لیکن اس عام سرد مہری کے باوجود کہیں کہیں ایسے خاص لوگ بھی نکل آتے ہیں جو کسی صلہ وستائش کی تمنا کے بغیر محض اپنے ذوق کی تسکین کیلئے کسی علمی موضوع کا حق ادا کرنے میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مخلص مولانا عبدالمعید سنبھلی ہیں جو ایک دینی واسلامی مدرسے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ برسوں سے سنبھل کی تاریخ لکھ رہے تھے، اور اب وہ سالہا سال کی اس کاوش کو کتابی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

مولانا عبدالمعید سنبھلی نے اس کتاب میں سنبھل سے متعلق حتی الوسع سب معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے تاریخ ایک ایسا موضوع ہے کہ اسے لکھنے والے کے اپنے سیاسی ومذہبی عقائد ور جحانات سے بچا کر بے میل، بے داغ، واضح اور شفاف شکل میں پیش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

یہ کتاب سنبھل کی تاریخ کے بارے میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی سبھی معلومات کسی محاکمے کے بغیر پیش کرتی ہے۔ اس کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ اس میں قدیم زمانے کی شخصیات کے علاوہ ان بہت سے علماء کے تراجم اور مدارس کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، جن کے بارے میں تاریخ کے بیشتر مصادر خاموش ہیں۔

امید ہے کہ علمی حلقوں میں عبدالمعید صاحب کی اس مخلصانہ کوشش کی قدر کی جائے گی۔

۱۹ رمحرم الحرام ۱۴۲۳ھ — نثار احمد فاروقی

۳ را پریل ۲۰۰۲ء — پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۳ رجامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تاریخ سنبھل پر ایک گراں قدر کاوش

از سعادت علی صدیقی

سرائے ترین سنبھل کے ساکن (مولینا) عبدالمعید بن سعد اللہ جوان دنوں ٹانڈہ رام پور جامعہ رحمانیہ میں معلمی اور جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں (ایک باشعور وسنجیدہ فکر، اہل قلم ہیں ان کی دو تصانیف شائع ہوچکی ہیں، جو مذہبی ودینی امور سے متعلق ہیں، اور اہل نظر سے داد تحسین حاصل کرچکی ہیں) عبدالمعید صاحب نے شمس العلوم سرائے ترین، حیات العلوم مرادآباد اور دارالعلوم دیوبند میں اکابر اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور علوم کی بخوبی تکمیل کی، تکمیل تعلیم کے بعد مدرسہ رحمانیہ ہاپوڑ، مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خان سنبھل میں تدریسی فرائض انجام دیئے ۱۹۸۱ء میں حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی ۱۹۸۲ء میں ٹانڈہ جامعہ رحمانیہ میں تقرر ہوگیا، جہاں درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی جاری ہے، "پہلی کتاب توبہ کیا ہے؟" ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئی، پھر "اہمیت ذکر ودعاء" طبع ہوئی قیام دارالعلوم دیوبند کے دوران مسیح اللہ خان خلیفہ حضرت تھانویؒ سے والہانہ عقیدت ہوگئی اور ان کے مریدین میں شامل ہوئے۔

عبدالمعید صاحب کا بڑا اہم کام تاریخ سنبھل کی تدوین وتالیف ہے وہ گذشتہ کئی برس سے اس اہم ترین موضوع پر کام کررہے ہیں یوں تو تاریخ سنبھل پر دو کتابیں احسن التواریخ مؤلفہ غلام احمد شوق فریدی مطبوعہ ۳۶/۱۹۳۵ء اور خلاصہ ایوان منتقل مرتبہ سید عبدالصمد زیدی مطبوعہ ۲۸/۱۹۲۷ء میں شائع ہوئیں لیکن دونوں ساقط الاعتبار بھی ہیں اور نایاب ہیں، عبدالمعید صاحب نے بڑی تلاش وجستجو اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے اور موضوع کو مختلف عنوانات مثلاً سنبھل کی وجہ تسمیہ، آبادی کا آغاز، اقوام وآبادی کا تناسب، تاریخی مقامات،

آثار قدیمہ، مشاہیر علماء شعراء، ادباء، اکابر، عمارات وغیرہ کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے، موصوف نے مواد کی تلاش، حقائق کی فراہمی اور کتب مطالعہ میں بڑی محنت کی ہے ان کی تالیف کردہ تاریخ سنبھل کے مسودہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی یہ کاوش تاریخ تحقیق اور تہذیب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اہم ثابت ہوگی، اہل علم وقلم کا فرض ہے کہ تاریخ سے متعلق کوائف کی فراہمی میں ان کی مدد کر کے ادب نوازی کا ثبوت دیں۔

دعاء ہے کہ عبدالمعید صاحب اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔

سعادت علی صدیقی

۲۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء

از عقیل الرحمٰن خاں
وزیر ریاست، حکومت اتر پردیش

حرفِ چند

مورخ اپنے دور کا ضمیر ہوتا ہے، جب بھی کوئی تاریخی کتاب مرتب کرے تو کسی طرح کی پاسداری، سیاسی، سماجی اور عقائد کے اختلاف کا بال برابر بھی اثر اس کی کتاب میں نہ ہو بلکہ جو جس درجہ و مرتبہ کا حامل ہو اُسے ویسا ہی لکھا جائے، تب ہی وہ کتاب معتبر اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے سند بن سکتی ہے۔ حضرت مولانا مولوی عبدالمعید صاحب نے تاریخِ سنبھل کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ یہ ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیسویں صدی میں احسن التواریخ کے بعد یہ پہلی کتاب ہوگی جو اُردو زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اس کے لئے مولٰنا موصوف نے کتنی جدّ و جہد کی ہوگی۔ کتنا اپنے دل و جگر کا خون بہایا ہوگا۔ چشم بینا سے کتنی کتابوں کے مطالعے کیے ہوں گے، اُسے مرتب کا دل و جگر ہی جان سکتا ہے۔ وہ قابلِ صد مبارک باد ہیں۔ مجھے جو مسوّدہ مولانا موصوف نے پڑھنے کے لیے دیا ہے، وہ مکمل کتاب نہیں بلکہ مقدمہ ہے جسے میں نے بہت غور سے پڑھا۔ اس میں کچھ اشارے کنایے ملتے ہیں جس کو تفصیل کے ساتھ مولٰنا نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔

میں دوبارہ عرض گزار ہوں کہ حضرت مولٰنا عبدالمعید صاحب دامت برکاتہم کا یہ عظیم کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رکھنے کا ضامن ہے اور انشاء اللہ یقیناً یہ کتاب پسندیدگی عوام و خواص حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ مولٰنا عبدالمعید صاحب کو عمر دراز عطا فرمائے (آمین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مصنف

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم:امابعد

حب الوطن من الایمان

وطن کی محبت ایمان کی علامت ہے۔

بلاتفریق وامتیاز مذہب وملت ہر شخص کو اپنے وطن عزیز سے محبت ہوتی ہے جوسکون وطمانینت اور مسرت وطن کی آغوش میں میسر ہوتی ہے وہ دوسرے مقام کے حسین مناظر اور دلفریب تفریح گاہوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

سنبھل:۔میرے آباء واجداد کا مسکن وماویٰ رہا ہے اور وہ اسی کی خاک میں محو استراحت ہیں۔سنبھل میری جائے پیدائش ہے اور اسی کی آغوش میں تعلیم وتربیت بھی پائی ہے۔

تاریخ سنبھل: لکھنے کے محرک جناب مولانا مفتی حبیب الرحمان خیرآبادی، صاحب مدظلہ،مفتی دارالعلوم دیوبند ہیں،ان سے مدرسہ حیات العلوم مرادآباد کے زمانہ قیام سے میرے روابط قائم ہیں۔اور تعلقات مثل قرابت کے ہیں۔موصوف مجھ پر ہمیشہ کرم فرمارہے ہیں اور مفید مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔انھوں نے ہی تاریخ سنبھل لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔

بندہ کی کتاب "توبہ کیا ہے" جب منظر عام پر آئی تو آپ نے اظہار مسرت فرمایا اور ایک مولانا صاحب سے ان الفاظ میں میرا تعارف کرایا "اب تک چھپے ہوئے تھے اب چھپ گئے" پھر مجھ کو تاریخ سنبھل کی تدوین کا حکم دیا۔میں نے تعمیل حکم کو ضروری سمجھا۔

اولاً جامعہ حیات العلوم کے کتب خانہ سے کتابیں مستعار لیں۔ نزہتہ الخواطر کا مطالعہ شروع کیا تو علمائے سنبھل کے تذکرے کے ''عنوان'' پر حضرت مفتی صاحب کے قلم کے نشان لگے ہوئے پائے اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مفتی صاحب کا ارادہ علمائے سنبھل کے تذکرے اور تاریخ مرتب کرنے کا تھا۔ لہٰذا یہ کام میرے ذمہ کیا اور مآخذ کی طرف رہنمائی کی اور ہمت افزائی فرمائی۔

یہ امر بھی مسلم ہے کہ حق پرست لوگوں کا شکریہ ادا کرنا اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا درحقیقت خداوند قدوس کی تعریف کرنا ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر نہیں کرپاتا چونکہ جس علم و فضل کے مشائخ و فضلا حکماء، اتقیا، دانشور، کاملین، بالغ النظر، بلند پایہ بزرگ، ممتاز شخصیتیں، حکام، نوابین، سلاطین، نامور اہل علم سنبھل کی سرزمین میں پیدا ہوئے ان کے تبحر علمی، زہد و تقدس اور فضل و کمال کا اعتراف دنیا نے کیا ہے حتیٰ کہ بعض مشاہیر علمائے حرمین شریفین نے بھی ان سے سند فضیلت حاصل کرنے کو اپنے لئے باعث فخر و برکت سمجھا۔ علمائے سنبھل عملی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، اور مجھے بعض حضرات سے ان کی طرح انکی خاطر بھی عزیز ہوئی بایں وجوہ میرا شوق تصنیف بڑھتا گیا۔ تاکہ ہر مکتب فکر و طبقہ اور زمانہ کے انسانوں کے لئے قصص الاولین مواعظ الآخرین کے مصداق ہوں۔

ان حالات وواقعات کو پیش نظر رکھ کر اپنی بے بضاعتی وعدم قابلیت کے اعتراف کے باوجود اس تاریخ کے لکھنے کا قصد کیا۔

وہ سنبھل جو دنیا کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے اور جس کی ابتدائی تاریخ ماقبل اسلام کے اندھیروں میں گم ہے، ہندوستان میں سلاطین اسلام کی آمد سے سنبھل کا نام تاریخ میں جمال و کمال کی بنا پر ابھرا، اور سنبھل کو انھوں نے شرف بخشا۔ بندہ نے اس کام کا آغاز کیا تاکہ اس قدیم شہر کے صحیح تاریخی حالات وواقعات

سے آنے والی نسلیں باخبر ہو سکیں۔

کام میں نے جس قدر آسان سمجھا تھا جب تحقیق و جستجو کے میدان میں قدم رکھا تو اسی قدر دشوار اور مشکل پایا۔ میں نے تاریخ کو قلمبند کرنے کے سلسلہ میں کامل بارہ برس تک زیادہ تر مسلسل اور گاہے گاہے غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔ میں نے تاریخوں، دستاویزات کے ہزارہا صفحات لوٹ ڈالے ہیں، اور دوسرے واقفیت کے ہر ایک ممکن ذریعہ سے چارہ جوئی کی ہے۔

تاریخی حالات کی تلاش و تجسس روایتوں کی تحقیق و تنقید، اغلاط و موہومات کی تردید و تکذیب جس قدر کٹھن و مشکل کام ہے اس کا پورا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کی تصانیف پر قلم دراز کرنے کا موقع ملا ہوگا۔

مقصد کے حصول و تائید کے لئے شہر سنبھل کی باون سرائیں چھتیس پورے کی گلیوں میں بارہ سال تک گشت لگایا تاریخی حالات کی تلاش و تجسس اور اہل شہر کے خاندان کے لوگوں سے مل کر تصدیق اور مزید معلومات کی فراہمی کے لئے اور ان کو عالم گمنامی سے نکال کر تاریخی اوراق کی زینت بنانے کیلئے جائے قیام ٹانڈہ بادلی سے ہر ماہ وطن سفر کرتا اور ایام تعطیل خاص کر رمضان المبارک و شوال المکرم ۲ ماہ کے قریب اسی کی تلاش و جستجو میں صرف ہوتے۔

سب سے زیادہ دقت کتابوں اور مختلف حوالوں کے تلاش کرنے میں ہوئی، سنبھل کی قدامت و کارناموں اور اہمیت کے لحاظ سے سنبھل کی کوئی تاریخ نہیں۔ اگرچہ آئینہ سنبھل، ایوان مقفل، احسن التواریخ جیسی کتابیں انتھک کوشش کے بعد دستیاب ہوئیں۔ اس میں جزوی بحث ہے ان سے سنبھل کی اہمیت و قدامت کا نہ سُراغ ملتا ہے اور نہ بھرپور روشنی ملتی۔ یہاں کتابوں کا کال ہے اور کوئی اچھا کتب خانہ بھی نہیں۔ اب حال میں محترم جناب سعادت علی صدیقی کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں

کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوا، واقعۃً تاریخی کتابیں کالعدم ہیں اور جو ہیں بھی وہ تاریخی کتابیں مطالعہ کیلئے دینے میں فراخ دلی اور وسعت سے کام نہیں لیا گیا جس سے خادم خاطر خواہ فائدہ نہیں حاصل کر سکا۔ اور جن حضرات کے پاس تاریخی کتابیں سنبھل کے حالات قلمبند تھے شاہی فرامین موجود تھے انھوں نے دکھانے سے گریز کیا۔ مجھے کتابوں کا جہاں سراغ ملا وہاں پہنچا۔ نایاب قلمی کتابوں کے مطالعہ اور مآخذ و مطالب کی غرض سے ملک کے مشہور کتب خانوں میں جیسے رام پور دہلی، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانوں کا متعدد بار طویل سفر کیا۔

میں نے بہت کتابیں خریدیں اور بہت جگہ سے کتابیں مستعار لیں اور اس کیلئے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ خاص کر رضا لائبریری رام پور بغرض مطالعہ سفر کا سلسلہ جاری رہا، اور رضا لائبریری سے، اصل مآخذ سے اقتباسات لیتا رہا۔ میں کارکنان رضا لائبریری کا مخلصانہ شکر گزار ہوں کہ ان حضرات کا قدم قدم پر تعاون ملتا رہا۔

اور اس کے علاوہ مختلف مقامات علی گڈھ، دہلی وغیرہ کا سفر بھی کیا۔

تاریخ سنبھل کا کام اس کی عظمت واہمیت کے پیش نظر صدیوں پہلے ہونا چاہئے تھا۔ افسوس کہ آج تک کوئی مستند و معتبر تاریخ قلمبند نہیں کی گئی۔

خداوند قدوس کا فضل عظیم ہے کہ اس نے آج وہ دن دکھایا کہ تاریخ سنبھل آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مآخذ کا اندراج ہر جگہ کیا گیا ہے اگر کہیں اندراج نہیں ہو سکا تو اس سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ مستند اور معلومات پر مبنی ہے۔

ضروری تفصیلات لکھنے میں بھی غلطی کا احتمال رہتا ہے اگر وہ رہ گئی ہوں تو درگذر کردی جائیں۔ تاریخی واقعات کو بیان کرنے میں اگرچہ میں پورے وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کما حقہٗ حق ادا ہو گیا تاہم تلاش وصبر و مشکلات کے بعد جو قارئین کے سامنے ہے وہ

محض حق تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔ دنیا میں کسی کام کو آخر نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا جتنا بھی کام ہو گیا وہ بھی کم نہیں جو جتنے کے لائق ہوتا ہے وہ اس کے مطابق اس سے کام لیتا ہے۔ حق تعالیٰ جس سے جو کام چاہے لے لیتا ہے وہ تنکے سے چاہے تو شہتیر کا کام لے لے۔ اور ذرہ کو چٹان کی قوت بخش دے۔

داد اورا قابلیت شرط نیست

تمام حالات کو احاطۂ تحریر میں لانا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے "تاریخ سنبھل" کے دو باب ہیں باب اول تاریخ پر اور باب دوم علماء، شخصیات، حکما، اُدبا شعراء، دور حاضر کے سرگرم علماء کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

تاریخ سنبھل: اہل سنبھل خاص کر مسلمانوں کیلئے اہل وطن کے بڑے کارناموں کی ایک اہم دستاویز ہے اور انہیں کے اسلاف کے کردار کا آئین نیز شاہان اسلام کے انحطاط وعروج وزوال کی ایک تصویر ہے۔ تاریخ سنبھل مبسوط تاریخ ہے امید ہے کہ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

عبد المعید سنبھلی

۱۴۱۱/۵/۱۳ھ

اہمیتِ تاریخ

تاریخ صرف سلاطین اور حکمرانوں کے حالات کا نام نہیں ہے بلکہ قوموں کے عروج وزوال اور ان کے افکار و خیالات تحریکات علمی و عملی اور جدو جہد کا نام بھی تاریخ ہے۔ جس کی بنیاد پر انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے بلند ہمتیں، حوصلوں کی بلندی و رفعت اور نئی راہیں عمل میں آتی ہیں اسلئے تاریخ حال و مستقبل کے لیے مشعل راہ ہے۔

وتلك الايام نداولها بين الناس.

اور ہم لوگوں کے درمیان زمانے کے حالات بدلتے رہتے ہیں

(پارہ ۴ سورہ آل عمران)

اپنے اسلاف اور آباء واجداد کے کارہائے نمایاں اور تاریخ کے اوراق کو مسخ کرنا۔ اور اپنی تاریخ سے کوئی لگاؤ نہ رکھنا۔ اور اپنی اصلی حقیقت سے بے خبر رہنا خود کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے مترادف ہے۔ جب کہ اپنے اسلاف کی تاریخ کو محفوظ رکھنا بیداری پیدا کرنے اور نوازے جانے کا سبب ہے۔ خود قرآن پاک نے آنحضور ﷺ کے زمانے کے یہود و نصاریٰ کو مخاطب کیا ہے۔

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم.

اے بنی اسرائیل تم میرے ان انعامات کو یاد کرو۔ جو میں نے تم پر کیے ہیں۔

(پارہ ۱، سورہ بقرہ)

حالانکہ یہ انعامات واحسانات ان پر نہیں کیے گئے تھے۔ بلکہ ان کے اسلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پر کیے گئے تھے۔ جیسے فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلانا، من وسلویٰ اتارنا، بادل کا سایہ کرنا، چٹان سے چشمہ جاری کرنا وغیرہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کریم خود اسلاف کی تاریخ محفوظ رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

نیز تاریخ کا مقصد یہ بھی ہے کہ واقعات کو سامنے رکھ کر اخلاق اور عادات انسانی سدھارے جائیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ بیان و تفصیل میں ہر قسم کی احتیاط مدنظر رکھی جائے۔ اسلام نے بھی احتیاط کو مدنظر رکھ کر علم اسماء الرجال اور فن روایات کو مدون کیا ہے۔

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے سب سے پہلے اس احتیاط کے پیش نظر فن حدیث کیلئے اسمائے الرجال کی تدوین کی۔

تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں بلکہ کل بنی نوع انسانی کے پچھلے تجربات کا دفتر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے، تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے۔ اور حال و مستقبل کو روشن اور تابناک بنائے۔

مقصد یہ بھی ہے کہ انسان ہمیشہ گزرے ہوئے حالات کی طرف مڑ کر دیکھنا پسند کرتا ہے، جس میں ترقی تنزلی ہر دو پہلو ہوتے ہیں۔

بایں وجہ انسان اپنے ماضی سے لگاؤ رکھتا ہے۔ ماضی کا مطالعہ حال کو سمجھنے اور مستقبل کو بہتر بنانے میں بڑی مدد دیتا ہے، گذرے ہوئے زمانے کو فراموش کر کے حال و مستقبل کو سازگار بنانا بہت دشوار ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ علم سیاسی شعور کی بیداری میں مدد دیتا ہے، اس وجہ سے اس علم کا مطالعہ کرنا باشعور کے لئے ناگزیر ہے۔ نیز اس علم سے نگاہ میں وسعت اور ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ علم قوموں کے عروج و زوال اجتماعی زندگی کی داستان جرائم و ظلم و ستم اور بدنصیبوں کی تصویر ہے۔

تاریخ کے بارے میں بے شمار نظریات ہیں۔ ہر مورخ نے تاریخ کے بارے میں اپنا نظریہ جداگانہ طور پر پیش کیا ہے۔

علم تاریخ:۔ اصطلاح میں اس علم کا نام ہے۔ جس کے ذریعہ نبیوں بادشاہوں فاتحوں اور مشہور شخصیتوں کے حالات اور گزرے ہوئے مختلف زمانوں کے عظیم الشان

واقعات معلوم ہو سکیں۔

مصنف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام رقمطراز ہیں کہ:

تاریخ کے لئے تین نقطہائے نظر ممکن ہیں۔

پہلا نقطہ نظر محض معروض کا مطالعہ ہے۔ یعنی واقعات اور حالات جیسے کچھ بھی گزرے ہیں۔ انہیں جوں کا توں دیکھا جائے۔

دوسرا نقطہ نظر قوم پرستانہ مطالعہ کا ہے۔ یعنی اہم واقعات کو اس قوم یا اس ملک کی حمایت کے جذبے سے دیکھیں۔ جس سے ہمارا تعلق ہے۔ اسی لحاظ سے تاریخ اخذ کریں۔ اور اسی لحاظ سے اشخاص واقوام کے متعلق رائے قائم کریں۔

تیسرا نقطہ نظر مقصد واصولی ہے۔ یعنی ہم نسبتی اور قومی تعصبات سے بالاتر ہوکر انسانی فلاح وسعادت کو مقصود بنا کر نیک وبد کا بے لاگ معیار سامنے رکھ کر نسل انسانی اور اس کے مختلف اجزا کو جانچیں۔

تاریخ کے متعلق ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں تاریخی حالات اور اس کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ ہم اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

حقیقت تاریخ

وہ انسانی اجتماعی و دنیا کی آبادی کی خبر دیتی ہے اور ان حالات کی بھی جو اس آبادی کو طبعی طور پر پیش آتے ہیں۔ جیسے باہمی کشیدگی اور تناؤ، باہمی میل جول، حکومتوں کے مراتب اور ان کے درجات، خاندانی حمیت ورعایت اور قسم قسم کے باہمی قہر وتسلط اور ان نتائج کی بھی جو ان سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے فتوحات ملکیہ حکومتوں کا ظہور، حکومتوں کے مراتب اور ان کے درجات۔ اور ان طریقوں کی بھی جو انسان اپنے اعمال ومساعی سے اختیار کرتا ہے۔ جیسے روزگار کے دھندے، علوم وفنون، صنعت وحرفت اور تمام ان حالات کی بھی جو دنیا کی آبادی سے طبعی طور سے

پیدا ہوتے ہیں۔
وہ رقمطراز ہیں: کہ تاریخ میں جھوٹ اور سچ کا اور غلطیوں کا احتمال رہتا ہے۔
چونکہ خبر میں جھوٹ اور سچ کا احتمال ہوتا ہے اس لئے تاریخ میں بھی جھوٹ اور سچ کا اور غلطیوں کا احتمال ہوتا ہے۔اور لکھتے ہیں:
ہر زمانہ میں اقوام کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔بدلتے ہوئے زمانوں میں اقوام عالم کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں اور ان کے اخلاق وعادات،طور طریقے اور تہذیب وتمدن ایک حالت پر اور ایک راہ پر باقی نہیں رہتے بلکہ ہر زمانہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں پھر جس طرح یہ تغیرات لوگوں میں اوقات میں اور شہروں میں رونما ہوتے ہیں اسی طرح دینا کے ہر گوشہ میں ہر زمانہ میں اور حکومت میں بھی رونما ہوتے ہیں یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں کار فرما چلا آتا ہے۔
احوال عادات بدل جانے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ رعایا اپنے حکمرانوں کے حالات وعادات پر قائم رہتی ہے۔چنانچہ حکمت والا مقولہ مشہور ہے الناس علی دین ملوکھم لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے پر ہوتے ہیں۔
معلوم ہوا کہ حکومتوں کے بدلنے سے حالات میں تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے۔
بہر حال زمانوں کے بدل جانے کی وجہ سے قوموں اور لوگوں کے بدلے ہوئے حالات سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی ہے۔

مقدمہ تاریخ سنبھل: سنبھل دہلی سے تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر جنوب مشرق یوپی میں ایک قدیم ترین تاریخی شہر ہے۔جس کے سر پر راجدھانی اور صوبائیت کا سہرا بندھ چکا ہے سلاطین اسلام اور راجاؤں کا مسکن رہا ہے تاریخ کے مطالعہ سے اس کے قدیم ہونے کا ثبوت ملتا ہے لیکن صحیح طور سے اس کے آباد ہونے کا سراغ نہیں ملتا کہ سنبھل کب آباد ہوا،جس کی ابتدائی تاریخ ماقبل اسلام کے اندھیروں میں گم ہے اس کی

قدامت کا اندازہ بھی دشوار ہے چونکہ تاریخ ہر زمانہ میں اس کے وجود کا یقین دلاتی ہے اور اس کے آثار قدیمہ اس کی قدامت کا زبان حال سے ثبوت پیش کرر ہے ہیں اس کے نہایت قدیم اور تاریخی شہر ہونے میں کوئی شک نہیں یہ شہر اول مشرق کی جانب کوٹ ''ست وت'' کے نام سے آباد ہوا پھر بجانب غرب محلہ گری کے نام سے آباد ہوا تیسری بار جانب شمال بنگال نام سے ترتیامیں آباد ہوا چوتھی بار برسہ مقامات کے درمیان راجہ حجات نے آباد کیا ہندو دیو مالا اور مسلمانوں کی تاریخ میں اس کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔ اور یہ شہر آریا اور بدئعہ ادوار میں علم کا مرکز رہا اور یہاں سنسکرت کی کافی پاٹھ شالائیں موجود تھیں۔ جس میں زبان ادب منطق کا درس دیا جاتا تھا یہاں جوگیوں کے بہت سے آشرم تھے جہاں تیاگ اور نفس کشی کی تعلیم دی جاتی تھی ان ادوار کے آج تک تیرتھ سنبھل میں موجود ہیں ابتداءً اس کا نام سنبھلا تھا بعد میں کثرت استعمال سے سنبھل ہو گیا ہندو عقیدے کے مطابق کل جگ میں کلکی اوتار دجال یہیں پیدا ہوگا بعض ہندو مفکرین کی تو یہاں تک رائے ہے کہ قتل انسانی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا اور بعض کے نزدیک نسل انسانی کی ابتداء یہیں سے ہوئی لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ سنبھل کو جو شہرت اور اہمیت اسلامی دور میں حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے اسے کبھی حاصل نہیں تھی۔

سنبھل کو بقاودوام کی سند مغلیہ دور حکومت میں ملی جب کہ اس شہر کا نام سرکار سنبھل قرار دیا گیا چنانچہ اس دور کی اکثر دستاویزات میں سرکار سنبھل کے الفاظ ملتے ہیں یہاں ابھی تک پرتھوی راج کے نانا راجہ حجات کے قلعہ کے دیرینہ آثار ابھی تک موجود ہیں اور محلّہ کوٹ اسی جگہ آباد ہے۔ ۱۴۰۴ء میں راجہ سندر پال کا مقابلہ سید سرداروں سے ہوا جس میں سید روشن علی کاملی درویش شہید ہوئے سنبھل نے غوریوں اور خلجیوں کے دور حکومت میں بھی اپنی حیثیت نمایاں رکھی اور اسی زمانہ میں شہر کے متعدد نئے محلے

آباد ہوئے لیکن مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے تیرتھوں کا احترام برقرار رکھا اوران کی دیکھ بھال کیلئے جائیدادیں مہیا کیں جواب تک موجود ہیں یہ شہر رقبہ کے لحاظ سے ۳۶ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔اوراس میں ایک سو بڑے چھوٹے محلے آباد ہیں جن میں باون سرائیں اور چھتیس پورے خاص طور سے مشہور ہیں شہر کے بیچ سے چار سڑکیں چاروں سمتوں میں جاتی ہیں اور بعض مقامات پر توایک محلہ اور دوسرے محلّہ کے درمیان دس میل کا فاصلہ ہے۔لیکن آبادیوں کے درمیان غیر آباد علاقہ بھی ہیں۔جن میں کھنڈرات واقع ہیں بعض بعض محلے اپنی مخصوص آبادیوں کیلئے مشہور ہیں شہر کی جامع مسجد اپنے محل وقوع کے اعتبار سے آبادی کے قلب میں واقع ہے اور بلندی پر ہونے کے باعث اس کی چھت سے پورا شہر سنبھل نظر آتا ہے،ہندوؤں کے تیرتھوں میں منو کامنا خاص طور پر مشہور ہے سورج کنڈ درگا چھتر بھی مشہور ہیں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارتوں میں جامع مسجد کے علاوہ قدم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نیز شاہ فتح اللہ ترین کا مزار محلّہ دربار سرائے ترین میں، بلبل کی مسجد، میاں سرائے میں قلعہ، فیروزپور کا قلعہ اور محلوں کے دیوان خانے اور امام باڑے مشہور ہیں نیز تاریخی یادگاروں میں محلّہ سرائے ترین کی جامع مسجد جوسکندر لودھی کی تعمیر کردہ ہے چکی کا پاٹ طوطا مینا کی قبر اور عیدگاہ کی باؤلی مشہور ہیں چکی کا پاٹ ایک اہم داستان کا اہم جز ہے امیر الدولہ نواب امیر علی خاں والی ٹونک سنبھل محلّہ سرائے ترین کے تھے ان کی متعدد تعمیرات آج بھی موجود ہیں کبیر کی سرائے میں عالمگیر اورنگ زیب کی تعمیر کردہ مسجد موجود ہے اور سنبھل سے ہمایوں کو خاص تعلق رہا ہے وہ ایک زمانہ تک یہیں کا صوبہ دار بھی تھا اس کو نرولی اور سنبھل دونوں سے قلبی لگاؤ تھا وہ ۹۳۷ء میں یہیں مقیم تھا۔

اور اسی نے رستم خاں دکنی کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا تھا یہی وہ رستم خاں ہیں جنہوں نے بعد میں مرادآباد شہر آباد کیا انھوں نے سنبھل میں عیدگاہ کی باؤلی بھی تعمیر

کرائی تھی ہمایوں جب ایران سے واپس آیا تو شیخ حمید مفسر سنبھلی نے اس کا کابل میں خیر مقدم کیا اس کی عدم موجودگی میں شیر شاہ سوری کے دور میں قنبر دیوانہ سرکار سنبھل کا صوبہ دار تھا لیکن ہمایوں نے سنبھل پر دوبارہ قبضہ کیا تو اس نے علی قلی سنبھلی کو جاگیر عطا کی۔

شہر سنبھل کی علمی وادبی حیثیت زمانہ قدیم سے مسلم ہے قدیم ہندو عہد کے سوات گیتو جیسے جید عالم نے یہاں کی زبان اور علمیت کی تعریف کی ہے یہ علاقہ کھڑی بولی اور برج بھاشا کے سنگم پر واقع ہے۔

روہیل کھنڈ کے پورے علاقہ میں خاص کر سنبھل اور مضافات سنبھل میں ہر جگہ کتابی اردو بولی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان سب کمال با محاورہ زبان استعمال کرتے ہیں مسلمانوں کے دور حکومت میں یہاں عربی اردو فارسی کی تعلیم کا خاص بندوبست تھا سینکڑوں مدرسے تھے جہاں ہندو مسلم طلبہ ساتھ پڑھتے تھے عربی اور مذہبی درسیات کیلئے اسرائیلی خاندان مشہور تھا، حاتم سنبھلی جن کو اپنے وقت کا ابو حنیفہ کہا گیا ہے انھوں نے منتخب التواریخ کے مصنف عبد القادر بدایونی کو پڑھایا تھا ان کے بعد اس خاندان میں بہت بڑے بڑے جید علما پیدا ہوئے جن کا تفصیلی ذکر آئے گا ان میں سے ایک مشہور عالم مولانا ابوذر سنبھلی گزرے ہیں جو حیدرآباد دکن کے وثیقہ یافتہ اور نواب بہادر جنگ کے محترم تھے، فارسی کی تعلیم کے لئے خلیفوں کا خاندان مشہور تھا جس کے آخری عالم خلیفہ بخش الدین ہوئے، پراکرتی عہد کی آلا اور ہلا کی داستان انہیں سے منسوب کی جاتی ہے راجپوت خاندان کی شہزادی بیلہ کا تھان بطور تلمیح استعمال ہوا ہے اس طرح پلا مود اور بلبل کو بھی ہندی ادب میں تلمیحاً استعمال کیا گیا ہے یہاں رسمی تعلیم کے علاوہ روحانی تعلیم کا بھی بڑا چرچہ رہا ہے شہر میں خانقاہوں اور چلہ گاہوں کے علاوہ سینکڑوں مزارات ہیں یہ شہر عام طور پر شہیدوں کا شہر کہلاتا ہے۔

فقراء دہلی و پیران بدایوں اور شہدائے سنبھل کی مثل مشہور ہے نیز سید سالار

مسعود غازی بھی یہاں آئے اس شہر کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ نظام الدین اولیاء کی جائے پیدائش بدایوں کی ہے وہ اس وقت سرکار سنبھل کا ایک حصہ تھا اس شہر کو ۱۱۹۱ھ سے زوال شروع ہوا اور یہ اجڑنے لگا حالانکہ برصغیر کے مشہور سیاست داں اور اہل علم اور سرسید احمد خاں کے ساتھی نواب وقارالملک اور سید ظہور احمد اسی شہر کے تھے آبادی کی اکثریت اب تک مسلمانوں کی ہے۔

نیز بامحاورہ سلیس نثر اردو کا آغاز بھی یہیں سے ہوا چونکہ شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی تفسیر قرآن کریم موسوم بہ خدا کی نعمت معروف بہ تفسیر مرادیہ جو ۱۷۷۱ء میں تصنیف کی ہے جو اردو تفاسیر میں سب سے پہلی تفسیر ہے یہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے چالیس سال قبل لکھی گئی۔

شق القمر معجزہ یہاں دیکھا گیا اس کی یادگار مسجد ہے ایک ہزار سال سے تیوہار نیزہ اور ہندوؤں کا تہوار دھجا ہوتی ہے یوں تو ہندوستان میں بہت سے نامور انسان پیدا ہوئے جنھوں نے سیاست وسماج علوم وفنون میں اور ادبی خدمت میں نام ومقام پیدا کیا مگر سنبھل کی تاریخ میں زمانہ بعید وقریب میں کئی بلند تر شخصیات رونما ہوئیں جنھوں نے سنبھل کا نام روشن کیا۔

یہ اسلامی بستی شہداء کا مدفن ہے آج اس شہر سنبھل کو ضلع مراد آباد کی تحصیل کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس سے سنبھل کے مقام واہمیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا چونکہ مقام واہمیت کے انحصار ضلع ،صوبہ اور راجدھانی پر نہیں ہوتا بلکہ بلند پایہ شخصیتوں پر اور علوم وفنون پر ہوتا ہے بحمد اللہ سنبھل کا دامن ہمیشہ ان نعمتوں سے مالا مال رہا ہے بلکہ اس نے ایسے گوہر ہائے مایہ کو اپنی آغوش میں چھپایا ہے۔ جس کی سربلندیوں نے اس زمین کو ہم پایہ آسمان بنا دیا ہے۔ یہاں کے علماء نے نمایاں خدمات انجام دیں، وہ جہاں رہے شمع انجمن بن کر رہے اور جس علم وفضل کے مشائخ اور فضلاء وحکماء اس

سرزمین پر پیدا ہوئے ان کے تبحر علمی زہد وتقدس اور فضل وکمال کا اعتراف دنیا نے کیا ہے۔

وتلك الايام نداولها بين الناس۔

ان ایام کو ہم ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔

مالك الملك توتى الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاءُ وتذل من تشاء بيدك الخير۔

تمام ملکوں کے مالک آپ جس کو چاہیں ملک دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور آپ جس کو چاہیں غالب کرتے اور جس کو چاہیں پست کردیتے ہیں اور سب بھلائیاں آپ ہی کے اختیار میں ہیں۔

عالم کا یہی کار خانہ
ایک رنگ پہ کب رہا زمانہ
دنیا کے تغیرات کو دیکھو،
ہوتے ہوئے دن رات کو دیکھو

اسرار ازل رانہ تو دانی ونہ من
ایں حرف معمہ رانہ تو خوانی ونہ من

قوموں کے عروج وزوال میں شہروں کی آبادیاں وبربادیاں پنہاں ہوتی ہیں۔

صاحب احسن التواریخ شہر سنبھل کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

اس خاک کے ناچیز ذروں نے ہر دور میں ایسے گوہر ہائے گراں کو اپنی آغوش میں چھپایا ہے کہ جن کی سربلندیوں نے اس زمین کو ہم پایہ آسمان بنایا ہے۔

یہ شہر بھی صدیوں سے مذکورہ آیت قرآنی کا مصداق ہے۔(یورپ وروم کی لائبریری میں سرفہرست شہر سنبھل کا نام درج ہے)نیز مصنف غیاث اللغات لکھتے ہیں:

محمد غیاث الدین ابن جلال الدین ساکن بلدہ مصطفیٰ آباد عرف رام پور متعلقہ پرگنہ شاہ آباد لکھنؤ سرکار سنبھل مضافات صوبہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد۔

مخلص کہتا ہے ــــــــــ مسلسلح رایات عالیات بحرکت آمدہ در کردہ آں طرف از سنبھل سر بفلک سود واز دائرہ لشکر معلیٰ آبردی دریاچہ توت افزود۔

باآں کہ قصبہ سنبھل از شارع بفاصلہ بود۔ سوداا وراق ارادہ سیر نمود۔ عجب شہر خوش سوادی دیدہ شد۔ ہر چار طرفش تا نظر کاری کند۔ درخت انبہ است سر بفلک سودہ۔ وچوں ایام بہار بود، ہیچ شاخی بی نبودہ۔ ہر درخت معشوق سیر نامی زیور زمرد پوشیدہ۔ وہر شاخ زلف صنمی دل چند بند گرویدہ۔

حضرت عارف کامل حضرت مرزا بیدل علیہ الرحمہ در تعریف انبہ کہ بہترین میوہ ہندوستانست ۔ دروازہ شہر کہ در نہایت بلندمی است۔ آسیا سنگی دارد امیل آہن آویختہ۔ گویند در زماں گزشتہ بازیگری از زمین معلقی زدہ، دفعہ اول میل آہن رانصب نمود ودر معلق دوئیم آسیا سنگ راباتعبیہ ساخت وگویا ایں آسیاسنگ سنگ زور آں بازیگر است، چہ بازی گری کہ بیک جست ایں آسیاسنگ راتواند فرود آورد۔ باداز یں دروازہ گزشتن رواست، ودر صورت عدم قدرت ایں معنی اگر ارادہ کند، بیجا چنانچہ بازیگران و معلق زنا تا حال از یں دروازہ نمیگذرند۔

شہر ویراں بیشتر یافتہ ـ لیکن از جملہ شہر ہامی قدیم است، اور عمارات وبازار ہالی پختہ دارد، آنجا خالی از نفاست مزاج نیستند، یکبار نشست اور برخاست ومعاش آنہا بمردم شاہجہاں آبادمی ماند۔

امین الدولہ بہادر کہ در عہد مبارک بمنصب ہفت ہزاری دسوار سرافرازی داشت از مردم اینجاست حویلی وسیع ورفیعی کہ مکان ہالی متعدد وحمام آئینہ خانہ دارد، بناساختہ و بہ تعمیر کردہ وباغ وبازار پیش روی حویلی نیز پرداختہ۔

مزار امین الدولہ بہادر مرحوم ہم درینجاست۔ آں طرف شہر بر سر بلندی گنبدی است، غرض کہ پیش ازیں ہم عبادت کدہ بود و حالا ہم عبادت کدہ است۔
بابر بادشاہ بہندوستان مسلط شدند و سنبھل را بجا گیر ہمایوں بادشاہ کہ در آن وقت نام نامی ایشاں ہمایوں میرزا بود۔ عنایت نمودند، در زماں ایشاں آں عمارت قدیم باسلوب مسجد درست کردند و حالا مسجد جامع ایں شہر ہماں گبند است۔

تاریخی کہ بر پیش طاق آں مرقوم است بقلم می آید۔ تاریخ:

جامع ابنیۂ فضل وکمال ☆ رافع الویہ ملک وملل
باسط اصحہ امن واماں ☆ بانی ابنیہ علم عمل
شاہ جم جاہ محمد بابر ☆ حفظ اللہ لہ عزوجل
دولت جوں بر افروخت بہند ☆ روشن از ہر تو آں شد سنبھل
کرد فرماں بکمین بندہ خویش ☆ کہ بود عمدہ ارکان ودل
میرا باعقل وخرد ہندو بیگ ☆ آں باخلاق نکوگشتہ مثل
جوں نہ فرمان شہنشاہ زباں ☆ یافت اتمام بتوفیق ازل
سال وتاریخ ومہ وروزش گشت ☆ یکم از شہر ربیع الاول

مخلص آگے چل کر جامع مسجد سے متعلق رقم طراز ہے:
اس مسجد سے متعلق ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ سنبھل کے ایک نائب صوبہ دار دیاناتھ سنگھ نے مسجد کے حکماء شہر سنبھل کے جاگیرداروں پر ٹیکس عائد کیے ۱۷۲۳ء میں قمر الدین اعتماد الدولہ نے اور ۱۷۷۷ء میں راجہ دولت سنگھ نے بھی ایسے ہی احکام جاری کیے وہ لکھتا ہے کہ اکثر مسلمانوں کے شہروں کے دیکھنے میں آتا ہے سنبھل کے ارد گرد بھی باغات ہیں شہر صاف اور ستھرا ہے اس کے مختلف حصول میں بارہ بازار ہیں۔

روہیلکھنڈ کی وجہ تسمیہ

غزنی و غوری حضرات جب کوہستان درہ میں سکونت پذیر ہوئے جس کا ایک وسیع سلسلہ چلتا ہے۔ اس کے شمال میں کوہ کاشغر اور جنوب میں بھگہ اور بلوچستان، مشرق میں کشمیر اور جنوب میں دریائے ہند ہے، جو قندھار کے قریب بہتا ہے۔ وہ لوگ اس پہاڑی کی سکونت کی وجہ سے روہیلہ کہلائے اور روہیلکھنڈ ان ہی لوگوں سے آباد ہے۔ گویا مختلف قبیلوں کے وہ لوگ تھے جو معاش کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے، زیادہ تر یہ لوگ کٹھاروں کے علاقے میں بس گئے اور مقامی لوگوں کے لیے سپاہیوں کا کام کرنے لگے۔

روہیلکھنڈ: سنبھل و ضلع مرادآباد روہیلکھنڈ کا مغربی وسطی حصہ ہے جو ایک بڑا خوبصورت قطعہ ہے۔ جس کا عرض البلد ۸، درجے ۳۰ دقیقہ ہے اور طول البلد ۸، درجہ ۴۰ دقیقہ ہے۔ اس کے حدود اربعہ شمال میں اضلاع بجنور و نینی تال، مشرق میں ریاست رام پور جنوب میں بدایوں، مغرب میں دریائے گنگ جو ہے۔ مرادآباد کو ضلع میرٹھ، غازی آباد بلند شہر کے اضلاع سے جدا کرتا ہے۔ دریائے گنگا کے کاٹ چھانٹ اور پانی کے بہاؤ سے ضلع کے رقبہ میں اختلاف ہوتا رہتا ہے جبکہ ۱۹۰۴ء میں چودہ لاکھ سڑسٹھ ہزار پانچ سو اسی (۱۴۶۷۵۸۰) ایکڑ رقبہ تھا۔

روہیلکھنڈ اور ملک کٹھیر کے حدود بریلی، مرادآباد، سنبھل، بدایوں کے اضلاع کو کٹھیر کہتے ہیں۔ شاہ آباد ضلع رام پور اور آنولہ ضلع بریلی میں شامل تھا۔ جب مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا تو سنبھل اور بدایوں میں علیحدہ علیحدہ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ۶۳۰ء میں چینی ایک سیاح ہیون تسانگ نے کٹھیر کا سفر کیا۔ اس وقت اس ملک میں شیلا بتا کی حکومت تھی۔ یہ بدھ مذہب تھا۔ اشوک دوئم اس کا لقب تھا۔ وہ مذہب کی اشاعت میں سرگرم رہا۔ جسکی وجہ سے شمال مشرقی بنگال تک اور ہمالیہ

دریائے نربدا تک اس کا اثر تھا۔ اس سے قبل یہاں بدھ مذہب کی حکومت تھی۔ لیکن کوئی قدیم عمارت نہیں تھی۔ جس سے صحیح اندازہ ہوتا۔

البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مراد آباد کے علاقہ میں تہذیب یافتہ آریہ ۱۰۰۰ء سے پہلے موجود تھے۔ (احسن التواریخ ص ۹۴/۹۵)

ہیون تسانگ جس زمانہ میں ادھر سے گزرا اس وقت کاشی پور کا قدیم نام (گوویسانہ) تھا ایک معتبر جگہ اور ڈھائی میل مربع میں آباد تھا اس کے گرد مندر و تالاب پلی ہوی مچھلیوں کے تالاب تھے۔ جنوب و شمال کے گوشہ میں گنگا۔ کے پاس قدیم شہر آباد تھا۔

مسٹر الکزینڈر۔ کا خیال ہے کہ راجپوت حملہ آوران تومرقوم نے پہلے ۷۰۰ء میں حملہ کیا اور سنبھل کو دار الحکومت بنایا۔ انہیں شاخوں سے اہیر، بہار، چیردس، تومرقوم سن گیارہ سو پچاس تک ۱۱۵۰ء تک حکمرانی رہی۔ لیکن مستقل حکومت نہ رہی۔ تومرقوم سے چوہان کے پاس حکومت آئی۔ ان سے یہ ملک مسلمانوں کے زیر نگیں آیا۔

سنبھل کی تاریخی حیثیت

سنبھل علمی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تاریخ میں اس کا نام اپنے جمال و کمال کی بنیاد پر ابھرا ہوا ہے، ما قبل اسلام اس کی تاریخ اندھیروں میں ہے۔

سنبھل مہاتم کے بموجب سنبھل کی آبادی کی ابتدا لاکھوں سال کی شماری ہوتی ہے۔ جب کہ اس دنیا میں انسانی وجود ہی نہیں تھا:

حکماء ہند نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلی مخلوق کی آبادی کی مدت کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے، جس کی مدت اتنی دراز ہوگئی کہ بقول حکماء ہند دنیا کی موجودہ قیام آبادی کی مدت۔ ۴۳۲۰۰۰۰ سال ہے۔ جو چار چگ یعنی دور پر منقسم ہے۔

(۱) اول دور کی مدت کا نام ست جگ۔ اس کی مدت سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار سال کی ہے۔

(۲) دوسرے کا نام دواپر ہے۔ اس کی مدت سترہ لاکھ چھیانوے ہزار سال ہے۔
(۳) تیسرے دور کا نام ترتیا ہے۔ اس کی مدت آٹھ لاکھ چونسٹ ہزار سال ہے۔
(۴) چوتھے کلیگ۔ جو کلجگ سے مشہور ہے۔ موجودہ دور کلجگ کا ہے۔

سنبھل ۳۶ مربع میل میں تھا ۱۱۹۱ء سے اس کا زوال شروع ہوا:
سنبھل چھ ہزار برس پرانا شہر ہے۔ جو ۴۰۰۰ ہزار برس قبل حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام آباد ہوا۔ (اخبار جنگ روزنامہ کراچی ۱۶ مئی ۱۹۷۸ء)

بقول مصنف آئینہ سنبھل کی آبادی ست جگ سے پائی جاتی ہے اور ست جگ میں سنبھل کا نام ستوتی اور دواپر میں پنگل اور ترپتا میں مہد گداہ تھا۔ اب موجودہ کل جگ میں سنبھل ہے۔

پرتھوی راج کے فوت ہونے پر ۱۱۹۳ء سے ۱۵۲۹ء تک تین سو چھتیس (۳۳۶) سال تک شاہان دہلی نے سنبھل کو پایۂ تخت نہیں بنایا۔ ہاں سنبھل کا نظم ان کے زیر نگراں رہا۔ ۱۴۴۸ء میں سلطان سکندر لودھی نے اپنی حکومت کا پائے تخت بنایا۔ چھ ماہ شہزادہ ہمایوں سنبھل رہا۔ عہد مغلیہ میں سنبھل کو معراج ارتقا حاصل ہوئی۔ اور حکومت مغلیہ کا ایک تاج زرّیں قرار پایا۔ بابر ظہیر الدین اپنی ابتدائی حکومت میں سنبھل آیا اور ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔ خواص خاں۔ محمد قاسم سنبھلی، دریا خاں، تارتار خاں، قنبر دیوانہ، نواب امین الدولہ وغیرہ ممتاز شخصیتیں بحیثیت گورنر سنبھل فائز رہیں۔

اس کی قدامت کا پتہ محلہ کوٹ زمین کھودنے سے بڑی مرمی خشت اور بعض جگہ دھاتیں اور بعض جگہ کنویں اور مکانات زمین کھودنے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کے بعض محلّے مسمار ہو کر ویران ہو چکے ہیں اس وجہ سے ایک پورے سے دوسرے پورے تک ایک سرائے سے دوسری سرائے تک ایک دو میل کا فاصلہ ہو گیا ہے۔ سنبھل کے زوال کا زمانہ ۱۱۹۱ء سے شروع ہوتا ہے۔

سنبھل کی وجہ تسمیہ

ہندوستانی راجاؤں کے دور میں یہ رسم رائج تھی۔ فقیر چوبیس سال کی عمر میں علوم وفنونِ سپہ گری وغیرہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد چوبیس سال متواتر رام کی عبادت میں مشغول رہ کر فارغ ہو، تب شادی کی درخواست کرے۔

اس دستور کے مطابق ایک گوشا میں سنبھلا رشی نے رام کی عبادت اور تپسیا مکمل کرنے کے بعد اس نے اہل راجہ کی بیٹی سے شادی کی درخواست کی۔ چونکہ یہ رسم رائج تھی اس رشی کی راجہ یا برہمن اپنی بیٹی سے شادی کر دیں مذکورہ راجہ نے اپنی بیٹی سے سنبھلا رشی کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شادی کر دی اور بہت جہیز دیا سنبھلا رشی نے وہ سب جہیز ختم کر دیا، اور بیوی کے قریب نہیں گیا اور پھر تپسیا میں مشغول ہو گیا۔ تپسیا سے فارغ ہو کر بیوی کے قریب جانے کا ارادہ کیا یعنی (صحبت کا) تب بیوی نے کہا جو سامان جہیز ضائع کر چکے ہو اسے لاؤ تب میرا قرب (صحبت) ممکن ہے۔ چنانچہ سنبھلا رشی جا بجا یہ سوال لے کر پھرا کہ جو شخص میرا سوال پورا کرے گا اس سے چھ گناہ یا دس گناہ مال اس کے پاس رہے گا، سنبھل کے راجہ کے سوا کسی نے اس کا سوال پورا نہیں کیا۔

پہلے سنبھل کا نام متی مشہور تھا۔ متی شہر کے راجہ نے سنبھلا رشی سے کہا کہ تم اس شہر متی میں سکونت اختیار کر لو، سنبھلا رشی نے سنبھل یعنی شہر متی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب سنبھلا رشی کی شہرت ہندوستان میں پھیل گئی۔ بیرونی ملکوں واطراف کے راجہ سنبھلا رشی کے درشن کرنے آنے لگے، تو دوسرے لوگ راجاؤں سے معلوم کرتے کہ کہاں جاتے ہو؟ تو جواب میں کہتے سنبھلا رشی کے پاس جاتے ہیں اسی طرح رفتہ رفتہ غلط العام فصیح کے مطابق شہر متی سنبھلا رشی کے نام پر سنبھل مشہور ہو گیا۔ (احسن التواریخ)

سنبھل مختلف مقام پر آباد ہوا

سنبھل چار جگ کے نام سے آباد ہوا

(۱) ست جگ، مقام چندائن میں سنبھل آباد ہوا چنانچہ وہاں اب تک ویران کھیڑا موجود ہے۔

(۲) دواپر ب جگ۔ میں تیرتھ منوکامنہ سے دکھن کی طرف سنبھل آباد تھا، وہاں بھی چند کھیڑے اس کی مٹی ہوئی آبادی کی روشن دلیل ہے۔

(۳) ترتیا جگ، میں تالاب بھاگرتی موجود تھا، محلّہ تمرداس سرائے کے پچھم میں بسا ہے وہاں بھی کھیڑے موجود ہیں۔

(۴) کل جگ، سنبھل کی موجودہ آبادی کلجگ کی ابتداء سے ہے۔

اسی وجہ سے سنبھل کے مختلف نام ہیں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں کبھی سرکار سنبھل کے نام اور کبھی حویلی سنبھل اور بلدہ سنبھل کے نام سے پکارا گیا ہے۔

"سنبھل میں کلکی اوتار کا ظہور"

سنبھل کی تاریخ کو ہندوستان میں ایک اہمیت کا مقام حاصل ہے ان کی مذہبی کتاب "کلکی پوران" میں تو مصنف نے بڑی تفصیل بیان کی ہے لیکن ہم یہاں مہاتمیئے کتاب سے جو سنبھل کے ہی ایک قابل مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اسی کے مختصر اقتباسات درج کر رہے ہیں۔

چار لاکھ اشلوکوں (شعروں) والے اٹھارہ پورانوں میں اسکند پوران بھی لاثانی ہے، اس میں (۸۱۰۰۰) اکیاسی ہزار اشلوک (شعر) ہیں اس کی روشنی میں سنبھل کا مہاتمیئے لکھا گیا ہے ستائیس اسباق والی اس "مہاتمیئے" نامی کتاب میں سنبھل کے ۶۸ تیرتھوں

اور ۱۹ کوپوں (کنوؤں) کا ذکر ہے۔ یہ کنوئیں بھی تیرتھ ہی ہیں، ویسے تو بھی پورانوں میں سنبھل کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔

پورانوں کے اس خوبی کے مطابق میر پوران میں سرشیٔ (پیدا ہوتا) پرلے (ختم ہونا) مذہب کی شان وشوکت قائم رکھنے والے راجونش منونتر اور اوتاروں کے چرتر (کردار) کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان اوتاروں کی جائے پیدائش کے بیان میں کلکی وشنو بھگوان کی جائے پیدائش سنبھل میں بتائی جاتی ہے۔ گورکھپور سے لکھی گئی "کلیان" نامی کتاب کے اسکند پوران کے مہیشور کھنڈ، کماری کا کھنڈ اس موجودہ ۲۸ کل یگ کے چوتھے آخری حصہ میں پوری دنیا کے مالک بھگوان وشنو کی جائے پیدائش سنبھل لکھی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے ہر کل یگ کے تین ہزار دوسو نوے (۳۲۹۰) سال گزرنے کے بعد اس سرزمین پر ایک بہادر شدرک نام کا راجہ ہوگا۔ یہ ایک سچ مذہب کی تبلیغ کرے گا۔ اور برائیوں کو دور کرے گا۔ کل یگ کے تین ہزار تین سو دسویں (۳۳۱۰) سال میں تندونش کی حکومت ہوگی۔ چارنکیہ نام والے برہمن کے ذریعہ اس خاندان کا خاتمہ ہوگا۔ کل یگ کے تین ہزار چھ سو (۳۶۰۰) سال گزرنے پر مگدھ دیش میں ہیم سدن کی بیوی رنجتی کے بطن سے بدھ کے روپ میں بھگوان وشنو کا دنیا میں ظہور ہوگا۔ کل یگ کی کل تعداد چار لاکھ بتیس ہزار سال ہے (۴۳۲۰۰۰) ان میں سے اب تک پانچ ہزار چوراسی (۵۰۸۴) سال گزر چکے ہیں ایک دوسری کتاب "شری مد بھاگوت مہاپوران" کے چارہویں حصہ کے دوسرے سبق میں لکھا ہے۔ چاند، سورج، برہستی پر تینوں گرہ جب ایک ہی راستہ سے ایک ساتھ گزریں گے تبھی ست یگ کا زمانہ شروع ہوگا۔ شری وشنو بھگوان کا نزول بھی کل یگ اور ست یگ کے بیچ میں ہی ہوگا۔ اور سنبھل میں شری وشنو یش برہمن کے گھر شری کلکی وشنو بھگوان کی پیدائش ہوگی۔

اسی بارھویں اسکندھ کے پہلے حصہ میں، ماضی، حال، اور مستقبل کے راجاؤں کا

ذکر کرتے ہوئے شری شک دیو جی مہاراجہ نے یہ بھی کہا ہے کہ دھرم تیر بدھشٹر کے راج سوئے یگ کے شروع میں بھیم سین کے ذریعہ جس جراسندھ راجہ کے تحت واقع ہوئی تھی اس کے والد کا نام برہ درتھ تھا۔ اسی خاندان کا آخری راجہ پرنچ تھا۔ پرنچ کے وزیر نے پرنچ کو قتل کر کے حکومت ہند کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس خاندان کی حکومت کافی دنوں تک چلی، اس خاندان کا آخری راجہ پرتھوی راج تھا جس کی دار السلطنت سنبھل تھی۔

پہلے سبق کے ۲۸ ویں اشکول تک یہ ذکر ہے۔ اس کے بعد ۲۹ اشکولوں تک یہ کہا گیا ہے کہ پرتھوی راج کے آٹھ پونوں کی اور چودہ ترکوں کی پیڑھیاں ہندوستان پر حکومت کریں گی۔

ترک، پٹھان، سید، یہ سب مسلمان کی ہی الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کے بعد انگریزوں کی دس پیڑھیاں اور پھر مونوں کی گیارہ پیڑھیاں حکومت کریں گی۔ ان کی حکومت کا زمانہ تین سو سال ہے۔ مون لفظ کے معنی بودھ کے ہیں اور یہ بات آج صحیح اترتی ہے کیوں کہ انگریزوں کے بعد جو راج چل رہا ہے وہ اشوک کی لاٹ اور چکر تا راج ہے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جو راج چل رہا ہے وہ بودھ راج ہیں۔ ہماری کرسی بھی اشوک کی لاٹ اور چکر پر چل رہی ہے، ہمارے قومی ترنگے پر بھی چکر ہی بنا ہوا ہے، اس کے بعد کل جگ کے خاتمہ تک ۴۲۶۹۰۰ سالوں میں ہونے والے واقعات کا مختصر بیان کر کے آخر میں اسی اسکندھ کے دوسرے حصہ میں شری کلکی وشنو بھگوان کے اوتار کا ذکر ہے۔ جس کا بیان وقت سے پہلے کیا گیا ہے۔

کلکی اوتار کی تصدیق وزمانہ ومقام کی تعیین

آپ نے اوتار کے عنوان میں پڑھا کہ کلکی اوتار کا ظہور سنبھل ہوگا یہاں چند چیزیں زیر بحث ہیں۔

(۱) کلکی اوتار کی صفات (۲) تصدیق، زمانہ و مقام کی تعیین۔

ہندوؤں کے پران میں کلکی اوتار کی چند اعلیٰ صفات بیان کی ہیں بدکاروں کا خاتمہ آخری اوتار کی شمشیر سے ہوگا۔ اعلیٰ تقویٰ جہان کے مولا، جگت پتی، بدکاروں کو ہی مارے گا، آسادھو دمن چار مددگار ہوں گے، چار بھراتاؤں کے ساتھ، دین کی توسیع اور بدکاروں کی ہلاکت میں مدد دینے کے لئے آسمان سے ملائکہ کا نزول ہوگا۔

دیوتاؤں کے ذریعہ ان کی مدد، آخری اوتار سے شیطان کو شکست ہوگی۔ کلی کا بھگانے والا، بے مثل حسین، آپریتم دیوتی، راجاؤں کے بھیس میں چھپے ہوئے چوروں کی تباہی، ترپ لنگ چھد ودیبون، جس سے خوشبو نکلنا، انگ راگائی پسینہ گندھا، عظیم معاشرہ کا نجات دہندہ ہوگا، عظیم بڑے سماج کا بدیشک بنا ولادت زوائد النور بارھویں تاریخ ۱۲ ربیع الاول میں ہوگی۔

مادھو ماس کی دوارشی شکل یکشی میں جنم۔ مقام سنبھل کے صدر پرویت وشنویشا کے یہاں ولادت ہوگی سنبھل کے پروہانت پروہت کے گھر میں ولادت۔ والدہ کا نام سومتی ہوگا۔ یہ تمام مذکورہ صفات آخری اوتار میں رہیں گی۔

کلکی اوتار کے مقام ظہور کی تعیین

برادرانِ وطن کے عقیدے کے مطابق یہ بات تو مسلم ہے کہ آخری اوتار کے ظہور کا مقام سنبھل گرام ہوگا۔ لیکن یہ ہندوستان میں کسی شہر یا قصبہ کے نام سے اطمینان نہیں جب تک اس کی مکمل وضاحت نہ ہو جائے۔

پہلے یہ تعیین ضروری ہے کہ سنبھل کسی شہر یا قصبہ کا نام ہے یا اس کی صفت ہے، پرانوں کے لحاظ سے سنبھل کسی قصبہ یا شہر کا نام نہیں ہو سکتا کیوں کہ اگر نام ہوتا تو اس کی صفت بیان کی جاتی۔ لیکن پرانوں میں کہیں پر بھی سنبھل گرام کی کیفیت نہیں بتائی گئی۔

ہندوستان میں ہمارے اس شہر کا نام سنبھل ہے، جو زیر بحث ہے تو آج سے تقریباً

چودہ سو سال پہلے یہاں کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا۔ جس میں مذکورہ صفات موجود ہوں اور لوگوں کو نجات دہندہ ہو۔ دوسرے کلکی اوتار کوئی معمولی اور کھیل تو نہیں کہ اوتار (نبی خاتم) کی بعثت ہو جائے اور قوم میں ذرہ برابر تبدیلی نہ ہو لفظ شمبھل کو خصوصیت سمجھ کر اس کے مولد پر غور کرنا ضروری ہے۔ لفظ شمبھل کا مادہ شم ہے۔ جس کے معنی پر امن مقام کے ہیں۔ لفظ شم کے ساتھ ور ترکیب سے شمور ہوا قواعد اصول کے لحاظ سے شمبھل لفظ کی تکمیل ہوئی۔ اب معنی ہوئے وہ مقام جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ دوسرے معنی (پانی) پانی سے قریب والا مقام کے مراد ہوں گے۔

شبہ کا ازالہ: یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب شمبھل کے معنی پانی کے ہیں تو پانی سے قریب والا مقام کیوں کر مراد ہے، جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ یہاں موضوع گفتگو مقام سے ہے نہ پانی سے خلاصہ کلام یہ نکلا کہ آخری اوتار کا مقام وہ ہے۔ جس کے آس پاس پانی ہو اور پر کشش امن والا مقام ہو۔ نیز اوتار کی سرزمین مقدس ہوتی ہے لہٰذا اس مقام کا بھی مقدس ہونا لازم ہے۔

اور وہاں تشدد وغیرہ نہیں ہونا چاہئے۔ نیز اس مقام کا زیارت گاہ ہونا بھی لازم ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے وہ مذہبی مقام ہو۔ بقول علمائے شمبھل میں (۳۶۰) ساٹھ زیارت گاہیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہاں۔ لات، منات، نامی زیارت گاہیں بھی ہیں۔ لات، منات، اور کتات وغیرہ سات مشہور بتوں کے پائے جانے والا مقام شمبھل ہے اور شمبھل کو ہی دار الامن کہتے ہیں۔ شمبھل کے لفظی معنی بلد الامن کے ہیں۔ آخری اوتار کی جائے وقوع امن دینے والا۔ اور تشدد اور حسد سے پاک ہونا چاہئے۔ تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ آخری اوتار کیلئے ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان میں ہو۔ اور سنسکرت اور ہندی بولے یہ کہنا نادانی ہوگا کہ آخری اوتار صرف ہندوستان میں ہو۔ کیا ہندوستان میں مقام شمبھل ہی جو زیر بحث ہے۔ ایشور کا پیارا مقام ہے؟ اور دوسرے

مما لک پیارے نہیں۔لہٰذا آخری اوتار بیرون ہند میں بھی مقام شمبھل کے آخری اوتار ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے مقام شمبھل میں اب سے چودہ سو سال پہلے ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو آخری اوتار کے معیار پر ثابت ہو۔ تمام پرانوں میں کلکی اوتار کی جائے وقوع کا نام شمبھل بتایا ہے لفظ شمبھل یا سمبھل دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

ہندوستان کے پرانوں اور ان کی مذہبی کتابوں سے آخری کلکی اوتار کے مقام کی تعیین میں کئی بحثیں بھی ہیں۔

اب ہم قرآن کی وہ آیات واحادیث پیش کرتے ہیں۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آخری کلکی اوتار اب سے پہلے آچکے ہیں جن کا نام نامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ ان کے پرانوں میں جو صفات بیان کی ہیں ان تمام کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اور آپ کا مقام بعثت دارالامن۔مکۃ المکرّمہ ہے۔ جیسے ارشاد ہے۔ومن دخل کان آمنا۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن عبدالمطلب کے گھر ہوئے جو قوم کے سردار تھے۔اور نسب مطہر تمام دنیا سے زیادہ شریف اور پاک ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ تمام کفار مکہ اور آپ کے دشمن بھی اس سے انکار نہ کر سکے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے بھی برکات کا ظہور اس طرح ہوا جس طرح آفتاب سے پہلے صبح صادق سرخ دنیا کو طلوع آفتاب کی بشارت دیتے ہیں۔ اسی طرح آفتاب نبوت کا طلوع قریب ہوا تو اطراف عالم میں بہت ایسے واقعات ظاہر کئے گئے جو آپ کی تشریف آوری کی خبر دیتے تھے، بہر حال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ۱۲ ماہ ربیع الاول میں ہوئی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چار یار (۱) ابوبکر صدیقؓ (۲) عمر فاورقؓ (۳) عثمان غنیؓ (۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے سامنے دعوت اسلام پیش کی۔ انھوں نے اس کے قبول کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا۔ بلکہ اس کے مٹانے کی پر زور کوشش کی۔

اور اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کے گھروں سے نکال دیا۔ وہ اپنی جان بچاکر مدینہ چلے گئے اور وہاں آپ کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے سچائی کو قبول کرلیا یہ جو کچھ پیش آیا وہ گو نہایت عجیب و حیرت انگیز ہے اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ کارنامے

عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دیا۔ تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخری شریعت کو پیش کیا۔ دنیا کے گوشے گوشے کو ترانۂ توحید و محبت سے معمور کر دیا۔ ظلمت کدہ کو سراج منیر بناکر بقعہ نور بنادیا۔ گمراہوں کو راستہ بتایا۔ بھولوں کو یاد دلایا۔ بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑا۔ غلط اوہام کو مٹایا۔ اخلاق فاضلہ سکھائے۔ دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دی۔ حکمت، دانائی، پند اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھائے۔ الغرض کلکی اوتار و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل اور تہذیبِ نفوس کی معراج، شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح تھی اور یہ سب اسی پُر آشوب زمانے میں جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیرباراں کے رد کرنے میں صرف ہو گئے۔

ہندوؤں کے پرانوں میں

مقام کی مطابقت: کلکی اوتار کا مقام پیدائش سنبھل ہوگا اور وہاں کے برہمن کے گھر میں تولد ہوگا۔ اس برہمن کا نام وشنویش ہوگا۔ مذکورہ نام سنسکرت زبان کے ہیں۔ یا تو معنوں کو یقین کر کے لکھے گئے ہیں یا پھر ان کی بگڑی صورت عربی زبان ہوگی۔ سنسکرت میں تقریباً ناموں میں غالب معنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ ان ناموں کے معنوں کو قبول کرنا زیادہ مفید ہے۔ لفظ سنبھل کا مادہ امن کرنا معنی والے لفظ شم ہے جس میں (بن) ملادیا گیا۔ سنبھل

کے معنی دار الامن ہو گے اور مکہ معظمہ کو عربی زبان میں دار الامن بھی کہتے ہیں جسکے معنی سلامتی کا گھر ہے جیسے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے (ومن دخله كان آمنا) جو شخص اس میں داخل ہو گیا وہ امن والا ہو جاتا ہے۔ اذجعلنا البیت مثابة اللناس وامنا۔ جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور مقام امن کو ہمیشہ مقرر کر رکھا۔ ان طهرا بیتی للطائفین والعکفین والرکع السجود۔ اس گھر کو خوب پاک صاف رکھا کرو بیرونی اور مقامی لوگوں کی عبادت کے واسطے۔ رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔ مکۃ المکرّمہ مقام امن دو وجہ سے ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں حج وعمرہ ونماز وطواف ادا کرنے سے عذاب دوزخ سے امن ہوتا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اگر کوئی خونی حدود کعبہ میں جس کو حرم کہتے ہیں اس کو وہاں سزائے موت نہیں دیں گے۔ البتہ رسد وغیرہ اس کو بند کر دیں گے کہ یہاں تک باہر نکل آوے پھر پکڑ لیں گے۔

(خلاصہ بحث)

ہندوؤں کے تمام پرانوں میں آخری کلکی اوتار کے جائے وقوع شمنبھل بتائی گئی اور دوسری صفات بھی ذکر کی گئیں۔ ان تمام صفات کے مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اب سے ۱۴۲۱ھ پہلے مکۃ المکرّمہ میں ظاہر ہو چکے ہیں۔ مکہ ہی دار الامن ہے دنیا میں کوئی شہر دار الامن نہیں اسمیں کلام نہیں شمنبھل دنیا کے شہروں میں قدیم ترین شہر ہے۔ جس کے سر پر راجدھانی صوبائیت۔ سرکار شمنبھل کا سہرا بندھ چکا ہے۔ اور آج کل ضلع مراد آباد کی صرف ایک تحصیل ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی تاریخ کے صفحات اور ورق گردانی اور تحقیق کے بعد واضح ہوتا ہے کہ یہ نہ دار الامن ہے اور نہ مذکورہ صفات کی عظیم اوتار کے ظہور کی جگہ ہے۔

بادشاہوں اور راجاؤں نے سنبھل کو مسکن کیلئے کیوں منتخب کیا؟

چونکہ سنبھل ایک صنعتی جگہ اور زرخیز علاقہ کے ساتھ مردم خیز جگہ رہی ہے۔ اور رام گنگا اور جمنا پار ہونے کے سبب یہ محفوظ جگہ رہی ہے جس کی وجہ سے سلاطین اسلام اور راجاؤں نے دار السلطنت بنایا اور حکمرانوں نے اپنا مسکن ٹھہرایا۔ بڑھتی ہوئی طاقتوں نے اپنی قوتِ آزمائی کیلئے مقرر کیا۔ باغیوں نے لوٹ مار کیلئے نشانہ بنایا۔ عہد بابری میں محمد قاسم نے علَم بغاوت یہاں سے بلند کیا۔ قنبر دیوانہ نے اپنی قوت کا مظاہرہ سنبھل میں کیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے علی قلی شیبانی خان زماں کو مقرر کیا مرزاؤں نے بھی بغاوت کا نشانہ بنایا۔ دوسری طرف سکھوں نے بھی سنبھل کو لوٹ مار و تخت و تاراج کا ارادہ کیا۔

سنبھل میں متفرق آبادیاں کیوں؟

سنبھل کی سب سے قدیم آبادی صرف کوٹ ہے۔ باقی باون سرائے، چھتیس پورے کے نام سے جو محلات آباد ہیں۔ وہ صرف مسلمان بادشاہوں کے زمانہ کے آباد شدہ ہیں۔ جو حضرات اپنے حلقۂ احباب و عزیز و اقارب سے ملنے یا تلاش معاش کے سلسلے میں پہلی بار سنبھل آتے ہیں، ان کو روڈویز، اور اسٹیشن پر اتر کر سراؤں، محلات کی دوری معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے، چونکہ بعض سرائیں بعض سے ۴سے ۵کلومیٹر کی دوری پر آباد ہیں، اس بعد و تفریق کی وجہ یہ ہے کہ سلاطین اسلام و حکمران نے باہر سے آنے والے مسلمانوں کو خلعت و جاگیریں عطا کیں، اور ان جاگیروں میں ہر ایک نے اپنی اپنی الگ سرائیں قائم کیں، مثلاً شیخ فتح اللہ کرمانی نے اپنی جاگیر میں فتح اللہ سرائے آباد کرائی، تو دوسری طرف شیخ کبیر اللہ سنبھل تشریف لائے تو انھوں نے سرائے کبیر آباد کرادی، تو اسی طرح شیخ رکن الدینؒ جو ظہیر الدین بابر کے ہمراہ تشریف لائے تھے، وہ بھی اپنی الگ سرائے، رکن الدین سرائے کا قیام عمل میں لے آئے۔ داؤد خاں حاکم سنبھل نے چودھری

سرائے کی بنیاد ڈالی۔ شاہ فتح اللہ ترین نے سرائے ترین کو رونق بخشی اولاد میں ترین خاندان آج بھی محلّہ دربار میں موجود ہے۔ اور خود در میان سرائے ترین محلّہ دربار میں ایک احاطہ باغ کے اندر بڑے مقبرے میں عالیشان عمارت میں محوِ استراحت ہیں۔ اسی سرائے ترین محلّہ کی مردم شماری ایک لاکھ ہے۔ ۳۵ر محلے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو اپنا وطن عزیز ہے جس کی وجہ سے اپنے وطن سے باہر جانا پسند نہیں کرتے، بندۂ مورخ بھی اسی محلّہ کا باشندہ ہے۔ یہاں کے سلاطینِ اسلام مسلم حکمراں علمی دوست اور علماء سے ربط اور ان کی مجالس میں شرکت، اولیاء وصلحا سے عقیدت ان کا نصب العین رہا ہے۔ اور بعض کی زندگی تو صلحاء کا نمونہ رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سکندر لودھی اور اکبر کے دورِ حکومت میں سنبھل علم کا مرکز رہا تھا۔ اسی دور میں بیرون ممالک سے یہاں علماء حضرات تشریف لائے جیسے بندگی میاں شیخ عزیز اللہ تلبنیؒ ہیں۔ ان ہی کی نسل میں نواب عاشق حسین خاں بھی تھے۔

سنبھل کے باون سرائے چھتیس پورے

(۱) فتح اللہ سرائے (۲) عثمان سرائے (۳) کمال سرائے (۴) محمود خاں سرائے (۶) رسول پور سرائے (۷) شہزادی سرائے (۸) شیخ نور سرائے، یا نوریوں سرائے (۹) حسین خان سرائے (۱۰) کشنداس سرائے (۱۱) شیخ علی سرائے (۱۲) کاغذی سرائے (۱۳) عالم سرائے (۱۴) بلو سرائے (۱۵) چھنگاسہ سرائے (۱۶) بریلی سرائے (۱۷) چودھری سرائے (۱۸) فقا سرائے (۱۹) لاڈن سرائے (۲۰) کبیر کی سرائے (۲۱) رکن الدین سرائے (۲۲) چتوانگی سرائے (۲۳) دیپا سرائے (۲۴) رستم سرائے (۲۵) کھگو سرائے (۲۶) ڈیرہ سرائے (۲۷) حاتم سرائے (۲۸) میاں سرائے (۲۹) ڈونگر سرائے (۳۰) پنجو سرائے (۳۱) جالب سرائے (۳۲) نئی سرائے (۳۳) بیگم سرائے (۳۴) سیف خاں سرائے (۳۵) جعدی خاں سرائے (۳۶) شیر خاں سرائے (۳۷) ترین سرائے

(۳۸) چمن سرائے (۳۹) بھٹی سرائے (۴۰) نعلبند سرائے (۴۱) باری سرائے (۴۲) (۴۳) تتاری سرائے (۴۴) بازپور سرائے (۴۵) جادالملک سرائے (۴۶) مجاہد پور سرائے (۴۷) لودھی سرائے (۴۸) قاضی سرائے (۴۹) تمرداس سرائے (۵۰) خواص خاں سرائے (۵۱) نروتم سرائے (۵۲) کرمانی سرائے۔

سنبھل کے چھتیس پورے

(۱) تاج پور (۲) ہتسر دپورہ (۳) جعدی پور (۴) تردی پورہ (۵) نواب پورہ عرف ہنبر (۶) سلیم پورہ (۷) رسول پور (۸) اسد پورہ (۹) کلاں اسد پورہ (۱۰) طشت پور (۱۱) بیگم پور (۱۲) فیروز پور (۱۳) ابوسعید پور (۱۴) فرخ پور (۱۵) رشید پور (۱۶) حسن پور (۱۷) گوبند پور (۱۸) خمر پور (۱۹) موسیٰ پور (۲۰) سکندر پور (۲۱) جوگی پور (۲۲) ہیبت پور (۲۳) خان پور (۲۴) شریف پور (۲۵) نصیر پور (۲۶) اسمٰعیل پور (۲۷) سلطانپور (۲۸) عیسیٰ پور (۲۹) شہباز پور کلاں (۳۰) شہباز پور خورد (۳۱) قاسم پور (۳۲) کبھگو پور (۳۳) فتح پور (۳۴) بھوانی پور (۳۵) علی پور (۳۶) سعید ین پور۔

سنبھل کی انیس کوپیں

(۱) یگ کوپ (۲) ہرشی کیش مہاکوپ (۳) پراسریشور کوپ (۴) وِکل کوپ (۵) مرتیو کوپ (۶) بلی کوپ (۷) سمدا گنی کوپ (۸) وایو کوپ (۹) رشرو کوپ (۱۰) شونک کوپ (۱۱) کرشو کوپ (۱۲) مہاساگر کوپ (۱۳) دھرڑی وارہ کوپ (۱۴) زسودک کوپ (۱۵) اشوک کوپ (۱۶) دھرم کوپ (۱۷) پنچ اگنی کوپ (۱۸) ارشودک کوپ (۱۹) دھرم کوپ۔

سرائے ترین کے محلّات

پنی گران، نواب خیل، شاہ جی پورہ، بازار گنج، باز خاں، پینٹھ اتوار، دربار،

کونجڑہ ان، جھالی جامن، دھوبیان، بھوڑا، حیات نگر، قصابان، حوض کٹورہ، جھجران، پکھواہاں، برکھیریان، کوٹلہ، چکلی، امان خیل، نذر خیل، پیپلا کھدانہ، نوادہ، باغیچہ، بارہ سینی، چاہ نایک، بارہ دری۔

اڑسٹھ تیرتھیں

(۱) سورج کنڈ (۲) ہنس تیرتھ (۳) کرشن تیرتھ (۴) کلچھتر (۵) وسا سومید (۶) بشن پادودک (۷) بجی تیرتھ (۸) سوادتیت دیب (۹) گیا کیشب (۱۰) پشاج موچن (۱۱) چترمکھ کوپ (۱۲) نیم شار (۱۳) دہرم ند (۱۴) چتو ساگر (۱۵) ایکانتی (۱۶) اوردہ رتنا (۱۷) اونتی سر (۱۸) لولارک (۱۹) چندر تیرتھ سنکھ مادھو (۲۰) جم کہنٹ (۲۱) اشوک کوپ (۲۲) پنچ اگنی کوپ (۲۳) پاپ موچن (۲۴) کالودک (۲۵) سوم تیرتھ (۲۶) چکرسودرشن (۲۷) انگارک (۲۸) گوکل بنارسی (۲۹) اتنی پریاگ (۳۰) باشک پریاگ (۳۱) چھمک پریاگ (۳۲) نارک پریاگ (۳۳) گندھرپ پریاگ (۳۴) مرتنجا (۳۵) جثیت پشکر (۳۶) مدہ پشکر (۳۷) کنشت پشکر (۳۸) دہرم کوپ (۳۹) نندا (۴۰) سونندا (۴۱) سمنا (۴۲) سوشیند (۴۳) سربھی (۴۴) برمابرت (۴۵) نربدا (۴۶) باگ بہارتی (۴۷) بنسی گوپال (۴۸) ریوا کنڈ (۴۹) سنگ گوداوری (۵۰) ارشودک کوپ (۵۱) گومتی (۵۲) بھوگنگا (۵۳) رن موچن (۵۴) ماگھرمتی وماہرمتی (۵۵) پشپ دنت (۵۶) اکرم موچن (۵۷) ادہ گیا (۵۸) کب مارگ (۵۹) رتن جگ (۶۰) چکرپان (۶۱) سرک دیپ (۶۲) موگس تیرتھ (۶۳) ملہاں (۶۴) بال کہنڈی (۶۵) ترسندہ (۶۶) بہاگیرتھی (۶۷) مکشودری (۶۸) بھدرکاشرم۔

مسلم بادشاہ ایک نظر میں

(۱) سب سے پہلے سنبھل میں مسلم حکمراں محمود غزنوی آیا تھا، اس زمانہ میں سنبھل، مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپسی تنازعات کی بناء پر خانہ جنگی کے دہانہ پر کھڑا تھا۔

ایسے نازک دور میں محمود غزنوی نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لے کر دونوں فریقین کے درمیان ایک حدِ فاصل کھینچ کر بہتر فیصلہ صادر فرمایا۔

قلعہ کی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف محلہ کوٹ شرقی میں ہندو آبادی اور دوسری طرف کوٹ غربی میں مسلم آبادی۔

آج بھی ۱۴۲۱ھ ۲۰۰۰ء میں وہ حد فاصل بدستور، کوتوالی، گھنٹہ گھر، چکی کے پاٹ سے نکلتی ہوئی جامع مسجد کی پشت سے ہوتی ہوئی قلعہ کے بدایوں دروازہ محلہ نالہ سے گزرتی ہوئی باہر نکلی ہے۔ جس کی تفصیل آگے چل کر دیں گے۔

(۲) ۷۵۲ھ میں سلطان فیروز سنبھل آیا۔

(۳) ۸۰۰ھ میں سلطان حسین والئ جونپور نے سنبھل پر ایک لاکھ فوج کے ساتھ چڑھائی کی، اور سنبھل فتح کر کے حاکم تاتار خان کو قید کر کے سارن صوبہ بہار بھیجدیا۔ اور سنبھل کو اپنے قبضہ میں رکھا۔

(۴) ۹۰۰ھ میں سلطان سکندر بن بہلول آیا اور چار سال تک یہاں قیام کیا اور اس نے یہ وقت عیش و عشرت، سیر و تفریح، اور شکار کھیلنے میں بسر کیا اور بقول بعض ۹۰۵ھ میں آیا۔

(۵) ۹۳۲ھ میں ظہیر الدین بابر سنبھل آیا۔ اسی دوران اندرون قلعہ ایک جامع مسجد کی توسیع و مرمت کرائی۔

(۶) ۹۳۶ھ میں سلطان ہمایوں کئی سال تک سنبھل کی غربی جانب دریا

سرپرچھاؤنی میں مقیم رہا۔

(۷) سنہ ھ میں سلطان محمد شاہ محلہ میاں سرائے نواب امین الدولہ کے قلعہ کے دیوان خانہ میں دارالسلطنت کا سہرا سنبھل کے سر بندھتا ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

سنبھل میں اسلامی آبادی

راجہ پرتھوی راج جو عیش پرست تھا۔ اس کا لڑکا سید پچاسہؒ کی لڑکی پر فریفتہ ہو کر اپنے محل سرائے میں زبردستی داخل کرنا چاہتا تھا۔ خودداری اور دینی حمیت اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حق تعالیٰ نے سید سالار مسعود غازی، محمود غزنوی کے بھانجہ کو جبر و تعدی کو فرو کرنے کے لئے منتخب کیا۔ موصوف نے محض انسانی ہمدردی کے سبب راجہ سے جنگ کی سید سالار مسعود کو فتح ہوئی تب سرزمین سنبھل پر اسلامی پرچم لہرایا۔ ۴۲۵ھ میں باقاعدہ اسلامی آبادی ہوئی، انفرادی طور پر مسلمان پہلے سے تھے جیسا کہ خود سید پچاسہؒ اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے۔ (ایوان مقفل)

سنبھل کب آباد ہوا؟

بقول سنبھلا مہاتم آبادی سنبھل کی ابتداء لاکھوں سال سے پائی جاتی ہے۔ علمائے ہند نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلی مخلوق کی مدتِ آبادی کو اس میں شامل کر لیا ہے۔ جس کی مدت بہت دراز ہو جاتی ہے۔ علمائے ہنود کے مطابق یہ مدتِ دراز چار جگ پر تقسیم ہے۔ پہلے کا نام ست جگ ہے، جس کی مدت سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار سال کی ہوئی۔ دوسرے کا نام دواپر ہے اس کی مدت سترہ لاکھ چھیانوے ہزار سال کی ہوگی۔ تیسرا ترتیا ہے اس کی مدت آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال کی ہوگی چوتھا کل جگ ہے جو موجودہ دور ہے اس کی ابتداء ۲۸ تاریخ ماہ چیت سے ہوئی جب کہ آفتاب برج جدی میں تھا۔ حساب تک (۵۰۱۹) پانچ ہزار انیس سال گزر چکے ہیں یہ شہر سنبھل

محلہ کوٹ جو جانب مشرق میں ہے ست جگ میں ست دت کے نام سے آباد ہوا۔
دوسری مرتبہ (دوامیر) میں محلہ گری کے نام سے جانب غرب میں آباد ہوا۔
تیسری مرتبہ (ترتیا) میں پنگل کے نام سے جانب شمال میں آباد ہوا۔ چوتھی مرتبہ راجہ حجات نے برسر مذکورہ مقامات کے درمیان ایک پُر فضاء میدان میں پختہ فصیل کے اندر سنبھل کے نام سے آباد کیا۔ جس کی وجہ تسمیہ قارئین کی نگاہ سے گذر چکی ہے۔
(ایوان مقفل۔آئینہ سنبھل۔احسن التواریخ۔گلشن ابراہیمی۔)

معجزہ شق القمر، سنبھل میں دیکھا گیا:

جہاں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سینکڑوں معجزات عطا کیے گئے وہاں ایک معجزہ شق القمر کا بھی ہے۔ معجزہ شق القمر سے قربِ قیامت کی تصدیق ہوتی ہے کیوں کہ شق القمر معجزہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس سے آپ کی نبوت ثابت ہوتی ہے اور نبی کا ہر قول صادق ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قیامت کے قریب آنے کی جو خبر آپ نے دی ہے وہ بھی صادق ہے۔

معجزہ شق القمر کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکۃ المکرمہ کے مقام منیٰ میں تشریف رکھتے تھے مشرکین مکہ نے آپ کی نبوت ورسالت کیلئے کوئی نشانی طلب کی اور یہ واقعہ چاندنی رات میں پیش آیا۔ حق تعالیٰ نے یہ کھلا ہوا معجزہ دکھایا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو کر ایک مشرق کی جانب اور دوسرا مغرب کی جانب چلا گیا۔ دونوں ٹکڑوں کے درمیان پہاڑ حائل نظر آنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرین سے فرمایا کہ دیکھو اور شہادت دو جب سب لوگوں نے یہ صاف طور پر معجزہ بچشم خود دیکھ لیا تو دونوں ٹکڑے پھر آپس میں مل گئے۔ اس کھلے ہوئے معجزہ کا انکار تو کسی آنکھوں والے سے ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ مگر مشرکین کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سارے جہاں کے لوگوں پر جادو نہیں کر سکتے اطراف ملک سے آنے والوں کا انتظار کرو۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ بعد میں تمام اطراف سے آنے والے مسافروں سے ان لوگوں نے تحقیق کی تو سب نے ایسے ہی چاند کے دو ٹکڑے دیکھنے کا اعتراف کیا۔

معجزہ شق القمر پر بہت اعتراضات کیئے گئے مثلاً اس سے خرق والتیام لازم آتا ہے اور اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے لوگ دیکھتے وغیرہ۔ ہر اعتراض کا جواب دیا گیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ معجزہ نام ہی ہے خرق عادت کا جہاں مکہ کے لوگوں اور مسافروں نے اور دوسرے ملکوں کے افراد نے یہ معجزہ دیکھا وہاں سنبھل کے راجہ نے بھی دیکھا۔ سورۂ قمر کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہندوستان کے مہاراج مالیبار نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا اور اپنے روزنامچہ میں لکھوادیا اور یہ ہی واقعہ اس کے مشرف باسلام ہونے کا سبب بنا۔ سنبھل میں بھی یہ معجزہ دیکھا گیا۔ سنبھل میں یہ بات زبان زد ہے اور حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس پر بہت سے شواہد موجود ہیں۔ نیز شق القمر مسجد ہے۔ جو بطور یادگار تعمیر کرائی گئی ہے۔ جہاں دنیا کے انسان دیکھ سکتے ہیں وہاں سنبھل میں دیکھے جانے میں کوئی استبعاد نہیں بلکہ سنبھل کو اس پر فخر ہے۔

راجہ حجات!

شوق فریدی نے سنبھلا گرام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شہر سنبھل جو دریا گنگا اور رام گنگا کے درمیان واقع ہے اسے راجہ حجات نے از سرِ نو آباد کیا تھا۔ یہ راجہ سرتھل کا باشندہ تھا اسے جذام کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اپنے عقیدہ کے مطابق سنبھل کے کنوؤں پر آ کر نہایا اور اس موذی مرض سے چھٹکارا حاصل کیا۔

اس وقت سنبھل بالکل ویران اور گمنام صحرا کے مانند تھا، اس نے پنڈتوں سے معلوم کیا کہ یہ کون سا مقام ہے۔ بتایا یہ سنبھل ہے۔

چونکہ سنبھل کئی مرتبہ اجاڑا اور بسایا گیا اس لئے اسے دوبارہ نئے سرے سے آباد کرایا گیا۔ اور عالی شان قلعہ بنوایا گیا۔ چھتیس پورے اور ایک سو چودہ محلوں پر آباد کیا گیا تھا قریب سولہ کوس کے وسیع علاقے میں یہ شہر آباد تھا۔

قلعہ سنبھل:

دوسری جگہ شوق فریدی لکھتے ہیں کہ بداؤ سنگھ ایک راجہ تھا اپنے نام پر بدایوں شہر کی بنیاد ڈالی اور سنبھلا سنگھ کے نام پر سنبھل میں قلعہ تعمیر کرایا۔ ہم سنبھل کی وجہ تسمیہ میں لکھ چکے ہیں کہ سنبھلا رشی کے نام پر غلط العوام فصیح کے قاعدہ سے سنبھل شہر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس کا پہلا نام متیٰ تھا اس شہر کی قدامت کی تو ابتدا ہی نہیں ملتی کہ کب آباد ہوا ہر زمانہ میں اس کا وجود پایا گیا۔ بہر حال راجح قول یہ ہے کہ راجہ جگات جو پرتھوی راجہ کا نانا تھا اسی نے قلعہ سنبھل کی تعمیر کرائی۔ بعد میں پرتھوی راج کے زیر نگیں آیا۔ اس قلعہ کے نشانات آج تک آثارِ قدیمہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

بہر حال اس قلعہ کی تعمیر نہایت استحکام، مضبوطی، اور ایک وسیع میدان، میں جنگی مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی تھی۔ اور اس کے اطراف میں چھوٹے بڑے چونسٹھ دیگر قلعے سنبھل کی حفاظت کے لئے تعمیر کرائے گئے۔ جو حقیقت میں فوجیوں کی تربیت گاہیں تھیں۔ دیواریں کافی بلند تھیں، عجیب وغریب تعمیر تھی، بیرونِ قلعہ ایک نہر جاری تھی اور اندرونِ قلعہ ایک نہایت تنگ سرنگ نکالی گئی تھی۔ کہ ایک ہی شخص اس سے گذر سکتا تھا۔ سرنگ کی غرض یہ تھی کہ وقتِ ضرورت خود کو دشمن سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اور یہ سرنگ نہر سے ملادی گئی تھی۔ تاکہ سرنگ کے ذریعہ نہر کے راستے راہِ فرار اختیار کی جاسکے۔ جب کہ سالار مسعود غازی سے جنگ ہوئی تھی تو اس وقت پرتھوی راج نے اسی نہر کے راستے سے راہِ فرار اختیار کی تھی۔

قلعہ کے چار طرف دروازے تھے، غربی جانب، دہلی دروازہ، شرقی جانب،

سرتھل دروازہ،شمال جانب ،کمایوں دروازہ،جنوب جانب ،بدایوں دروازہ،قلعہ کے باون برج تھے آج (۲۰۰۰ء) تک صرف شمال کا حصہ باقی ہے جس میں چکی کا پاٹ نصب ہے،اوراس کے عقب میں احمد،ومحمد کے مزار،اورایک مسجد ہےاورایک برج کا نشان،محلّہ زندہ والوں میں بتایا جاتا ہے۔

''سنبھل اور پرتھوی راج''

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ سلطان محمود غزنوی، امیر ناصر الدین سبکتگین کا بلند اقبال وفاتح بیٹا تھا۔

سلطان محمود غزنوی کو حق تعالیٰ نے ،حوصلہ،خلوص،شجاعت،اوراقبال عطا کیا تھا اور یہ اس کی خوبیاں ہی ہیں کہ آج تک اس کا نام روشن ہے۔خدا تعالیٰ نے اسے اپنی آغوش رحمت میں لے لیا تھا۔اس کے دل میں اسلام،اور مسلمانوں کیلئے ایک خاص ہمدردی کا جذبہ موجزن تھا وہ بلند حوصلہ،پختہ ارادے،اور خلوص ومحبت کا پیکر تھا۔اس کے ایمانی رعب اوراس کی قوت کا ایسا اثر تھا کہ بڑے بڑے بلند حوصلہ،راجہ،اپنی فوجی طاقت مضبوط ہونے کے باوجوداس سے مقابلہ تو درکنار راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے۔اور چند ایک اپنا سارا مال اس کی خدمت میں لے کر خود حاضر ہوجاتے۔ محمود غزنوی پر قدرت کچھ ایسی مہربان تھی کہ بغیر جنگ کے ہی کافی مال اس کے ہاتھ لگ جاتا تھا۔

محمود غزنوی کے لشکر کی خبر سن کر بڑے بڑے قوی،اور طاقتور لوگوں کے دل مارے خوف کے لرز جاتے اوران پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔اوروہ راہِ فرار کے راستے تلاش کرنے لگتے۔

کہا جاتا ہے کہ دہلی اور سنبھل کے طاقتور حکمراں پرتھوی راج نے محمود غزنوی کے حملہ سے بچنے کیلئے اپنا دارالسلطنت سنبھل کو بنایا تھا۔اورایک قلعہ سنبھل اور دوسرا امروہہ

میں تعمیر کرایا تھا۔ تاریخ سے صرف اتنا ہی پتہ چلتا ہے، ورنہ تو سنبھل اور امروہہ دونوں زمانہ قدیم سے ہیں اور سنبھل زیادہ قدیم ہے۔

صرف غزنوی حملہ سے بچنے کیلئے سنبھل کو دارالحکومت بنایا یہ کچھ مشکوک سا لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ پرتھوی راج نے محمود سے خوف کھا کر دھلی کو خیر باد کہہ کر سنبھل کو جائے پناہ بنایا۔ پھر بھی اس میں کچھ وزن ہے۔

ویسے کہا یہ جاتا ہے کہ پنجاب اور اس کے گرد ونواح پر قابض ہونے کے بعد محمود کے سامنے پرتھوی راج تھا۔

محمود غزنوی کے بارے میں یہ تأثر کہ اس کا اصل مقصد ہندوستان کی دولت حاصل کر کے اور مندروں کو توڑ کر ایک فرقہ کی حوصلہ شکنی کرنا تھا تو یہ بات قیاس میں نہیں آتی۔

بلکہ یہاں یہ کہنا زیادہ بہتر اور مناسب ہوگا کہ اس پر خدا کی خاص نظر کرم تھی کہ وہ جدھر کا رخ کرتا کامیابی اس کے قدم چومتی اور منزل خود بخود اس کے قدموں میں آ گرتی۔ اور اس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے راجہ خود اس کی اطاعت پر راضی ہو جاتے، اور جو ایسا نہیں کرتے وہ راہِ فرار اختیار کر لیتے۔ شروع میں تو ایسا ہوا کہ راجہ جے پال کی حمایت میں ہندوستان کے کُل راجہ جمع ہو جاتے مگر دوسری طرف پورے ہندوستان میں اسکی آمد کا تہلکا مچ جاتا۔

پھر کسی غیر ملکی کو وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ جو مقامی لوگوں کو ہوتی ہیں کیوں کہ وہ ایک ایک راستے سے واقف ہوتا ہے۔

بہر حال محمود غزنوی میں اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور وہ بت پرستی کو ختم کر کے تمام انسانوں کو ایک خدا کی عبادت پر لانا چاہتا تھا۔ جو خالق السموٰات والارض ہے۔

بہر کیف کہا یہ جاتا ہے کہ پنجاب وغیرہ فتح کرنے کے بعد اسکا اصل مقصد

پرتھوی راج تھا اس کا سنبھل کو راجدھانی بنانا، اس کے قدرتی حسن، زرخیز زمین، آب و ہوا کے علاوہ دوسری خصوصیات کی وجہ سے بھی تھا۔ راجاؤں وغیرہ میں بھی سنبھل کافی مشہور رہا اور فوجی اعتبار سے تو ایک محفوظ جگہ تھی۔

دہلی کے جمنا پار اور گڑھ مکتیشور کے علاقہ میں گنگا پار کرکے غیر ملکی کیلئے آگے جانا سخت دشوار تھا اسی وجہ سے سید سالار مسعود غازی کی فوج کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

محمد غوری، پرتھوی راج

پرتھوی راج نے سنبھل میں قلعہ تعمیر کرلیا اور سنبھل کو دارالحکومت بنایا۔ دھلی کی بنیاد راجہ داد پتہ راجپوت نے ڈالی۔ راجہ داد پتہ پہلا حکمراں تھا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں آٹھ راجاؤں نے حکومت کی، اس کے خاندان کو جب زوال آیا تو دھلی کی حکومت راجپوتوں کے بہترین گروہ چوہانوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ خاندانِ چوہان کے کئی راجہ جب حکومت کرچکے تو پرتھوی راج کے ہاتھ سے حکومت چھن کر محمد غوری کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور آگئی، محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دی تو دھلی پر غوریوں کا قبضہ ہوگیا۔ محمد بن قاسم کی ہندوستان آمد کے تقریباً تین صدیوں بعد محمود غزنوی نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو دور، دور تک فتح و کامرانیوں کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ محمود غزنوی سے پہلے اس کے والد امیر سبکتگین نے راجہ جے پال کو شکست دے کر ایک حد تک اپنے لئے راہ ہموار کرلی تھی کابل اور پشاور میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ محمود کی حیرت انگیز کامیابیوں کا دبدبہ ایسا قائم ہوا کہ لاہور اور اس کے گرد و نواح اس کے سائے میں آگئے۔ محمود غزنوی کی مسلسل فتوحات نے راجپوتوں کا شیرازہ منتشر کرکے رکھدیا تھا۔ محمود کی آمد کی خبر سن کر راجہ دارالسلطنت چھوڑ کر فرار ہوجایا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں حکومتِ اسلامیہ کا قیام بہت سہل تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ محمود غزنوی کے آخری حملہ اور محمد غوری کے ہندوستان آمد تک ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرا۔ اس دوران راجپوتوں کو

اپنا نظامِ حکومت مستحکم کرنے اور متحد ہونے کا موقع ایک مرتبہ پھر سے مل گیا۔

(گلشن ابراہیمی، آبِ کوثر)

یہاں محمد غوری کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام محمد تھا۔ جب وہ تخت نشیں ہوا تو اسے معز الدین کا خطاب ملا۔

اس لحاظ سے اس کا پورا نام سلطان معز الدین محمد غوری ہوا۔ لیکن چونکہ ایام شہزادگی میں اسے شہاب الدین بھی کہتے تھے۔ اور ہندوستان میں اس کی اکثر فتوحات اس زمانہ میں ہوئیں جب کہ وہ شہزادہ تھا۔ اور اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا نائب تھا۔ اس لئے بعض مورخین نے اسے شہاب الدین غوری کہا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ نے بھی شہاب الدین غوری کے نام سے ہی یاد کیا ہے۔

جیسا کہ محمد غوری کو شہاب الدین کے نام سے یاد کرتے ہیں، بعض مورخین نے دو جداگانہ شخصیتوں کے نام لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اور ایسے ہی شوق فریدی کے قول کے مطابق رائے پتھوڑا اور پرتھوی راج دو الگ الگ نام ہیں۔ محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ شہاب الدین غوری کی ترائن میں دہلی اور اجمیر کے حکمراں سے جو جنگ ہوئی تھی وہ رائے پتھوڑا تھا۔ اور شیخ محمد اکرام آبِ کوثر میں لکھتا ہے کہ مقام ترائن میں جو جنگ ہوئی وہ محمد غوری مشہور شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج کے درمیان ہوئی۔ مذکورہ اقوال اور دیگر مورخین کی پیش کردہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رائے پتھوڑا اور پرتھوی راج ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تمام ہی مورخوں نے ترائن کی جنگ کی تاریخ ایک ہی بیان کی ہے۔ اگر یہ دو مختلف نام ہوتے تو یقیناً تاریخ میں اس کا اندراج مختلف ہوتا۔

بہرحال معز الدین غوری عرف شہاب الدین غوری نے شروع ہی سے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے سرحد کے قریب جو مسلم

ریاستیں تھیں ان پر قبضہ کرنا ضروری تھا چنانچہ ملتان، اچھ، اور لاہور پر قبضہ کرلیا۔ ترائن میں دوسری بار پرتھوی راج (رائے پتھوڑا) سے جو جنگ ہوئی اس وقت پرتھوی راج کے ساتھ شمالی ہند کے تمام راجہ اور ۳ لاکھ راجپوتوں کا لشکر محمد غوری سے مقابلہ کیلئے آگے بڑھا۔ ۱۵۰ راجپوت راجاؤں نے ہمت سے مقابلہ کیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد دشمن کے قدم میدان جنگ سے اکھڑ گئے اور لشکر بھاگنے لگا پرتھوی راج نے بھی راہ فرار اختیار کی۔ لیکن لشکر اسلام نے پیچھا کر کے گرفتار کرلیا اور کام تمام کیا۔ یہ وہی پرتھوی راج ہے جس کے نانا راجہ حجات نے سنبھل قلعہ تعمیر کرایا تھا اور سنبھل کو دارالحکومت بنایا۔ سالار مسعود غازی سے معرکہ آرائی ہوئی تو اس نے پانی کے راستہ سے فرار ہو کر جان بچائی تھی۔

''شہزادی کا اقدام خودکشی''

پرتھوی راج جو دہلی اور اجمیر کا بادشاہ تھا۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

پرتھوی راج کی ایک نہایت حسین و جمیل، اور پرُ کشش لڑکی تھی۔ جس کا نام بیلا تھا پرتھوی راج نے سنبھل کے دورانِ قیام اپنی لڑکی کی شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ چونکہ پرتھوی راج کا تعلق راجپوت خاندان سے تھا۔ لہٰذا اس قوم کے مختلف رسم و رواج تھے اور شادی کی رسم میں یہ شامل تھا کہ شہزادی کا شوہر وہی شخص ہو سکتا ہے جو شہزادی کے لشکر کو شکست دے کر اس کے ڈولے پر قبضہ کرلے۔

جب پرتھوی راج نے اپنی بیٹی کی شادی کا اعلان کیا تو اس چیلنج کو قنوج کے راجہ نے اپنے بیٹے پرمل کے لئے منظور کرلیا۔

شادی کی بقیہ تمام رسمیں پوری کرنے کے بعد شہزادی کا ڈولہ سنبھل کی آبادی سے باہر ایک مخصوص جگہ رکھ دیا گیا۔

ایک یہ بھی دستور تھا کہ دولہا کی فوج فتح یاب ہو جائے تو دولہا، دلہن کے ڈولے

پر قبضہ کر کے اپنے گھر لے جائے اور دولہا کی فوج شکست کھا جائے تو اس صورت میں
ڈولہا لڑکی کے باپ کے گھر رہے گا۔
بہر کیف دونوں طرف کی فوجیں میدانِ جنگ میں اتر پڑیں۔ اور جنگ کا
آغاز ہو گیا دونوں کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دونوں اطراف کی فوجیں
اپنے کمال دکھا رہی تھیں۔ اور شہزادہ پرمل بھی بڑی بہادری سے میدان میں ڈٹا رہا
شہزادے کی فوج میں چند بہادر بھی تھے جن کے جوہر اور کمال کو پرتھوی راج نے دیکھا۔
شہزادہ پرَمل فتح کامرانی کے جھنڈے گاڑ کر شہزادی کے ڈولہ پر قبضہ کر کے لے
جانے لگے تو پرتھوی راج کی فوج کے کسی جوان نے بے خبری میں حملہ کر دیا۔ جس سے
شہزادہ شدید زخمی ہو گیا۔ اور زخموں کی تاب نہ لا کر اس جہاں سے اس کی روح پرواز کر گئی۔
اُدھر شہزادی اس اندوہناک واقعہ کی تاب نہ لا سکی، اور اپنی زندگی کو موت
پر ترجیح دی۔
چنانچہ جب شہزادہ پرَمل کو نذرِ آتش کیا گیا تو شہزادی بھی اس میں کود کر ستی ہو گئی
(یہ ہندوؤں میں صدیوں پرانی اور دقیانوسی رسم ہے)
شہزادہ پرمل کے کچھ جوان مارے گئے اور کچھ فرار ہو گئے۔ ان میں کچھ نے اپنی
بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ پرتھوی راج نے ان کو سنبھل میں ہی روک لیا، اور
اعزازات اور انعامات سے نوازا اور جاگیریں عطا کیں۔ اور کچھ کو اعلیٰ عہدوں پر فائز
کر دیا۔ وہ تین شخص تھے۔ جن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

وہ تین شخص جن کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۱) اعلیٰ (۲) اودل (۳) سید طالن (طالب علی) سید طالب علی کا ذکر ہندو
حضرات اکثر اپنے گیتوں میں کرتے ہیں۔
کہتے ہیں کہ اودل کا مکان محلّہ چودھری سرائے شیخ بہاؤالدین کے مقبرے کے

متصل تھا۔ اودل کا دوسرا نام ہلو تھا۔ ہلو کے معنی زوردار حملہ کے ہیں اس کے اعتبار سے وہ اسم با مسمیٰ تھا اس کے نام پر سنبھل کی ایک سرائے کا نام ہلو سرائے رکھا گیا آج (۱۴۲۱ھ میں) سے وہ محلہ ہلّو سرائے سے مشہور ہے۔

اور اودل کی اولاد آج بھی سنبھل میں قنوجیوں کے نام سے مشہور ہے۔ ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

اعلیٰ اور اودل کی سنبھل اور قرب و جوار میں شجاعت اور بہادری کے قصے سنائے جاتے ہیں اور ایک روایت کے مطابق چکی کا پاٹ بھی انہیں کا نصب کیا ہوا ہے۔

بہادر شہزادہ پرمل کا صدمہ شہزادی برداشت نہ کر سکی اور ستی ہوگئی۔ اس داستان نے زیبہ گیتوں کو جنم دیا۔

بیلا کا استھان:

بیلا کا ستی استھان۔ (یعنی وہ جگہ جہاں بیلا کا ڈولا رکھا گیا، اور وہ ستی ہوئی) وہ جگہ آج بیلا کا ڈولہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور چٹیل میدان پڑا ہوا ہے۔ اور یہ جگہ ہندوؤں کے نزدیک بہت متبرک سمجھی جاتی ہے جو عیدگاہ سنبھل کے متصل ہے۔ دوسرا قول! ہندوؤں میں یہ بھی مشہور ہے کہ بیلا اسی میدان کے متصل زمین میں غائب ہوگئی۔

سر اٹھانے کا دیکھا انجام

قنوج کے راجہ اور پرتھوی راج میں جب جنگ ہوئی تو پرتھوی راج کی فوج کے بہادر جوان کثیر تعداد میں ہلاک ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے پرتھوی راج کی فوج میں پہلے جیسی شان و شوکت باقی نہ رہی تھی۔ اس کی فوجی طاقت کافی کمزور ہو چکی تھی۔

اس دور میں سید پچاسہ ؒ نے اپنے پیر و مرشد کے حکم سے برہمن کا روپ اختیار کیا اور قلعہ سنبھل کے قریب سکونت اختیار کر لی۔ سید پچاسہ ؒ کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی

جو کافی حسین تھی۔

پرتھوی راج کا بیٹا جب اُدھر سے گذرا جہاں سید پچاسہؒ رہا کرتے تھے تو اچانک بالکل غیر متوقع اس کی نظر ان کی لڑکی پر مرکوز ہوگئی۔ پرتھوی راج کا بیٹا اس کے رُعب حسن کی تاب نہ لا سکا اور اپنا دل اس کے قدموں میں ڈال دیا اور اسکے عشق نے دیوانگی کی حدود پار کر کے جنون کی سرحد پر قدم رکھ دیا۔ اور اس پر اس کے عشق کی ایسی جنونی کیفیت غالب آئی کہ کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، اور تکلم تک ترک کر دیا۔ ماں کی مامتا اپنے بیٹے کی جنونی کیفیت دیکھ کر اسے برداشت نہ کر سکی، اس نے بیٹے سے اس حالت کی وجہ معلوم کی تو اس نے سید پچاسہؒ کی لڑکی پر عاشق ہونے کا سارا قصہ سنا دیا۔ اور کہا کہ اگر میری شادی اس لڑکی سے نہ ہوئی تو میں موت کو گلے لگانے میں تأمل نہیں کروں گا۔

ماں نے یہ سارا واقعہ اور بیٹے کی حالت کا ذکر راجہ سے کیا۔ ماں نے بھی اپنی تشویش اور پریشانی کا اظہار کیا۔

تو راجہ نے بیٹے کو طلب کر کے کہا کہ یہ اتنی اہم بات نہیں ہے جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ سید پچاسہؒ ہماری رعایا میں سے ہے، ہم اسے طلب کر کے کہدیں گے اور وہ بخوشی شادی کے لئے تیار ہو جائے گا اور انکار نہیں کرے گا۔

پرتھوی راج نے اپنے کارندے بھیج کر سید پچاسہ کو دربار میں طلب کر لیا۔ اور اپنے بیٹے کے لئے لڑکی کا رشتہ مانگا۔ سید پچاسہ راجہ کی بات سن کر حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے۔ اور ضبط سے کام لیتے ہوئے عرض کیا کہ مہاراج بیٹے کا اختیار تو باپ کو ہوتا ہے، اور بیٹی کا اختیار ماں کو، اگر آپ کا حکم ہو تو بیوی سے ذکر کر دوں جیسا جواب ملے گا عرض کر دوں گا۔ راجہ نے یہ تجویز منظور کر لی۔

سید صاحب گھر پہونچے، چہرہ، اداس تھا۔ بیوی کے اداسی کا سبب معلوم کرنے

پر ساری روئیداد دہرا دی۔ بیوی نے کہا کہ اب تو یہاں سے راہِ فرار اختیار کرنا ہی بہتر ہے کیوں کہ ابھی تک تو ہم اپنے راز کو چھپائے ہوئے تھے اور کسی طرح گذر بسر کر رہے تھے۔ لیکن اب ہماری آبرو اور دین پر آن پڑی ہے۔

ماں نے یہ سارا قصہ بیٹی سے بھی کہہ سنایا۔ بیٹی باشعور اور عقلمند تھی۔ اس نے ساری داستان سن کر کہا کہ یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ میں جیسا کہوں ابا اسی کے مطابق کریں۔ رلجہ سے جا کر کہیں کہ میں تعمیل کے لئے تیار ہوں، مگر چونکہ میری اولاد میں صرف ایک ہی لڑکی ہے، میں اپنے عزیز و اقارب اور خاندان کے افراد کو مطلع کر دوں تا کہ وہ بھی اس مسرت کی گھڑی میں شریک ہو سکیں، انہیں شکایت کا موقع بھی نہ ملے گا۔

چونکہ عزیز و اقارب دُور دراز اور مختلف جگہوں پر رہتے ہیں، اس لئے اس کام میں کم از کم ۳ر۴ ماہ کا عرصہ لگ جائے گا۔ لہٰذا مجھے جب تک کیلئے مہلت دی جائے۔ اس کے بعد میں بخوشی اپنی بیٹی کو آپ کے لڑکے سے بیاہ دوں گا۔

بیٹی کے مشورہ کو رلجہ سے کہا گیا تو رلجہ نے مہلت دیدی۔ سید پچاسہ جب گھر واپس آئے تو بیٹی نے باپ سے کہا کہ آپ غزنی (افغانستان) چلے جائیں، اور وہاں پہونچ کر اپنی مجبوری و مظلومیت کی ساری داستان تفصیل سے سنا دیں۔ وہاں، اسلام اور مسلمانوں کے ہمدرد و غمخوار کوئی راستہ ضرور نکالیں گے۔

سید پچاسہ کفرستان کی گھنگھور تاریکیوں میں (سنبھل) اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ یہاں یہ ذکر بھی نہایت ضروری ہے کہ پرتھوی راج کے لئے مشہور ہے کہ مسلمانوں کا دشمن اور متعصب ذہن رکھتا تھا۔ دن چڑھے تک مسلمانوں کی صورت نہیں دیکھتا تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کی صورت دیکھنا منحوس سمجھتا تھا۔

نیز۔ سنبھل، دہلی، اجمیر، اس کے زیر سایہ تھے۔ بڑا حکمراں تھا:

سنبھل کی باون سرائے اور چھتیس پورے تو مسلم حکمراں کی یادگار ہیں۔ یہ

سب اس کے دورِ حکومت کے ایک محلّہ کے برابر نہیں۔

اٹھارہ لاکھ فوج اس کے لشکر میں تھی۔ چودہ لاکھ فوج مختلف مقامات پر اور باقی چار لاکھ حدودِ سنبھل پر نگرانی کے لئے مامور تھی۔

سید پچاسہ اپنی لڑکی کے مشورہ کے مطابق غزنی کے لئے رختِ سفر باندھنے پر تیار ہو گئے سفر شروع ہوا اور بالآخر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔

غزنی پہنچ کر سید مسعود غازی سے ملاقات کی اور اپنی ساری داستان کہہ سنائی۔ جس کے سننے کے بعد ان کے خون میں جوش پیدا ہوا اور غزنی کے مختلف مقامات پر اعلانِ جہاد کر دیا۔ اس اعلان سے غازیوں کے اندر جوش پیدا ہوا۔ اور ایک لشکر۔ علماء، صلحا، حفاظ، شہزادگان، سید، مغل، پٹھان، غرض ہر برادری پر مشتمل ۴ لاکھ مجاہدین کی تشکیل عمل میں آئی اور مجلس شوریٰ کا اجلاس اور انتخاب عمل میں آیا۔ اور یہ طے پایا کہ کوئی بھی قدم بغیر مشورہ کے نہ اٹھایا جائے اور سنت کی مکمل اتباع ہو۔

چونکہ ارکانِ شوریٰ ذی عقل اور سنجیدہ و تجربہ کار ہوتے ہیں۔ لہٰذا شوریٰ کے اجلاس میں یہ بات زیرِ بحث آئی کہ ہندوستان کا خطرناک سفر، وہ بھی ایسی جگہ کہ جہاں کفرستان کے اندھیروں نے ہر چیز اپنے اندر جذب کر لی ہو۔ بلا سوچے سمجھے ہندوستان کی سرحد پر قدم رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔

صاحب الرائے وسیاح حضرات نے مختلف مشورے دیئے۔ مشوروں کے بعد مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکر جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان کے لئے روانہ ہوا۔ لشکر نے پہلا قدم ملتان رکھا، اور وہاں کے ہندو حکمرانوں کی فوج نے تعاقب کیا، مجاہدین اسلام کے لشکر نے ان کی فوج سے مقابلہ کیا اور کافی فوج ماری گئی وہاں سے فتح پا کر یہ لشکر لاہور کے قریب ایک قلعہ تھا وہاں پہونچا۔ وہاں بھی قلعہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ کامیابی نے لشکر کے قدم چومے اور یہ لشکر اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا رہا۔

راستہ کی ساری صعوبتیں اور مختلف جگہوں پر مقابلہ کرتا ہوا میرٹھ پہونچا۔ میرٹھ سے لشکر حسن پور آیا وہاں بھی گھمسان کی جنگ ہوئی۔ بہر حال شیر اسلام سید سالار مسعود غازی یہ سنبھل آن پہونچا۔ غزنی سے سنبھل آتے ہوئے مغرور راجاؤں اور سرکش حکمرانوں، اور کوہ شکن پہلوانوں کا مقابلہ کرنا اور ہر جگہ فتح حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔

بہر حال سید مسعود غازی قلعہ سنبھل کا محاصرہ کرکے خیمہ زن ہو گئے اور چاروں طرف لشکر نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ (۱) مورچہ شاہ دریا تالاب (۲) مورچہ فیروز پور وقلعہ فیروز پور (۳) مورچہ دریا سر تالاب (۴) مورچہ تالاب بھوگنگا اور قلعہ سنبھل کے شرقی جانب نہر کے کنارے ایک دمدمہ بلندی پر باندھا۔ مجاہدینِ اسلام کے لشکر نے یکبارگی چاروں طرف سے دھاوا بول دیا۔

اس سے قبل یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پرتھوی راج کے خیر خواہ ہر مقام کی خبریں اور مجاہدین کی سرفروشی اور فتح کی خبریں برابر پہونچا رہے تھے۔ مگر پرتھوی راج خواب غفلت میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ ان خبروں کی کوئی پرواہ نہ کی اور شراب کے نشہ میں چور ہو کر کہتا کہ کوئی بات نہیں ہے، سنبھل تک مخالف کو آنے دو اور یہ وقت بتائے گا کہ فتح کس کی ہوگی۔ آخر کار لشکر اسلام نے آدھی رات گزرنے کے بعد محاصرہ کرلیا۔ اور یہ محاصرہ طول پکڑ گیا۔ چونکہ قلعہ بہت مضبوط اور بلند تھا۔

دشمن کی فوج بھی قلعہ کی بلندی سے جنگ کے لئے آمادہ تھی۔ کامیابی کی کوئی صورت بظاہر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس سے مجاہدین کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ اگرچہ پرتھوی راج غرور میں سرشار تھا۔ مگر ایسا تیرانداز تھا کہ آواز پر تیر چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

مندر میں جو مورتی رکھی ہوئی تھی اس نے اس شب خداوند کریم کے حکم سے اللہ اکبر، بآواز بلند کہا پرتھوی راج بستر پر نیند کے مزے لے رہا تھا اچانک تکبیر کی آواز اس کی

سماعت سے ٹکرائی تو اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آواز کی سیدھ میں جو تیر چلایا تو مورتی کے لب میں جالگا اور مورتی کے لب سے خون بہہ نکلا۔ پجاری نے فوراً صورتِ حال سے مطلع کیا۔

پرتھوی راج نے پنڈتوں کو طلب کیا اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکستان کے لوگ چڑھ آئے ہیں۔ پنڈتوں نے شگون نکال کر اسے شگون بد سے تعبیر کیا۔ اور مورتی کو پاش پاش کر کے مندر کے کنویں میں پھینک دیا گیا دونوں طرف کی فوجیں میدان میں اتر گئیں، جنگ شروع ہوئی، دونوں نے دلیری کا ثبوت دیا۔ رات آنے پر یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی دونوں طرف سے تیروں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ قلعہ کی برج سے جو تیر پھینکا جاتا وہ لشکرِ اسلام کو زخمی کرتا۔ شہدا کے خون سے زمین رنگین ہو گئی۔ چند دن اسی طرح گذر گئے۔

تو ایک شب سید مسعود غازی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی آپ نے بشارت دی کہ صبح کو فتح تمہارے قدموں میں ہوگی۔ لشکر میں اب تک جو مایوسی چھائی ہوئی تھی وہ پھر جوش میں بدل گئی۔ چونکہ اب تک بے شمار مجاہدین جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

صبح ہوتے ہی سید مسعود غازی نے لشکر کو ترتیب دیا۔ جو دمدمہ قائم کیا گیا تھا اس سے تیروں کی بوچھار کر کے دشمن کی لاشیں فرش پر بچھادیں۔ اُدھر پرتھوی راج کا بیٹا جو سید پچاسہ کی لڑکی پر عاشق تھا۔ قلعہ کی برج سے تیروں سے مسلمانوں کو زخمی کر رہا تھا۔

اسلامی لشکر میں سے دو جوان آگے بڑھ کر حملہ آور ہوئے اور فتح حاصل کی جن کے نام احمد، اور محمد ہیں اگر چہ ان دونوں کے جسم تیروں سے چھلنی تھے۔ مگر وہ برابر آگے کی جانب بڑھتے رہے۔ فتح حاصل کرنے کے بعد قلعہ میں داخل ہوئے۔ اور وہیں دونوں کی روح اس جہان فانی سے پرواز کر گئی۔ سید مسعود غازی نے ان کو اسی جگہ سپردِ خاک

کردیا۔ آج ایک ہزار سال گذرنے کے بعد بھی قلعہ کا صرف یہ حصہ باقی ہے۔ جس میں چکی کا پاٹ بھی نصب ہے۔ اسی کے عقب میں احمد و محمد کے مزار ہیں۔ وہیں ایک مسجد بھی ہے۔ قلعہ سنبھل مکمل فتح ہونے پر اسلامی پرچم لہرایا گیا۔ پرتھوی راج کا لڑکا اور لشکر برج پر موت کے گھاٹ اترے۔ پرتھوی راج اپنی جان بچا کر خفیہ راستے سے فرار ہوگیا۔ بعد میں سلطان محمد غوری کے ہاتھوں مارا گیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

سنبھل میں مختلف مقامات پر مقبرے و مزارات ہیں، جو مجاہدین کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اور میرٹھ کی نوچندی، امروہہ کا عرس، سنبھل و پورنپور اور بہرائچ کا نیزہ، یہ سب مسعود غازی کی فتح پر جشنِ فتح کے طور پر منائے جاتے ہیں۔

سنبھل میں جہاں شہید احمد و محمد کے مزار ہیں۔ وہیں دوسرے شہدا کے مزارات اور مقبرے موجود ہیں۔ نیز احمد و محمد دونوں آپس میں ماموں بھانجے تھے۔

جس دھجا کا ذکر پیچھے کیا جاچکا ہے، چونکہ ابتداءً پرتھوی راج کو سید سالار مسعود غازی پر فتح ہوئی اس کے جشنِ فتح پر سنبھل میں ایک میلہ قائم کیا گیا تھا جو ہولی کے دوسرے دن دھجا کے نام سے ہوتا ہے اس میلہ میں ہزاروں مرد عورتوں کے لباس میں ناچتے گاتے ہیں جس کا تفصیلی ذکر آپ ملاحظہ کرچکے ہیں۔

سید مسعود غازی نے پرتھوی راج کو شکست دے کر جب فتح حاصل کی اور قلعہ پر قبضہ کیا تو مسلمانوں نے اس جشنِ فتح پر جھنڈوں، ڈھالوں کا ایک میلہ لگایا جو نیزہ سے مشہور ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے یہ دونوں تہوار آج ایک ہزار سال کا عرصہ گذر جانے پر بھی اسی دھوم دھام سے ہر سال منائے جاتے ہیں۔

سید مسعود غازی محمود غزنوی کے بھانجے اور سید ساہو کے فرزند ہیں، سید ساہو کا قیام مدینہ منورہ میں تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے وہاں سے بلا کر اپنی ہمشیرہ کے ساتھ عقد کردیا، چونکہ اجمیر محمود غزنوی کے زیرِ نگیں آچکا تھا اور اسلام کے دلدادے موجود تھے

سلطان محمود غزنوی نے سید ساہو کو ایک بڑی فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے سالار کا خطاب عطا کیا، اور انہیں مع اہل وعیال کے اجمیر نومسلموں کی اصلاح اور مدد کے لئے روانہ کیا۔

سید سالار ساہو نے اجمیر آ کر قیام کیا۔ وہیں سید سالار مسعود کی پیدائش ہوئی۔

نو سال تک قیامِ اجمیر کے دوران حفظ قرآن و دیگر علوم وفنون سے فراغت کے بعد اپنے آبائی وطن غزنی چلے گئے اور اپنے ماموں سلطان محمود غزنوی کی آغوش میں تین سال تک پرورش پائی۔

پھر ایک لشکر کے ہمراہ پرتھوی راج سے مقابلہ کیلئے سنبھل روانہ ہوئے ہندوستان کی سرحد پر قدم رکھا تو اٹک، لاہور کے قریب قلعہ ملتان، میرٹھ، امروہہ، حسن پور، ہوتے ہوئے سنبھل پہونچے۔ پرتھوی راج سے جنگ کے دوران ابتداء شکست ہوئی۔ لیکن بعد میں پرتھوی راج کا بیٹا مارا گیا اور پرتھوی راج اپنی جان بچا کر خفیہ راستے سے بھاگ نکلا۔ بعد میں محمد غوری کے ہاتھوں مارا گیا۔

یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے! کہ سید مسعود غازی جب سنبھل پہونچے تو مجاہدین خیمہ زن ہوئے اور ۳ لاکھ مجاہدین کا لشکر ان کے ہمراہ تھا سنبھل کے صرف بائیس (۲۲) کنویں قبضہ میں آئے جو لشکر کے لئے ناکافی تھے۔ پانی کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک سوت ندی قلعہ سنبھل کے مشرقی جانب ہے اس میں پانی بکثرت موجود ہے۔ حکم ہوا کہ لشکر ندی کے قریب خیمہ زن ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اس ندی کا نام یار وفادار رکھا۔ آج نیزہ بھی اسی ندی پر ہوتا ہے۔ اسکے بعد مسعود غازی نے آگے قدم رکھا، بہرائچ تک تین جنگیں ہوئیں بہرائچ پہونچنے پر دشمن نے کسی طرح موقع پا کر آپ کو شہید کر دیا۔

وہیں آپ کا مزار ہے، جس میں وہ دنیا کی ساری الجھنوں سے بے خبر آرام کی نیند سو رہے ہیں۔

نوچندی!

میرٹھ کی نوچندی کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کیوں کہ یہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ سید سالار مسعود غازی کے ہندوستان کے سفرِ جہاد میں میرٹھ میں جو جنگ ہوئی اس میں آپ کی ایک انگشت شہید ہوئی وہیں دفن کیا گیا جو مقبرہ کی شکل میں ہے۔ نوچندی کے نام پر ہر سال میلہ ہوتا ہے۔ نوچندی اس وجہ سے نام رکھا گیا کہ چاند کی نو تاریخ میں انگشت مبارک شہید ہوئی تھی۔ (احسن التواریخ، تاریخ سنبھل سروے)

"صدیوں پرانا تہوار نیزہ"

سنبھل کے مسلمان تقریباً ایک ہزار سال سے ایک تہوار مناتے ہیں، جسے وہاں نیزہ کہا جاتا ہے، نیزہ ایک عجیب و غریب تہوار ہے۔ منگل کے دن سنبھل سے کوئی پانچ کلومیٹر دور ایک ندی کے کنارے اس میلے کا اہتمام کیا جاتا ہے، جسے عوام تازی نیزہ کہتے ہیں۔ اور یہ ہنگامہ آرائیاں دو دن تک چلتی ہیں۔ دوسرے روز محلّہ چمن سرائے اور بریلی سرائے کے درمیان اس کا اہتمام ہوتا ہے۔ جو باسی نیزہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس نیزہ کی اہمیت اور خاصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میلے کی وجہ سے گھروں کو دلہن کی طرح سجایا و سنوارا جاتا ہے، درودیوار پر روغن کرایا جاتا ہے، جسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سارے سنبھل میں جشنِ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بعض گھرانوں میں رنگ برنگ کے ملبوسات تیار کرائے جاتے ہیں۔ گویا میلے کی تیاریاں اپنے پورے شباب پر ہوتی ہیں۔

نیزہ سے دو یوم پیشتر اتوار کی شام کو شاہ و گدا غرض ہر گھر میں شکرانہ بنتا ہے اور پیر کی شام کو پوری، کچوری بنائی جاتی ہیں، چاولوں کے اندرسے، (ایک قسم کی مٹھائی) میٹھی پوریاں، ہمہ اقسام کے عمدہ و لذیذ کھانے پکائے جاتے ہیں، اور یہ سب کام اتنے

اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے جیسے یہ بھی احکامِ خداوندی میں شامل ہو۔

منگل کی صبح سارے لوازمات اپنے ساتھ لے کر مختلف سواریوں سے لوگ اس میلے کیلئے روانہ ہوتے ہیں۔ ایک قابلِ دید ہجوم ہوتا ہے۔ چونکہ راستہ کچا ہے، اور گرد وغبار لوگوں پر ایسا میک اپ کرتی ہے کہ ان کی شکل قابلِ دید ہوتی ہے۔ پھر یہ ہجوم اپنے ساتھ لائے ہوئے لوازمات ندی کے کنارے بیٹھ کر تناول فرماتے ہیں۔ آپ کو میلے میں ہر طرح کی دکانیں ملیں گی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ بعض لوگ اس نیزہ کو متبرک موقع سمجھ کر منگنی کی رسمیں تک ادا کرتے ہیں۔ لوگ اسے دین کا ایک اہم ستون سمجھ کر بڑے چاؤ سے کرتے ہیں۔ بہر نوع یہ خرافات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

کچھ پہلے امراء کے گھروں کی عورتیں، قیمتی ملبوسات وزیور سے آراستہ ہو کر، گھروں میں بیٹھا کرتی تھیں۔ اور اب نئی نویلی دلہنیں، اپنے سہاگ کے کپڑے زیب تن کرتی ہیں۔ عورتوں کا غول کا غول سڑکوں پر امنڈ پڑتا ہے۔ اور ان دلہنوں کے دیدار کو جاتا ہے۔

"یادگار"

سنبھل کے ایک صاحب اکبر بادشاہ کے یہاں کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ اور بادشاہ کے بہت چہیتے تھے۔ جب نیزہ کا وقت قریب آیا تو انھوں نے سنبھل کا نیزہ دیکھنے کیلئے بادشاہ کے حضور چھٹی کی درخواست پیش کی، چونکہ وہ بادشاہ کے چہیتے تھے اور ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی تھیں اس لئے ان کی چھٹی کی درخواست نامنظور کردی گئی۔ اور انہیں بادشاہ نے بلا کر کہا کیوں کہ تمہارے اوپر کچھ اہم ذمہ داریاں ہیں اسلئے ہم تمہیں چھٹی تو نہیں دے سکتے البتہ ہم اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ تم ہمیں یہ بتاؤ کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے، ہم شاہی دربار کی جانب سے اس سے بہتر میلے کا انتظام کروادیں گے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ پھر تم سنبھل کے نیزہ کو بھول جاؤ گے۔ بہر نوع شاہی خزانہ سے ایک شاندار میلے کا انتظام کروادیا گیا، اور جب سارے کام مکمل ہو گئے اور میلہ لگ کر تیار

ہو گیا، تو ان صاحب سے کہا گیا کہ شاہی نیزہ تیار ہو چکا ہے لہٰذا تم جا کر دیکھ سکتے ہو۔ دیکھنے کے بعد ہم تمہاری رائے کے منتظر رہیں گے۔

چنانچہ ان حضرت نے نیزہ کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا، اس کے بعد وہ دربار شاہی میں حاضر ہوئے، بادشاہ نے معلوم کیا کہ سنبھل کے نیزہ کے مقابلہ میں شاہی نیزہ کیسا لگا۔

انھوں نے کہا کہ جہاں پناہ شاہی نیزہ ہر طرح سے سنبھل کے نیزہ سے بہتر ہے۔ لیکن اس میں ایک کمی رہ گئی تھی جو مجھے کھٹکتی رہی۔ بادشاہ نے معلوم کیا کہ وہ کونسی کمی ہے جو شاہی نیزہ میں رہ گئی۔ تو انھوں نے اس پر کہا کہ حضور، جہاں پناہ، سنبھل کے نیزہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہاں دیہاتی عورتیں ایک دوسرے سے مل کر روتی ہیں، وہ منظر اس نیزہ میں کہیں نظر نہ آیا۔

بادشاہ اس کمی کی بات کو سن کر مسکرایا اور کہا کہ تم سنبھل کا نیزہ ضرور دیکھو گے اچھا جاؤ ہم تمہیں سنبھل کا نیزہ دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

بہر حال یہ نیزہ سید مسعود غازی کی فتح کی ایک یادگار ہے۔ شروع میں یہ نیزہ کھادر پر ہوتا تھا۔ اور اب سوت ندی کے کنارے کے پار کھادر سے جنوب کی جانب شہباز پور کی اراضی پر ہوتا ہے۔ ہفتوں پہلے سے اس کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں، اور چند دن قبل کچھ مقامات پر ۳۵/۴۰ فٹ اونچے بانس میں کپڑا باندھ کر ڈھالیں گاڑی جاتی ہیں۔ جہاں چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔ سنبھل کے علاوہ بھی اور کئی جگہ نیزہ ہوتا ہے۔

نیزہ سے متعلق مشہور قطعہ:

چونکہ نیزہ ایک مشہور و مخصوص سنبھل کا تاریخی تہوار ہے جس کی قدامت ایک ہزار سال ہے۔ اس کے متعلق مفتی عبد السلام کا قطعہ بھی مشہور ہے۔

قطعہ

جب برجہاد آئے یہاں سید سالار
غالب ہوا اسلام مخالف ہوئے فی النار
اس "سوت" ہی نے لشکر کو بے حد کیا سیراب
غازیؒ نے خطاب اس کو دیا یارو فادار

مفتی عبدالسلام نیزہ کی شان و شوکت کا اظہار کرتے ہیں۔

نشان شوکت اسلام نیزا سالار
ہے جس نشان کا مددگار حیدر کرار
بھنور میں فکر کے کشتی ہوا مخالف ہے
مگر لگائے گا مسعودؒ ناخدا اسے پار

قطعہ دیگر۔

سید مسعودؒ در ہندوستان
آمدہ بودند با فوج و نشان
ازبرائے دین احمد جان بداد
اونہ ماند وماند ازونام ونشان

قطعہ دیگر۔

نیزہ سید سالار ہے آج
سوت پر گرمیٔ بازار ہے آج
غلبۂ دین کی نشانی ہے یہ
رنج میں لشکر کفار ہے آج

دیگر نیزہ آیا ہے شہر سنبھل کا
لوگ کرتے ہیں گشت جنگل کا
گرچہ تاریخ ماہ ٹل جائے
نہ ٹلے پر یہ روز منگل کا
دیگر چرا باشد این مجمع نیزہ نام
نہ بے اصل شد چنیں اژدہام
شنیدم کہ سالارؒ چوں فتح یافت
لبِ سوت بافوج کردہ قیام
نیزہ سالارؒ کی ہے دھوم دھام
کرگئے ہیں دین کا اعلیٰ وہ کام
جاتے ہیں اس میلہ میں سب خاص وعام
کیوں نہ ہو ہر سال میں پھر تازہ نام

(ارمغان فلاح ص ۴۳)

"ہندوؤں کا مشہور تہوار"

سنبھل میں ایک قدیم زمانہ سے دھجا نام کا ایک تہوار ہوتا ہے۔ جس کی نوعیت ہی عجیب وغریب ہے۔ تہذیب، کلچر، وشرافت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہولی کے بعد محلّہ تمر داس سرائے کے قریب ایک باغ میں یہ میلہ لگایا جاتا ہے اور وہ جگہ دھجا والے باغ سے مشہور ہے۔

ہولی کے دوسرے دن سنبھل کے قرب وجوار کی مختلف قومیں چوپی یعنی عورتوں کا روپ دھار کر شراب میں مست سڑکوں پر ناچتے گاتے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک چوپی آٹھ دس آدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس میں ہر آدمی کی شکل وصورت مختلف ہوتی ہے۔ یہ چوپیٔ دھجا کے بعد کئی دن تک وہاں کے امیر، اور سیاسی لوگوں کے

یہاں ناچ گا کر نظرانہ وصول کرتے ہیں۔ بقول فرید شوق کے پرتھوی راج کے جشن فتح کے طور پر یہ میلہ ہوتا ہے۔ سید مسعود غازی نے جب سنبھل کی مشرقی جانب صف بندی کر کے پرتھوی راج کے قلعہ پر حملہ کیا، لیکن پرتھوی راج کے لشکر نے شکست دیدی۔ یہ میلہ اسی کی یادگار ہے، جو آج تک قائم ہے۔

سید سالار مسعود:

سید سالار مسعود امیر ساہو بن عطار کے فرزند ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن الحنیفیہ تک منتہی ہوتا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔ اور آپ کی والدہ ماجدہ عطا بن محمد سبکتگین کی ہمشیرہ تھیں محمد قاسم فرشتہ نے محمود غزنوی کا بھانجہ لکھا ہے۔

۸ر شوال ۴۰۵ھ کو مقام اجمیر میں پیدائش ہے۔

قطعہ تاریخ ہوا تابندہ طالع مسعود
خاک میں کفر کے ملے خاکے

(تاریخ سالار مسعود ص ۲۷)

سید ساہو نے فرزند ارجمند کی پیدائش کی مسرت میں ۳ر دن تک جشن فرحت منایا۔ فقرا محتاجوں کو عطایا سے جھولیاں بھر دیں۔ جب سید غازی چار سال چار ماہ چار دن کے ہوئے تو سالار ساہو کے فرزند کو حضرت سید ابراہیمؒ کی خدمت میں تلمذ کے لئے پیش کیا۔ بطور شکریہ چار گھوڑے، جواہرات و نقدی ابراہیم کی خدمت میں پیش کی۔

(تاریخ سید سالار مسعود ص ۳۲، ۳۳)

شوق فریدی بحوالہ فیروز شاہی لکھتا ہے کہ:

سید سالار مسعود نواح دہلی میں پچھمؔ اور دریا خراسان میں رجب سالار اور بعض مقامات میں غازی مکان اور بعض جگہ بالا میاں اور بالا پیر کہلائے۔

اہل بصیرت اس پر متفق ہیں کہ آپ کی شہادت کے بعد جو لوگ ہندوستان میں

شہید ہوئے وہ سب آپ کی متابعت پر مامور ہیں۔ آپ سر کردہ شہداء ہند ہیں آپ بہرائچ میں مدفون ہیں۔

(احسن التواریخ ص ۳۱ تاریخ سید مسعود سالار، ص: ۲۷و۳۲و۳۳)

قطعہ تاریخ سید سالار مسعود۔

بل احیاء عندربھم ہے۔

۴ ۲ ۴ ھ

سید سالار مسعود غازی کی یادگار

سید سالار مسعود غازیؒ کی درگاہ کے متعلق راحت علی خاں رقم طراز ہیں کہ:

سرزمین بہرائچ میں تقریباً ایک ہزار سال پہلے سلطان محمود غزنوی کے بھانجے پیر ہرات حضرت شیخ عبداللہ انصاری کے ہم عصر اور حضرت شیخ ابوالحسن فرقانیؒ کے مرشد سید سالار مسعود غازیؒ مظلوموں کی حمایت میں غزنی سے چل کر یہاں ایک جنگ میں شہید ہو کر آسودۂ خواب ہو گئے ان کا آستانہ آج بھی ہندو مسلم ایکتا کی ایک یادگار بنا ہوا ہے۔

بہرائچ آمد

وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کے ہمراہ ملتان، دھلی، میرٹھ، سنبھل، قنوج، بلگرام اور بدایوں وغیرہ ہوتے ہوئے سترکھ پہونچے ان ہی دنوں بہرائچ کا علاقہ سورج پرست حکمرانوں کے زیر اثر تھا اور یہاں راجہ بہل دیو۔ اس وقت تخت نشیں تھا اس کی ایک رعایا ٹھر قوم بھی تھی راجہ کے دربار کا رواج تھا کہ ہر سال رعایا کی ایک پہلی اولاد نرینہ دیوتھی کو دیوی جی کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا اتفاق سے اب کے ایسے شخص کی اولاد کی باری تھی جو اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی اس کا باپ بڑا پریشان تھا ادھر سترکھ میں حضرت مسعود غازیؒ کے کمالات کا غلغلہ دور دور تک پھیل چکا تھا اس ٹھر قوم نے ایک وفد آپ کی خدمت میں بھیجا اس نے اپنی داستانِ پریشان سنائی آپؒ نے یہ واقعہ سن کر بہرائچ کے لئے کوچ کیا

اور میدانِ کارزار سے گزرتے ہوئے اس مقام تک پہونچے جہاں لڑکے کو بھینٹ دینے کا انتظام تھا اس طرح آپ نے دیوی جی بھینٹ سے اس لڑکے کو بچالیا لیکن خود دشمنوں کے نرغہ میں پھنس کر عالم جوانی ۱۹ برس کی عمر میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

تاریخ شہادت

آپ کی شہادت چودہ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۲ جولائی ۱۰۳۳ء میں واقع ہوئی مزار اقدس اسی جگہ ہے جہاں پر آپ نے جام شہادت نوش کیا۔

مزار شریف کی تصدیق

مزار شریف کی تصدیق تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے قطب اور صاحبِ سلسلہ بزرگوں کے اقوال سے بھی ہوتی ہے جنھوں نے آستانہ کی زیارت کی ہے ان کا بیان ہے کہ مزار شریف کی حاضری کے وقت ان کے دماغ ایسی خوشبو سے معطر ہو گئے جو صرف بزرگانِ دین اور اولیائے کرم کے مزار سے ہو سکتے ہیں۔

سید سالار مسعود غازیؒ پر ایک تحقیقی نظر

سید سالار مسعود غازیؒ کی عمر اور ان کے کارناموں اور تاریخ پر نظر کی جائے تو چند سوالات سامنے آتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کی ذات گرامی کا تعلق محمود غزنوی سے ہے۔ اور ان کی شخصیت صوفیاء مورخین کے نزدیک قابل احترام ہے۔ نیز سید سالار مسعود غازیؒ کی عمر ۱۹ سال ہوئی ہے۔

(۱) سوال: ان کے کارنامے جو بعض مورخین نے ذکر کئے ہیں۔ جبکہ تاریخ ہند کی مستند کتابیں ان کے تذکرہ سے خالی ہیں۔

(۲) سوال: سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملہ بتائے جاتے ہیں۔ لیکن مرأۃ مسعود، تاریخ مسعودی اور تاریخ محمود غزنوی مطبوعہ دار الفرقان دھلی تینوں

نے صرف ۱۲ بارہ حملے تسلیم کئے ہیں۔ اور صاحب مرأۃ الکونین نے محمود غزنوی کے حملوں کی تفصیل تیرہ لکھی ہے۔

لیکن ان حملوں کی تفصیل میں کہیں بھی مسعود غازی کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ ان کے والد سالار ساہو کا ذکر ہے، جو محمود غزنوی کے بہنوئی اور سپہ سالار ہیں۔

(۳) سوال: سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ محمود غزنوی کا آخری حملہ سومنات کے مندر پر ہے اس وقت مسعود غازی کی عمر صرف دو سال تھی وہ اس حملہ میں اپنے والد کے ساتھ شریک ہیں اور خود ان کے انتقال کے ایک سال قبل تک والد حیات رہے جو سپہ سالار تھے۔ مسعود غازی نے کل عمر ۱۸ ر سال ۱۱ ر ماہ پائی۔

(۴) سوال: غور کیا جائے کہ ان کے حالات و زندگی میں جب کہ والد حیات ہیں اور سپہ سالار ہیں اس کم عمری میں کیا ان کو سپاہ گری کی کمان ملنا ممکن تھا۔ خصوصاً جب کہ حریف بھی زبردست ہو اور مسلمانوں کے مقابلہ پر ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے ہوں اور مقابلہ بھی سخت ہو۔

(۵) سوال: حال یہ ہے کہ کہیں ان کی (انگشت) انگلی دفن ہے۔ اور کہیں خون کے قطرے اور بہت سی جگہ ان کے علم نصب کئے جاتے ہیں۔

(۶) سوال: سید سالار مسعود کا سنبھل تشریف لانا۔ پرتھوی راج سے جنگ ہوئی ابتداءً ہندوؤں کو فتح ہوئی اس کے جشن میں دھجا تہوار منایا جاتا ہے، پھر مسلمانوں کی فتح ہوئی جس کی خوشی میں نیزہ منایا جاتا ہے اور سید پچاسہ بزرگ کی لڑکی کے ساتھ پرتھوی راج کے لڑکے کی جو ایک طویل داستان کیسے وابستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

جواب: تمام تر پیدا ہونے والے شبہات کا جواب جس سے شبہات دور ہو جاتے ہیں یہ ہے تحقیقی اور اصل بات یہ ہے کہ مورخین حضرات نے ساہو سالار۔ اور مسعودؒ دونوں کی شخصیتوں کو ایک جگہ (گڈمڈ) کر کے انہیں سید سالار مسعود غازی کر کے (بیکارا) بنا دیا۔

جو واقعات سید سالار مسعود غازی کے بیان کئے جاتے ہیں وہ در حقیقت سید ساہو سالار سے وابستہ ہیں ان کے بیٹے کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

سید سالار مسعود غازیؒ: **(حوالہ جات)**

ضیاء الدین برنی کے لکھنے کے مطابق وہ سلطان محمود غزنوی کے فوج کے ایک سپاہی تھے، جب کہ ابوالفضل کا بیان ہے کہ وہ سلطان کے عزیز (خویشاوند) تھے۔ عبدالقادر بدایونی نے خیر آباد کے ایک ولی کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ایک افغانی تھے جو شہادت سے سرخرو ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے اسلئے آنے والی نسلوں نے ان کے سوانح میں خیالی اور رومانی داستانیں شامل کر دی ہیں۔

عبدالرحمٰن نے مراۃ مسعودی میں جو جہاں گیر کے عہد ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء میں لکھی گئی ہے ان سب داستانوں کو شامل کر لیا ہے۔ اگر چہ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے غزنوی عہد کی ایک مفقود تاریخ، تاریخ ملا محمد غزنوی سے بھی استفادہ کیا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ جوانی میں غازی میاں اپنے باپ سالار ساہو کے ہمراہ جنگوں میں شریک رہے، سولہ برس کی عمر میں وہ ہندوستان پر چڑھائی کے لئے نکلے۔

وہ غازی میاں۔ جو بالا میاں، بالا پیر، ہتھیالہ بیر وغیرہ کے ناموں سے بھی معروف و مشہور ہیں اور ان کی داستانیں شمالی ہند کی ثقافتی زندگی، خاص طور پر مشرقی اتر پردیش (بھارت) کے کئی شہروں میں منفرد مقام رکھتی ہیں اور ان کی بہت سی حکایات مشہور ہیں۔

ماخذ۔ غازی میاں کے متعلق سب سے پہلا حوالہ امیر خسرو کی اعجاز خسروی (طبع نولکشور) ۲۰۰۱ء میں ملتا ہے۔ جس میں مصنف نے ان کی ملک گیر مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ دیگر ماخذ کیلئے دیکھئے:

(۱) ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی سلسلہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔
(۲) عبداللہ: تاریخ داؤدی ص ۳۸ علی گڈھ ۱۹۰۴ء۔ (۳) نعمت اللہ: تاریخ خاں جہانی
۱: ۲۱۷، ڈھاکہ ۱۹۶۰ء (۴) ابوالفضل: اکبرنامہ، سلسلہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔ ۳: ۲۷
(۵) فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ طبع نولکشور۔ ۱: ۱۳۹۔ (۶) عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ
سلسلہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی: (۷) عبدالرحمٰن، مرأۃ مسعودی مخطوطہ کے لئے دیکھئے:
(Story) عدد ۱۰۰۶ (۸) داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، نول کشور کانپور ۱۹۰۰ء ص ۱۶۰:
(۹) غلام معین الدین عبداللہ معارج الولایت، مقالہ نگار کا ذاتی نسخہ۔ (۱۰) ابن بطوطہ۔
(۱۱) احسن التواریخ اور متعدد حوالہ جات۔

سلطان غیاث الدین بلبن کا سنبھل پر غیر متوقع حملہ آسمان کی بجلی ثابت ہوا

سلطان غیاث الدین بلبن کے حالات پر مختصر روشنی ڈالنا بے محل نہ ہوگا سلطان نسباً ترک تھا، چنگیز خانی حملہ میں گرفتار ہو کر بغداد میں فروخت ہوا سلطان کا تعلق ہندوستان کے بادشاہ التمش کی نسل سے تھا۔ پھر ہندوستان لایا گیا اور دوسرے غلاموں کے ساتھ التمش نے اسے بھی خرید اغلامی اور قید کی صعوبتوں کے بعد بلبن کو عزت و وقعت حاصل ہوئی کیوں کہ اسکے چہرے سے بلند اقبال و عظمت نمایاں تھی اوّلاً امیر شکاری کے عہدہ پر مقرر ہوا چونکہ بلبن کا ستارہ عروج پر تھا ترقی کر کے امیر خود کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوا۔

پھر سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں مزید ترقی کی۔ وزارت کے عہدہ پر فائز ہوا ناصر الدین کے دور میں بلبن کو ایسا اقتدار حاصل ہوا کہ ناصر الدین محمود صرف نام کا بادشاہ تھا۔ بقول مورخین ناصر الدین محمود ایک کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ سیاہ سفید کا مالک بلبن تھا۔ (تاریخ فرشتہ و موج کوثر)

بلبن ایک خاص رنگ اور شان کا بادشاہ ہوا ہے، مثلاً بلبن کا قول تھا کہ نبوت کے بعد خلق خدا کی خدمت کا سب سے بڑا ذریعہ بادشاہت ہے اور اس کے حقوق کا پاس و لحاظ

ضروری ہے۔ اور جو بادشاہ اپنا جاہ و حشم و رعب قائم نہیں رکھتا وہ اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے سکتا اور ایسے بادشاہ کی رعایا بغاوت اور دوسری خرابیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بلبن عمدہ خصائل وصفات کے باوجود بغاوت و سرکشی کو ناپسند کرتا بلکہ کبھی برداشت نہیں کیا۔ باغی خواہ مسلم یا غیر مسلم اس کی سرزنش میں کسی قسم کی رعایت کا خانہ نہیں تھا۔

تاریخ فیروزشاہی عہد بلبن کی ایک دلچسپ روئیداد پیش کرتی ہے۔ جہاں دوسرے بادشاہوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے وہیں سنبھل میں رونما ہونے والی بغاوت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ چونکہ سنبھل اور اس کے نواحی علاقوں کے لوگ پورے طور پر اطاعت گزار نہیں ہوئے تھے یہاں کے لوگ ہمیشہ خودمختار رہے، اسی سبب سے بغاوتوں کا مرکز رہا۔ سنبھل میں کھٹیاروں کی بغاوت کچلنے کا تذکرہ برنی کرتا ہے۔ اور اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیاث الدین بلبن کے ابتدائی دور حکومت میں سنبھل، امروہہ، بدایوں اور ان کے نواحی علاقے ایک بڑی بغاوت کا مرکز بنے ہوئے تھے ان علاقوں کے حکمرانوں نے باغیوں سے نمٹنے میں بلبن سے اپنی معذوری کا اظہار کیا گویا مرکزی حکومت کے لئے وقار کا ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ سنبھل جیسی دور دراز کی بغاوت ملک میں امن وانتظام کی صورت حال پر اثر انداز ہوتی ہے، بلبن نے حکومت کے ان اہم نقطوں کو نظر انداز نہیں کیا اور حکومت کے استحکام کی خاطر وہ شخصی طور پر کھٹیاروں کی بغاوت فرو کرنے کی تیاری میں مصروف رہا۔ برنی لکھتا ہے کہ بلبن نے فوجوں کی تیاری کا حکم نافذ کیا اور عوام الناس میں اعلان کرا دیا کہ بادشاہ شکار کیلئے ہمالیہ کے صحرائی علاقے میں جا رہا ہے گیارہ گھنٹے کے اندر تمام فوجیں ساز و سامان کے ساتھ ۵ ہزار چیدہ سوار لے کر دھلی سے سنبھل کیلئے روانہ ہو جائیں سلطان نے آخری وقت تک ارادہ کا اظہار نہیں کیا یہ فیصلہ اس کی سیاسی بصیرت کا اور سوجھ بوجھ کا مظہر تھا۔ محمد قاسم اپنی تاریخ فرشتہ میں رقم طراز ہیں کہ پانچ

ہزار تربیت یافتہ فوج کا سنبھل پر اچانک غیر متوقع حملہ آسمان کی بجلی ثابت ہوا اور بلبن اس وقت وہیں رہا۔ جب تک ہر گھر مقتل گاہ نہ بن گیا۔

آگے لکھتا ہے کہ بلبن کی خوں ریزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلبن کے عہد میں سنبھل، امروہہ، اور اس کے نواحی علاقوں میں بغاوت کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اور جلال الدین خلجی کے دور حکومت ترک بلبن کی تلوار نے باغیوں کو خاموش کر دیا بلبن نے اپنے چالیس سالہ اقتدار میں اول عہدہ وزارت پر خود مختاری کی حیثیت سے پھر تخت دہلی پر بیٹھ کر ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مستحکم کیں جس کا تاریخ میں ایک خاص مرتبہ ہے۔

سلطان ناصر الدین محمود نے دہلی کو سنبھل پر ترجیح دی

سلطان ناصر الدین محمود شمس الدین التمش کا چھوٹا بیٹا تھا۔ بڑے بیٹے کا نام ناصر الدین تھا اس کے انتقال کے بعد سلطان التمش نے اسی کے نام پر ناصر الدین رکھا، علاء الدین کے بعد حکومت میں ناصر الدین بہرائچ کا حاکم مقرر ہوا۔ رعایا کی اصلاح کی کوشش میں سرگرم رہا، اور صوبہ کو معمور و آباد کیا اس کے انصاف و رعایا دوستی کی بڑی دھوم ہوئی اور شہرت ملی اور کچھ ہی دنوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی، سلطان درویش صفت بادشاہ نہایت پاکیزہ طبیعت تھا، فقیرانہ زندگی بسر کرتا، ناصر الدین محمود کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اولیاء و صلحاء کے نمونے پر تھی اس نے انتظام سلطنت وزیر کو سپرد کر کے کہہ رکھا تھا کہ تم ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے اس ذات بے نیاز (حق تعالیٰ) کے حضور میں تمہیں اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے، ۱۲۸۱ء میں سلطان ناصر الدین محمود نے قلعہ گڑھ مکتیشور کا محاصرہ کیا، وہاں کا راجہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ کوہ ہمالیہ کی طرف بھاگ نکلا تو لشکر سلطان کو فتح ہوئی۔ لشکر نے چند روز گڑھ مکتیشور قیام کیا سفر کی تھکان زائل ہونے اور سکون و آرام کے بعد سلطان ناصر الدین محمود اپنے معزز سردار و فوج کے ساتھ سنبھل کی طرف بڑھا اور امروہہ ہوتے ہوئے سنبھل کو رونق

بخشی، ایک مدت تک سنبھل میں قیام کیا قیام کے دوران ملکی انتظام میں مصروف رہے،
چونکہ علاقہ سنبھل میں خصوصیت کے ساتھ شکار دستیاب ہوتے تھے۔ بادشاہ نے بھی
سیر و شکار کیا اور سلطان نے دوران قیام سنبھل میں محلہ کوٹ میں ایک مسجد کی بنیاد
ڈالی۔ بادشاہ کا زمانہ قریب آجانے کے سبب سلطان نے دھلی کو سنبھل پر ترجیح دی
اور دھلی کوچ کر گیا۔ وہ تعمیر ناقص رہ گئی۔ داؤد خاں سردار کو سنبھل کا حکمراں گورنر مقرر کر گیا
اور ترکی سپاہیوں و فوج کا ایک دستہ بغرض حفاظت داؤد خاں کے سپرد کیا۔

چونکہ سنبھل اکثر بغاوتوں کا شکار رہا ہے، ان ترک سپاہیوں نے سنبھل میں اپنی
بود و باش اختیار کر لی۔ جب یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا تو باہم میل جول
و ربط قائم ہو گئے تو سنبھل و نواح کے قصبات کو مسکن بنا لیا۔ آج بھی محلہ دیا سرائے
اور دیگر مواضعات میں موجود ہیں اور وہ دو قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔

(تاریخ امروہہ، وفرشتہ، موج کوثر، ایوان متقل)

لودھی خاندان کی آمد

کچھ افغانی باشندے تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے تھے جن کا تعلق لودھی
خاندان سے تھا اس افغانی قافلہ میں ملک بہرام نام کا ایک شخص بھی شامل تھا، جو بہرام
لودھی کا دادا تھا۔ وہ ملتان آ گیا، وہ زمانہ فیروز خاں باربک کی حکومت کا تھا اور ملتان کے
حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ خدا نے اسے پانچ بیٹے دیئے۔ ان میں سے ایک ملک
کالا تھا اس کی چچازاد بہن تھی۔ وہ بہن جس مکان میں رہتی تھی وہ منہدم ہو گیا وہ اس
حادثہ میں ہلاک ہو گئی چونکہ بچہ کی ولادت کے ایام پورے ہو چکے تھے فوراً پیٹ چاک
کر کے بچہ کو نکالا گیا یہی بچہ بہلول لودھی تھا۔ اسی بہلول لودھی کا بیٹا سکندر لودھی ہے
جس نے سنبھل کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ (تاریخ فرشتہ)

اسلام خاں بہلول لودھی کے چچا تھے۔ اسلام خاں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے

اپنی آخری عمر میں بہلول کو ولی عہد بنانے کی وصیت کی، اسلام خاں کے انتقال کے
کے بعد بہلول لودھی ولی عہد منتخب ہوا۔ اسلام خاں کے زمانہ میں دھلی میں سلطان محمد شاہ
حکومت کر رہا تھا، ادھر محمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بیٹا علاؤ الدین تخت دہلی کا جانشین ہوا
چونکہ علاؤ الدین میں ذاتی صلاحیت قریب قریب عنقا تھی اور امور مملکت سے اسے کوئی
دلچسپی نہیں تھی جس کی وجہ سے پورے ملک میں افراتفری پھیلی، ہر جگہ کا حکمران اپنی
خودمختاری کا دعویدار ہوا اس وقت میں سنبھل میں دریا خاں خودمختاری حکومت کر رہا تھا
اور دوسری طرف سرہند سے دھلی تک بہلول لودھی کی حکومت تھی۔ ۱۷ ربیع الاول
۸۵۵ھ میں سلطان بہلول لودھی دھلی کا مستقل تخت نشیں ہوگیا۔

دریا خاں حاکم سنبھل نے اطاعت قبول کی

کچھ لوگ افغانی حضرات کی حکمرانی کو پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے ۸۵۶ھ
میں جونپور کے والی حسین شرقی کو بلایا۔ محمد حسین شرقی نے اپنے ہمراہ ایک لشکر جرار لے کر
دھلی کا محاصرہ کیا۔ طرفین کی فوجوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ محمد حسین شرقی کو شکست
ہوئی۔ اس فتح سے بہلول لودھی کا اقتدار اور بڑھ گیا، پھر دوسرے ملکوں کو فتح کرنے
اور سلطنت کو وسیع کرنے پر متوجہ ہوا جہاں پہونچا وہاں کے حاکم نے اطاعت قبول کی
اور شاندار استقبال کیا، اس وقت میں سنبھل کا حکمراں دریا خاں لودھی تھا بادشاہ جب
(برن) پہونچا تو سنبھل کے حکمراں دریا خاں نے بھی سلطان بہلول کی اطاعت قبول کی
اور سات ہاتھی کا نذرانہ پیش کیا، بایں وجہ سلطان نے دریا خاں کو سنبھل کا حاکم
برقرار رکھا یہاں پر ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دریا خاں لودھی حاکم سنبھل کے
پاس ایک نیزہ تھا جو اس وقت علم سرداری سمجھا جاتا تھا اسے رائے پرتاب صاحب کے
بیٹے نرسنگھ نے چھین لیا تھا۔ جب سلطان بہلول لودھی شمس آباد آیا تو اس وقت نرسنگھ
نے بادشاہ کی ملازمت کرلی، دریا خاں لودھی وغیرہ نے موقع پر اس کے انتقام میں فرزند

نرسنگھ کو قتل کرادیا رائے پرتاب اور چند افغانیوں کو اس حادثہ سے بہت رنج ہوا۔

سنبھل پر والیٔ جونپور محمد حسین شرقی کا قبضہ

بہلول لودھی جب مختلف مقامات پرگذرا اٹاوہ ہوتے ہوئے آگے بڑھا، تو محمد حسین شرقی نے دوبارہ حملہ کا ارادہ کیا۔ بہلول سے معرکہ آرائی ہوئی۔ اسی دوران قطب خاں لودھی اور دریا خاں حاکم سنبھل نے لشکر پر شب خون مارا۔ دوسری طرف علاؤ الدین امور سلطنت سے عدم دلچسپی کے باعث بدایوں میں گمنامی کی زندگی پر قناعت کر بیٹھا تھا۔ اس وقت محمد حسین شرقی کا حملہ اہم واقعات میں سے ہے۔ بہلول لودھی کے لشکر سے سات دن تک قتل وغارت گری کا میدان گرم رہا اسی دوران بدایوں میں علاؤ الدین کا انتقال ہوگیا۔ محمد حسین شرقی بظاہر علاؤ الدین کی تجہیز و تکفین کے لئے گیا، لیکن اس کا مقصد کچھ اور تھا تدفین کی رسومات ادا کرنے کے بعد علاؤ الدین کے بیٹوں سے بدایوں کی سلطنت چھین کر اپنی طاقت بڑھائی اور اس کے فاتحانہ پروگرام میں سنبھل بھی شامل تھا، بدایوں سے سنبھل کی طرف بڑھا ایک بڑے لشکر کے ساتھ سنبھل پر حملہ کیا، سنبھل کے گورنر مبارک شاہ کو قید کیا اور سنبھل کو خوب لوٹا اور مال واسباب سمیٹا۔ سنبھل کی فتح سے اس کی خواہش کو تھوڑا اطمینان ہوا اور یہ فتح اس کی عزم میں باعث ترقی ہوئی۔ حسین شرقی نے دوسری بار پوری طاقت سے دہلی پر حملہ کیا چونکہ بہلول لودھی کی حسین شرقی کے عزائم پر گہری نگاہ تھی۔ بہلول لودھی نے حالات کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے صلح کرلی۔ جو بہلول کے حق میں سیاسی فتح تھی جب حسین شرقی جونپور واپسی کر رہا تھا۔ تو بہلول لودھی نے تمام سیاسی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر عقب سے حملہ کر دیا اور خود جونپور پر قبضہ کیلئے اپنی تمام فوجی طاقت کا استعمال کیا اور جونپور پر قابض ہوا اور سنبھل کے لئے محمد قاسم لودھی کو سنبھل کا گورنر مقرر کیا۔ جو دوسرے لودھی سلطان سکندر لودھی کے عہد میں بھی اپنے عہدہ پر فائز رہے۔ (تاریخ فرشتہ)

بہلول لودھی کے دور حکومت میں سنبھل

بہلول بڑا مدبر اور امور انتظامیہ وسلطنت کی صلاحیتوں کا مالک تھا، والی جونپور حسین شرقی سے جو صلح ہوئی تھی، بہلول لودھی اعتماد ختم کر کے حسین شرقی کے قبضہ میں جو جاگیریں تھیں، ان پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ حسین شرقی جدھر کا رخ کرتا، بہلول پورا تعاقب کرتا، اس نے اپنے سیاسی عزائم کے تحت جونپور، بہرائچ ، میوات، رابری، بھوگاؤ، گوالیار، سنبھل میں اپنی عظمت برقرار رکھی۔

بہلول لودھی کا انتقال

بادشاہ سفر میں مقام سکیٹ کے نواح قصبہ بھوراولی میں تھا بیمار پڑ گیا، مرض شدت پکڑ گیا ۸۸۴ھ مطابق جولائی ۱۴۸۹ء میں بہلول اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ بہلول نے اڑتالیس سال آٹھ ماہ سات دن حکمرانی کی۔

سلطان سکندر لودھی کی تخت نشینی

چونکہ بہلول کا راستہ میں انتقال ہوا تھا اس کی لاش کو دہلی بھیج دیا گیا۔ بہلول لودھی کا بیٹا سکندر لودھی تمام امراء کی موجودگی میں ۸۹۴ھ میں دہلی کا تخت نشیں ہوا۔ اس وقت سکندر کے چھ بیٹے اور ۵۳ قریبی امراء تھے۔ (فرشتہ)

سنبھل دار السلطنت!

۸۹۴ھ میں سکندر لودھی نے دہلی تخت نشینی کے بعد وسعت سلطنت کی طرف توجہ کی مہمات میں لگا رہا۔ بہت سے مقامات کے سفر کئے۔ کہیں بعض نے بغیر معرکہ آرائی کے اطاعت قبول کی اور بعض جگہ معرکہ آرائی کے نتیجہ میں فتح حاصل ہوئی، اور باغیوں وسرکشوں کو مختلف سزائیں دیں۔

۸۹۴ھ میں دہلی تخت پر متمکن ہونے کے گیارہ سال بعد ۹۰۵ھ میں سنبھل کو

دار السلطنت بنایا سلطان شاہ سکندر نے کن مصلحتوں کے پیش نظر سنبھل کو دار السلطنت بنایا اسکی تفصیل تو کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سکندر جو خوبصورتی کا دلدادہ تھا شاید اس لئے دہلی کا قدیم شہر جو اپنی رونق و خوبصورتی کھو بیٹھا تھا پسند نہیں آیا اور شاہ شکار کا بھی شوقین تھا یہاں شکار بھی بہت ملتا تھا۔ اور فوجی ضروریات کے پیش نظر رام گنگا اور جمنا کو عبور کر کے دشمن کے آنے سے بچنے کی سنبھل بہت محفوظ جگہ تھی۔ ڈاکٹر حمید الدین نے لکھا ہے کہ شہر دہلی کے قدیم اور تقریباً برباد شدہ شہر سکندر لودھی کیلئے اپنی دلچسپی کو کھو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اسے سیاسی اور فوجی ضروریات نے بھی ایک ایسا نیا شہر جو دار الحکومت بن سکے ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹ء میں اس نے سنبھل کی جانب کوچ کیا اور چار سال تک دار الحکومت بنائے رکھا۔

(تاریخ سروے، گلشن ابراہیمی، احسن التواریخ)

سنبھل سکندر لودھی کے قیام کے دوران

سنبھل علم کا مرکز بنا رہا، بادشاہ علمی دوست شخص تھا۔ دور دراز سے علماء کو بلاتا علمی مذاکرے کی مجلس قائم ہوتی علماء کو خلعت و نوازشات سے شرفیابی بخشتا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سکندر لودھی نے دہلی کا حکمراں اصغر خاں کو مقرر کیا تھا سنبھل میں سلطان سکندر لودھی کو خبر ملی کہ دہلی کا حاکم اصغر خاں بد کرداری اور بد اعمالی پر اتر آیا ہے سلطان نے خواص خاں کو مامور کیا کہ دہلی جا کر اصغر خاں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کرے۔ یہ حکم ملتے ہی خواص خاں دہلی کیلئے روانہ ہوا۔ دہلی پہونچنے سے قبل ہی اصغر خاں شنبہ کی شب ۹۰۷ھ کو سنبھل خود ہی آ کر حاضر ہوا۔ لیکن پھر بھی اس کو گرفتار کر لیا گیا اور پناہ نہیں دی۔ ادھر خواص خاں دہلی کا حکمراں بن بیٹھا۔ اور حکومت کرنے لگا۔

یہ خواص خاں وہی ہیں جن کا مقبرہ محلہ خواص خاں میں پختہ قبر کی صورت میں ہے سنبھل کی غربی جانب انتہائی آبادی پر واقع ہے۔ اور اس مسجد سے متصل ہے جس پر عشرہ محرم

کے دن اہل شہر و حکام کا ہجوم و اجتماع اور لوگوں کا ازدحام ہو کر تعزیوں کا نظارہ کرتے ہیں۔
(احسن التواریخ)

سکندر لودھی ایک قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔ سنبھل کے قیام میں اس کا بہت سا وقت افغان امراء اور اٹاوا، چندیری، گوالیار کے ہندو راجپوتوں، راجاؤں سے لڑائی میں گزرا۔ شاید یہی وجہ آگرہ شہر کی بنیاد رکھنے کی ہوئی۔ اور اس کی نگاہ میں آگرہ کی اہمیت میں اضافہ کر دیا بہر کیف۔ ان حالات کے باوجود اس نے علم و فن کی طرف بہت توجہ کی۔ اس کے زمانہ میں سنبھل علم و علماء کا مرکز رہا۔ اور دور دراز سے علماء آتے اور درس و تدریس کیلئے مدارس کا قیام وجود میں آیا۔

چونکہ سکندر لودھی خود بھی علماء کے حلقہ میں شریک ہوتا۔ اور دلچسپی کے باعث سرپرستی فرماتا۔ ایک شاعر اور ادبی دوست ہونے کے ناطے اپنی حکومت میں تعلیم پھیلانے کا اہتمام کیا۔ آب کوثر اور اخبار کے مطابق سکندر نے عرب، ایران، ایشاء کے مرکزی ممالک کے علماء کو اپنی حکومت میں درس و تدریس کے لئے بلایا۔ اور علمی معیار بہت بلند کیا۔ ملتان سے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی اور شیخ حسین طاہر جیسے علماء کو بلا کر اہم عہدوں پر فائز کیا شیخ عبداللہ تلبنی کو سنبھل میں ایک مدرسہ کا ناظم مقرر کیا۔ ان کے شاگردوں میں شیخ حاتم سنبھلی اور شیخ اللہ دیئے جونپوری کافی مشہور شخصیتیں ہیں۔ (جن کی بہت مشہور تصانیف ہیں مثلاً فقہ میں ہدایہ کا حاشیہ کئی جلدوں میں لکھا۔ کافیہ کی بے نظیر شرح تفسیر مدارک وغیرہ) بدایونی۔ شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی کے متعلق لکھتا ہے۔

این ہر دو عزیزان ہنگام خوابی ملتان آمدہ علم معقول را دران دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود۔
(آب کوثر، گلشن ابراہیمی، احسن التواریخ، سنبھل سروے)

ان حضرات نے قاضی اسد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم داخل نصاب کیں اور بہت جلد یہ کتابیں مقبول عام ہوگئیں۔ سلطان نے ان بزرگوں کی بہت قدر اور ہمت افزائی کی۔ سلطان خود شیخ عبداللہ کی درسگاہ میں شریک ہوتا تھا۔ اور اس خیال سے کہ اس کے جانے سے درس کا سلسلہ رُک نہ جائے مدرسہ سے متصل گوشہ مسجد میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور مولانا کی پوری تقریر سنتا اور فیض حاصل کرتا۔

سلطان سکندر کے زمانہ ہی میں مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز دہلی تشریف لائے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر کی اور موصوف نے مدتوں آگرہ درس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔ (آب کوثر)

سلطان سکندر کا علمی ذوق

سکندر شعر و شاعری سے بہت دل چسپی رکھتا تھا۔ وہ ایک ستھرے مذاق کا مالک اور شاعری کی طرف اس کی طبیعت مائل تھی۔ پاکیزہ اور عمدہ عمدہ اشعار لکھا کرتا۔ اس کا تخلص گلراضی تھا۔ سلطان کا مقرب اور خاص مصاحب شیخ جنابی کنبوہ تھا اسی بادشاہ کے دورِ حکومت میں فرہنگ سکندری اور دوسری علمی و ادبی کتابیں لکھی گئیں۔

(گلشن ابراہیمی)

سلطان سکندر کی دینی حمیت

محمد قاسم نے اپنی کتاب تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں سکندر لودھی اپنے بھائی باربک شاہ سے مصروف جنگ تھا اس وقت ایک فقیر نے سکندر کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تیری فتح ہوگی۔ بادشاہ نے غصہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کہا کہ جب دو مسلمان میں معرکہ آرائی ہو تو کبھی یک طرفہ فیصلہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہنا، بجا اور درست ہے کہ خدا کرے ایسا ہو جس میں اسلام کی بول بالائی ہو۔ (آب کوثر)

سلطان سکندر کے عہد کا ایک عبرت ناک واقعہ

سلطان میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں ایک یہ بھی خوبی تھی کہ خاص کر دینی امور میں علماء سے مشورہ کرتے۔ اور ان کے فتویٰ پر عمل کرتے۔ ملک العلماء عبداللہ جیسے صدق وصاف گوئی، جرأت اور اسلامی روح سے صحیح فتویٰ دیتے۔ بادشاہ عمل کرتا۔ چنانچہ سنبھل میں اس کے عہد میں ایک عبرت ناک واقعہ بدھن برہمن کے قتل کا پیش آیا۔ اس برہمن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندو مذہب اور اسلام دونوں سچے ہیں یہ خیال کبیر اور گرونانک نے بھی ظاہر کیا تھا۔ اور سلطان ان دونوں کی قدر کرتے تھے۔ اور اس کے علاوہ صوفیوں کے اقوال اور شعراء کے اشعار اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ بدھن کے معاملہ میں علماء کا اختلاف تھا۔

بہر حال بدھن کا یہ مقولہ پورے شہر میں پھیل گیا کہ ہندو مذہب بھی برحق ہے اور مسلمانوں کا مذہب سچا ہے قاضی پیارے اور شیخ بدر نے ایک دوسرے کے خلاف فتوے دیدیئے۔ شیخ بدر اور قاضی کو اور اس ہندو کو بادشاہ کی خدمت میں روانہ کردیا۔ بادشاہ علمی مباحث سننے کا بہت شوق رکھتا تھا اس نے چہار اطراف سے بڑے نامی گرامی مشہور علماء کو اپنے دربار میں بلوایا۔ جن کے نام یہ ہیں۔ میاں قادر بن خواجہ، شیخ بدر، میاں عبداللہ بن اللہ داد، تلبنی، سید بن محمد بن سعید خاں دہلوی، ملا قطب الدین اور ملا اللہ داد، صالح سرہندی، سید امان، سید احسن قنوجی اور میاں عزیز اللہ سنبھلی وغیرہ بادشاہ کے مقربین خاص میں سے تھے۔ سب نے مل کر ایک مجلس مباحثہ کی۔ اور ان علماء نے یہی رائے دی کہ اس نے اسلام کی صداقت تسلیم کرلی ہے اس لئے وہ مسلمان ہوگیا اس کے بعد کسی دوسرے مذہب کی صداقت مانے گا تو مرتد ہوجائے گا۔ اور مرتد کی سزا ان کے نزدیک موت تھی۔ بدھن کا اصل واقعہ فارسی میں آب کوثر سے نقل کیا ہے۔ ذیل میں فارسی عبارت۔

نقل است کہ زناردارے بود بودھن نام در موضع کانیر سکونت داشت، روزے

درحضور بعضے مسلماناں اقرار کردہ بود کہ اسلام حق است و دین من نیز درست است۔ این سخن ازو شائع شدہ۔ بگوش علماء رسید۔ قاضی پیارہ و شیخ بدہ کہ ہر دو در لکھنوتی بودند و تنقیص یک دیگر فتویٰ می دادند اعظم ہمایوں حاکم آن ولایت زناردار مذکور ا ہمراہ قاضی پیارہ و شیخ بدہ پیش سلطان بہ سنبھل فرستاد۔ چوں سلطان ر اباستماع مذاکرہ علمی رغبت تمام بود علماء نامی را از ہر طرف طلبید۔ میاں قادن بن شیخ خواجہ و میاں عبداللہ بن اللہ داد تلبنی و سید محمد بن سعید خاں از دہلی و میر امان و سید احسن از قنوج آمدند و جمعے از علماء کہ ہمیشہ ہمراہ سلطان بودند۔ مثل سید صدر الدین قنوجی و میاں عبدالرحمٰن ساکن سیکری و میاں عزیز اللہ سنبھلی ایشاں نیز درآں معرکہ حاضر شدند۔ اتفاق علماء براں شد کہ اورا حبس کردہ عرض اسلام باید نمود، اگر اباء آورد باید کشت بودھن از اسلام آوردن اباء نمودہ کشتہ شد۔ سلطان علمائے مذکورہ انعام فرمودہ بجاہائے خود رخصت داد۔

چونکہ بدھن کے معاملہ میں علماء کا اختلاف تھا بادشاہ نے یہ مسئلہ علماء کے سامنے پیش کیا علماء نے فتویٰ دیا کہ بدھن نے اسلام کی صداقت تسلیم کرلی ہے اس لئے وہ مسلمان ہوگیا۔ اب کسی دوسرے مذہب کی صداقت کا اقرار کرتا ہے تو وہ مرتد ہوجائے گا اور مرتد کی سزا ان کے نزدیک موت تھی۔ اس لئے بدھن کے لئے ضروری تھا کہ ہندو مذہب کا انکار کرکے پوری طرح مسلمان ہوجائے۔ ارتداد کی سزا موت بھگتے۔

سکندر نے قاضیوں اور قانون دانوں کے فیصلہ پر عمل کرنا ایک مسلمان بادشاہ کا فرض سمجھتے ہوئے بدھن کو پھانسی دلوادی۔ (آب کوثر)

بہر نوع۔ سکندر نے علم و فضل کو بڑی ترقی دی اگرچہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ: مذہبی جوش میں افراط کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اور بعض نے متعصب کہا ہے اور بعض مؤرخین نے اصل واقعہ کو دوسرے رنگ میں تبدیل کرکے یوں کہا کہ ایک ایسے شخص کو پھانسی دی گئی جس نے اپنا مذہب تبدیل کرنے سے انکار کردیا تھا اور عالموں

کے فتویٰ کو جابرانہ یک طرفہ بعید از انصاف کہا ہے قارئین حضرات بدھن کا اصل واقعہ پڑھ چکے ہیں۔ جو حقیقت پر مبنی ہے اور عالموں کا فتویٰ مذہبی نقطۂ نظر سے صحیح ہے۔ بادشاہ خود اسلام کا دلدادہ، مذہب سے واقفیت رکھتا تھا۔ انصاف پسند تھا۔ ایسے بادشاہ کی طرف عدم انصاف کی نسبت حقیقتِ واقعہ سے ناواقفیت ہے یا تعصب کی بات ہے۔ اسی بناپر بادشاہ نے ان تمام علماء کو شاہی نوازشوں سے مالا مال کیا اور سب واپس چلے گئے۔

(گلشن ابراہیمی، آب کوثر، احسن التواریخ، سنبھل سروے)

سلطان سکندر لودھی ایک نظر میں

سکندر لودھی نے فارسی زبان کو مرکزی حیثیت ہی نہیں دی بلکہ اسے زیادہ استوار کیا۔ جب کہ ملکی معاملہ اور لگان کا حساب و کتاب اسلامی حکومت کے آغاز سے ہندو محاسبوں، پٹواریوں، اور قانون دانوں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اور اب تک وہ حساب ملکی زبانوں ہی میں رکھتے تھے۔ مگر یہ طریقہ مسلمان حکمرانوں کے لئے بڑا مضر تھا۔ اور معاملہ انہی کے حساب و کتاب پر منحصر تھا۔ جس میں یہ لوگ بڑی موثر کمی بیشی کر سکتے تھے۔ سکندر نے اس بدنظمی کو مٹانا چاہا اور بعض دفاتر کی نسبت حکم نافذ کیا کہ وہ فارسی میں رکھے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے بہت ہندو ملازمین کو فارسی زبان سیکھنی پڑی۔ ملا نظام الدین نے لکھا ہے کہ

"وکافراں بخواندن ونوشتن خط فارسی کہ تا آں زماں درایشاں معمول نبود پرداختند" (آب کوثر)

ہندوؤں کی ایک جماعت نے محنت وذہانت کے سہارے ادبی درجہ حاصل کرلیا اور عہدِ سکندری میں ایک برہمن شاعر کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا ایک مطلع آب کوثر میں نقل کیا ہے۔

دل خوش نشدے، چشم تو خنجر نشدے گر
رہ کم ونشدے، زلف تو ابتر نشدے گر

اس کے علاوہ بادشاہ نے علم وادب کی ترویج پر خاص توجہ دی اور ان کوششوں میں اسے کامیابی ہوئی چنانچہ طبقات اکبری میں سکندر لودھی کی نسبت لکھا ہے۔

''در عہد فرخندہ او علم رواج یافت۔ وامرازادگاں دولت وسپاہیاں بکسب فضل اشتغال نمودند''۔ (آب کوثر)

سکندر طالبِ دعا ہوا

محمد قاسم نے اپنی تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جب بہلول لودھی کا انتقال ہوا اور امراء سلطنت نے سکندر لودھی کو جانشیں کیلئے طلب کیا تو سکندر پہلے شیخ بہاؤالدین کی خدمت میں دہلی اسلئے گیا کہ وہ اس کے حق میں دعائے خیر کردیں چونکہ شیخ بڑے ولی کامل تھے۔

شیخ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے سامنے کتاب میزان پڑھوں۔ یہ عرض فرما کر کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کردیا۔ شیخ نے (بدان اسعدالله تعالی فی الدارین) جملہ پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا تجھے دین ودنیا میں نیک بخت کرے۔ بادشاہ نے اس جملہ کی تکرار کی درخواست کی شیخ نے پھر اس جملہ کو تین مرتبہ پڑھا۔ اس کے بعد سلطان نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور شیخ کی اس بات کو فالِ نیک پر محمول کیا اور وہاں سے رخصت ہوا۔

سنبھل کو معراجِ ارتقاء

جب کہ آگرہ شہر کی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی اس وقت سنبھل مقام عروج پر تھا۔ دارالسلطنت کا شرف حاصل تھا سلطان سکندر لودھی نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور سنبھل کے بعد دارالخلافہ بنایا۔ چونکہ سلطان کا بہت سا وقت افغانی امراء اور راجپوتوں سے لڑائی میں گزرا جب سکندر ۱۴۹۳ء میں کٹیاروں کی بغاوت فرو کرنے کیلئے سنبھل پہونچا تو سنبھل کا ماحول اور آب وہوا پسند آئی تو اس نے ۱۵۰۰ء میں سنبھل کو دارالحکومت بنایا۔ اور جب تک آگرہ میں اس کا محل تیار نہیں ہوا چار سال تک یہاں حکمرانی کی۔ بہر حال دارالحکومت آگرہ منتقل کرنے کی خواہ کوئی بھی معقول وجہ رہی ہو لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ سنبھل اس وقت

سکندر لودھی کے لئے دہلی اور آگرہ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ دہلی اس وقت ایک شکستہ شہر کی صورت میں تھا اگر چہ ہمیشہ شاہوں اور راجاؤں کا منظورِ نظر رہا۔ ہر ایک نے دار السلطنت بنایا اور آج بھی ۱۹۹۰ء میں بہت سی قدیم عمارتیں شکستہ نظر آتی ہیں چونکہ مرورِ زمانہ سے ہر چیز تغیر پزیر ہوتی ہے۔ اور آگرہ اس وقت لودھی سلطنت کے جاہ حشم کے قابل نہ تھا۔ جب کہ سنبھل سکندر کیلئے نہ صرف آب وہوا کی وجہ سے منظورِ نظر تھا بلکہ سنبھل اور اس کے قرب وجوار میں شکار کافی مقدار میں ملتا تھا اور سلطان اس کا دلدادہ تھا۔ شاید یہ وجہ بھی ہو کہ سنبھل اسوقت میں پرتھوی راج چوہان کی تعمیر کردہ خوبصورت عمارتوں کی وجہ سے مشہور تھا چونکہ راجہ حجات چوہان نے جو قلعہ تعمیر کرایا تھا تو اس کی حفاظت کیلئے ہر چہار طرف ۶۳ چھوٹے قلعہ تعمیر کرائے گئے تھے۔ اس سے قبل راجہ حجات کا بڑا قلعہ تعمیر کردہ تھا بایں وجہ سنبھل کو شہرت حاصل تھی اور ہندو دھرم میں سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ سکندر نے دار السلطنت بنا کر اس میں چار چاند لگا دیئے۔ سلطان سکندر نے آگرہ کی بنیاد ڈالی اور اپنا محل تعمیر کرا کے دار السلطنت منتقل کیا۔

(آب کوثر۔ احسن التواریخ۔ سنبھل سروے۔ گلشنِ ابراہیمی)

سلطان سکندر لودھی کا انتقال

موت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ تمام تر تمناؤں، لذتوں، اور اقتدار کو ختم کرنے والی چیز موت ہے۔ بادشاہ کو ایک مہلک مرض ہوا۔ دنیا کو اپنے دستور کے موافق سکندر لودھی کو بھی آرام کی نیند سلانے کی خبر سنانی تھی۔ لہٰذا دن بدن مرض شدت اختیار کرتا گیا۔ بادشاہ نے کسی کو اپنا مرض نہ بتایا اور اسی حالت میں امورِ سلطنت انجام دیتا رہا اور دربارِ عام بھی کرتا رہا لیکن انجام کار مرض اتنا بڑھ گیا کہ بادشاہ کے حلق کے نیچے نوالہ کا جانا بھی دشوار ہو گیا۔ اور سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ اس حالت میں ذیقعدہ کی ۷ رتاریخ ۹۲۳ھ میں انتقال ہوا۔ اور راہی ملک عدم ہوا۔

سکندر کی دانشمندی

اس کی دانشمندی کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے دو بھائی جو تنگ دست و غریب کاشتکار تھے معاشی بدحالی کی وجہ سے دونوں بھائی فوج میں ملازم ہو کر کسی مہم پر فوج کے ہمراہ چلے گئے۔ جب جنگ کے اختتام پر بہت سامال و قیمتی کپڑے اور دو لعل ان کے ہاتھ آ گئے۔ آپس میں مشورہ کیا کہ اب یہ مال مل گیا ہے، زیادہ ہوس نہ کرنا چاہئے۔ اور گھر چل کر اطمینان کی زندگی بسر کی جائے۔ مگر بڑا بھائی نہ مانا۔ اس نے کہا کہ جب صرف ایک کی کوشش سے اتنا مال ہاتھ آ گیا تو آگے کوشش کر کے قسمت آزمانی چاہئے یہ سوچ کر سارا سامان دونوں بھائیوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ ایک ایک لعل بھی حصہ میں آیا۔ چھوٹا بھائی تو اسی مالِ غنیمت پر قناعت کر کے وطن جانے لگا تو بڑے بھائی نے اپنے حصہ کا مال غنیمت بھی اس کے سپرد کر دیا کہ یہ میری بیوی کو دیدینا چھوٹا بھائی جب سارا سامان لے کر گھر پہونچا تو اس کی نیت میں فرق آ گیا۔ اس نے لعل کے علاوہ سارا مال اپنی بھاوج کو دیدیا۔ جب بڑا بھائی دو سال کے بعد واپس آیا۔ بیوی سے وہ مال غنیمت طلب کیا کہ دکھاؤ۔ بیوی نے وہ سارا سامان لاکر سامنے رکھ دیا۔ اس مال میں لعل نہیں تھا، اس نے بیوی سے پوچھا کہ لعل کہاں ہے بیوی نے جواب دیا کہ تمہارے بھائی نے لعل دیا ہی نہیں تھا۔ بھائی کو دل شکنی ہوئی، چھوٹے بھائی سے کہا کہ لعل کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کی بیوی کو دیدیا تھا۔ بیوی نے برابر انکار کیا۔ اور دونوں بھائی بیوی کو چور سمجھتے۔ بیوی نے کہا اچھا میں کل جواب دوں گی۔ وہ عورت قاضی شہر کے یہاں فریاد لے کر پہونچی مگر قاضی نے کوئی خاص مدد نہ کی عورت مایوس ہو کر چلی آئی۔ کیوں کہ بھائیوں کی طرف سے جو گواہ تھے ان کی گواہی عورت کے خلاف ہوئی۔ اس وجہ سے عورت ناکام رہی۔ سکندر لودھی کو ان باتوں کی اطلاع ہوئی، اس نے عورت اور دونوں بھائیوں کو دربار میں طلب کیا اور کہا کہ موم پر لعل کی صحیح صحیح تصویر بنائیں اس پر گواہوں اور بھائیوں نے تصویر بنادی عورت سے بھی کہا گیا تو عورت نے تصویر بنانے سے انکار

کردیا۔ چونکہ جو چیز دیکھی نہیں اس کا نقشہ ذہن میں نہیں تو اس کی تصویر کس طرح اتار سکتی تھی ۔ اور گواہوں نے جو شکل بنائی تھی وہ بھی ان دونوں بھائیوں سے بالکل مختلف تھی ۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ گواہ جھوٹے ہیں ۔ بادشاہ نے ان تمام تصویروں کو اپنے پاس رکھا اور حکم دیا کہ گواہوں سے کہو اگر انہوں نے سچ نہ بولا تو جان سے جائیں گے ۔ جب گواہوں نے جان کا خطرہ دیکھا تو بادشاہ کو حقیقت حال سے آگاہ کردیا ۔ اس کے بعد چھوٹے بھائی پر بھی بہت سختی کی تب اس نے بھی بادشاہ کو ٹھیک بات بتادی ۔ غریب عورت پر جو الزام لگ رہا تھا اس طرح اس سے نجات پائی ۔ یہ سکندر لودھی کی حسن تدبیر وفراست کی مثال تھی ۔

سنبھل ابراہیم لودھی کے عہد میں!

ابراہیم لودھی اپنے باپ سلطان سکندر کے انتقال کے بعد تخت نشیں ہوا ۔ افغانی اعزاء سے وہ روش اور برتاؤ ترک کردیا جو باپ دادا نے کیا تھا ۔ جس کی وجہ سے افغانی امراء خلاف ہوگئے ۔ اور شہزادہ جلال بغاوت پر اتر آیا ۔ اور دوسری جانب بہادر خاں کرمانی اور دیگر امراء نے بھی لشکر کے ساتھ آگرہ کا قصد کیا ۔ ابراہیم کے عہدِ حکومت میں آگرہ کی سلطنت کو وہ استحکام نہ رہا ، جو سکندر کے عہد میں تھا دریا خاں کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا بہادر خاں جانشیں ہوا ۔ ابراہیم لودھی سے باغی ہوکر سنبھل پر قبضہ کیا اور اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا اور اپنے آپ کو سلطان محمد شاہ کے نام سے مشہور کیا ۔ اور دوسرے امراء جو ابراہیم سے منحرف ہوگئے تھے ۔ وہ سب محمد شاہ سے آملے اور محمد شاہ ایک لاکھ کی جمعیت کا مالک ہوا ۔ سنبھل سے بہار تک سب اس کی ملکیت میں شامل ہوگئے ۔

بہر نوع افغانی امراء لودھی کے عہد میں خود مختار ہوچکے تھے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان کی قوت بھی بڑھ گئی تھی ۔ اور بادشاہ سے منحرف رہے اور حسد کرتے تھے لودھی کی اطاعت نہیں کرتے ، لہٰذا ان کے انحراف اور غرور کی وجہ سے امورِ سلطنت

میں بہت بدانتظامی ہوگئی تھی۔ بابر نے ہندوستان فتح کرنے کا یہ بہترین موقع دیکھ کر چار مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا اور ناکام رہا لیکن پانچویں مرتبہ کامیابی نے اسکے قدم چومے۔ اور دارالسلطنت دہلی کا شہنشاہ بنا۔

سنبھل عہدِ مغلیہ میں!

حکومتِ مغلیہ کا بانی سلطان ظہیر الدین بابر ہے، جو تیمور کی نسل سے تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں ترکستان کے شہر فرغانہ میں تخت نشیں ہوا لیکن مخالفوں سے طویل کشمکش کے بعد اسے موروثی وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اول کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور ہندوستان پر ۹۲۵ھ میں یہ پہلا حملہ تھا۔ بابر شاہ نے دریائے سندھ کے کنارے تک اور پنجاب کے ایک بہت بڑے مشہور پرگنے تک اپنی فتح کو جاری رکھا۔ اور یہیں سے ایک پیغام ابراہیم لودھی کے پاس دے کر بھیجا کہ جن ممالک پر بابر شاہ نے قبضہ کیا ہے وہ زیادہ تر آل تیمور کی جائداد تھے۔ اس لئے یہی مناسب ہوگا کہ پرگنہ پہرہ اور اس کے گردونواح کے قصبوں کو بابر شاہ کے قبضہ میں دیدے۔ دوسرے حملہ میں لاہور کو فتح کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر دوسری طرف کا رُخ کرلیا تھا۔

پانچویں حملہ میں ۹۲۶ھ کے اندر پانی پت کے میدان میں بابر نے اور ابراہیم لودھی نے اپنی اپنی فوجیں مرتب کیں اور صف آرا ہوئے اور لودھی کی فوج نے پہلے معرکہ آرائی میں بہت تیزی دکھائی۔ لیکن رفتہ رفتہ قوت سلب ہوتی نظر آئی۔ خونریزی بڑھتی گئی۔ اور شام ہوتے ہوتے صرف تلواروں کی آوازیں آتی رہیں۔ زمین پر خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اس جنگ کا اختتام بابر کی فتح پر ہوا اور ابراہیم لودھی مع اپنے لشکر کے اس جنگ میں مارا گیا۔ (گلشن ابراہیمی، آبِ کوثر)

بابر آگے بڑھ کر دہلی پر قابض ہوگیا لیکن اس فتح سے پورا ہندوستان فتح نہ ہوا تھا۔

قاسم سنبھلی کی بغاوت

تزک بابری میں خود ظہیر الدین بابر رقمطراز ہے:

جب ظہیر الدین بابر ہندوستان آیا۔ تو اپنے باغیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

کہ پہلی بار جب ہم آگرہ آئے اس وقت ہمارے مجاہدین اور یہاں کے باشندوں کے درمیان بیحد نفرت وغیرت و بغض تھا۔ رعایا اور سپاہی ہمارے مجاہدین کی آواز سے کوسوں دور بھاگتے تھے تھوڑے ہی دن بیتنے پائے تھے کہ دھلی، آگرہ اور دیگر مقامات کے لوگوں نے جہاں اپنے اپنے قلعہ محفوظ کر لئے تھے اور کسی کی اطاعت قبول نہ کی اور سب آمادۂ فساد ہو گئے۔ انہیں میں سے سنبھل میں قاسم سنبھلی نے، سیانہ میں نظام خاں نے، میوات میں حسن خاں میواتی نے، علم بغاوت بلند کیا۔ قنوج اور گنگا کے اطراف کا پورا ملک پٹھانوں کے قبضہ میں تھا۔ آگے رقمطراز ہے کہ قاسم سنبھل کی بغاوت کو دبانے کیلئے ہم نے اپنے امراء سے مشورہ کیا سنبھل کی جانب ہندو بیگ، ملک قاسم، کتا بیگ، اور کوکلتاس کو مع اس کے بھائیوں کے بھیجا۔ (سنبھل سروے، گلشن ابراہیمی، تزک بابری)

ان ہی دنوں میں خان افغان نے سنبھل کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا، قاسم سنبھلی نے بادشاہ سے اپنی اطاعت کا اظہار کیا اور مدد کی درخواست کی مذکورہ امراء دریائے جمنا کو عبور کر کے ببن خان افغانی سے جاٹکرائے اور ببن خاں کو شکست دی، اور حدود سنبھل سے باہر نکال دیا۔ قاسم سنبھلی نے اس احسان کے بدلے میں قلعہ کو کوکلتاس کے سپرد کر دیا اور خود بابر کی اطاعت قبول کر کے امراء میں شامل ہو گیا۔ ظہیر الدین بابر نے سنبھل شہر کو شہزادہ ہمایوں کے سپرد کیا۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ لودھی کے عہد میں بدانتظامی اور امراء کا انحراف وغرور اور مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے ہر جگہ کے صوبہ دار خود مختار ہو بیٹھے تھے۔

(گلشن ابراہیمی)

اس فتح کے بعد بابر کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سنبھل میں بغاوت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ یہی حال کول، راپری اور افغانوں کا تھا۔ وہ امیر و راجہ جو شہنشاہ کے دربار میں اطاعت گزاری کی حیثیت سے حاضر ہوتے تھے۔ اب اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اور ہر صوبہ میں رئیس باغی ہونے لگے تھے۔ چونکہ ہندوستان کے باشندے مغلوں کی حکومت و سیاست سے ڈرے ہوئے تھے اس لئے ظہیر الدین، بابر کے ابتدائی حالت و ایام میں اطاعت گزاری کی طرف مائل نہ ہوئے۔ بلکہ ہر ایک اپنی ساکھ برقرار رکھنے کیلئے پوری طرح بادشاہ کی مخالفت میں تھا۔ اگرچہ امراء ابراہیم لودھیؒ کے فرمانبردار بھی نہ تھے۔

خاندان مغلیہ

خاندانِ مغلیہ نے بڑے بڑے نامور بادشاہ پیدا کئے ہیں۔ لیکن بابر کی شخصیت میں ایک خاص دل کشی تھی۔ جو دوسرے مغلوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی ذات اسلامی تمدن کی امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے کہ اسلامی عقیدت میں ایک ہی شخص بیک وقت صاحب قلم و سیف ہے۔ بابر ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہیں تھا بلکہ وہ فارسی اور ترکی کا عمدہ شاعر بھی تھا۔ اس کی لکھی ہوئی تزک بابری اپنی قسم کی ایک بے مثال کتاب ہے۔ اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دل چسپ مرقع ہے۔ تزک بابری کی تصنیف کے علاوہ بابر خط بابری کا موجد تھا۔ اور اس طرز تحریر میں اس نے کلام مجید کے کئی نسخے لکھ کر مکۃ المکرمہ بھجوائے۔ اسے ہندوستان میں زیادہ دن رہنے کا موقع نہیں ملا۔ کیوں کہ بابر کی زندگی ہندوستان میں بہت ہی مختصر مگر طوفانی تھی۔ (گلشن ابراہیمی، رود کوثر)

لیکن اس نے اپنی فطری ذہانت سے جلد ہی یہاں کی خصوصیات پالیں۔ اس نے اپنے لئے ہمایوں کو جو وصیت لکھی اس سے اس کی دانشمندی، انصاف پسندی، اور مدبرانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

وفات: ۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات ہوئی۔

ہندوستان کی کہانی بابر کے قلم سے

بابر اپنی کتاب واقعات بابری میں رقمطراز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے بعد اس وقت تک یعنی میری آمد تک تین فرمانروائے اسلام ہندوستان آئے اور قبضہ کیا۔

(۱) سلطان محمود غزنوی جب انھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا وہ اس وقت چند جگہوں کا حاکم بھی تھا اور اس کے ساتھ غزنی کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ تھی۔ اور یہاں کوئی عظیم الشان بادشاہ نہ تھا۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے راجہ حکومت کر رہے تھے بایں وجہ ہندوستان کی حالت بھی بہتر نہ تھی۔

(۲) سلطان شہاب الدین غوری ہیں۔ یہ بھی اپنے ہمراہ ایک لاکھ بیس ہزار سوار لیکر آئے۔ اگر چہ یہ کہیں کے بادشاہ نہ تھے لیکن ان کا بھائی خراسان کا بادشاہ تھا۔ سلطان محموغزنوی کی طرح ہندوستان غوری کے وقت میں بھی طوائف الملو کی تھی۔

(۳) لیکن جب میں پہلی بار ہندوستان آیا ہوں تو دو ڈیڑھ ہزار سوار میرے ہم کاب تھے اگر چہ بدخشاں کابل، قندھار، کی حکومت میری تھی لیکن ان شہروں سے نصف خراج مجھ تک نہیں پہونچتا تھا۔ دوسری طرف مملکت کے بعض حصے ایسے تھے کہ دشمن کے قریب ہونے کی وجہ سے خود مدد کے محتاج تھے۔ پہرہ سے بہار تک افغانوں کا تسلط تھا۔ ہندوستان کی طاقت دیکھتے ہوئے میرے ساتھ پانچ لاکھ فوج ہونی چاہئے تھی۔ دوسری طرف عظیم الشان بادشاہ تھا بہت بڑی فوجی طاقت کا مالک تھا۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مقابلہ میں اوزبک جیسے زبردست حریف کو اپنے پیچھے چھوڑ کر ابراہیم لودھی جیسے خونخوار دشمن سے ٹکر لی۔ اور ان مشکلات کے باوجود مجھے کامیابی ہوئی میں اپنی کوشش اور جدوجہد کے نتیجہ میں فتح نہیں سمجھتا۔ محض خدا کی عنایت وکرم سے فتح نصیب ہوئی۔ یہ میرا ایمان ہے۔ (گلشن ابراہیمی)

سرزمینِ سنبھل پر بابر کی آمد

ظہیر الدین بابر کو ہندوستان آ کر کافی جدوجہد اور آلام ومصائب نیز پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا چونکہ ایک خاص اکثریت بغاوت پر تُلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف بغاوت کے بازار گرم تھے۔ اور عوام حکومتِ مغلیہ کی سخت مخالف تھی۔ جب بابر کو فتح حاصل ہوئی اور غازی کا لقب ملا، تو آگرہ واپسی سے قبل بابر نے باغیوں وسرکشوں کی سرکوبی کے لئے امراء کو مامور کر کے روانہ کیا اور ۹ رذی الحجہ ۹۴۳ھ میں کول اور سنبھل کیلئے روانہ ہوا۔ سنبھل کے اطراف میں چونکہ شکار کافی تعداد میں ملتا تھا۔ اور سنبھل کی آب وہوا سیر وتفریح کیلئے موزوں، اور جنگی لحاظ سے ایک محفوظ جگہ تھی۔ بابر نے سنبھل کے مختصر دورانِ قیام میں ایک عالی شان جامع مسجد کی مرمت کرائی۔ اگرچہ کتبات تعمیر کی خبر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے کتباتِ تاریخ شاہد ہیں۔

افتادہ زمین ۹۳۳ھ

(احسن التواریخ، گلشن ابراہیمی)

مقدمہ جامع مسجد سنبھل

سنبھل میں جہاں بے شمار آثار قدیمہ اور تاریخی عمارتیں اور نادر چیزیں موجود ہیں ان میں سے ایک جامع مسجد سنبھل محلّہ کوٹ میں ہے دوسری مساجد کی طرح اس میں بھی پنجوقتہ نماز، نمازِ جمعہ وعیدین ادا کی جاتی ہیں۔ اور باقاعدہ امام اور مؤذن مقرر رہتے ہیں اس کی عمارت مسجد ہی کے طرز پر ہے یعنی پچھم کی سمت کی تعمیر ہے، ابتدا ہی سے یہ مسجد بنائی گئی اسکے مسجد ہونے پر سر کی آنکھیں شاہد ہیں لیکن برادران وطن اہل شہر سنبھل کے نزدیک جامع مسجد کا مسئلہ اہمیت کا حامل ہے۔ اہل شہر سنبھل کے باشندوں میں ملکی پیمانہ پر یہ بات مشہور ہے کہ یہ جامع مسجد بابر ظہیر الدین کی تعمیر کردہ ہے۔ نیز فریقین اور ہر طبقہ کے لوگ اس کے قائل ہیں۔ اور چند مؤرخین حضرات جیسے

صاحب احسن التواریخ، صاحب تاریخ امروہہ، صاحب علم وعمل صاحب کتاب سنبھل سروے، مخلص وغیرہ نے بھی بابر کی تعمیر لکھی ہے۔ اسی سلسلہ میں جہاں تک میری رسائی ہوئی ہے اور مجھے معلومات فراہم ہوئیں اور دلائل عقلیہ ونقلیہ جمع کئے وہ ناظرین حضرات کے پیش خدمت ہیں اور اس میں چند بحثیں ہیں۔

(۱) ظہیر الدین بابر کے سنبھل آنے میں شک نہیں۔ اس کا سنبھل آنا روز روشن کی طرح واضح ہے۔ متعدد مؤرخین نے اس کے سنبھل آنے کو لکھا ہے۔

(۲) ظہیر الدین بابر کو ہندوستان فتح کرنے کے بعد ملک میں صرف ۴ سال حکومت کرنے کا موقع ملا، اس کی زندگی نے زیادہ ساتھ نہیں دیا۔

(۳) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اور عقل باور نہیں کرتی کہ بابر نے تھوڑی مختصر سی مدت میں ملک بھر میں تعمیرات کرادیں اور سنبھل کی جامع مسجد کی بھی تعمیر کرائی۔

(۴) ہاں بابر ظہیر الدین کا جامع مسجد کی مرمت کرانا قرین قیاس ہے اور عقل اس کو باور کرتی ہے۔ اس مرمت کو مؤرخین نے تعمیر سے تعبیر کردیا اور یہی بات عوام وخواص میں شہرت پاگئی۔

(۵) یہی قریب تر ہے کہ ظہیر الدین بابر نے جامع مسجد سنبھل کی مرمت کرائی، مرمت کو تعمیر سے بیان کیا گیا (مثال سے واضح ہوتا ہے) جیسا کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد کی، حالانکہ مشہور یہ ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمانؑ نے کی بلکہ مرمت یعنی تعمیر ثانی کی جس کو تعمیر سے تعبیر کیا گیا۔ اور جیسا کہ مشہور ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ نے کی جب کہ ان دونوں حضرات نے تعمیر ثانی کی اور اول تعمیر حضرت آدمؑ نے کی ہے۔

(۶) اسی طرح یہ تعمیر ظہیر الدین بابر کی نہیں بلکہ بابر نے مرمت کرائی اسی مرمت کو تعمیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۷) یہ قدیم تعمیر ہے۔ جو بابر کے عہد سے پہلے بھی موجود تھی۔ کیوں کہ یہاں پہلے سے مسلمان آباد تھے، بابر کے آنے سے قبل قاسم سنبھلی، سنبھل کا حاکم تھا اسی نے بابر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جس کا تفصیلی ذکر پڑھ چکے ہیں، سنبھل علم کا گہوارہ تھا سکندر لودھی نے چار سال تک سنبھل کو دار السلطنت قرار دیا تھا، یہ فارسی، عربی کا مرکز تھا، جامع مسجد کی یہ تعمیر بابر کی آمد سے پہلی تعمیر ہے۔

(۸) اس شہر میں مسلمان سلاطین کی آمد سے اکثریت میں رہے ہیں اور آج بھی ہیں یہاں کے مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ کوئی مسجد ہو، لہٰذا یہ مسجد پہلے سے تھی اور بعد میں بابر نے ترقی دی، مغلیہ دور حکومت میں سنبھل کو معراج ارتقاء حاصل ہوئی اور مغلیہ حکومت میں سنبھل کو مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔

(۹) نیز یہ تعمیر مغلیہ طرز کی نہیں ہے۔

(۱۰) البتہ بابر ظہیر الدین نے اپنی آمد پر مزید کام کرا کے زینت بخشی اور تکمیل کی جیسا کہ رستم خاں دکنی جو شاہ جہاں کے عہد سے سنبھل کے ۲۵ سال تک گورنر رہے۔ انہوں نے بھی مسجد کی مرمت کرائی اور مشرقی بڑا دروازہ بھی انہی کی تعمیر کردہ یادگار ہے۔

(۱۱) یہ کہنا کہ بابر نے مندر توڑ کر مسجد تعمیر کرائی یہ بے بنیاد اور تاریخی حقیقت سے بعید ہے۔

رہی یہ بات کہ یہ مسجد کس مقام و جگہ پر تعمیر ہے اور کس نے کرائی۔

(۱) پہلی بات کی وضاحت کہ مسجد کس جگہ پر تعمیر ہوئی، ہم صاف الفاظ میں اوّلاً یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ مندر نہیں تھا۔

(۲) دلیل، اس جامع مسجد کی جگہ پرتھوی راج کا محل تھا۔ اب افتادہ زمین پڑی تھی جب سلاطین اسلام کی آمد ہوئی اور مسلمانوں کو تسلط حاصل ہوا تو چونکہ یہ جگہ شہر میں بلند اور اونچی جگہ تھی اسی پر جامع مسجد کی تعمیر کی گئی۔

(۳) یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس جگہ کسی کونے یا قرب و جوار میں چھوٹا سا مندر ہو پرتھوی راج نے اپنے محل کیلئے اس جگہ کو منتخب کر کے اپنا محل تعمیر کرایا اور اس کے عوض میں رانی والا مندر بنوادیا جو آج بھی موجود ہے۔

(۴) اس جگہ مندر نہیں تھا کیوں کہ مندر کیلئے طواف (گھومنے کی جگہ) بھی ہوتی ہے اس میں کوئی جگہ گھومنے کی نہیں ہے۔

(۵) مندر کی عمارت اس انداز کی چوکور نہیں ہوتی۔

(۶) ہاں مسجد ہی کی عمارت چوکور ہوتی ہے اور مغرب کی سمت میں ہوتی ہے۔

(۷) موجودہ مسجد کی تعمیر زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ یہ مسجد ابتداء ہی سے بلند اور اونچی جگہ پر تعمیر ہے جیسا کہ مساجد کی تعمیر میں لحاظ کیا جاتا ہے اور اس کا مغرب سمت میں تعمیر ہونا شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کوئی بھی مندر نہ تھا۔

تاریخ جامع مسجد

۷۷۲ھ میں شاہ تغلق نے مسجد کی تعمیر کرائی ہے اور ظہیر الدین بابر نے ۹۳۲ھ میں توسیع کرائی۔

ظہیر الدین بابر اور جامع مسجد

ظہیر الدین بابر حکومتِ مغلیہ کا پہلا بادشاہ ہے۔ ابتدائی دورِ حکومت میں سنبھل آیا۔ مغلیہ دورِ حکومت میں سنبھل کو معراج ارتقا کا مقام حاصل تھا۔ اور اسے مغلیہ دورِ حکومت میں ایک بلند مقام حاصل رہا ہے۔ ظہیر الدین بابر نے سنبھل میں جامع مسجد کی مرمت کرائی جس کے کتبات اس کی روشن دلیل ہیں۔

ہندوستان میں صدیوں سے مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ اور یہی یہاں کی گنگا جمنی، تہذیب کہلاتی ہے۔ ہم یہاں صدیوں سے ایک دوسرے کے غم، اور خوشی

میں برابر شریک ہوتے رہے ہیں۔

مسلم حکمرانوں کی فوج میں ہندوستانی سپاہی، اور سپہ سالار بھی رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے حکمرانوں کو پوری وفاداری کا ثبوت دیا۔

اکبر اعظم کی حکومت کو مستحکم بنانے میں راجہ مان سنگھ اور دیگر راجپوتوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح ہندو راجاؤں کے یہاں مسلمان بھی فوج میں تھے اور سپہ سالار بھی ہوئے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے وفاداری کا ثبوت دیا۔

ہندوستان میں برٹش دورِ حکومت سے پہلے ہندو مسلم فساد، اور فرقہ واریت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اور نہ ہی تاریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ ایک ریاست کے دوسری ریاست سے، ایک راجہ کے دوسرے راجہ سے اقتدار کی جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ اورنگ زیب کے ظالم ہونے کی بات کرتے ہیں، انہیں حقیقت کا صحیح علم نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا بیج انگریز مؤرخوں نے بویا۔ ایسی کئی شہادتیں، بلکہ تحریری ثبوت موجود ہیں۔ کہ اورنگ زیب نے کئی مندروں کو جائیدادیں دی ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے مندروں کو منہدم کر کے مسجدیں تعمیر کروائیں کیا وہ لوگ اپنے گریبان میں جھانکنا گوارہ کریں گے۔

ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے گورنر اڑیسہ نے اپنے مضمون "ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات" میں تفصیل سے گفتگو کی ہے، ہم اس مضمون کے کچھ اقتباسات آگے دیں گے۔

جب سے اس ملک کے اقتدار کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں آئی، انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعصب کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے نصاب میں تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کی حکومت مستحکم ہو سکے۔

اور انہوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلم حکمران ظالم اور جابر تھے۔ خود کو

مستحکم کرنے کے لئے انگریزوں نے مذکورہ طریقہ کار اپنایا تھا۔

جب کہ مسلم حکمرانوں کا عدل وانصاف ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہے۔

"کھلی کتاب تھے ہم کو پڑھا نہیں تم نے"

جن مؤرخوں میں تعصب نہیں تھا انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔اور مسلم حکمرانوں کے عدل وانصاف کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ظہیر الدین بابر نے اپنی زندگی کا چراغ گل ہونے سے قبل اپنے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کے نام جو وصیت لکھی تھی اس سے اس کے عدل وانصاف، اور اپنے رعایا سے خلوص ومحبت کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔بابر لکھتا ہے:

فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔اور یہ اللہ ربُّ العزت کی بڑی عنایت اور نوازش ہے کہ اس نے مجھے اس ملک کا بادشاہ بنایا۔ میرے بعد حکومت کی لگام جب تمہارے ہاتھ میں آئے تو تم مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا۔

(۱) تم مذہبی تعصب کو دل میں ہرگز جگہ نہ دوگے۔اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو کسی طرح کی ٹھیس نہیں پہونچاؤ گے، نیز ان کی مذہبی رسومات کا خیال رکھتے ہوئے ہر ایک کے ساتھ انصاف کروگے۔

(۲) گاؤکشی سے رعایا کی دلجوئی کے لئے پرہیز کروگے۔

(۳) اسلام کی اشاعت، خلوص ومحبت ہی سے بہتر ہو سکتی ہے، دوسری طرف اسلام میں حقوق کی ادائیگی ضروری ہے۔اور ہر ایک قوم ومذہب کے ماننے والوں کو عدل وانصاف کا حکم دیتا ہے۔ (حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق)

اب آپ سمجھئے کہ بابر مذہب کا کتنا پابند تھا۔اس نے سنبھل آکر افتادہ زمین کوٹ پر جامع مسجد کی مرمت کرائی، مندر کو منہدم کر کے ہرگز ایسا نہیں کیا گیا، اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

دلیل اول:

اسلام واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی بھی متنازع یا ناجائز زمین پر مسجد تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اور ایسی مسجد میں نماز پڑھنا درست نہیں ہے، نمازی ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ لہٰذا اسلام کے ان قوانین کو جانتے ہوئے بابر کا مندر منہدم کر کے مسجد تعمیر کرانا بعید از قیاس ہے۔ اور یہ ایک انصاف پسند حاکم پر سراسر الزام ہے اس طرح کے الزام تراش کر اہلِ وطن میں تعصب اور نفرت کی آگ کو ہوا دینا ہے۔

دلیل دوم:

سنبھل میں اس جامع مسجد کے علاوہ دوسری جامع مسجد نہیں ہے جب کہ ہر شہر میں جامع مسجد ہوتی ہے۔

دلیل سوم:

اس مسجد پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ۱۸۷۸ء میں مقدمات ہو چکے ہیں اور فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا ہے۔

بابر نے بذات خود کچھ ایام سنبھل میں قیام کیا۔ (تاریخ امروہہ ص ۴۴) ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ء میں ہمایوں سنبھل میں تھا جب کہ بابر کا انتقال ہو گیا۔

دلیل چہارم:

ہندوستان جب سے غلامی کی بیڑیاں توڑ کر آزاد ہوا ہے، ان بیڑیوں کو توڑنے میں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں نے بھی مل کر ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اور یہ آپسی تال میل ہی کی وجہ تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

دلیل پنجم:

جب ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا تو آئین میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ تاریخی عمارات، مساجد اور مندر جو جہاں ہیں اور جس پوزیشن میں ہیں اپنی اصل حالت پر قائم رہیں گے۔

تقسیم وطن کے بعد آج بھی پاکستان میں، مندر، گردوارے، جہاں تھے اپنی اسی حالت میں قائم ہیں اور حکومت ان کی نگراں ہے۔ آج بھی سکھ زائرین اپنے گردوارے کی زیارت کے لئے ہر سال پاکستان جاتے ہیں۔

دلیل ششم:

اس ملک میں آج تک کوئی عمارت ایسی نہیں ہے جو مشترکہ طور پر دونوں مذاہب (ہندو مسلمان) کے لوگ اپنی اپنی مرضی کے مطابق عبادت کر سکیں۔ ایسی مشترکہ عبادت کی جگہ نہ ہے اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

دلیل ھفتم:

جب سے اس جامع مسجد کی ظہیر الدین بابر نے مرمت کرائی، اس وقت سے مسلمان اس میں آزادانہ ماحول میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتے آئے ہیں۔ شاہی امام کا خاندان آج بھی موجود ہے اور اسی خاندان کے ایک فرد قاری عبد الباسط صاحب اس مسجد کے امام ہیں۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ

۱۸۷۸ء میں جامع مسجد پر ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔ مدعی اور مدعا علیہ کون تھے، مدعی نے کیا دعویٰ کیا تھا اور مدعا علیہ نے کیا جواب دیا، گواہان کون تھے اور کیا بیانات دیئے، ہم اس بحث کو ترک کرتے ہوئے ہائی کورٹ کے فیصلے کی نقل درج کر رہے ہیں۔

۲۶ رمئی ۱۸۷۹ء ہائی کورٹ کا فیصلہ، اپیل نمبر ۱۱۲

۱۸۷۸ء چھیدا سنگھ مدعا علیہ اپیلانٹ، بنام محمد افضل بار مدعی اسپاڈنٹ

یہ مضحکہ خیز مقدمہ ہے اگر اپیلانٹ کو نیک صلاح دی جاتی تو یہ مقدمہ اس عدالت میں ہرگز نہ آتا۔ اس امر کی کثیر شہادتیں موجود ہیں کہ یہ عمارت طویل زمانہ سے بطور اسلامی مسجد کے استعمال کی جا رہی ہے۔ اور ہندو اپیلانٹ کا یہ عذر کہ ہندو اس کو بوقتِ ضرورت

بلامخالفت مسلمان اس کو استعمال کرتے ہیں اس قدر لغو ہے کہ قابلِ توجیہ نہیں۔اس کے متعلق جج کی یہ رائے بلاشبہ صحیح ہے کہ ایسی کوئی عمارت نہیں ہوسکتی جس کو مسلمان اور ہندو دونوں عبادت کی غرض سے استعمال کرسکیں۔نہ ایسا کبھی سنا گیا ہے اور نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے۔جج نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ ہندوؤں کا یہ دعویٰ شہادت سے قطعی طور پر باطل ہوتا ہے۔یہ اپیل ہرگز دائر نہیں ہونی چاہئے تھی۔اور اس کے یہاں رجوع کرنے میں کونسل اور وکیل اپیلانٹ نے اپنے فرائضِ منصبی میں سخت غفلت کی ہے۔

اپیل ہذا کے خلاف مذکورہ بالا رائے کا اظہار کرتے ہوئے ہم اس کو مع کل اخراجاتِ عدالت خارج کرتے ہیں۔

دستخط

(سر، آر، اسٹوارٹ، چیف جسٹس ہائی کورٹ)

ان امور پر جو مقدمہ ہذا میں فریقین کے بیانات سے پیدا ہوئے اور جن کو عدالت نے تجویز کیا ہے۔ہمیں عدالت کا فیصلہ قانونی طور پر صحیح اور شہادت کے موافق معلوم ہوتا ہے اور موجباتِ اپیل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔جس کی بناء پر ہم ڈگری مصدورہ عدالت صاحب جج ضلع بحق مدعی میں کوئی دخل اندازی کرسکیں۔

لہٰذا اپیل مع اخراجات کے ڈسمس کی جاتی ہے۔

دستخط

(مسٹر، الیف، جی پیر حسن، جج ہائی کورٹ) (از احسن التواریخ)

دلیل اول: مذاہب ومعابد کی حفاظت:

آج ہندوستان میں مذاہب ومعابد وعبادت گاہوں کی نہ حفاظت ہے اور نہ باہم قوموں میں ادب واحترام ہے جب کہ ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ اس ملک کے باشندے باہم محبت واحترام کے ساتھ رہتے تھے۔اور ہر قوم ومذہب کے ماننے والوں کی جان وآبرو ومال محفوظ تھا اور جملہ مذاہب کے عبادت خانوں کی حفاظت تھی۔

نیز سلاطین اسلام کا طریقہ جاری تھا کہ بلالحاظ رعایا و عقیدوں کے ان کو جاگیریں اور جائدادیں وقف کرتے رہے ہیں۔ اورنگ زیبؒ کو شدید متعصب بادشاہ کہا جاتا ہے اور انگریزوں نے ان کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کیں اور تعصب کی آگ بھڑکائی۔ جب کہ تاریخ اور ان کے فرمان شاہد ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ اورنگ زیب نے بعض مندروں کے لئے جائدادیں وقف کیں۔

شہنشاہ اورنگ زیبؒ کے متعلق مولانا طفیل احمد صاحب روشن مستقبل صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ:

ایک شخص نے انہیں عرضی پیش کی جس میں لکھا تھا کہ تنخواہ تقسیم کرنے والے دونوں افسر آتش پرست و پارسی ہیں انہیں برخاست کر دیا جائے۔ سلطان کی طرف سے جواب ملا کہ سلطنت کے کاروبار میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہئے۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور ہندوؤں کو گورنر، جنرل، وائسرائے کے عہدوں پر فائز کیا گیا۔ یہاں تک کہ افغانستان جو خالص اسلامی صوبہ تھا اس پر بھی ہندو کو نائب دار السلطنت مقرر کیا گیا جو راجپوت تھا۔ (روشن مستقبل ص ۳۶) شہنشاہ اورنگ زیب کا اپنے عہد میں اس طرح کا طرز عمل رہا اور اس طرح کے ہزار ہا واقعات ہیں اسکے باوجود ان پر ایک متعصب بادشاہ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

دلیل دوم ۲: ہندوستان میں قومی یک جہتی کی روایات:

ڈاکٹر بشمبھر ناتھ گورنر اڑیسہ رقمطراز ہیں:

مسلم حکمرانوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی حکومتوں میں ہندوؤں کے مندروں اور دھرم شالاؤں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ برنڈوں گوردھن اور متھرا کے مندروں کو شاہی خزانے سے مدد ملی جاتی تھی۔ متھرا ضلع کے گوردھن میں پری دیوجی کا مندر ہے یہ

۱۵۰۰ء میں بنا۔ احمد شاہ کے ایک دستخطی فرمان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کی امداد سے مندروں کو خرچ کیلئے روپیہ ملتا تھا۔ اکبر آباد کے صوبہ اچھیز اقصبے کے کسانوں اور زمیں داروں کے نام۔ احمد شاہ کے فرمان ملتے ہیں۔

دلیل سوم ۳:

اس فرمان کے ذریعہ سترہ بیگھا زمین بنالگان مندر کے پجاری شیتل داس بیراگی کے نام دو دو ماہ میں دیجاتی ہے جس سے وہ دیوتا کے بھاگ اور ٹھاکر جی کا خرچ برداشت کر کے اس زمین کی مال گزاری بیراگی جی کے لئے منظور کی جاتی ہے۔ جس سے وہ ٹھاکر جی کیلئے ضروری چیزیں خرید سکیں۔ ارچھیز ابازار کے چودھری کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ایک گاڑی اناج پر پاؤ سیر ٹھاکر جی کے لئے رکھ لیا جائے وہ بیراگی جی کو ضرور ملے۔ فرمان بتاریخ یکم رمضان ۱۱۳۹ھ شہنشاہ کی بلند تخت حکومت کا چھٹا سال فرمان ضلع آگرہ اچھیز ازسنگھ مندر کے لئے ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء احمد شاہ بادشاہ۔

دلیل چھارم ۴: حکم قرآنی

قرآن کے حکم کے مطابق یہ ہے کہ کسی مذہب کے عبادت خانہ کو منہدم کرنا ایک ظالمانہ فعل ہے۔

دلیل پنجم ۵: مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان عہد

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں شام و فلسطین کے عیسائی اسلامی مملکت میں شامل ہوئے اس وقت مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان جو عہد نامے لکھے گئے ان میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی درج تھا کہ ان کے گرجا میں رہائش خانہ نہ لے جائیں اور نہ ان کو ڈھایا جائے اور نہ ان میں کچھ کمی کی جائے۔

دلیل ششم ۶: ایک دیگر آیت جس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت

خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ڈھادیئے جائیں اور اللہ اسکی ضرور مدد کرتا ہے. جو اللہ کی مدد کرے بے شک اللہ زبردست ہے اور زور والا ہے۔
(سورہ حج)

بابر کے حالات میں مستند ترین ماخذ

ظہیر الدین بابر کے حالات میں مستند ترین ماخذ خود اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا روزنامچہ سوانح ہے. جو علمی حلقوں میں تزک بابری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ روزنامچہ بابر کے پورے حالات وسوانح حیات کو حاوی ہے. جس میں اس نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تفصیل سے قلم بند کردیا ہے حتی کہ وہ جن مقامات پر گیا ہے وہاں کے عوام کی حالت، جانوروں کی قسمیں، آب وہوا، باغات اور عمارتوں کا تذکرہ بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے اصل کتاب ترکی زبان میں ہے متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے بابرنامہ کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہوا نیز بابرنامہ کے نام سے ہی اردو زبان میں بھی ترجمہ ہے اب یہی انگریزی اور اردو کے دونوں ترجمہ تذکرہ نویسوں کے لئے ماخذ و مرجع کا کام دیتے ہیں۔

دلیل ھفتم:۷

کوئی بھی شخص اول سے آخر تک پڑھ جائے اسے کہیں بھی نہ ملے گا کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کرا کے مسجد تعمیر کرائی ہو۔

تزک بابری کے علاوہ دوسری کتب تاریخ، جیسے اکبرنامہ ابوالفضل، طبقات اکبری تالیف خواجہ نظام الدین احمد، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی، خلاصۃ التواریخ منشی سبحان رائے، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ. غرض کہ کسی بھی معاصر یا غیر معاصر مستند و معتبر تاریخ میں کسی مؤرخ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ بابر نے مندر ڈھا کر مسجد تعمیر کرائی ہو چونکہ مؤرخ حقیقت حال کو بیان کرتا ہے اگر ایسا ہوتا تو مؤرخ ضرور لکھتا۔

دلیل ہشتم: ۸

اس کے علاوہ بابر خود جیسے ذہن و مزاج کا حکمران ہے اس کے لحاظ سے یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی مذہبی عبادت گاہ پر غلط نگاہ ڈالے گا اس کے مزاج کو سمجھنے کے لئے وہ وصیت نامہ جو گزر چکا ہے کافی ہے۔

دلیل نہم: ۹

بابر مندر شکنی کے الزام سے قطعاً بری ہے چنانچہ پروفیسر شری رام شرما، اپنی مشہور کتاب مغل امپائر ان انڈیا میں پوری صفائی سے لکھتے ہیں کہ ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کیا یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لئے کی کہ وہ ہندو ہے۔

(صفحہ ۱۵۵ ایڈیشن ۱۹۴۵ء بحوالہ معارف فروری ۱۹۵۶ء)

دلیل دہم: ۱۰ کتبات بابری

آج کی دنیا میں کتبات کی جو اہمیت ہے وہ دانشور اور اہل علم سے مخفی نہیں آج حکومتیں ان کی فراہمی اور حفاظت پر کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں اور ان سے صرف عمارتوں ہی کی تاریخ معلوم نہیں کی جاتی بلکہ قوموں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں انہیں مستند ترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

دلیل یازدہم ۱۱: جامع مسجد سنبھل کے کتبات

دلیل دوازدہم ۱۲:

خلاصۃ التواریخ کے مؤرخ بتا کہ سجان رائے نے تھانیشور کے سالانہ ہندو میلے اور یہاں کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب سکندر لودھی نے اس میلے کو بند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو دربار کے مشہور مؤرخ اور عالم فاضل میاں عبداللہ لودھی نے اس بات کی زوردار مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مندروں کا گروانا اور ندی، تالاب کے کنارے پرانے زمانہ میں ہونے والے نہان کو بند کرنا قطعی غیر قانونی اور شریعت کے خلاف ہے۔

لکھا ہے کہ سکندر لودھی غصے سے لال ہو کر ایک ننگی تلوار لے کر یہ کہتا ہُوا ان کے اوپر جھپٹا کہ تو بت پرستوں کی طرف داری کرتا ہے۔ ان عالم صاحب نے یہ جواب دیا کہ میں بادشاہ سلامت کو شریعت کا فتویٰ بتا رہا تھا اب یہ آپ کی مرضی ہے چاہے مانیں یا نہ مانیں بادشاہ کے اوپر اس کا بڑا اثر پڑا اور اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور کبھی اس نے ہندو میلے کے بند کرانے کا ارادہ نہیں کیا۔

دلیل سیزدھم ۱۳:

قاضی مغیث الدین ایک کٹر قسم کا مورخ تھا جب اس نے علاؤالدین خلجی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہندوؤں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرے تو علاؤالدین خلجی نے جواب دیا کہ مولانا تم ایک بہت بڑے عالم ہو۔ دنیا کے تجربات کے لحاظ سے صفر ہو۔ میں بالکل پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ پر میں نے دنیا خوب دیکھی ہے میں وہ حکم جاری کرتا ہوں جس میں حکومت اور رعایا کا فائدہ سمجھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بات شریعت کے مطابق ہے یا خلاف، میں وہی حکم دیتا ہوں جو حکومت کیلئے اچھا ہو اور موقعہ کے مطابق سمجھتا ہوں۔ سلطان جلال الدین نے ہندوؤں کی طرف اپنے نرم رخ کو سختی میں بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔

دلیل چہاردھم ۱۴: سفرنامہ مخلص

مخلص نے اپنے سفرنامہ میں سنبھل کی جامع مسجد کو بابر کے عہد کی تعمیر بتائی ہے اگر چہ ہندو ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ وہ اس موضوع پر کچھ اور روشنی ڈالتا وہ لکھتا ہے کہ اس مسجد کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ سنبھل کے ایک نائب صوبہ دار دیا ناتھ سنگھ نے مسجد کے لئے حکماً شہر کے جاگیرداروں پر ٹیکس عائد کیا۔ نیز ۱۷۲۳ء میں قمر الدین اعتماد الدولہ نے اور ۱۷۷۷ء میں رائے دولت سنگھ نے بھی ایسے ہی احکام جاری کیے،

نیز مخلص لکھتا ہے کہ۔ چوں بابر بادشاہ بہندوستان مسلط شدند و سنبھل را بجا ہمایوں بادشاہ کہ درآنوقت نام نامی ایشاں ہمایوں میرزا بود عنایت نمودند۔ در زمان ایشاں بشہر سنبھل جامع مسجد تعمیر کردند۔ حالا ایں جامع مسجد شہر است۔ (سفرنامہ مخلص ص ۱۳۰)

سنبھل ہمایوں کے سائے میں

شہزادہ ہمایوں ظہیر الدین بابر کا بیٹا ہے ۴؍ذیقعدہ منگل کی شب ۹۱۳ھ کو دنیا کے شوروغل میں اپنی زندگی کی آنکھ کھولی اور تازہ ہواؤں کو اپنے سانسوں میں جذب کرلیا۔ سنِ ولادت کی تاریخ شاہ فیروز بخت شد تاریخی مصرعہ ہے۔ ہمایوں کو ناصر الدین کے لقب سے نوازا گیا۔ بابر نے اپنے دورِ اقتدار میں "بدخشاں" کی حکومت شہزادہ ہمایوں کے سپرد کردی تھی۔

جب بابر نے ہندوستان پر پانچویں مرتبہ حملہ کیا، اور ابراہیم لودھی جیسے طاقتور اور خونخوار بادشاہ سے پانی پت کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی اس وقت ہمایوں باپ کی مدد کیلئے "بدخشاں" سے ایک لاکھ فوج لے کر پہونچا۔ ۹۲۶ھ مطابق ۱۵۲۶ء میں بابر کو فتح نصیب ہوئی۔ اور جب اس فتح کے شادیانے چاروں طرف بجنے لگے تو اس مسرت وانبساط کی گھڑی میں شہزادہ ہمایوں کو سات لاکھ منکا انعام میں دیا گیا۔ اور پھر تقریباً دو ماہ گزرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسے انعامات سے نوازا گیا اور اب کی بار ایک چرقب، ایک تلوار، اور سونے کی کٹھاری والا گھوڑا دیا گیا۔ لیکن اس فتح کی خوشی میں جو سب سے بڑا انعام دیا گیا وہ تھا سنبھل کی حکومت جو فیروزہ جاگیر میں جولائی ۱۵۲۶ء میں شامل کی گئی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمایوں کو "بدخشان" کے انتظام کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن وہ دو ماہ سے زیادہ عرصہ تک وہاں نہیں رہ سکا۔ اور ۱۵۲۹ء میں آگرہ لوٹ آیا تھا۔

(گلشن ابراہیمی، ڈاکٹر اے، ایل)

ہمایوں چھ ماہ تک سنبھل مقیم رہا اور انتظام مملکت میں منہمک رہا۔ شدید گرمی کی تاب نہ لاکر ہمایوں قیام سنبھل کے دوران بیمار ہو گیا تھا۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ رانا سانگا جو ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ اور اس سے پہلے، اسلامی فتوحات سے جو راجہ تباہ ہوئے تھے وہ اسی قبیلے کے تھے۔ دو چار پشتوں کے بعد سلسلۂ نسب آپس میں مل جاتے ہیں۔ جب

رانا سانگا نے بابر پر حملہ کیا تھا تو اس وقت ایک لاکھ فوجی جوان اس کے ساتھ تھے۔

اور وہ امراء جو ابھی تک حلقۂ اطاعت میں شامل نہیں ہوئے تھے، مثلاً محمود خاں، راجہ چندیری، رائے دلیپ، حسن خاں میواتی وغیرہم، یہ سب ہی مل کر رانا سانگا کی مدد کیلئے پہونچے، یہ بھی تقریباً دولاکھ لشکر کے ساتھ بابر سے مقابلہ کر کے مغلوں سے ہندوستان کی حکومت چھیننے کیلئے آگرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب بابر اپنے معتمد علیہ اور امراء کو ہمراہ لے کر بیانہ کے نواح میں پہونچا تو دونوں فریقوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ شاہی فوج زخمی ہو کر شکست سے دوچار ہوئی۔

طرح طرح کے شبہات نے لوگوں کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور لوگ کافی سہم سے گئے اور ہیبت خاں نیازی نے سنبھل کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ کیوں کہ سنبھل اس لحاظ سے محفوظ مقام تھا۔ اور وہیں پناہ لی۔

اب پھر ایک نئے انقلاب نے جنم لیا۔ فوجوں کو دوبارہ تربیت دلائی گئی۔ اور پھر جنگ کیلئے میدان میں کود پڑے۔ فوجی جاہ و جلال سے زمین و آسمان لرز اُٹھے، اور پھر ہر ایک نے اپنے جوہر دکھائے، بارود کے آلات سے کام لیا گیا، دشمن کی ثابت قدمی اور استقلال کو شہنشاہِ اسلام ظہیر الدین بابر نے دیکھ کر ایک لشکر کے ہمراہ ایک ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن تاب نہ لا سکا۔ میدانِ جنگ سے دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے، اور ہندوؤں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ رانا سانگا کے علاوہ بڑے بڑے حکمراں جیسے حسین میواتی، اور دیگر راجہ اس جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد بابر غازی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور فتح بادشاہِ اسلام اس معرکہ کی تاریخ ہے۔

بابر کی علالت اور انتقال

بابر ۹۳۶ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۵۳۰ء میں سخت بیمار ہو گیا۔ جوں جوں علاج کیا گیا مرض

میں افاقہ کے بجائے اضافہ ہوتا گیا اور موت کے بے رحم ہاتھ ایک عظیم شخصیت کی طرف بڑھتے رہے، اور آخر کار زندگی پر موت نے فتح حاصل کرلی۔ زندگی نے اپنی ہار کو تسلیم کرلیا۔ اور جھلملاتی شمعِ حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ عوام ایک عظیم مدبّر سے محروم ہوگئے۔ آسمان وزمین نے آنسو بہائے، درودیوار نے گریہ وزاری کی، لوگوں نے صفِ ماتم بچھائی، لیکن سب بیکار، بے سود، ملک تو یتیم ہو چکا تھا۔

محمد قاسم کی تحقیق کے مطابق ان دنوں شہزادہ ہمایوں کالنجر کے قلعہ کی تسخیر کیلئے گیا ہوا تھا۔ لیکن دیگر مؤرخین کی رائے میں جیسے ڈاکٹر راما شنکر ارتھی نے اپنی کتاب ''دی مغل امپائر'' (ہمایوں) ''The, Mughal, Impire. Humayun'' میں لکھا ہے کہ ہمایوں اس دوران سنبھل واپس آ گیا تھا۔ اور اپنے والد کے آخری سانسوں تک سنبھل ہی میں قیام کیا۔ اور اسی طرح کی رائے، ج، ایم، شیلٹ نے ظاہر کی ہے۔ کہ ہمایوں صحت یاب ہوا اور سنبھل آیا۔ لیکن جب بابر کا مرض شدت اختیار کر گیا۔ اور زندگی سے مایوسی کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے تو پھر ہمایوں کو سنبھل سے آگرہ بلا لیا گیا۔

قابل مصنف کا پہلا جملہ تو تحقیق پر مبنی ہے، لیکن ان کا یہ کہنا کہ ہمایوں کو آگرہ بلایا گیا تھا یہ امر غور طلب ہے، کیونکہ ڈاکٹر راما شنکر ادتھی کے لکھنے کے مطابق ہمایوں نے اپنے والد کے انتقال کی خبر سنبھل ہی میں سنی تھی۔ جب کہ ہمایوں افغانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے پہونچا تھا۔ آگے چل کر بیان کیا ہے کہ ہمایوں کے سنبھل کے دورانِ قیام کسی طرح کی بغاوت اور گڑبڑ نہیں ہوئی۔ محمد قاسم آگے چل کر لکھتا ہے۔ کہ جب ہمایوں تخت نشینی کے بعد ۹۱۸ھ میں کالنجر کے قلعہ پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کیا۔

ایک اور مؤرخ لکھتا ہے کہ بابر کی وفات کے فوراً بعد ہمایوں کو تخت نشینی کیلئے خواجہ خلیفہ نے ایک پیغام سنبھل ہمایوں کو روانہ کیا کہ بابر کی وفات کو صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ لیکن دو ایک دن گذرنے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ شہنشاہ کی وفات کو

انتظام مملکت نیز امن کی خاطر راز میں رکھنا دوراندیشی کے خلاف ہے۔امیر رائش خاں نے یہ مشورہ دیا کہ کسی کو لال کپڑے پہنا کر ہاتھی پر بٹھا کے یہ اعلان کروادیا جائے کہ بابر درویش ہوگیا ہے اور کہتا ہے کہ اپنا تخت ہمایوں کو دیدیا جائے ،اس بابرنامہ کے مطابق اسکیم پر عمل کیا گیا۔۳۰ر دسمبر ۱۵۳۰ء میں ہمایوں آگرہ پہونچا۔

''ہمایوں کی تخت نشینی''

بابر کی وفات کے بعد ہمایوں آگرہ دارالسلطنت پر تخت نشیں ہوا،اور شاہی لقب نصیرالدین ہمایوں پایا۔ ملک میں اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔اور خطبہ پڑھا گیا،اور سنبھل کی حکمرانی کے لئے عسکری مرزا کو مقرر کیا گیا اُدھر ہمایوں کا بھائی کامران مرزا بادشاہ کو مبارکباد دینے اور مزاج پرسی کے بہانہ کر کے ہندوستان کی جانب روانہ ہوا،لیکن اسکے برعکس اس کا مقصد پنجاب پر قبضہ کرنا تھا۔ہمایوں نے اس کی بدنیتی کو اپنی صلح پسندانہ طبیعت کے پیش نظر اسے نظرانداز کردیا۔کامران قندھار اور کابل کا حاکم تو پہلے ہی سے تھا۔اب ہمایوں نے پنجاب پشاور کی حکومت کا فرمان لکھ کر اس کے نام روانہ کیا۔اس طرح اسے اقدام سے باز رکھا۔اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

(گلشن ابراہیمی، احسن التواریخ)

سنبھل پر ہمایوں کے دورِ اقتدار کے حالات معلوم نہیں ہوسکے تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ بابر کا ہمایوں کو سنبھل کی حکمرانی کے لئے بھیجنا اس علاقہ کی گڑبڑ اور اطاعت سے انحراف،اور بغاوت کو کچلنا تھا۔

ہمایوں کا سنبھل چھ ماہ قیام کرنا۔عدم انحراف اور اطاعت قبول کرنا اس بات کا مدلّل ثبوت ہے۔اور ہمایوں کو یہاں پریشانیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ نیز ہمایوں کے سنبھل قیام کا ایک باعث وہ علوم بھی تھے جن کا وہ دلدادہ تھا۔علمِ ریاضی،اور علم نجوم

میں اسے بڑی دلچسپی تھی اور اس میں اسے عبور حاصل تھا محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ اس نے عناصر اور آسمانوں کی مختلف صورتوں اور پردوں کے ساتھ کرۂ ارض کا ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ نقشہ کے ہر حصہ کو مناسب رنگوں سے مزین کیا تھا۔ اور آسمان کے مثل ستاروں کو ان کی جگہ نصب کر دیا تھا۔ اس طرح پورے ہفتہ کے لئے سات محفلیں ترتیب دی تھیں۔ جن میں اہل علم شریک ہوتے اور خود بھی محفل میں ہر روز شرکت کرتا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سنبھل سلطان سکندر لودھی کے عہد سے ہی علم کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے عالم سکندر کے عہد میں سنبھل آیا کرتے تھے، بہر حال سنبھل کا قیام ہمایوں کے لئے ایک طرح سے خوش بختی کا سبب ہوا۔ کہ بابر کی وفات کے بعد تخت نشینی کے لئے متوقع خانہ جنگیوں سے بچ گیا۔ جو اس کی عدم موجودگی میں ہوتیں۔ نیز ہمایوں انتظامی اور سیاسی امور میں اریہند بیگ سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اسے بہت رسوخ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ وزیر کو معزول کر سکتا تھا، وہ سنبھل میں ہمایوں کا نہ صرف مشیر خاص تھا بلکہ ایک فوجی جنرل بھی تھا۔ (تاریخ سنبھل سروے)

افغانی حکومت کی بنیاد

جب ہمایوں تخت نشیں ہوا تو اس کی عمر اس وقت قریب ۳۰ رسال تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ نرم دل، خوش اخلاق اور خلوص و محبت کا پیکر تھا۔ ادھر شیر شاہ افغانی نے بڑی شان و شوکت پیدا کر لی تھی ہمایوں سے جنگ پر آمادہ تھا۔ لیکن ہمایوں چونکہ نرم گو، اور با اخلاق تھا اس لئے اس نے اپنی مصلحت اور وقت کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صلح میں ہی عافیت سمجھی۔

شیر شاہ افغانی اور ہمایوں کے جن شرائط پر صلح ہوئی ان کے حوالہ سے اس نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں ان شرائط کا ہمیشہ پابند رہوں گا۔ اس عہد کے بعد ہمایوں اور مغل سپاہ کو اطمینان ہو گیا۔

اس کے دوسرے ہی دن ۶ ۹۴۶ھ میں شیر شاہ نے سارے عہد توڑ کر مغل لشکر پر حملہ کر دیا، چونکہ اس اچانک حملہ کی مغل سپاہ کو امید نہ تھی لہٰذا وہ اس حملہ کی تاب نہ لا سکے، اور اس کے بعد کئی مرتبہ شیر شاہ نے حملہ کیا۔ جنگ و جدال کے بازار گرم ہوئے۔ آخر کار شیر شاہ نے ۱۵۴۰ء میں اسے شکست دی۔ اور ہمایوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس کی نرم دلی، اس کے اخلاق سے سب ہی نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ اس کے بھائیوں نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ راجہ مالا یوں وغیرہ بھی عہد شکنی پر اتر آیا۔ بادشاہ سیستان، ہرات ہوتا ہوا ایران پہونچا اور شاہِ ایران کا مہمان بنا۔

شیر شاہ افغانی

شیر شاہ نے تخت دہلی کی باگ ڈور سنبھالی، تقریباً پندرہ سال تک افغانی برسرِ اقتدار رہے۔ شیر شاہ کا نام فرید خاں اور باپ کا نام حسن خاں تھا۔ اس نے خود پانچ سال تک تخت دہلی پر حکومت کی۔ یہ ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ بڑا قابل تھا۔ اور یہ اس کی قابلیت ہی تھی کہ ایک معمولی عہدے سے ترقی کرتا ہوا ہندوستان کا بادشاہ بن بیٹھا۔

اسے تخت دہلی پر صرف پانچ سال حکمرانی کرنا نصیب ہوا۔ اس عرصہ میں بھی اسے لڑائیوں سے فرصت نہ ملی لیکن اس تھوڑی سی مدت میں اس نے امورِ سلطنت میں نمایاں کام انجام دیئے۔ اس نے جونپور کے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی۔ سکندر نامہ، گلستاں، بوستاں، وغیرہ اسے زبانی یاد تھیں، فلسفے سے بھی واقف تھا۔ عربی میں کافیہ شرح کافیہ مصنفہ قاضی شہاب الدین پڑھ چکا تھا۔ قدیم سلاطین کی تاریخ کا شائق اور علماء و فضلاء کا قدرداں تھا۔ شیر شاہ ۱۵۴۵ء میں کالنجر کا محاصرہ کرتا ہوا مارا گیا موت نے اسے مہلت نہ دی۔ اس کی جگہ اسلام شاہ افغانی تخت نشیں ہوا۔ اس کا زمانہ بھی مختلف جھگڑوں میں گزرا ۱۵۴۵ء میں انتقال کر گیا تو مغلوں نے اس کے جانشیں سے تخت چھین لیا۔ اور ۱۵۵۵ء میں پھر سے ہمایوں دہلی اور آگرہ کا بادشاہ ہو گیا۔ (رود کوثر)

نواب اعتماد الملک سنبھلی

وطن سنبھل تھا اور شہر کے رؤساء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ جب شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان جنگ ہوئی تو اس وقت اعتماد الملک شیر شاہ کے ملازم نے ان معرکہ آرائیوں میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دے کر وفاداری کا ثبوت دیا۔ چنانچہ ایک معرکہ میں ان کا فرزند قتل ہو گیا نیز ذاتی قابلیت بھی رکھتا تھا۔ بایں وجہ مقربین میں شمار ہوا۔

شیر شاہ دہلی کا بادشاہ ہوا تو نواب الملک کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا، اور اعتماد الملک کے خطاب سے نوازا۔ ان کو وفاداری اور نیک طبیعت کے باعث آج تک یاد کیا جاتا ہے اور انکی قبر سنبھل میں پختہ گنبد میں تھی۔ لیکن اب وہ گنبد شکستہ ہو کر منہدم ہو چکا ہے۔

(احسن التواریخ)

خواص خاں

شیر شاہ بن حسن افغانی حکومت کا پہلا بادشاہ ہے۔ جو معمولی جاگیر سے ترقی کر کے دہلی کا تخت نشین ہوا۔ خود ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ خواص خاں، جو جودھپور کے قریب ایک جگہ خواص پور کا باشندہ شیر شاہ کا غلام تھا۔ جہاں شیر شاہ بڑا منتظم اور قابل حاکم تھا وہاں خواص خاں کی بھی بہادری و مردانگی کو اس کی فتوحات میں بڑا حصہ تھا۔ گویا اسی کی وجہ سے شیر شاہ کو ہندوستان کی عظیم سلطنت حاصل ہوئی۔ اعظم ہمایوں سے شیر شاہ نے حکومت چھینی۔

اعظم ہمایوں جب مقام لکنوتی میں چند ماہ سے آرام کے سانس لے رہا تھا وہ آگرہ اور میوات میں فساد برپا ہونے کی خبر سن کر آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ شیر شاہ نے ایک لشکر جرار لے کر مقام جوسا کے قریب اپنے ڈیرے ڈال دیئے۔ اور اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ہمایوں کی فوج اسکے ارادہ اور اپنی شامت انجام سے بے خبر تھی۔ شیر شاہ کی فوج نے غافل پا کر شب ہی میں یک لخت دھاوا بولا۔ اور صبح ہوتے ہی میدان میں اتر پڑی۔

ہمایوں کی فوج کو بالکل مہلت نہیں ملی۔ جس کے نتیجہ میں ہمایوں نے شکست خوردہ ہوکر آگرہ کی راہ لی۔ مغل فوج نے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پائی۔ یہ واقعہ ۹۴۶ھ کا ہے اس فتح کے بعد شیر شاہ ہندوستان کی سلطنت کا مالک بن بیٹھا۔ اور اپنے نام کا خطبہ شروع کیا۔ اور سکہ جاری کیا۔ شیر شاہ نے پانچ سال تک تخت شاہی پر حکومت شروع کی اور انتظام حکومت میں نمایاں اصلاحیں کی اور بعض وہ کام انجام دیئے کہ اس سے پہلے مسلمان بادشاہ نہیں کر سکے تھے۔ جیسے روہتاس کے قلعہ پر شیر شاہ اپنی حسنِ تدبیر سے قابض ہوا۔ شیر شاہ نے ہیبت خاں نیازی کو مغل علاقوں پر قبضہ کرنے کا حکم دیا اس نے اودھ اور سنبھل پر قبضہ کرلیا۔ ہیبت خاں کی فوج نے سنبھل کی خوب لوٹ مار کی اور باشندگانِ سنبھل کو اپنا ماتحت بنالیا۔ شیر شاہ نے ناصر خاں کو سنبھل کا گورنر مقرر کیا اس وقت سنبھل سرکار کی حیثیت رکھتا تھا، ناصر خاں قابل اور اچھا منتظم تھا۔ لیکن سخت مزاج اور غصہ ناک تھا باشندگان سنبھل نے شیر شاہ سے اس کی سخت مزاجی کو بیان کیا، شیر شاہ نے عیسیٰ خاں کالکاپوری کو سنبھل کا گورنر مقرر کیا عیسیٰ خاں نے سنبھل کے قیام کے دوران بہت اچھا انتظام کیا۔ رعایا کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ فتنہ وفساد پھیلانے والوں کو سختی سے روک کر رعب قائم کیا چونکہ خواص خاں شیر شاہ کے دوش بدوش تھا اور اپنی فرمانبرداری کا ہمیشہ ثبوت دیتا تھا۔ شیر شاہ اپنی قابلیت اور خواص خاں کی اولوالعزمی ہو ہمدردی سے ہندوستان کی عظیم سلطنت کا فرماں روا بنا تھا۔ تو شیر شاہ نے خواص خاں کو امیر الامراء مقرر کیا اور اپنی ممالک محروسہ کا دسواں حصہ جاگیر میں دیا۔ کالنجر کا قلعہ فتح کرنے میں شیر شاہ مارا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد خواص خان اس کے بیٹے سلیم شاہ کے امیروں میں داخل ہوا۔ سلیم شاہ کے عہد کے ایک بزرگ شیخ علائی جب عازم حج ہوئے اور موضع خواص پور کے قریب پہونچے تو خواص خاں نے شیخ علائی اور ان کے ہمراہیوں کا شاہی انداز میں استقبال کیا تھا۔

سنبھل سلیم شاہ بن شیر شاہ کے زیر اقتدار رہا

شیر شاہ نے اپنے انتقال کے وقت دو لڑکے چھوڑے ا۔ عادل خاں ۲۔ سلیم شاہ۔ سلیم شاہ باپ کی وفات کے وقت پٹنہ کے مضافات قصبہ ریون میں حکمرانی کر رہا تھا۔ اور عادل خاں جو ولی عہد تھا (بڑا بھی تھا) قلعہ انتھنور پر قابض تھا چونکہ عادل خاں بہت دور تھا۔ موقع کی نزاکت اور فتنہ وفساد کو روکنے کیلئے امیروں نے بعد مشورہ سلیم شاہ کو تخت شاہی پر بٹھا دیا۔ سلیم شاہ نے تخت نشینی کے بعد اپنے بھائی عادل خاں کو لکھا کہ آپ یہاں آجائیں، آپ ہی عنان حکومت سنبھالیں میں آپ کا فرمانبردار رہوں گا۔ اپنے خلوص کا اظہار بھی کیا، ادھر خواص خاں اپنی جاگیر سے سلیم شاہ کی خدمت میں پہنچا۔ عادل خان نے بھائی کی دعوت پر فوراً لبیک نہیں کی بلکہ اپنی آمد کو خواص خاں اور ان کے مشورہ پر موقوف کیا۔ چونکہ عادل خاں ولی عہد تھا امیروں نے عادل خاں کے آگرہ آنے کو ترجیح دی۔ (تاریخ فرشتہ)

عادل خاں انتھنور قلعہ سے روانہ ہو کر آگرہ پہونچا دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔ عادل خاں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کر کے عنان حکومت سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ اور بیانہ اور اس کے نواح کی جاگیروں پر قناعت کی خواص خاں اور عیسی خاں کو ہمراہ لے کر بیانہ روانہ ہوا۔ چند ماہ بعد سلیم شاہ نے عادل خاں کی گرفتاری کا حکم جاری کیا عادل خاں یہ خبر پا کر خواص خاں (جو اس وقت میوات کا حاکم تھا) کے پاس پہونچا سلیم شاہ کی عہد شکنی پر غصہ ہوا اور سلیم شاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور عادل خاں کے ہمراہ ایک لشکر جرار لے کر سیکری پہونچا۔ اتفاق سے وہ شب شب برأت تھی خواص خاں نے شب کا کچھ حصہ عبادت، نماز اور حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے ملاقات میں گزارا۔ صبح آگرہ پہونچے۔ سلیم شاہ نے ان کی آمد کی خبر سن کر آگرہ سے فرار ہو کر مقابلہ کیلئے جزیہ جمع کر کے تیاری کا ارادہ کیا۔ امراء کے منع کرنے سے اس ارادے سے باز آ گیا۔ امیروں نے اپنی اطاعت اور افغانوں پر اعتماد کا یقین دلایا۔ آخر کار آگرہ کے قریب معرکہ آرائی ہوئی۔

فیروز پور میں دونوں کی فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ خواص خاں نے پہاڑوں کی راہ لی جن امیروں نے خواص خاں اور عادل خاں کا ساتھ دیا تھا۔ سلیم شاہ نے ان کو قید کر لیا۔ اس وقت ہمایوں لاہور میں مقیم تھا بعض امراء ہمایوں کے پاس پناہ گزیں ہوئے۔ سلیم شاہ ایک لشکر جرار لے کر مقابلہ کیلئے روانہ ہوا۔ ادھر ہمایوں پنجابی بڑی فوج لے کر جو بادشاہ کی فوج سے دوگنی تھی مقابلہ کے لئے آگے بڑھا اور ساتھ میں خواص خاں بھی تھا دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ خواص خاں بغیر لڑے میدان جنگ سے فرار ہو لیا خواص خاں جو نہایت شجاع اور سخی تھا اور طاقت ور حاکم تھا۔ چونکہ سلیم شاہ کی یہ عادت تھی کہ جب کسی امیر کو ابھرتا اور طاقت میں بڑھتا دیکھتا تو برداشت نہیں کرتا۔ اسے نظر بند کر دیا کرتا تھا۔ خواص خاں کو اس کے اس رویہ سے خوف ہوا۔ جنگلوں اور میدانوں میں جان کی حفاظت کیلئے گشت کرنے لگا۔

سلیم شاہ کے دور حکومت میں تاج خاں کرمانی سنبھل کا گورنر تھا

اسی وقت میں خواص خاں کا اہم واقعہ سنبھل سے آٹھ کلومیٹر دور سرسی میں پیش آیا۔ چونکہ سلیم شاہ خواص خاں سے اس لئے ناراض تھا کہ خواص خاں نے اس کے بھائی عادل شاہ کی تخت نشینی حاصل کرنے میں مدد کی تھی۔ اگرچہ خواص خاں نے جیسا کہ شیر شاہ کی فرماں برداری کا ثبوت دیا ایسا ہی سلیم شاہ کے ساتھ معاملہ کیا۔ یہاں تک کہ نیازیوں نے جب سلیم شاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو خواص خاں نے بھی مخالفت کی۔ لیکن سلیم شاہ کا دل پھر بھی صاف نہ ہو سکا۔ اس نے اپنی حکومت کے تحفظ و بقاء واستحکام کیلئے اقدام کیا کہ امیروں میں سے جسے ابھرتا دیکھتا اسے نظر بند کر دیتا۔ ادھر خواص خاں سلیم شاہ سے خوف زدہ تھا۔ ۹۵۹ھ میں سنبھل کے حاکم گورنر تاج خاں کرمانی جو معتمد علیہ بھی تھا اس سے امان لے کر سنبھل آیا۔ اس سے خفیہ طور پر اسے شاہی احکامات دیئے گئے کہ خواص خاں کو قید کر کے قتل کر دیا جائے، بعض خیر خواہ نے سلیم شاہ کی عہد شکنی پر یقین دلایا کہ چونکہ وہ اس کی عادت سے واقف تھا۔ تاج خاں کرمانی نے

اپنے عہد کا کوئی لحاظ پاس نہ کیا۔ اور شب میں دھوکہ سے قتل کروادیا۔

خواص خاں کا جنازہ دہلی لے جایا گیا۔ اور وہیں دفن کیا گیا۔

راجہ متر سین ۱۵۵۳ء

سلیم شاہ کے انتقال کے بعد کھٹیاروں نے اپنی سابقہ عظمت کافی حد تک حاصل کرلی۔ آنولہ اور لکھیم پور پر اپنے قبضہ کو برقرار رکھتے ہوئے۔ بریلی اور چوبلہ کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ وقت وہ ہے جب کہ سنبھل کا گورنر متر سین (۱۵۵۳ء میں) تھا۔

شیخ حمید الدین سنبھلی

آپ کی جائے پیدائش سنبھل ہے۔ آپ بڑے جید عالم تھے۔ تمام علوم پر عبور حاصل تھا۔ خاص کر فقہ اور تفسیر پر ملکہ تھا۔ قرآن کریم کی تفسیر پر گرفت مضبوط تھی۔ علم میں گہرائی و گیرائی انداز بیان دل چسپ اور موثر تھا۔ آپ بلند پایہ بزرگ، اور علوم ظاہری و باطنی میں دسترس رکھتے تھے۔

ہمایوں آپ سے حسن عقیدت رکھتا۔ مقربین میں آپ کا شمار تھا۔ جب ہمایوں ایران سے واپس آیا تو کابل میں ملاقات ہوئی۔ شیخ حمید الدین کو خیال ہوا کہ ہمایوں ایران میں شیعہ ہوگیا تو ایک دن ہمایوں پر برہم ہوکر فرمایا کہ آپ کے لشکر میں سبھی لوگ رافضی ہوتے ہیں۔ ہمایوں نے استفسار کیا کہ آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی شیخ نے جواب میں عرض کیا کہ ان تمام کے نام سے رفضیت ٹپکتی ہے۔ کسی کا یار علی، تو کسی کا نقش علی، کسی کا حیدر علی، سب اسی طرح کے نام ہیں۔ صحابہ کرام کے ناموں پر کسی کا نام نہیں باوجود کہ ہمایوں حد سے زیادہ نرم دل تھا شیخ کی بات گراں گزری اور عرض کیا کہ میرے دادا کا نام عمر شیخ مرزا تھا شیخ کو اپنے عقیدے سے مطلع کر کے شبہ کا ازالہ کیا۔ آپ کی وفات شہر سنبھل میں ۷ محرم الحرام ۹۸۳ھ میں ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر۔ ج:۴، ص:۹۹)

قنبر دیوانہ اور سنبھل

چونکہ نصیرالدین ہمایوں کے بھائیوں نے ہمایوں کی مدد نہیں کی تھی اس سبب سے مغلوں سے عنان حکومت نکل کر شیر شاہ کے قبضہ میں چلی گئی۔ پندرہ سال تک ہندوستان کی عظیم سلطنت پر افغانوں نے حکومت کی افغانوں سے پہلے بادشاہ شیر شاہ سوری نے پانچ سال تک حکومت کی ۱۵۴۵ء میں کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشیں ہوا۔ اس کا زمانہ مختلف جھگڑوں میں گذرا، جیسا کہ نظر نواز ہوا جب ۱۵۵۴ء میں انتقال ہوا تو اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت نشیں ہوتے ہی قتل کر دیا گیا۔ پھر محمد شاہ عادل تخت کا مالک بن بیٹھا۔ اسکے بعد سکندر شاہ نے آگرہ میں تخت نشیں ہو کر افغانی امیروں کے روبرو ایک پر زور تقریر کی کہ شیر شاہ نے ہندوستان کی سلطنت مصیبتوں اور کاوشوں کے بعد حاصل کی تھی۔ تم متحد و متفق رہو اور حسد و نفاق کو دل سے نکال دو لیکن افغانوں میں باہم اختلاف دل میں گھر کر چکا تھا۔ جس سے شیرازہ بکھر گیا۔ ادھر ہمایوں ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کے گھات میں تھا۔ افغانوں کی کدورت کے باوجود سکندر شاہ ایک بڑے لشکر کو لے کر ۹۶۲ھ میں سرہند کے قریب بیرم خاں ترکمان شہزادہ اکبر کے مقابلہ میں آیا۔ اس میں افغانوں کو شکست فاش ہوئی۔ اب افغانی حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل بجھ گیا۔ پندرہ سال کے عرصہ کے بعد دوبارہ نصیرالدین ہمایوں ہندوستان پر قابض ہوا پھر مغلوں کی حکومت کے عروج کا زمانہ شروع ہوا۔ خدا کے فضل سے ہندوستان کے تخت پر رونق افروز رہو کر نوازشات کیں اور صوبوں کے گورنر مقرر کئے۔ ہمایوں کی فوج کا ایک افسر قنبر دیوانہ نامی ایک شخص تھا یہ قنبر اقبال نامہ جہانگیری کے قول کے مطابق پاگل تو نہ تھا۔ لیکن سنکی ضرور تھا۔ اس نے ایک فوج اکٹھی کر کے ۲۳ جولائی ۱۵۵۵ء کو سرہند پر تسلط حاصل کر لیا، اور قرب و جوار کے دیہاتوں پر بھی اپنی طاقت

میں کافی اضافہ کرلیا تھا۔ فتح سرہند کے بعد وہ سنبھل کی طرف چلا۔ ساتھیوں اور دوستوں پر دولت نچھاور کی غریبوں کی خوب مدد کی۔ اس کی طاقت یہاں تک بڑھی کہ سنبھل پر تسلط حاصل کرلیا۔

فتح سنبھل کے بعد قنبر دیوانہ نے اپنے بیٹے عارف اللہ کو بدایوں کی فتح کیلئے روانہ کیا۔ بدایوں کے گورنر رائے حسین نے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پاکر راہ فرار اختیار کی۔ اس طرح بدایوں پر بھی قابض ہو گیا۔ اپنے ساتھیوں کو سلطان کے لقب سے نوازنے لگا۔ ہمایوں کو قنبر کی فتوحات کا علم ہوا تو اس نے علی قلی خاں شیبانی کو سنبھل کا حاکم مقرر کر کے قنبر دیوانہ کو دربار شاہی میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ بصورت دیگر سزا دینے کا حکم دیا۔ اس وقت قنبر بدایوں کے قلعہ میں روپوش تھا۔ علی قلی شیبانی نے بدایوں پہونچ کر قنبر کو اپنے سامنے حاضر ہونے کا حکم نافذ کیا۔ قنبر نے مغل پیغام بر سے گفت وشنید کے بعد قلعہ سے باہر آنے سے انکار کردیا اور علی قلی سے اس کے معاملہ میں دخل اندازی کرنے سے روکا کہ وہ خود سلطان اعظم ہمایوں کو جواب دہ ہے، میں نے یہ فتوحات اپنی قوت سے حاصل کی ہیں، علی قلی شیبانی کے لوگوں نے اسے قید کر کے قتل کردیا۔ چونکہ قنبر دیوانہ ہمایوں تک اپنی عرضی پیش کرچکا تھا ہمایوں اپنی طبیعت کے اعتبار سے بہت نرم تھا۔ اس کی عرضی قبول ہونے کے بعد قاسم مخلص کو بدایوں روانہ کیا کہ قنبر کو بحفاظت دربار شاہی تک لایا جائے اور مکمل امن کا یقین دلایا جائے۔ لیکن وقت اجل آچکا تھا۔ قاسم کے پہونچنے سے قبل ہی قنبر کو قتل کردیا گیا۔ یہ واقعہ ۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ میں پیش آیا۔ ہمایوں نے قتل کو ناپسند کیا۔ اور علی قلی شیبانی کے رویہ سے ناراضی کا اظہار کیا۔

(تاریخ فرشتہ ص ۶۷۸ ج ۱، دربار اکبری ص ۱۹۸۔۱۹۹)

ہمیوں بقال اور علی قلی خاں شیبانی حاکم سنبھل

ہمیوں بقال کے حال کو تمام مؤرخین نے سخت عبارتوں میں بیان کیا ہے، اس کی لیاقت اور برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی تعریف میں قلم کو نہیں روک سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ریواڑی کا غریب بنیا قوم کا ڈھوسر تھا مصنف دربار اکبری لکھتا ہے کہ بنیوں میں یہ ایک رذیل فرقہ ہے۔

اکثر اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ وہ بازاروں اور گلیوں میں لونوں، لونوں کہتا پھرتا تھا وہ بدن کا حقیر اور بدصورت تھا کم رو آنکھ سے بھینگا یا کانا تھا مگر اس کے چست نظام برجستہ حسن تدبیر اور جنگی فتوحات پر کون پردہ ڈال سکتا ہے۔

اس کی ترقی کا ستارہ عروج پر تھا اس کی قسمت جاگی اور بادشاہ سلیم شاہ کے بازار لشکر میں لے گئی۔ وہاں دوکان کھولی۔ آدمی شناس تھا رفتہ رفتہ بازار کا چودھری بن بیٹھا۔ سلیم شاہ کم مرتبہ لوگوں سے بہت گھل مل جاتا تھا اسے ہم کلامی کا موقع ملنے لگا۔ بادشاہ نے اسکی کارگزاری سن کر اور محنت دیکھ کر بازار لشکر کا کوتوال مقرر کردیا، چند دن بعد فوجداری کے مقدمات بھی اس کے حوالے کردئے گئے۔

نمک خوردہ نے اب اور زیادہ ہمت و محنت دکھائی قرب حاصل کرنے کیلئے۔ ادھر بادشاہ سلیم افغانوں سے بیزار تھا جب اسے کام بخوبی انجام دیتے ہوئے دیکھا تو خدمتیں سپرد کیں منصب میں اضافہ کردیا، غرض اپنی خدمت گزاری یا آقا کی خیر خواہی سے دن بدن اعزاز بڑھتا گیا اور قابل اعتماد ہوگیا۔ اور جو باوقار امراء کے کام تھے وہ اسے دئے گئے انتہا یہ ہے کہ جب ہمایوں ایران سے کابل آیا اور کامراں بھاگ کر ادھر آیا تو لالہ ہمیوں کا دربارِ سلیم شاہ سے انتخاب ہوا اور ہمایوں کے خیر مقدم کے لئے گیا۔ اگرچہ کامراں کو یہ ناگوار بھی گزری۔ ہمیوں کی ذات کچھ بھی ہو

لیکن اس کے کارنامے باآواز بلند کہتے ہیں کہ وہ اپنی ذات سے عالی ہمت اور حوصلہ مند ہے۔اور آقا کے لئے مستعد و چست خدمت گزار بہتر منتظم، چستی اور چالاکی طبیعت میں داخل تھی۔محبت و عرق ریزی سے دلی شوق رکھتا تھا۔

(دربار اکبری ص ۸۴۳، ۸۴۷)

بہر حال اس نے افغانی آندھیوں میں پرواز کی تھی۔جو سردار بادشاہی کے دعویدار اور اس کے پروان چڑھانے بڑھانے والے تھے وہ آپس میں کٹ مر گئے۔نظم فوج اور شاہی خزانے اس کے قبضہ میں آ گئے۔

شہزادہ ہمایوں ہندوستان کی سلطنت پر دوبارہ تخت نشیں ہوا اسی عرصہ میں ہمایوں کو مرگ ناگہانی پیش آئی۔جلال الدین محمد اکبر تخت نشیں ہوا۔ہمیوں بقال سلطنت کے خواب دیکھنے لگا۔اور یہ خیال کیا کہ ۱۴ برس کا لڑکا تخت پر قابض ہے اور وہ سکندر سور کے ساتھ پہاڑوں میں الجھا ہوا ہے۔

ہمیوں بقال نے موجودہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور افغانی کثیر فوج کو اپنے گرد نظر آتی دیکھا تو اسے کئی بادشاہوں کی کمائی، وخزانے اور کارخانہ سلطنت قبضہ میں دکھائی دینے لگے۔ادھر تجربات نے کان میں کہا کہ جدھر قدم بڑھایا ہے تو کامیابی و فتح ہوئی ہے۔۱۴ برس کے لڑکے کی بنیاد ہی کیا ویسے ہی اکھیڑی جا سکتی ہے۔

بہر حال جس لشکر پر اسے گھمنڈ تھا اسے ترتیب دے کر روانہ ہوا۔جلال الدین اکبر کی طرف سے آگرہ کا حاکم سکندر خاں تھا اس کا ہوش و ہواس ہمیوں کی آمد کی خبر سے اڑ گیا اور بے مزاحمت جنگ ہو کر قلعۂ آگرہ سے بھاگ نکلا۔اور ہمیوں بقال برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا گیا۔اور اس سے اور بھی ہمت زیادہ ہو گئی۔

ہمیوں کے ساتھ جرار فوج راجپوت، میواتی، پٹھان قوم، پر مشتمل تھی نیز توپیں غرض جنگی تمام سامان ساتھ تھا اپنی کامیابی کا جھنڈا لہراتا ہوا۔اور سب کو کھوندتا ہوا دہلی

آ پہنچا دہلی کا حاکم اس وقت تردی بیگ تھا اس نے خبر پاتے ہی اکبر کو ایک عرضی لکھی۔ اور شاہی امراء کو خطوط لکھ کر مدد چاہی کہ جلد دہلی آ کر دشمن کا مقابلہ کرو لیکن خود اس نے کوئی تدبیر و انتظام نہیں کیا جب شہر میں لشکر کے آنے کی خبریں پھیلیں تو مجلس شوریٰ قائم ہوئی۔ بعض کی رائے ہوئی کہ علی قلی خاں حاکم سنبھل سے آتا ہے اس کا انتظار کیا جائے چونکہ وہ زبردست سپہ سالار و منتظم ہے دیکھیں وہ کیا تدبیر کرتا ہے آخر دشمن آمادہ جنگ ہوا۔ فرار ہونے کا کوئی پہلو نہ رہا۔ تو تغلق آباد میدان جنگ قرار پایا۔ علی قلی خاں شیبانی حاکم سنبھل حملہ کی تیاریاں کر کے روانہ ہو چکا تھا۔ میدان جنگ میں تردی کے پاؤں اکھڑ گئے اور فوج کو مقابلہ کی ہمت نہ رہی چونکہ لڑائی کا قاعدہ ہے کہ جب ایک کے پاؤں اکھڑ جائیں تو سب کے اکھڑ جاتے ہیں بلا کسی مزاحمت کے ہمیوں دہلی کی حکومت پر قابض ہو گیا

سکندر بیگ سنبھل کے گورنر کے ساتھ سرہند کی طرف چلا گیا۔ ۵ر نومبر ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں ہمیوں بقال کو شکست فاش دے کر دوبارہ مغل حکومت کی جڑیں مضبوط اور قائم ہوئیں۔ اس جنگ میں علی قلی خاں حاکم سنبھل نے بڑی بہادری کے مظاہرے کے ساتھ جوہر دکھلائے۔

جلال الدین اکبر نے علی قلی خاں کو سنبھل کا گورنر برقرار رکھا۔ اس نے سنبھل سے لے کر لکھنؤ تک کا سارا علاقہ اپنے قبضہ میں کیا، اکبر نے اس کی خدمت و کارنامے پر اسے خان زماں کے خطاب سے نوازا۔

مشرق میں سلیم شاہ کے وارثوں نے سر اٹھایا اور مقابلہ کیا لیکن ۱۵۵۹ء میں علی قلی خاں خان زماں نے ان کی تادیب کی اور بنارس و جون پور پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح حاکم سنبھل نے مغل حکومت کی سرحدیں بہار تک پھیلا دیں۔

پانی پت کی جنگ سے حقیقت میں مغل حکومت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ اس

جنگ میں مغلوں نے افغانوں پر اپنی برتری ثابت کر دی۔ اب شہنشاہ اکبر کے سوا تخت کا کوئی مستحق نہ تھا۔

۶ رنومبر ۱۵۵۶ء کو اکبر اپنی فاتحانہ فوج و سرداروں کے ساتھ دہلی پہنچا۔ اور دہلی میں ایک شاہی جشن منعقد کیا جن امراء اور سپاہیوں نے کارنامے انجام دیئے تھے انکو خلعت وانعامات تقسیم کئے جیسے علی قلی خاں حاکم سنبھل کو خاں زماں کے خطاب سے نوازنے کے ساتھ دوآبے کے کچھ پرگنہ ملا کر سرکار سنبھل عطا کی۔ علی قلی خان کا پانی پت کی فتح میں کلیدی کردار تھا جب کہ علی قلی خاں قلب کا سپہ سالار تھا۔ (دربار اکبری ص ۱۹)

اکبر کی یلغار

علی قلی خاں شیبانی نے جن کو خاں زماں کا خطاب دیا گیا تھا۔ سنبھل سے آگے بڑھ کر جونپور وغیرہ اضلاع شرقی میں فتوحات عظیم حاصل کر کے بہت سے خزانے اور سلطنت کے سامان جمع کئے اور دربار اکبری میں نہیں دئے تھے۔ ابھی تک شاہم بیگ کے مقدمہ میں ماخوذ تھے۔ سلطان اکبر ادہم خاں سے دل جمعی کر کے آگرے آیا آتے ہی توسی ہمت پر زیں رکھا۔ اور سورج مشرق سے مغرب چلا گیا۔

یک جا قرار ہمت عالی نمی کند
گردش ضرورت است بلند را

سلطان جانتا تھا کہ خاں زماں من چلا بہادر ہے اور غیرت والا ہے اور اہل دربار نے اسے ناراض کر دیا ہے۔ عمر رسیدہ امراء کو ساتھ لیا۔ بادشاہ کڑک دمک سے کڑہ مانک پور میں جا کھڑا ہوا کہ خاں زماں اور ان کا بھائی بہادر خاں دونوں ہاتھ باندھ کر پاؤں میں آن پڑے وہاں سے بھی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ پھرے۔ بہکانے والوں نے اس کی طرف سے بہت کان بھرے تھے۔

بادشاہ کہا کرتا تھا کہ امراء ہرے بھرے درخت ہیں۔ اور ہمارے لگائے

ہوئے ہیں۔ انہیں سرسبز کرنا چاہئے۔ نہ کہ کاٹنا، انسان میں برگزیدہ صفت گناہ کی معافی ہے۔ (دربارا کبری ص ۲۵۔۲۶)

حسن خاں بچگوئی کا سرکارِ سنبھل پر حملہ

علی قلی خاں سنبھل سے فوج لے کر لکھنؤ تک چڑھتا چلا گیا۔ شمالی تمام ملک صاف کردئے یہ لکھنؤ کے مقام میں تھا اور اکبر اس وقت قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا حسن خاں بچگوئی سرکار سنبھل پر حملہ آور ہوا حسن کا مقصد یہ تھا کہ اس فساد کی خبر سن کر اکبر ادھر آئے گا۔ یا خان زماں جو آگے بڑھا جاتا ہے وہ اس طرف لوٹے گا۔ حسن خاں ۲ ر ہزار فوج لے کر آیا۔ افغانی ۳ ۴ ر ہزار فوج خاں زماں کے پاس دریا سروہی اترے۔ بہادر خاں کی فوج کو گھاٹ پر روکدیا۔ (دشمن دست گریباں تھے) علی قلی بہت اطمینان سے ضروریات سے فراغت کے بعد نقارہ پر چوٹ لگا کر اس کڑک دمک سے پہنچا کہ غنیم کے قدم اٹھ گئے اور ہوش اڑ گئے اور بری طرح بھاگے۔ خاں زماں سات کوس تک مارتا اور لاشوں کو بچھاتا چلا گیا کشتے کٹے پڑے تھے اور زخمی لوٹتے تھے۔ (دربارا کبری ص ۲۰۴)

عہد مغلیہ میں سنبھل کے حکمراں۔

جیسا کہ مقدمہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس شہر کے سر پر راجدھانی صوبائیت کا سہرا بندھ چکا ہے، سرکار سنبھل اور حویلی اس کا نام رہا ہے۔ راجاؤں اور سلاطین اسلام کا مسکن رہا ہے، زوال پذیر اور پستی میں گرتے گرتے اب صرف ایک تحصیل کی حیثیت حاصل ہے، اس میں جہاں یہاں کی عظیم شخصیات اور سلاطین اسلام وراجاؤں وحکمراں کا تفصیلی ذکر جزو تاریخ ہے وہیں سنبھل کے حکمراں کا اجمالی تذکرہ بھی ہے جو عہد مغلیہ میں برسر اقتدار رہے۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) داؤد خاں (۲) نصرت شاہ (۳) اسد خان (۴) تاتار خان (۵) جلال خان (۶) الہ داد خان (۷) سلطان حسین (۸) خواص خان (۹) بہادر خان (۱۰) محمد قاسم سنبھلی (۱۱) محمد یحیٰ تاران (۱۲) شہباز خان (۱۳) قنبر دیوانہ (۱۴) علی قلی (۱۵) خان زماں (۱۶) دریاں خان (۱۷) ابراہیم حسین (۱۸) بریلی خان (۱۹) عین الدین احمد خان (۲۰) غلام ابوالفضل مرزا قندرھار (۲۱) مرزا محمد کوکلتاش (۲۲) مرزا عسکری (۲۳) رستم خان دکھن (۲۴) نواب امین الدولہ (۲۵) نہتے خان (۲۶) محمد روشن خاں (۲۷) نواب ذوالفقار (۲۸) رائے دولت سنگھ (۲۹) نواب عظمت اللہ خان (۳۰) حسین علی خان (۳۱) رائے شمبھوناتھ (۳۲) نواب احمد اللہ خان بہادر (۳۳) غلام محمد خان، کرم خان (۳۴) نواب علی وردی خان۔

سنبھل میں خانساماں احمد علی

گجرولہ کے نواب احمد علی خاں بہادر کے خانساماں احمد علی الیٹ صاحب کے پاس وکالت میں تھے ان کے دادا انور محمد، نواب امین الدولہ کے ہمراہ دہلی سے سنبھل آ گئے۔ نواب امین الدولہ کا سنبھل محلہ میاں سرائے میں قلعہ ہے۔ ان کے خدمت گاروں میں شامل ہو گئے۔ جب نواب صاحب کا کام زوال پزیر ہوا، تو نظام علی خاں پسر نواب فیض اللہ خاں کی سرکار میں ملازم ہوا۔ اوران کا لڑکا ممو خانساماں کے عہدہ پر فائز ہوا۔ ممو خاں نے ایک طویل مدت تک اسی سرکار میں بسر کی۔ اس کے بعد بغیر کسی مواخذہ کے نظام علی خاں سے رخصت ہو کر نواب احمد علی خاں کی سرکار میں خانساماں کے عہدہ پر مقرر ہوا۔ وہاں کچھ ہی ایام کے بعد ہر دل عزیز ہوا چونکہ رئیس کی خدمت میں، ہر ایک شخص کی بغیر غرض ولالچ کے شفارش کرتا تھا۔ جب تک وہاں قیام رہا تمام ہی لوگ خوش دل رہے اور باوقار زندگی گذاری اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی پورا کرتا۔ خوشامدیوں کے مکروفریب میں نہیں پھنستا تھا۔

کچھواہہ راجپوت

سرائے ترین میں ایک محلّہ کچھواہان ہے، آزادی ملک سے پہلے اس محلّہ کے باشندے اکثر ہندو تھے۔ آزادی کے بعد یکے بعد دیگرے اپنے مکانات فروخت کر کے چلے گئے۔ بقول مولانا مفتی آفتاب علی خاں صاحبؒ اس محلّہ میں ایک بڑی حویلی ہے۔ جو کچھواہان خاندان کی ہے، غالباً اسی وجہ سے اس محلّہ کا نام کچھواہان ہے۔ عبدالقادر رام پوری اپنی وقائع میں رقمطراز ہیں۔ جے پور میں کچھواہان راجپوتوں کی ریاست ہے یہ لوگ اپنے کو راجہ رام چندر پسر راجہ جسرت کی اولاد میں سمجھتے ہیں۔ حکیم عبدالغنی رام پوری نے تاریخ راجگان ہند جلد اول میں کچھواہہ راجپوتوں کی وجہ تسمیہ کے متعلق جتنی دلچسپ حکایتیں مشہور ہیں ان سب کو یکجا نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ راجگان جلد اول صفحہ نمبر ۲۷۸، ۲۸۰) اور یہ قوم بھی چارن کتاب کے بموجب اپنی تعریفوں اور بُرائیوں میں حد سے گذرنا ان کا نمایاں کام ہے۔ اور ہندو قوم کے باستانی ناموں کی راجاؤں بنسیاولی سے مقابلہ کریں تو بہت فرق نکلے گا۔ کچھواہہ اور راٹھور دونوں اپنے کو رامچند رتک پہونچاتے ہیں۔ جب کہ رامچند رسورج جیسے تھے۔ اور بھاگوت کے بارہویں الھکندہ میں تفصیلی بحث کے بعد لکھتا ہے کہ سنبھل میں ایک برہمن کے گھر میں کلکی اوتار ظاہر ہوگا جو تمام راجاؤں کو قتل اور زخمی کرے گا اور سورج بنسی اور چندر بنسی قوم کے ایک راجہ کو جو برف کے پہاڑ میں جس کو ہمالیہ کہتے ہیں خدا کی عبادت میں بیٹھا ہوگا۔ اٹھالائے گا اور روئے زمین کی حکومت اس کے حوالہ کردے گا۔ اور بھلائی وسچائی وانصاف کا زمانہ واپس آجائے گا۔ اور ست جگ شروع ہوگا۔

(علم وعمل صفحہ نمبر ۲۰ وقائع عبدالقادر خان)

جنگ آزادی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نواب یوسف علی خاں والیُ رام پور انگریزوں کے

حلیف اور وفادار رہے۔ انگریزوں کی طرف سے مراد آباد کا انتظام ہاتھ میں لے لیا۔ اور انگریزوں کی بڑی شاندار خدمات انجام دیں۔

(وقائع نصیر خانی صفحہ نمبر ۳۹ مطبوعہ ایجوکیشنل کراچی)

گرسہائے قوم جاٹ ساکن مرادآباد نے بھی جنگ آزادی میں انگریزوں کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ نواب رام پور کی ماتحتی میں جنوبی مرادآباد کا نائب ناظم تھا اس کی وفاداری کے صلہ میں راجہ کا خطاب ملا۔ اور گیارہ گاؤں معافی ملے۔ جس کی آمدنی اس وقت دس ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ (وقائع نصیر خانی ص ۵۹ مطبوعہ ایجوکیشنل کراچی)

مرزا عبدالہادی حاکم سنبھل

مرزا عبدالہادی مولوی عبدالقادر مصنف وقائع عبدالقادر خانی کے بڑے لڑکے ہیں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدائش ہے ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں ان کے چچا محمد ناصر کی صاحبزادی حسینی بیگم سے نکاح ہوا۔ مرزا عبدالہادی ذی علم، باوجاہت، وسیع اخلاق، بڑے عقلمند تھے۔ ۱۸۳۱ء میں انگریزی حکومت کی ملازمت میں آئے۔ دیوانی کی سرشتہ داری سے ترقی کر کے تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے اور خاص سنبھل و مرادآباد اور اس کے علاوہ ٹھاکردوارہ، شاہجہاں پور، گورکھپور، حسن پور، بلاری، امروہہ وغیرہ مقامات میں چالیس سال تک باوقار حاکم رہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۷۰ء میں بعمر ۶۷ سال میں انتقال ہوا۔

(وقائع نصیر خانی صفحہ ۵۰ مطبوعہ ایجوکیشنل کراچی)

میاں عبدالوہاب رئیس سنبھل

بیرم خاں خانِ خاناں راستی، حسن خلق، نیاز و خاکساری میں سب سے سبقت لئے ہوئے تھا اور ابتدائے حال میں ظہیرالدین بابر کی خدمت میں پھر ہمایوں کے حضور میں رہ کر پروان چڑھا جس وقت اکبر تخت نشین ہوا اس وقت یہ دربارِ اکبری میں نہ

تھا مگر اس کے رستمانہ کارنامے اور جانثاری وحسن تدبیر زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ اسے دربار اکبری میں لایا جائے چنانچہ اسے دربار اکبری میں درجہ اول پر جگہ دی گئی کیونکہ اس کے ہاتھ میں تدابیر وزارت کا ذخیرہ تھا جس طرح چاہے نظامِ سلطنت کا رخ موڑ دے اور اقبالِ خداداد مددگار تھا۔ جس کام پر ہاتھ ڈالتا پورا کر ڈالتا تھا، ہمایوں جب شہزادہ تھا اس وقت بیرم خان نے نوعمری میں بابر کی خدمت میں آ کر نوکری کی۔ جب کہ ۱۶ر سال کی عمر تھی ایک لڑائی میں اس نے ایسا کارنامہ انجام دیا کہ دفعۃً شہرہ ہو گیا بابر نے بلا بھیجا اور خود گفتگو کی اور نوعمر بہادر کی ہمت افزائی کی اور بہت سراہا۔ ہونہار کی پیشانی سے آثارِ اقبال نمایاں تھے دیکھ کر قدردانی کی اور کہا کہ شہزادہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کریں جب ہمایوں بادشاہ ہوا تو اس کے دربار میں رہنے لگا ان دونوں کے حالات سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے درمیان قدرتی اتحاد ہے۔

ہمایوں کی سلطنت کو ہندوستان میں اسی نے دوبارہ قائم کیا جب کہ ہمایوں دکن میں مہم میں جانیا میز کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ پہاڑوں کی چوڑائیوں پر بنا ہوا تھا۔ درختوں اور جنگلوں سے گھرا ہوا تھا بہت اونچائی پر تھا ہمایوں نے سیڑھیاں لگوائیں۔ اور ۳۹ جوان رسیوں اور سیڑھیوں پر چڑھے چالسواں بہادر بیرم خان تھا صبح ہوتے ہوتے تین سو جانباز پہنچ گئے اور خود بادشاہ بھی پہنچا اور قلعہ فتح ہو گیا۔ ۹۴۶ھ میں شیر شاہ سے پہلی لڑائی مقام جوسہ میں ہوئی بیرم خان نے وہ کارنامے دکھائے اور ہمت سے دشمن کی صف کو تہہ وبالا کر دیا اور دلیری سے دشمن کی فوج پر حملہ آور ہوا کہ اس کا منہ پھیر دیا لیکن ہمراہی امراء کی بے نظمی وکوتاہی سے معرکہ طول پکڑ گیا دشمن کو فتح ہوئی ہمایوں شکست خوردہ ہو کر آگرہ آیا۔ بیرم خان کی تلوار آگرہ تک آقا کی حفاظت میں اٹھی رہی۔ دوسری معرکہ آرائی نواح قنوج میں ہوئی ہمایوں کی قسمت نے یہاں بھی ساتھ نہ دیا اُمرا کی اور فوج بری طرح پریشان ہوئی

کہ ان کو دوسرے کی ہوش و خبر تک نہ رہی۔ ہمایوں نے بدحالی سے شکست کھائی۔

بیاں باں مرگ ہے جمنوہ خاک آلودہ تن کس کا

سنے ہے سوزن خار مغیلان تو کفن کس کا

اس جنگ میں کچھ مارے گئے اور قید ہوئے اور بھاگ نکلے انہیں بھاگنے والوں میں وفادار جانثار بھی بھاگا اور سنبھل میں پناہ لی۔

میاں عبدالوہاب رئیس سنبھل سے پہلے ہی شناسائی و اتحاد تھا انہوں نے اپنے گھر میں پناہ دی لیکن ایسا نامی گرامی کیسے گمنام چھپا ہوا رہ سکتا ہے اس لئے مترسین کو لکھنؤ کے راجہ کے پاس روانہ کردیا کہ علاقہ جنگل میں چند روز تم رکو۔ چنانچہ ایک مدت تک وہاں رہا۔

نصیر خاں حاکم سنبھل

اس وقت نصیر خاں حاکم سنبھل تھے۔ میاں عبدالوہاب رئیس سنبھل نے انھیں پناہ دی تھی۔ جب ان کو خبر ہوئی تو انھوں نے مترسین کے پاس آدمی بھیجا۔ مترسین کی کیا تاب تھی۔ کہ شیر شاہی امیر کے آدمیوں کو ٹالدے۔ ناچار بھیج دیا۔ یہاں سید عالی عیسیٰ خاں کہ کہن سال امیر زادہ افغانوں کا تھا۔ شیر شاہ کا بھیجا ہوا تھا۔ اس کی اور میاں عبدالوہاب کی سکندر لودھی کے وقت سے دوستی تھی۔ میاں عبدالوہاب نے عیسیٰ خان سے کہا کہ نصیر خاں ظالم ایسے نامور اور عالی ہمت سردار کو قتل کرنا چاہتا ہے ہو سکے تو کچھ مدد کرو۔ میاں عبدالوہاب اور ان کی خاندان کی بزرگی کا سب ہی لحاظ کرتے تھے۔ عیسیٰ خان گئے اور قبیلہ سے چھڑا کر اپنے گھر لے آئے۔ شیر شاہ نے عیسیٰ خاں کو ایک مہم پر بلا بھیجا۔ یہ مالوہ کے رستہ میں جا کر ملے۔ بیرم کو ساتھ لے گئے تھے اس کا بھی ذکر کیا۔ اس نے پوچھا اب تک کہاں تھا۔ مسند عالی! شیخ ملھن قتال کے پاس پناہ لی تھی۔ شیر شاہ نے کہا بخشیدم۔ عیسیٰ خاں نے کہا خون تو اس کی خاطر بخشا۔ اسپ و خلعت میری سفارش سے دیجئے۔ اور ابوالقاسم گوالیار سے آیا ہے حکم دیجئے کہ اس کے پاس اترے شیر شاہ نے اسے قبول کرلیا۔

شاہ فتح اللہ ترین:

حضرت شیخ سلیم چشتی جو شیخ بہاؤالدین کے لڑکے اور خواجہ ابراہیم کے مرید ہیں شیخ صوم وصال رکھتے تھے ابتدائے زمانہ میں سپاہیوں کے طریقہ پر رہتے تھے جب اس درویشی کی راہ میں قدم رکھا تو بلاد اسلامیہ کی سیر وسیاحت کی اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اسی سیر وسیاحت کے دوران شیخ ابراہیم چشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا آپ کو عرب میں شیخ الہند اور ہندوستان میں شیخ الاسلام کے لقب سے پکارا گیا جب آپ ہندوستان واپس آئے تو سیکری میں بود وباش اختیار کی جو اس وقت ویرانہ جگہ تھی۔ آپ نے بہت ریاضتیں کی عموماً روزہ سے رہتے اور ٹھنڈی چیزوں سے روزہ افطار کرتے ہر روز ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے وغیرہ وغیرہ۔

شہنشاہ اکبر

اکبر اعظم کو آپ سے کمال خلوص اور اعتقاد ہو گیا اس نے ویرانہ میں شہر آباد کر دیا اور اس پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کر دیا جس کا نام فتحپور رکھا اکبر نے فتحپور سیکری کو ایک مدت تک اپنا دار الخلافہ بنائے رکھا بادشاہ کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا۔ اکبر نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فرزند کیلئے دعاء کی درخواست کی جب اکبر سلیم چشتی کی خدمت میں دعا کی غرض سے حاضر ہوا تو شاہ فتح اللہ ترین باہر کے کمرہ میں موجود تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اپنی کمر اکبر کی کمر سے ملا دے اس دعا میں شاہ فتح اللہ بھی شریک تھے۔ شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو فرزند عطا کرے گا۔ بڑے لڑکے کو ہمیں دینا ہم اس کی تربیت کریں گے۔ حق تعالیٰ نے اکبر کو ایک لڑکا عطا کیا جس کا نام شیخ کے نام پر سلیم رکھا گیا اور جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا۔ شیخ نے اس کی تربیت کی اور اپنی صاحبزادی سے دودھ پلوایا۔ شیخ کی پیدائش ۸۹۷ھ کو ہے اور وفات ۲۹ رمضان ۹۷۹ھ کو ہے آپ کا مقبرہ فتح پور کی جامع مسجد میں ہے جو اکبر بادشاہ نے شیخ کی خاطر بنوائی تھی۔ جو بہت عالیشان عمارت ہے اس کا بلند

دروازہ ہندوستان کی بہترین و مشہور عمارت میں سے ہے۔ (سفینۃ الاولیاء ص ۲۴۱)

آپ ہندوستان کے بڑے اور مشہور ولی اللہ میں سے ہیں۔ گویا آپ آفتاب ہیں جس کی شعاعوں نے پورے ہند کو روشن کیا۔ شاہ فتح اللہ ترین، حضرت شیخ سلیم چشتی کے اجلہ خلفاء میں سے ہیں (تاریخ جہانگیر ص ۱۳۔۱۴)

آپ کابل قندھار کے رہنے والے تھے ابتداءً آپ قنوج آئے اور قنوج سے فتح پور سیکری گئے۔ اور بھی چند مقامات پر آپ کا قیام رہا۔ فتح پور سیکری سے جھنجھانہ پہونچے وہاں حضرت شیخ شاہ عبد الرزاق جھنجھانوی سے ملاقات کی۔ اور ان سے بیعت ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر حضرت شیخ جیلانی کی روحانیت نے فتح پور سیکری کی طرف اشارہ کیا ناچار سیکری واپس آئے چونکہ آپ شیخ کامل کی تلاش میں بہت سی جگہ کا سفر کر چکے تھے۔ شیخ سلیم کی طرف اشارہ بھی ملا تو آپ شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو کر خدمت مرشد میں رہے ریاضت کی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ خلافت ملی اور شیخ کے سب سے بڑے خلیفہ ہوئے۔ اور سنبھل جانے کا حکم ملا۔ (مظاہر الانساب)

قبیلہ (خاندان)!

کابل میں ایک جگہ ہے وہاں ایک قبیلہ ترین کے نام سے ہے اور اس کا سلسلہ نسب بھی ملتا ہے۔ حضرت شیخ شاہ فتح اللہ اسی قبیلہ ترین سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ سنبھل کی آبادیاں کسی نہ کسی بزرگ کے نام سے موسوم ہیں جب آپ سنبھل آئے تو یہاں سلطان سکندر کے عہد کی ایک جامع مسجد تھی، جس کا تفصیلی ذکر آگے آتا ہے۔

ترین خاندان

آپنے اس مسجد کے قریب قیام فرمایا۔ اور آپ کے لقب پر اس محلّہ کا نام سرائے ترین رکھا گیا ترین خاندان آج بھی موجود ہے۔ جس کا سلسلہ و شجرہ آپ تک ملتا ہے۔ ہم اس کو نقل کرتے ہیں۔

سرائے ترین :- سنبھل کی تمام سراؤں سے بڑی سرائے ہے۔ آج کل اس کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ سرائے ترین کی قدیم آبادی صرف کوٹلہ ہے۔ پہلے اس کا نام ترین سرائے تھا۔ ۳۵ محلے ہیں۔ ۳۴ مساجد ہیں۔ اس میں ایک محلّہ دربار ہے جو درمیان سرائے ترین ہے۔ اسی محلے میں آپ کا خاندان ترین خاندان کے نام سے موسوم ہے۔ اس خاندان میں علماء، حکماء، متمول لوگ گزرے ہیں۔

شاہ فتح اللہ ترین :- آپ سرائے ترین کے روح رواں ہیں۔ جسمانی سلسلہ آج تک موجود ہے۔ روحانی فیض بھی اہل سرائے ترین کو حاصل ہے۔ آپ کو دربارِ سلیم چشتی سے سنبھل خاص کرنے کا حکم ملا۔ اس کی وجہ تو نظر سے نہیں گزری۔ مگر میرے ذہن میں یہ آتی ہے کہ جیساکہ سنبھل کی ہر سرائے میں بزرگوں کا ورود ہوا ہے۔ جیسے شیخ لاڈن، لاڈن سرائے میں۔ شیخ رکن الدین، رکن الدین سرائے میں۔ شیخ پنجو، پنجو سرائے میں۔ شیخ ہلالی ہلالی سرائے میں۔ شیخ حاتم، حاتم سرائے میں۔ سنبھل کے ہر چہار طرف بزرگ تھے۔ یہ سنبھل کا دکھنی حصّہ بزرگ سے خالی تھا۔ غالباً اس وجہ سے حکم ملا کہ سنبھل چلے جاؤ۔ نیز سنبھل کے باشندے ہر زمانے میں خود مختار اور اقتدار پسند تھے جس کی وجہ سے مزاج میں تعلّی پائی گئی۔ ان کی اصلاح کی غرض سے مامور کیا گیا۔

آپ کا مقبرہ درمیان سرائے محلہ دربار میں احاطہ باغ کے اندر ہے جو مغلیہ عمارت، گنبد عمارت اور برانڈے پر مشتمل ہے۔ گنبد پر سفید ماربل حال ہی میں کرایا گیا ہے۔ جب عرس ہوتا تھا تو مقبرہ کے سامنے قوالی ہوتی تھی۔ اس احاطہ باغ کا بڑا دروازہ نواب امیر علی خاں سنبھلی جو بعد میں ٹونک کے نواب ہوئے نے مغلیہ طرز پر بنوایا جو آج بھی موجود ہے۔

پہلے اس کا نام ترین سرائے تھا۔ آج بھی بعض لوگوں کی زبان سے ترین سرائے ادا ہوتا ہے۔ شیخ فتح کی آمد پر اس کا نام سرائے ترین ہوا۔

شجرہ:

شجرہ سلسلہ سجادگان، حضرت حجۃ الواصلین شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی چشتی المتوفی ۲۷ ر جمادی الثانی ۹۹۹ھ مدفن محلہ دربار خلیفہ کلاں شیخ العجم والعرب شیخ الاسلام سلیم چشتی المتوفی ۲۱ ر رمضان ۹۷۹ھ فتحپور سیکری آگرہ۔

نمبر شمار	نام جانشیں	تاریخ گدی نشینی	تاریخ وفات	مدفن
(۱)	شیخ حسینؒ	۳۰ ر رجب ۹۹۹ھ	۱۰۲۷ھ	درگاہ شیخ فتح اللہ اندورن احاطہ
(۲)	عبداللطیف	۱۰۱۷ھ	۱۱۲۰ھ	
(۳)	عبدالرحمٰن			
(۴)	عبدالواحدؒ	۱۰۹۲ھ	۱۱۲۰ھ	
(۵)	رئیس سنبھل شیخ منگل	۱۱۲۰ھ	۱۱۳۹ھ	
(۶)	رئیس سنبھل شیخ یحییٰ	۱۱۳۹ھ	۱۲۰۰ھ	
(۷)	شیخ عبیداللہؒ	۱۲۰۰ھ		
(۸)	شیخ ضیاءاللہؒ	۱۹۰۳ء		
(۹)	شیخ کرامت اللہؒ			
(۱۰)	شیخ ضیاءالدین		۱۹۲۳ء	
(۱۱)	شیخ زین العابدین	۱۹۲۳ء	۱۹۲۷ء	
(۱۲)	شیخ امیرالدینؒ	۱۹۲۷ء	۱۲ر اگست ۱۹۳۸ء	
(۱۳)	شیخ بصیرالدین	۱۴ر اگست ۱۹۳۸ء	۱۱ر اپریل ۱۹۷۱ء	
(۱۴)	شیخ ذوالفقارالدین عرف شیخ طاہر	۱۳ر اپریل ۱۹۷۱ء	اور ۸ر اکتوبر ۱۹۹۹ء امریکہ منتقل ہو گئے	
(۱۵)	شیخ نفیس الدین	۸ر اکتوبر ۱۹۹۹ء		

اولاد: شیخ فتح اللہ ترین

شاہ فتح اللہ کے تین لڑکے تھے (۱) ابو سعیدؒ (۲) حسن (۳) محمد اسمٰعیل (۴) ایک لڑکی تھی۔

حسن کی قبر آپ کے مقبرہ کے غربی جانب احاطہ باغ میں بتائی جاتی ہے۔ حسن کی اولاد میں دربار کے خان ترین ہیں انھیں تک ان کا شجرہ پہونچتا ہے۔

محمد اسمٰعیل کی قبر لال قبر کے سامنے کھیت میں چھوٹی اینٹ کا مزار ہے۔ جو بوسیدہ حالت میں ہے۔ اس کے سرہانے ایک بڑا پتھر ہے۔ جتنا باہر ہے اتنا ہی اندر ہے۔

شیخ ابو سعیدؒ

سرائے ترین کے بڑے قبرستان میں مدفون ہیں۔ جو لالکی تالاب کا قبرستان کہلاتا ہے۔ ایک پختہ مزار ہے۔ اور چاروں طرف چبوترہ ہے۔ یہ جگہ قبرستان میں اونچی ہے صاف ستھری ہے۔ اور بعض تو اس قبرستان کو ابو یحییٰ کے نام سے پکارتے ہیں۔ عوام میں آپ کو ابو یحییٰ کہتے ہیں۔ آپ کو یہ مقبولیت وشرف حاصل ہے کہ جب اس قبرستان میں فاتحہ وایصال ثواب کیلئے لوگ آتے ہیں تو پہلے آپ کے مزار پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتے ہیں۔ بعد میں اپنے اپنے متعلقین کی قبر پر پہونچ کر ایصال ثواب کرتے ہیں۔

وفات: ابو سعید ۹۷۵ھ

مزار کی بے حرمتی:

پہلوان لوگ مزار کے چبوترے پر صرف لنگوٹہ باندھ کر ورزش کرتے ہیں۔ اور چبوترے کے متصل اکھاڑہ ہے۔ اس میں باہم زور آزمائی اور داؤ سیکھتے سکھاتے ہیں۔ یہ عمل صبح وشام ہوتا ہے۔

لڑکی: شاہ فتح اللہ کی ایک لڑکی تھی۔ نام سکینہ تھا انکا قیام مقبرہ کے احاطہ باغ کے عقب

میں رہتا تھا۔ ان کی بہت جاگیر تھی بتایا جاتا ہے۔ کہ جانی کی بغیہ کے متصل ان کی جاگیر تھی۔ جو آج قبرستان ہے اور لال کی (تالاب) بھی انھیں کی ملکیت میں تھی۔ محمد عثمان خاں ساکن محلہ کھواہان ان کے کارندے تھے۔ ان کا مقبرہ جانی کی بغیہ میں ہے۔ زمانہ کے گزرنے کے بعد بھی مزار بہت مضبوط ہے متصل چھوٹی دو قبریں اور ہیں،

جامع مسجد دربار:

برآمدہ کی تعمیر ۴ر شعبان ۱۴۰۴ھ میں ہوئی ہے۔ گیارہ صفیں ہیں۔ یہ مسجد ۹۰۷ھ صدی کی تعمیر کردہ ہے۔ لودھی طرز کی ہے طول میں ۹۸ فٹ عرض میں ۲۶۲ فٹ آثار ۱۲۔ ۱۳ انچ تین در، تین گنبد ہیں برآمدہ ۴۸ فٹ ہے اندر کا حال ۳۶ فٹ صحن ۱۰۰ ارفٹ ہے چونکہ سکندر لودھی کے زمانہ میں سنبھل کو دارالسلطنت ہونے کا رتبہ حاصل ہوا۔ اور چار سال تک سکندر لودھی بہ نفس نفیس سنبھل رہا۔ بحکم سکندر لودھی ۸۹۹ھ میں تعمیر شروع ہوئی پھر سکندر لودھی نے آگرے کی بنیاد ڈالی اور وہیں چلا گیا مسجد کی تعمیر ۹۰۷ھ میں مکمل ہوئی جیسا کہ کتبہ سے ظاہر ہے۔ یہ عمارت بہت پختہ ترین ہے۔ اندر کا ہال ٹھنڈا رہتا ہے۔ مسجد کا محل وقوع، درمیان سرائے ترین ہے۔ مشرق جانب میں ۸ فٹ آثار ہیں ایک ۲۸ فٹ طویل دیوار ہے۔ اس میں تین دروازے ہیں۔ درمیانی دروازہ کھلا رہتا ہے۔ بقیہ دروازے عیدین وغیرہ کو کھلتے ہیں اس سے متصل مسجد کا طویل عریض چبوترہ ہے۔ اتر جانب ایک دروازہ ہے۔ اس جانب مسجد کی دو کانیں ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر کیلئے چار کنویں کھودے گئے تھے۔ ایک کنواں متصل مسجد تھا اور ایک دربار کے بڑے کنویں سے موسوم ہے۔ تیسرا کنواں مسجد میں ہے۔ چوتھا کنواں اس وقت حاجی مستقیم خاں کے مکان میں ہے۔

مسجد میں ایک پیتل کا گھنٹہ ہے۔ جو ہر گھنٹہ پر بجایا جاتا ہے۔ پوری سرائے ترین میں اس کی آواز گونجتی ہے۔ نیز عیدین کے چاند دیکھنے پر اور سحری کے اختتام

وروزہ کے افطار کے وقت بجایا جاتا ہے۔ شمالی وجنوبی جانب کمرے ہیں۔ایک کمرہ میں مسجد کا ملبہ پڑا رہتا ہے۔اور ایک میں مؤذن رہتے ہیں۔فارسی کا کتبہ جو خط نستعلیق میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔کہ اس کی تعمیر سکندر لودھی کے عہد کی ہے۔اس میں یہ عبارت بھی ہے۔بشکر سلطان السلاطین سکندر بن شاہ بہلول تسع مائۃ وسبع، لیکن بیچ کے در پر جو عبارت کندہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اربعین کی تعمیر ہے۔

دونوں کتبوں کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی تعمیر سکندر لودھی کے عہد میں شروع ہوئی ہے۔اس کے بعد آگرہ چلے جانے پر مکمل ہوئی۔

شاہ اربعین:

یہ ایک شاہ زادہ تھا جس کو شیخ کامل کی تلاش تھی۔اول یہ فتح پور سیکری پہونچا چونکہ شیخ سلیم چشتی کا انتقال ہو چکا تھا۔وہاں سے سنبھل شیخ فتح اللہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔سنبھل شیخ فتح اللہ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہوا۔اور شیخ کی خدمت میں بودوباش اختیار کی۔اور جامع مسجد کی تعمیر کی تکمیل اور پلاستر وغیرہ کرایا، ظاہری کتبہ سے یہ ہی سمجھ میں آیا۔

شیخ فتح اللہ کی مقبرہ کے احاطہ باغ میں پتھر کا کھونٹا ہے۔جو شاہ اربعین کی قبر کا نشان ہے۔

شجرہ شاہ فتح اللہ:

ملک جاناں خاں ملک فیروز شاہ، ملک عین الدین شاہ فتح اللہ ترین سنبھلی، شیخ حسن، شیخ عبداللطیف، شیخ عبدالواحد، شیخ منگل، شیخ یحیٰ، شیخ عبداللہ، شیخ عبیداللہ، شیخ ضیاء اللہ، شیخ ضیاء الدین خاں، شیخ امیر الدین خاں، بصیر الدین خاں، متقی الدین خاں، زین العابدین، لڈن خاں، سجادہ نشین محمد طاہر، فقیر الدین خاں، علاؤالدین عرف منے خاں۔

بصرالدین خاں کے صاجبزادگان میں بقید حیات محمد طاہر ہیں ۔اوراب جناب نفیس الدین عرف ببن خاں کوسجادہ نشین منتخب کیا گیا ہے۔

مقبرہ کا ایک بڑا گیٹ ہے اس سے متصل ایک بہت بڑا چبوترہ ہے جس پر مولسری کے درخت تھے اور یہ چبوترہ سجادہ بصیرالدینؒ کے مکان کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔آج مرورِزمانہ کی وجہ سے یہ سطح زمین کے برابر آچکا ہے۔مقبرہ شاہ فتح اللہ اس بڑے دروازے کے مقابل ہے چبوترہ پر دوستونی دروازہ ہے۔اور یہ دونوں دروازہ مقبرہ کے بالکل مقابل ہیں۔اس محلّہ دربار میں کئی تاریخی وشاہی عمارتیں ہیں۔ اور یہ حصہ چوکور قابل دید ہے۔مثلاً نواب مستقیم خاں کی تعمیرہ کردہ بیچ دربار میں چوکور ایک عمارت ہے۔بنگلہ کے نام سے مشہور ہے۔جس کی تاریخ سنگ پر کندہ ہے۔وہ یہ ہے ۱۲۳۵ھ اس کے متصل ایک کنواں ہے۔جس کا تفصیلی ذکرعنقریب آتا ہے۔ سامنے شجاعت علی خاں کی مغلیہ طرز کی کوٹھی ہے۔اس عمارت کے ہر چہار طرف کئی دروازے تھے۔مغربی جنوبی دروازے آج بھی موجود ہیں شمالی دروازہ ۱۹۸۸ء میں منہدم ہوگیا ہے۔

کرامات:

انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء کرام کی کرامات مسلمات میں سے ہیں۔شاہ فتح اللہ ترین ولی کامل تھے۔ان کی بہت سی کرامات میں سے چند کرامات کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

(۱) آپ ان پڑھ تھے۔بعض حضرات خاص کر علماء کا اعتراض تھا۔کہ شاہ فتح اللہ عالم نہیں ان کی بات کا کیا اعتبار کیا جائے۔اسی وجہ سے علماء کا طبقہ معتقد نہیں تھا۔ آپ کے ایک خلیفہ شیخ وجیہہ الدین تھے انہیں یہ اعتراض گراں گزرتا تھا کبیدہ خاطر ہوتے شیخ وجیہہ الدین کیلئے جب یہ برداشت سے باہر ہوا تو شیخ کی خدمت میں عرض کیا۔شیخ نے فرمایا کہ معترض کو میرے پاس لے آنا۔میں ان کے اعتراض کو رفع کردوں گا۔

ایک عالم صاحب کو شیخ کی خدمت میں لایا گیا۔ معلوم کیا کہ آپ کو کیا اعتراض ہے انھوں نے مذکورہ اعتراض کا اعادہ کیا شاہ فتح اللہ نے ان عالم صاحب سے کہا کہ آپ جس کتاب کو چاہیں مجھ سے سن لیں۔ مولانا نے ہدایہ کا انتخاب کیا شاہ فتح اللہ نے فرمایا اول۔ درمیاں۔ آخر جہاں سے چاہیں سن لیں میں پڑھتا ہوں آپ غور سے عبارت دیکھو۔ آپ نے چند صفحات بطور حفظ پڑھ دیئے اور کوئی غلطی نہیں آئی۔ اس کے بعد سے علماء بھی آپ کی ولایت کے قائل اور معتقد ہو گئے۔

(تذکرہ علماء ہند صفحہ ۸۰)

(۲) چونکہ آپ کے پیرومرشد سلیم چشتی کی فتح پور سیکری آماجگاہ تھی۔ وہاں سے آپ کو خاص انسیت تھی۔ وہاں سے شاہ فتح اللہ کے پاس ایک خط آیا کہ فتحپور سیکری میں عدم بارش کے سبب لوگ پریشان ہیں۔ آپ بارش کی دعا فرمائیں شاہ فتح اللہ اس وقت جامع مسجد دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ خط پڑھ کر چند مریدوں کے ہمراہ فوراً جنگل چلے گئے۔ اور باران رحمت کی دعا کی۔ اسی وقت بادل اٹھا۔ جو فتحپوری سیکری کی طرف چلا۔ آپ نے مرسل کے پاس خط لکھا کہ فلاں تاریخ و دن و وقت بارش ہوئی ہوتو لکھو۔ جب جواب وصول ہوا تو معلوم ہوا کہ شاہ فتح اللہ نے جس وقت دعا کی تھی۔ اسی وقت بارش ہو گئی۔ (تذکرہ اولیاء ہند جلد دوم صفحہ ۸۰)

(۳) سرائے ترین میں جب جنگل کے راستہ سے داخل ہوتے ہیں تو آبادی کے متصل لب سڑک ایک قبر لال قبر کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ شیخ فتح اللہ ترین حجامت بنوا رہے تھے۔ اچانک حجام سے کہا ۲ منٹ کے لئے توقف کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آپ اپنے حجرہ میں گئے پھر حجامت بنوانے لگے۔ حجام نے دیکھا کہ کاندھے اور سر پر کھروچ لگی ہے۔ اس کا سبب معلوم کیا۔ آپ نے بتانے سے انکار کیا۔ حجام نے جب اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک جہاز بھنور میں پھنس گیا تھا۔ میں نے اس کو سہارا دیا ہے اور شیخ نے تاکید کر دی کہ کسی

سے ذکر نہ کرنا حجام نے افشاء کر دیا۔ شیخ نے کہا تھا کہ اگر تم ظاہر کر دو گے تو تمہاری قبر ٹھوکروں میں ہوگی۔ اس کی قبر سڑک کے کنارے ٹھوکروں میں ہے اور لال قبر سے مشہور ہے۔

رستم خاں دکنی فیروز جنگ بہادر:

سنبھل کی سرزمین جہاں بہت سے حکمران اور سلاطین اسلام کا مرکز رہی ہے۔ جیسے شیر خاں۔ عیسیٰ خاں میر محمد خاں۔ مرزا حسین مظفر حسن خواص خاں۔ مرزا علی شہزادہ ھمایوں۔ نواب امیر علی والی نواب ٹونک کا تو مستقل وطن تھا۔ ان میں قابل ذکر رستم خاں دکنی ہیں۔

وجہ تسمیہ رستم خاں دکنی:

ان کا نام مقرب خاں تھا۔ ۲۵ سال تک سرکار سنبھل کے گورنر رہے ابتداءً نظام الملک والی دکن کے عمال تھے ۱۰۴۰ھ میں شاہ جہاں کی ملازمت میں داخل ہوئے شہنشاہ جہاں گیر نے شہزادہ (شاہ جہاں) کو جب دکن کی مہم کے لئے روانہ کیا تو ایک عرصہ تک شہزادہ کی رفاقت میں یہ دکن رہا۔ چونکہ زمانہ شہزادیت میں شاہ جہاں کا مزاج پہچان کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس لئے رستم خاں شاہ جہاں کے قریب تر ہو گیا۔ اور تخت نشین ہوا تو رستم خاں کو سنبھل کا گورنر مقرر کیا اور کارہائے نمایاں انجام دہی کے سبب پنج ہزاری منصب سے سرفراز ہو کر رستم خاں کا خطاب ملا۔ اور دکن اور قندھاری لڑائیوں میں نمایاں کام انجام دئے دوسرا خطاب فیروز جنگ بہادر ملا۔

رستم خاں داراشکوہ کے طرف دار تھے۔ اور اورنگ زیبؒ سے جو جنگ ۱۰۶۹ھ میں اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی رستم خاں مع اپنے فرزند رفعت علی خاں اور برادرزادہ عظمت خاں اور دیگر اعزہ کے مقتول ہوئے۔

شہر مرادآباد کی بنیاد:

مرادآباد کی بنیاد رستم خاں دکنی نے ڈالی۔ اور اسے بسایا۔ نیا شہر آباد ہونے سے پیشتر چوپلا کہلاتا تھا۔ کیونکہ یہاں چار گاؤں تھے۔

(۱) دھیری (۲) بھدورہ (۳) مان پورہ (۴) ڈیریا۔

یہ چاروں گاؤں قدیم تھے۔ شہر کی آبادی کی توسیع ہونے پر شہر کے محلوں اور آبادی میں شامل ہو گئے۔

لیکن قدیم گاؤں کے ناموں پر ریلوے اسٹیشن پار موضع دھیری، کٹگھر اسٹیشن کے قریب اور موضع مانپور جنکشن اسٹیشن کے مال گودام کے سامنے ڈیڑھ سو سال قبل سے آباد ہیں۔

بھدورہ کوئی آباد گاؤں نہیں تھا۔ بھدورہ سنسکرت میں ڈاکوؤں کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس بھدورہ کے نکالے ہوئے باشندے جہاں کہیں بھی آباد ہیں اب بھی بھدوریہ ٹھاکر کہلاتے ہیں۔

جیسے ضلع آگرہ اور گوالیار کے ٹھاکر آج بھی بھدوریہ ٹھاکر سے مشہور ہیں۔

شاہنشاہ اورنگ زیب نے مہا سنگھ بھدوریہ راجہ کا خطاب اور سہ ہزاری منصب سے نوازا تھا۔

چوپالا:

مذکورہ چاروں گاؤں چار کناروں پر آباد تھے۔ چونکہ ان کے وسط میں ایک ہال چوک بن جاتا تھا اسی وجہ سے چوپال کہتے۔ یہ مقامات جنگلات، جھاڑ جھنکاڑ سے گھرے ہوئے تھے۔ یہ جگہ رستم خاں کو بہت زیادہ پسند آئی اور اس کے دل کو بھا گئی۔ اس نے اس چوپالہ کی آبادی کا نام اپنے نام پر اول تو رستم نگر رکھا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

ادھر رام گنگا ہے گا گن ادھر
دو آبے میں بستا ہے رستم نگر

ان مواضعات میں زیادہ تر راجپوت آباد تھے جن کو کھٹیر یہ کہتے تھے۔
یہ لوگ جنگجو اور بہادر تھے ان کا پیشہ لوٹ مار تھا۔ ظاہر میں کھیتی باڑی بقدر ضرورت کرتے تھے۔
(سنبھل سروے ص ۶۔ احسن التواریخ ص ۹۷، تاریخ مراد آباد ص ۳ ص ۴۔ وقائع نصیر خانی ص ۸۸ مطبوعہ ایجوکیشنل کراچی)

یہاں کے شاہی زمینداروں کو سو ۱۰۰ سو ۱۰۰ اور پانچسو پیادے رکھنے کی اجازت حاصل تھی۔ برائے نام شاہی تابعدار کہلاتے تھے ورنہ آزادی سے گزر بسر کرتے تھے
(تاریخ مراد آباد ص ۳)

۱۶۲۶ میں کھٹیاروں کا راجہ رام سنگھ کمایوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ کمایوں کے راجہ نے سلطان شاہ جہاں سے مدد چاہی۔ شاہ جہاں نے رستم خان دکنی کو رام سنگھ کے زور کو فرو کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس وقت سنبھل کا گورنر تھا یہ حکم اس کو سنبھل پہونچا۔
رستم خاں دکنی ایک بہادر سپاہی اور مایہ ناز جرنیل ہی نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑا مدبر اور منتظم حاضر دماغ بھی تھا اس کے کارناموں سے اس کی شخصیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نے شاہی حکم ملتے ہی اپنی فوج کے ہمراہ قلعہ چوپلہ پر قبضہ کرلیا۔ اور راجپوتوں کو جنگ میں شکست فاش دی۔ اور راجہ رام سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔
یہ فتح گورنر سنبھل کیلئے باعث اعزاز و ترقی و مسرت ثابت ہوئی اسی فتح کی یادگار میں چوپلہ پر ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جو شہر مراد آباد کی جامع مسجد ہے، اور اسی جگہ کا نام رستم نگر رکھا۔ (سنبھل سروے ص ۶۰)
جب رستم خاں دکنی کی بہادری و کامرانی و فتح کا حال مغل شہنشاہ شاہ جہاں کو معلوم ہوا تو رستم خاں کو فوراً مغل دربار میں حاضری کا حکم ملا۔ ممکن ہے کہ شاہی حکم سے

زیادہ کام کرنے اور نئے شہر کا نام اپنے نام پر رکھنے پر باز پرس کرنے کیلئے حکم شاہی ملا ہو۔ اور اس وقت شاہی احکامات سے زیادہ عمل کرنا حکومت وقت کے خلاف ہو۔

رستم خاں شاہ جہاں کے حکم کے مطابق حاضر دربار ہوا چونکہ رستم خاں بہت حاضر دماغ دوراندیش تھا اس نے ابتداءً گفتگو میں کہا میں نے تو نئے شہر کا نام شہزادہ مراد کے نام پر رکھا ہے اسی وقت سے نئے شہر رستم نگر کا نام مراد آباد ہو گیا۔

(تاریخ مراد آباد ص ۳ سنبھل سروے ص ۶۰ و ۶۱)

جامع مسجد مراد آباد:

رستم خاں دکنی اچھا جرنیل ہونے کے علاوہ ایک بہترین منتظم اور عمارتوں کا دلدادہ تھا، مغل شہنشاہوں کے طرز پر عمارتوں کا شوقین تھا، نیز شاہ جہاں کا مزاج شناس تھا۔ جب دیکھا کہ بادشاہ کو تعمیرات کا شوق ہے تو اس نے بھی شہر کی بنیاد ڈالی اور مراد آباد میں قلعہ تعمیر کرایا۔ نیز جامع مسجد مراد آباد کی تعمیر کرائی۔ اسی جامع مسجد کے درمیانی دروازہ پر ایک کندہ تاریخ نصب ہے۔

(قطعہ تاریخ)

بنودہ　در　مراد آباد　مسجد
کہ بدبس کافر و ھندو درآنجا
شہ عادل شہاب الدین غازی
بہ رستم خاں عطا فرمودہ آں را
بنا فرمود عالی قدر خانی
در آں مسجد رعنا و زیبا
بنائے دین خود را کرد محکم
بدنیا دیں　خودرا کرد برپا

پئے تاریخ او ہر نکتہ دانے
شد در بحر فکر از طبع رعنا
ز دانایاں یکے زاں بحر معنے
بروں آورد لولوی مصفا
در خشندہ دری اینست بشنو
ز احراری نہ از خضر و مسیحا
کہ رستم خاں ز الطاف الٰہی
بنائے خانہ دین کرد بالا

۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں یہ مسجد غیر آباد ہوگئی تھی اور اس میں تعزیہ رکھا جانے لگا۔ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۸ء کے قریب دریائے رام گنگا کی طغیانی سے محفوظ رکھنے کے لئے دو پائے مع برجیاں تیار کی گئیں۔

شہر کی جامع مسجد قرار دی گئی۔ اس وقت حضرت مولانا عالم علی صاحب نگینوی جو محدث حضرت شاہ محمد اسحاق دھلوی کے شاگرد تھے رام پور میں پڑھاتے تھے۔ قاضی شہر جناب امداد حسین نے جناب نواب کلب علی والی رام پور کے ذریعہ ان کو امام شہر مقرر کیا، ان کے بعد صاحبزادگان میں مولانا قاسم علی اور مولانا دائم علی بھی امام شہر رہے۔

۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں اولہ باری ہوئی اور سخت زلزلہ سے مسجد کا جنوبی مینارہ شہید ہو گیا ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں توسیع کی گئی سہ درہ کے بجائے ہفت در ہوئی۔ مرزا احمد شاہ بیگ روہیل کھنڈی نے ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے۔
(سنبھل سروے ص ۶۱)

شاہ دھلی جب ہوئے شاہجہاں
تب ہوا تعمیر مسجد کا نظام

باعث تعمیر رستم خاں ہوئے
جس کے باعث آج تک ہیں نیک نام
مولوی قاسم علی کے عہد میں
وسعت مسجد نے پایا اہتمام
صحن کی وسعت ہوئی اور در بڑے
ہو گیا اک حوض کا بھی انتظام
مولوی دائم علی نے جہد کی
اور ہوا مسجد کا کافی انصرام
اس قدر وسعت بھی نا کافی رہی
در میاں جمعہ و ماہ صیام
ایک درجہ اور مسجد کا بڑھا
فضل حق سے وہ بھی ہو گیا تمام
سال تکمیل اس کا جو ہر نے لکھا
مسجد کا ہے کرد گار خاص و عام
دوسری تاریخ میں اک پند ہے
روح بانی جس سے ہوئی شاد کام
ذات رستم خاں نے اس کی
نام رستم خاں سے پایا اختتام

اس مسجد کا محل وقوع رام گنگا ہے اور اونچائی پر ہے۔ صبح و شام کے اوقات میں ٹھنڈی ہوا محسوس ہوتی ہے، برابر توسیع ہوتی رہی ہے۔ آج ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے۔

(تاریخ مرادآباد ص:۵، سنبھل سروے ص:۶۱)

مرمت جامع مسجد سنبھل:

رستم خاں دکنی نے نہ صرف شہر مرادآباد کی جامع مسجد تعمیر کرائی بلکہ سنبھل کے نواح میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جامع مسجد سنبھل کی رستم خاں نے مرمت کرائی جس کی جنوبی محراب میں پتھر پر تاریخ کندہ ہے۔

مسجد جامع زہر سو سر بسجدہ کردہ بود
بہر پر پا ساختن خاں کریم نیک خو
حکم فرمودہ کہ تعمیرش بصد خوبی کنند
ہر کہ بشند از دل و جاں صد دعا کردہ براو
چو از تاریخ اورا ہاتف شیریں سخن
ہاتف بلطف وعنایت شد چو بامن رو برو
خان دین پرور بہادر رستم فیروز جنگ
سجدہ گاہ خلق کردہ ہاتف این گفتگو

اس پتھر پر ایک شعر کے نیچے یہ تاریخ ۱۰۶۷ھ برآوردہ حروف ہے۔

جامع مسجد تزین کرد
نہاد نیک خطاب رستم خاں
بنوشت اسعدی تاریخش سال
داد الٰہی خانہ رونق

رستم سرائے:

۱۰۵۷ھ میں رستم خاں دکنی نے مرادآباد اور سنبھل کے وسط میں گاگن کے پل کے نزدیک ایک آبادی کرائی جس کا نام رستم سرائے رکھا، اور سنبھل کی عیدگاہ بھی تعمیر کرائی جس کا تفصیلی ذکر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور سنبھل میں ایک رستم پورآباد کیا۔

(تاریخ مرادآباد، ص: ۸)

فیروز پور کا پل:

سید فیروز رستم خاں دکنی کا مشیر خاص اور اس کی حکومت کا دارومدار یا باگ ڈور سید فیروز پر تھی، جب باہم تعلقات میں بگاڑ آگیا۔ تو سید فیروز رستم خاں کی خدمت انجام دہی سے قاصر رہے۔

۲۳ رصفر دربار شاہجہانی سے سید فیروز کو ایک ہزار بیگہ آراضی جاگیر عطا کی گئی۔ یہ آراضی سنبھل اور قصبہ سرسی کے درمیان سوت ندی کے کنارے تھی۔

فرمان شاہی پر رستم خاں بہادر فیروز جنگ تحریر ہے

وہاں سید فیروز نے ۱۰۶۵ھ میں اپنی سکونت کیلئے ایک چھوٹا مگر خوشنما و مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ جس کی بعض عمارتیں عالیشان۔ دروازہ مسجد و مقبرہ آج بھی موجود ہے اس مقام کا نام اپنے نام پر فیروز پور رکھا۔ سوت ندی کا پل بھی فیروز پل کے نام سے مشہور ہے جب اس پل سے گزرتے ہیں تو قلعہ کے کھنڈرات نظر آجاتے ہیں۔ سید فیروز کی قبر بھی اسی مقام فیروز پور میں ہے۔ یہ قلعہ اب سے ڈیڑھ صدی قبل آباد تھا اب ویران ہے۔

حسن پور:

حسن خاں اور رکن الدین دو بھائی تھے اور دونوں بھائی شاہی منصب عہدیدار بھی تھے۔ یہ شیخ رکن الدین جناب نواب بہادر خان بانی قصبہ بہادر گڑھ ضلع میرٹھ اور بانی ضلع شاہجہاں پور کے نانا تھے اور خود درویش صفت تھے، شیخ رکن الدین نے اپنے نام پر رکن الدین سرائے آباد کی جو سنبھل کی ایک سرائے ہے۔ دوسرے بھائی حسن خاں بھی عہدیدار تھے اور ان کو شاہی خطاب مبارک خاں ملا تھا۔ مراد آباد کے جغرافیہ میں ان کا نام مبارک خاں تحریر ہے۔ اس قصبہ حسن پور میں گوشائیں آباد تھے۔ ان پر تسلط حاصل کر کے نکالا اور اپنے نام پر حسن پور رکھا۔ یہ ضلع مراد آباد کی تحصیل ہے۔

اور سنبھل سے بسوں کے ذریعہ آمد ورفت ہے حسن پور سے نومیل پر دھلی ریلوے لائن پر گجرولہ جنکشن اسٹیشن ہے۔ یہاں کے بنئے بہت خوشحال ہیں۔

اسلام خاں اور سنبھل:

اسلام خاں عہد شاہ جہانی کے رستم خاں دکنی گورنر سنبھل کے فرزند عزیز ہیں۔ رستم خاں دکنی جو عہد شاہ جہاں ومغلیہ دور حکومت میں ۲۵ سال تک سنبھل کے گورنر رہے۔ سنبھل میں بہت سی عمارات آپ کی تعمیر کردہ ہیں۔ قصبہ اسلام نگر جو ضلع بدایوں کی تحصیل بسولی کا تھانہ ہے یہ قصبہ عہد مغلیہ مین سرکار سنبھل کے تابع تھا۔ اس کا پہلا نام نیودھنا تھا۔ رستم خاں نے اپنے لڑکے اسلام خاں کے نام پر اس کا نام اسلام نگر رکھا یہ قصبہ بدایوں سے ۲۴ میل پر ہے۔ (شاندار ماضی، ج:۴، ص:۲۴۱)

امیر الدولہ۔ امیر الملک نواب امیر خاں سنبھلی:

نواب محمد امیر خاں محلہ نواب خیل سرائے ترین سنبھل میں ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے آپ کے والد محترم کا نام محمد حیات ہے، سلسلہ نسب اس طرح ہے محمد امیر خاں بن محمد حیات خاں بن طالع خاں بن مولی خاں بن علی خاں ان کے جد اعلی قیس عبدالرشید تھے۔ جو افغانوں کا ایک وفد لے کر آنحضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے افغانستان واپس ہو کر وہاں بدھ مت اور آتش پرستوں میں اسلام پھیلایا۔ (تاریخ ٹونک ص ۷)

ہندوستان آمد:

اس خاندان کے پہلے فرد طالع خاں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور سرائے ترین سنبھل میں سکونت اختیار کی ان کے فرزند محمد حیات خاں جو امیر خاں کے والد ہیں۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۲۸)

محمد حیات خاں:

سرائے ترین کی قدیم آبادی صرف محلہ کوٹلہ ہے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد کے مشائخ چشت میں شاہ فتح اللہ ترین خلیفہ شیخ سلیم چشتی سنبھل آئے اور سرائے ترین محلہ دربار میں بود و باش اختیار کی سرائے ترین کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ قدیم سے پست جگہ رہی ہے۔ یہاں کے باشندے اقتصادی اعتبار سے کمزور ہیں اور مزدور طبقہ کی اکثریت رہی ہے۔ جو یہاں ہے۔ محمد حیات خاں ایک کاشت کار تھے۔ خاندانی سرمایہ داری حاصل نہیں تھی۔ محلہ دربار میں مستقیم خاں کی تعمیر کردہ عمارت جو (بنگلہ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قرآن کریم و دینیات کا درس دیتے تھے۔ والد محمد حیات خاں کی غربت ان کی تعلیم میں مانع ہوئی۔ اس زمانہ میں تعلیم کا چرچہ بہت کم تھا۔ آپ کی جو علوم حاصل کرنے کی عمر تھی وہ دوسرے مشاغل میں صرف ہوئی علوم مروجہ حاصل نہیں کر سکے۔ ابتدا ہی سے سپاہ گری کا شوق ہوا۔ اور اس فن میں کافی مہارت و مناسبت حاصل کر لی۔ سرائے ترین میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی جنگ کے قاعدے کے مطابق صفیں آراستہ کرتے تھے۔ باقاعدہ تعلیم حرب کرتے۔ اور خود کمزور پارٹی کی طرف سے لڑتے اسے جتانے اور فتح کرانے میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے اور فتح یاب ہونے والی پارٹی کو بطور انعام اناج یا کوڑیاں تقسیم کرتے تھے۔ اور کچھ لڑکے مثل اردلی کے پالکی کے ساتھ چلتے تھے۔ حسب حیثیت ان لڑکوں کو سپہ سالاری اہلکاری اور چوبداری کے عہدے دے کر ان کی دلجوئی کا لحاظ کرتے تھے غرض امیر خاں میں لڑکپن میں اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے لڑکپن کا زمانہ تو والد محترم کے سایہ عاطفت میں یوں گزرا۔

آغاز جوانی:

اب جوانی کا دور شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی کے تقاضوں و ضرورتوں نے تلاش معاش پر مجبور کیا ۱۲۰۲ھ میں قسمت آزمائی اور کشور کشائی کیلئے سرائے ترین سنبھل سے

باہر نکلنے کے شوق نے بے چین کر دیا۔ والد محترم سے باہر جانے کی اجازت طلب کی مگر محبت پدری مانع رہی (تاریخ ٹونک ص ۸) صبر و تحمل کے ساتھ والد کی رضا کے متلاشی رہے۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تو ایک دن والد کی اجازت کے بغیر سنبھل سے نکل پڑے اور لکھنؤ پہنچے مگر ناکام واپس ہوئے پھر غلام قادر خاں روہیلہ کی فوج کے ساتھ میرٹھ تک جانا ہوا۔ لیکن مقصد میں ناکام رہے تقدیر ان کی صبر کی آزمائش کرتی رہی تب ہونہار نوجوان نے یہ سمجھ کر کہ والد کی رضامندی حاصل کئے بغیر کامیابی مشکل ہے، سرائے ترین واپس آ کر والد کی اجازت تک باہر جانے کا ارادہ موقوف کیا۔

سپاہیانہ زندگی:

بیس برس کے اقبال مند نوجوان نے والد سے رخصت چاہی باپ کے سامنے نوجوان بیٹے کا جوش شجاعت و سپہ گری و بلند ہمتی کو دیکھ کر بیٹے کی مفارقت گوارہ کی اور دعاء خیر دیکر سپرد خدا کیا۔ ۱۷۸۰ء میں چند اصحاب کے ساتھ کسب معاش کیلئے سنبھل سے نکلے راستہ میں سپاہی پیشہ اور طالب روزگار آدمی آپ کے ساتھ شامل ہوتے رہے۔ اور شامل ہونے والے نوجوان آپ کو جمعدار کہنے لگے یہ کسے معلوم تھا کہ آگے چل کر یہ اسلامی اقتدار کی قیادت کریں گے۔ غرض یہ چالیس رفقاء ہو گئے اور پہلے متھرا پہونچے۔ وہاں راجہ سندھیال کی طرف سے دو بائی خیمہ زن تھا۔ نوجوانوں کی بھرتی کرنے پر مامور تھا۔ ان رفقاء نے اپنے کو بھرتی کیلئے پیش کیا۔ دوبائی صاحب نے ان میں سے چند کا انتخاب کیا مگر امیر خاں کو کم عمری کے سبب نہیں لیا بقیہ ساتھی وہاں سے روانہ ہو کر دہلی ہوتے ہوئے علاقہ ریواڑی میں چلے گئے کچھ عرصہ مختلف سرکاروں جیسے نجف علی قلی خاں کی سرکار اور مانکھ سنگھ کی ملازمت گزار کر جودھپور، پالن پور گجرات۔ ہوتے ہوئے سورت پہونچے اسی دن ایک پنڈت راجہ (گائیکواڑ ریروده) کی طرف سے ۴۰ سوار لے کر سورت آیا ہوا تھا۔ انگریزوں سے چوتھ وصل کرنے

کیلئے نیز اپنی قوت بڑھانے کیلئے نوجوانوں کو بھرتی کررہا تھا۔ اس وقت امیر خاں کے ہمراہ ۲۰۰ سوار تھے۔ شب میں امیر خاں پنڈت سے جا ملے۔ پنڈت نے آپ کو مع ساتھیوں کے اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا۔ امیر خاں نے پنڈت سے معلوم کیا۔ کہ ہم کو کس کام کے لئے ملازم رکھا ہے۔ وہ بتائیں۔ پنڈت نے بتایا کہ انگریز مجھے کمزور سمجھ کر ۲ر برس سے چوتھ ادا نہیں کر رہے ہیں اس موقع پر امیر خاں کے ساتھ ۳ سو جوانوں کا جتھا تھا۔ امیر خاں نے بہادرانہ کام انجام دیا۔ جس سے انگریز سمجھا کہ ان کے ساتھ بڑی جمعیت ہے۔ مرعوب ہوگیا پنڈت سے ملا، اور ۳ برس کا چوتھ ادا کر دیا پنڈت نے طے شدہ رقم کے علاوہ انعام دے کر امیر خاں کے ساتھیوں کو رخصت کیا۔ (تاریخ ٹونک ص ۸) اب تک آپ کے ہمراہ ۲۰۰ سپاہی تھے۔ مذکورہ سرکاروں میں ملازمت کے بعد خود اپنی ایک جمعیت پیدا کر لی۔ اور اپنی لیاقت و شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔ اور بارہا اپنی قلیل جمعیت سے بڑی فوج کا مقابلہ کیا۔ اور بڑے بڑے لشکروں کو شکست دی۔ آپ کی طاقت و جمعیت روز بروز بڑھتی گئی 1215ھ میں ستر، اسی ہزار سوار پیادہ آپ کے ہمراہ تھے۔ ۱۲۳۰ھ میں امیر خاں نے اپنے ایک امیر سپاہی محمد اکبر خاں کو پچاس ہزار پیادے اور بارہ ہزار سوار سپرد کیے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۲۸)

امیر خاں کی ذاتی صلاحیت:

آپ خاندانی سرمایہ دار، سپہ سالار و نواب بھی تھے لیکن خداداد جو صلاحتیں آپ کے اندر رونما ہوئیں وقت کا مبصر ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جن کی لیاقت اور فوجی اہمیت کی شہرت کچھ ہی ایام میں دور دور تک پہنچی، معرکہ آرائی اور جنگ کے نشیب و فراز سے خوب واقف کار ہو چکے تھے اور معرکہ آرائی میں آپ کی شمولیت فیصلہ کن ثابت ہوتی تو بادشاہوں نے اور حاکموں نے اپنے یہاں طلب کیا ۲۵ سال تک مختلف مقامات کو جنگ آزمائیوں کی جولانگاہ بنائے رکھا انیسویں صدی کے آغاز میں روہیل کھنڈ کی جو جمعیت آپ کے ساتھ تھی ہندوستان بھر میں اس سے بڑی کوئی

طاقت نہیں تھی اگر چہ دکن میں نظام شمالی ہند میں اودھ کی سلطنت وسط ہند اور دکن میں مرہٹوں کی روایتیں قائم تھیں اور انگریز کی طاقت جس کا ستارہ عروج پر تھا ان میں سب سے بڑی طاقت امیر خاں سنبھلی کے ساتھ تھی بڑی بڑی ریاستیں آپ کی یلغار سے لرزہ براندام رہتی تھیں۔ اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کا بہترین فوجی عنصر اور تازہ خون اور وقت کے بہت سے شاہین وشہباز تھے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۲۸)

سید احمد شہید نواب امیر خاں کی رفاقت میں:

سید صاحب کے پیش نظر جو مقاصد تھے ان کی سربراہی اور عملی مشق و تربیت متقاضی تھی کہ عملی معرکہ آرائی اور میدان جنگ اور اس کے نشیب و فراز سے گذر کر جنگ کا عملی تجربہ حاصل کریں ضروری ہوا کہ ایسی شخصیت جس کی رفاقت میں رہ کر سید صاحب کو اپنے مقصد عظیم واقامت جہاد میں قوت و تجربہ حاصل ہو تو ہندوستان میں اس وقت صرف ایسی طاقت نواب امیر خاں سنبھلی کی تھی نواب امیر خاں کا لشکر دہلی سے دور دراز فاصلہ پر ہونے کے باوجود سید صاحب دہلی سے روانہ ہو کر نواب کے لشکر میں شامل ہو گئے (تفصیل دیکھئے امیر نامہ میں) اور یہ لشکر عظیم مختلف مقامات جیسے جے پور۔ جودھ پور۔ بھانپور۔ اجمیر، بیکانرو وغیرہ اور ان کے درمیان کے صدہا مقامات و قصبات ہمیشہ اس لشکر کی زد میں رہتے تھے اور یہ لشکر اپنے مقاصد میں کامیابی کیلئے بے آب و گیاہ ریگستان گھنے، جنگل ہر گرم و سرد سے گزرتا بیماری فاقہ تنگی، خطرہ، فتح و شکست، قلت و کثرت افواج غرض جنگ کے ہر نشیب و فراز سے سابقہ پڑتا ان تمام حالات میں سید صاحب نے نواب کی رفاقت و لشکر میں چھ سال گزارے اور نواب نے سید صاحب کے ساتھ برادرانہ معاملہ کیا۔

(سیرت سید احمد شہید ص ۱۲۹ و ص ۱۳۴)

نواب امیر خاں کی خصوصیات:

ذاتی دلیری، یا نرمی، جفاکشی اور قوت برداشت، رفیقوں کے ساتھ حسن سلوک فیاضی، اولوالعزمی اور سپاہیانہ اوصاف میں وہ تاریخ کے قدیم فوجی سرداروں اور بانیان سلطنت کا نمونہ تھے (سیرت سید احمد شہیدؒ، ص: ۱۲۹) نواب کی صوفیانہ زندگی تھی اس دور کی پرسکون زندگی کا حق ادا کیا ایک دفعہ تلوار میان میں رکھنے کے بعد پھر کبھی باہر نہیں نکالی اور اپنی زندگی میں واحد دلچسپی تقویٰ میں تھی۔ نیک تو ابتدا ہی سے تھے کہ انہوں نے داڑھی کبھی نہیں منڈوائی نماز کے پابند شراب کبھی نہیں پی شب میں عبادت اور دن میں ہمیین کرتے۔ (ص ۲ تاریخ ٹونک)

نوٹ: نواب امیر علی خاں کی فتوحات کو اسلامی فتوحات ہند کی آخری کڑی سمجھا جاتا ہے۔
(ایضاً ص ۳)

نواب امیر خاں کی یادگار: چونکہ آپ کا وطن سرائے ترین سنبھل تھا حب الوطن من الایمان کے مطابق آپ کو سرائے ترین سے آخر دم تک تعلق رہا آپ نے محلہ دربار میں شاہ فتح اللہ ترین کے مقبرہ کا بڑا عالیشان صدر دروازہ تعمیر کرایا جس میں چند کمرے اور دو منزلہ عمارت ہے عرس کے ایام میں اس عمارت میں نقارہ بجتا تھا آج بھی یہ عمارت اپنے حال پر باقی ہے اور اس کو دیکھ کر نواب کی یاد تازہ ہوتی ہے آج تک اہل ٹونک و سرائے ترین کے مابین قرابت کا سلسلہ جاری ہے نواب کی بہن کانی خدیجہ کی نسل محلہ نواب خیل میں موجود ہے جہاں نواب کی بہت سی جاگیریں تھیں وہیں سرائے ترین کا بازار بھی انہی کی ملکیت میں تھا۔

کانی خدیجہ:

نواب امیر خاں ولد محمد حیات خاں قیام سرائے ترین سنبھل میں غربت کا شکار تھے ان کی ایک بہن تھیں جن کا نام خدیجہ تھا شکل وصورت میں خوبصورت نہیں تھیں آنکھ

میں بھی نقص تھا جس کی وجہ سے کہیں سے شادی کا پیغام نہیں آتا تھا تقاضائے بشری یا حق تعالی نے انسان کا جوڑا بنایا ہے۔ان کی شادی نرولی کے ایک معمولی مزدور کے ساتھ کر دی گئی موصوفہ حقوق زوجیت کے فرائض کی بجا آوری گمنامی وتنگ دستی کی زندگی سے بسر کرتی رہیں اور ادھر امیر خاں کے کارنامے ایک دن رنگ لائے کہ انگریز سے مصالحت پر ٹونک کی ریاست کے مالک ہو گئے تب ہر چہار طرف سے اطمینان والی اور پر سکون کی زندگی نصیب ہوئی۔

خدیجہ بہن:

یاد آئیں تو نواب صاحب بے چین ہو گئے اور بہن خدیجہ کے پاس کافی مقدار میں نقدی اور ہر قسم کی اشیاء چند مخصوص لوگوں کے ساتھ مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں اپنی بہن و بہنوئی کی خدمت میں بطور تحفہ نرولی روانہ کئے قاصدین کا لشکر شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ سفر کر کے نرولی داخل ہوا اور نواب کے بہنوئی کا نام و گھر معلوم کرتے ہیں تو ہر شخص لاعلمی کا اظہار کرتا ہے کیونکہ بہنوئی غربت کی وجہ سے غیر متعارف تھے نیز شاہی جاہ وجلال دیکھ کر خیال گزرا ہوگا کہ نواب صاحب کے بہنوئی کوئی بڑی شخصیت ہوگی اس وجہ سے بھی ان کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا جب قاصدین نے نواب کی بہن کا نام سے تعارف کرایا کہ سرائے ترین سنبھل سے ان کی شادی ہوئی ہے محمد حیات خاں کی لڑکی ہیں تب ان کے مکان پر پہنچایا،نواب کے بہن بہنوئی سپاہیوں کو دیکھ کر ڈر گئے ان کو بتایا کہ آپ کے بھائی امیر خاں ٹونک کے نواب بن گئے ہیں وہ تب بھی نہیں سمجھیں کیونکہ قیام سرائے ترین سنبھل میں بچے مروا کہا کرتے تھے اب کہتی ہیں کہ امیر خاں نواب ہو گیا ہے۔قاصدین نے تفصیل بتائی تو حسب حیثیت ان کی ضیافت کی چونکہ مکان غیر محفوظ چھپر کا تھا خدیجہ بہن نے کہا کہ اس مال واسباب کی یہاں رہ کر حفاظت نہیں ہو سکتی میں اپنے میکے سرائے ترین چلتی ہوں

قاصدوں اور سپاہیوں کے ہمراہ سرائے ترین پہنچ کر ایک مکان تعمیر کرایا وہیں بود باش اختیار کی ان کی اولاد میں نواب شمس الدین تھے جو سخاوت میں ضرب المثل ہیں اور ان کی سخاوت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں محلّہ نواب خیل میں ان کے خاندان کے افراد آج بھی پائے جاتے ہیں آپ کی جاگیر ۷۵ گاؤں تھے۔

نواب امیر خاں کی انگریز سے مصالحت:

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں نواب امیر خاں خود مستقل بڑی جمعیت و طاقت کے مالک تھے نواب امیر خاں کا عزم ہندوستان سے انگریزوں کو نکال کر اس پورے ملک میں حکمرانی کا تھا (سیرت سید احمد شہید) بایں وجہ نواب انگریزوں کے حریف و برسر جنگ رہے ۱۸۰۰ء میں اس وقت ہندوستان کی تمام قابل ذکر طاقتیں ختم ہو چکیں تھیں اور جو ختم نہیں ہوئی تھیں وہ مفلوج ہو کر انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی ایسی بڑی طاقت بن گئی کہ اب پورے ملک میں ہندوستانی سیاست انگریزوں کی مخالفت یا حمایت میں منقسم ہو گئی۔ (شاندار ماضی جلد نمبر ۲ ص ۱۷) اس سے قبل ہندوستانی گروپ بندی کا رخ قوم و مذہب جیسے مرہٹہ، پٹھان، راجپوتانہ، شیعہ سنی کی بنیاد پر تھا، لیکن انگریزوں سے معاہدہ کے بعد گروپ بندی انگریزوں کے مخالفت یا حمایت ہو گئی۔ ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کا زور تھا ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے سلطان ٹیپو کو ختم کیا ہندوستانی تمام طاقتوں کو کمزور کرنے کے بعد اپنے اقتدار کو مستحکم کر کے برسر جنگ رہے آخر ۱۸۰۳ء میں دہلی فتح کی دھلی کے بعد اس وقت کی سب سے بڑی طاقت نواب امیر خاں اور جسونت راؤ ھکر کی طاقت کو کمزور کیا تو یہ طاقتیں بھی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئیں، لیکن انگریزی اقتدار کے خلاف ان کی کوشش برابر جاری رہی، چند سال بعد یہ کوششیں بہت نازک حقیقت بن کر سامنے آئیں لیکن نواب

امیر خاں اور جسونت راؤ ھلکر کی شکست خوردہ طاقت نے پھر سنبھالا اور ہندوستانی دوسری تمام طاقتیں ایک دفعہ پھر انگریز کے خلاف میدان جنگ میں آ گئیں ہندوستانی حکمرانوں اور انگریزوں کی قوت آزمائی اور جدوجہد کا یہ ۱۸۰۸ء سے آخری اور نازک دور شروع ہوا تھا۔ اسی موقع پر سید احمدؒ حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایماء سے نواب امیر خاں کے لشکر میں بھرتی ہوئے جب کہ حالات کا تقاضا ہوا کہ ہر باشندہ ملک انگریزوں کے خلاف جنگ جو سپاہی بن جائے تو آپ کی سپاہیانہ طبیعت کی مناسبت سے شاہ عبدالعزیز نے ان کو نواب امیر علی خاں جسونت راؤ ھلکر کی فوج میں بھرتی کرنے کے لئے بھیج دیا۔ (شاندار ماضی جلد نمبر ۲ ص ۸۶۔۸۷)

چھ سال تک سید احمد شہید آپ کے لشکر میں رہے ۱۲۲۱ھ میں جب جنرل ملک صاحب نے موٹھی صاحب ناظم بندیل کھنڈ کے نواب کے پاس پیغام بھیجا کہ اورنگ آباد میں جس قدر ملک واسلی وغیرہ آپ کو دینا چاہا تھا۔ اس پر تیرہ لاکھ روپیہ کا ملک اور اضافہ کر کے ہم دینا چاہتے ہیں آپ اسے قبول کرلیں اور اس تخت و تاج سے باز آئیے تو نواب نے جواب دیا کہ ہمارا عزم ہے کہ تمام ہندوستان پر حکمرانی کریں۔ اتنا سا ملک و مال کیوں لیں۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۳۶)

نواب صاحب انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے پر آمادہ تھے ۱۸۰۰ء کے آخر میں جب لارڈ میک انگریزی فوجوں کو لے کر دھلی کی طرف بڑھا تو اس وقت سندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی محافظ تھیں۔ انہوں نے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔ لارڈ میک نے دھلی پر تسلط حاصل کیا پھر امیر خاں اور ہلکر آگے بڑھے مگر دھلی کے محاذ پر ان کی بھی شکست ہوئی تو سکھوں کی مدد حاصل کرنے کے لئے امرتسر پنجاب۔ رنجیت تک پہنچے۔ یہاں نواب صاحب کو مالی امداد تو ملی مگر فوجی امداد کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ امیر نامہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ پٹیالہ سے اس عزم پر نہضت کی رنجیت سنگھ سے سازش کر کے انگریزوں پر لوٹیں اور

اگر ساتھ نہ دیں تو شاہ شجاع الملک بادشاہ کابل سے ملیں شاہ کے ظل حمایت میں معاندین سے انتقام لیں (سیرت سید احمد شہید ص ۱۴۳)

۱۲۲۱ھ میں جب ہلکر نے انگریزوں سے مصالحت کی ابتدائی بات چیت کی تو نواب صاحب سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ رنجیت سنگھ میں ہماری امداد کرنے کی ہمت نہیں اور شجاع الملک کے لانے کے لئے وہاں تک پہنچنے کا ہمارے پاس خرچ نہیں ہے آپ کی کیا رائے ہے۔ اس پر نواب صاحب نے جواب دیا کہ رنجیت سنگھ وغیرہ میں ہمت نہ سہی میں کابل جاتا ہوں۔ بہر طور شاہ کابل کو ملک پر لاتا ہوں فی الوقت ہمارے پاس دس پندرہ لاکھ روپیہ کے جواہر موجود ہیں یہ شاہ کو دوں گا۔ اور باقی دھلی لکھنؤ سے وصولی کر کے دینے کا اقرار کروں گا۔ اور انگریزوں کو ہند سے نکالوں گا۔ مہاراجہ ہلکر نے پھر کہا کہ اگر شاہ آپ کی دعوت پر نہیں آئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ کچھ پرواہ نہیں اٹک جا کر اپنے ہم وطن ہم قوم پٹھان کو جمع کروں گا۔ اور لاکھوں یوسف زئی ساتھ لے کر لوٹوں گا۔ اس میں شک نہیں کہ نواب امیر خاں بلند ہمت تھے۔ اور انگریزوں سے ہندوستان خالی کرانے کی طاقت بھی تھی۔ کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن انگریز رفتہ رفتہ بر سر جنگ طاقتوں کو اور ریاستوں کو توڑتے رہے۔ اور خود ان کے حالات کوتاہ نظری بے نظمی اور رفیقوں کی خود غرضی ان کو اس بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ مصالحت پر مجبور کرتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۱۷ء میں ایک طرف پیشوا نے انفنسٹن کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد سندھیا نے بھی ایک معاہدہ صلح پر دستخط کر دیے بالآخر ۶ رجنوری ۱۸۱۸ء کو نواب صاحب کے رفیق قدیم ہلکر نے بھی مصالحت کر لی۔ اور نواب امیر علی خاں تن تنہا رہ گئے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۴۴) نواب امیر علی خاں کی یلغار سے بڑی بڑی طاقتیں وریاستیں لرزہ بر اندام رہتی تھیں۔ ہندوستان میں اس وقت مالک ہونے کے باوجود خود اولوالعزم شخص تھے۔ لیکن انگریزوں کی چالاکی اور نواب صاحب کی سادہ لوحی کی بنا پر نواب صاحب کو قدم ٹیکنے پڑے۔

سنبھل روھیلوں کے زیر تسلط:

نواب علی محمد خاں جن کا تذکرہ چند عنوانات کے تحت گوش گزار ہو چکا ہے۔ جو داؤد خاں بن شاہ عالم خاں کے منشی تھے، آگے چل کر نوابان رام پور کے مورث اعلیٰ ہوئے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد فوراً ان کا بیٹا معظم نامی ہندوستان کے تخت پر مئی ۱۷۰۷ء میں بیٹھا اور بہادر شاہ کا لقب پایا۔

جو اپنی کمزوری کی بنا پر عظیم سلطنت پر قابو نہیں پا سکا جس سے سلطنت مغلیہ کمزور ہو گئی بد نظمی کا دور شروع ہوا اور سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ گویا حکومت مغلیہ کا آخری دور تھا۔ تو محمد علی خاں نے افغانوں کے گروہ جو تلاش معاش میں ہندوستان آئے تھے۔ انہیں اپنے زیر اثر کر کے بڑی جمعیت وقوت حاصل کر لی تھی۔ ہزاروں آدمی اور جانسٹھ کی فتح کے بعد نواب علی محمد خاں نے لقب پایا نادر شاہ کے ہندوستان پر حملہ کے بعد فرار شدہ افغانی ان کے ساتھ جا ملے جس سے علی محمد خاں کی طاقت و جمعیت میں مزید اضافہ ہوا نواب محمد خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کیلئے بادشاہ نے مرادآباد کے گورنر راجہ ہرنند کو حکم دیا کہ روہیلوں کو ملک کٹھیر سے نکال دیا جائے راجہ ہرنند نے بریلی کے گورنر عبدالنبی کو اپنے ہمراہ لیا گورنر عبدالنبی نے کچھ عذر کیا لیکن راجہ ہرنند نے قبول نہ کیا اور اپنے ہمراہ 50000 کی شاہی فوج لے کر حملہ کیلئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا نواب علی محمد خاں ۱۲ ہزار جانباز روہیلوں کی جمعیت ساتھ لے کر اچانک شب میں شاہی فوج پر حملہ آور ہوا اور شاہی فوج کو سخت ہزیمت ھوئی اور دونوں گورنر بھی مارے گئے ۱۷۴۴ء میں نواب علی محمد خاں نے سنبھل امروھہ مرادآباد بریلی پر قبضہ کر کے اپنے زیر نگیں کر لیا اس کے بعد قمر الدین کے بیٹے میر منو کی شادی نواب علی خاں کی لڑکی کے ساتھ عمل میں آئی۔

آہستہ آہستہ علی محمد خاں کے کافی علاقہ زیر نگیں آ گیا ۱۷۴۶ء میں نواب علی محمد خاں کی اودھ کے نواب صفدر جنگ سے معرکہ آرائی ہوئی۔

اس طرح اسے پھر شاہی فوجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی کمان گڑھ مکتیشر کے والی محمد شاہ نے کی۔

علی محمد خاں نے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر خود کو بدایوں کے قریب مقام مکرو کے قلعہ میں محصور کرلیا۔

بادشاہ نے بنفس نفیس فوج کشی کی اور گڑھ مکتیشر کو عبور کر کے سنبھل کے علاقہ سے گزر کر نواب علی خاں پر حملہ آور ہوکر اپنے تسلط میں لے لیا ہمراہ دہلی لے جا کر چند ماہ نظر بند کر دیا۔

ننھے خاں حاکم سنبھل

۱۱۹۳ھ میں وزیر الممالک آصف الدولہ نے ننھے خاں کو حاکم سنبھل مقرر کیا۔ ننھے خاں کے خسر عمر حیات خاں بن روشن خاں تھے۔ اور ان کے صاحبزادے کا نام عامر خاں ہے۔ جن کا ذکر دوسرے عنوان کے تحت آگے آتا ہے۔ یہ وہی عمر حیات خاں ہیں جنکے نام پر حیات نگر آباد ہے جو سنبھل کے ایک محلّہ کی حیثیت رکھتا ہے سرائے ترین سے متصل ہے، بہجوئی، علی گڈھ اور آگرہ کو بسیں۔ یہیں سے گذر کر جاتی ہیں۔ حیات نگر سے متصل ایک باغ ہے جو فقیروں والا کہلاتا ہے۔ آج کل قبرستاں ہے۔ ان کی سکونت امروہہ تھی اور حیات خاں کے قبضہ میں بہت سی جاگیریں وموا ضعات تھے۔ امروہہ میں کئی عمارتیں حیات خانی پائی جاتی ہیں۔ ایک باغ حیات خاں والا اور ایک مسجد ان ہی کی طرف منسوب ہے۔ امروہہ محلّہ گذری کے سید حضرات سے حیات خاں کی کسی معاملہ میں ان بن ہوگئی اور معاملہ طول پکڑ گیا۔ یہاں تک کہ حاکم سنبھل اپنے خسر کی حمایت میں فوج کشی کر کے مخالفوں پر حملہ آور

ہوئے۔ خاص کر میر اسد الدین خاں سے مخالفت تھی ان کے اسباب کو خوب لوٹا اور چند لوگ مارے گئے۔

نواب کفایت اللہ خاں تحصیلدار سنبھل

۱۸۶۶ میں نواب کفایت اللہ خاں ولد نواب سیف اللہ خاں سنبھل کے تحصیلدار تھے حاکم ضلع کے لشکر گاہ کے باغ کی صفائی کے سلسلہ میں میڈ رسن کلکٹر اور مجسٹریٹ مراد آباد سے گستاخانہ گفت وشنید ہوگئی۔ جس کی وجہ سے نواب کفایت اللہ خاں ضلع بجنور تبدیل ہوگئے۔ حاکم ضلع مراد آباد (کلیکٹر) نے حاکم ضلع بجنور نے نواب کفایت اللہ خاں کی تخریب کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں وہ برخاست ہوگئے۔ ایک طرف مولوی عبد الہادی کے نواب سیف اللہ خاں دوست تھے۔

بعض لوگوں نے بطور حسد کے حاکم ضلع مراد آباد میڈ رسن کو مولوی عبد الہادی کی طرف سے کان بھر کے برانگیختہ کیا جس کے نتیجہ میں کلکٹر حاکم ضلع نے مولوی عبد الہادی سے تخلیہ میں کہا کہ نواب کفایت اللہ خاں تحصیلدار سنبھل نے جو کچھ ہم سے گستاخانہ گفتگو کی ہے وہ تمہارے اشارہ وسکھانے کی وجہ سے کی ہے کیونکہ اس کے باپ نواب سیف اللہ خاں تمہارے دوست تھے اور تم اس کو بجائے فرزند کے سمجھتے ہو۔

چونکہ اس نے جو گستاخی کی تمہارے اشارے اور کہنے سے کی لہٰذا تم استعفےٰ دیکر میرے پاس سے چلے جاؤ ورنہ تم کو اس مقدمہ قتل میں جو امروہہ میں ہوا ہے رکھدونگا۔ اور ابھی اس کے قاتل کا پتہ نہیں چل سکا ہے اس میں تم کو ماخوذ کرلوں گا۔ اس معاملہ میں تمہاری سازش کی یہ دلیل ہے۔ کہ قاتلان مشتبہ سادات امروہہ ہیں ان لوگوں سے تمہارا بہت ربط وضبط ہے۔ مولانا عبد الہادی صاحب نے صاحب کی میز پر سے کاغذ اٹھایا اور جو کچھ بن پڑا سب کچھ کہا کہ کوئی باپ اپنے صلبی بیٹے کو ایسی تعلیم جو کہ حضور کے دل میں رنجش کردے نہیں دے سکتا چہ جائیکہ وہ تو دوست کا بیٹا ہے اور نواب کفایت اللہ باشعور اور

تجربہ کار شخص ہے ایک مدت سے سرکار کا ملازم ہے نیز یہ شرفاء کا طریقہ بھی نہیں ہے۔ اگر حضور کا مقصد میرا استعفیٰ لینا ہے تو اس وقت حکم کے مطابق استعفیٰ دیدیں گے۔ چنانچہ لکھا۔ حضور کے زبانی حکم کے مطابق اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیتا ہوں امید ہے کہ منظور کیا جائیگا۔ مولانا نے اپنے دستخط بھی کردئے۔ کلکٹر صاحب نے کہا کہ دوسرا استعفیٰ لکھو اور حسب الحکم کی قید مت لگاؤ۔ چنانچہ مولانا عبد الہادی صاحب نے اس مضمون کا استعفیٰ لکھا کہ میں نے گورنر کی ملازمت نیک نامی دیانت داری اور خوشنودی حکام کے ساتھ تیس سال سے زیادہ مدت تک انجام دی۔ لیکن اب مجھے ملازمت کرنا منظور نہیں ہے اس لئے استعفیٰ دیتا ہوں۔ کلکٹر صاحب نے اسکو بھی سن کر فرمایا اسکو بھی چاک کردو۔ اور دوسرا استعفیٰ لکھو۔ کہ بخوشی خاطر ملازمت چھوڑ رہا ہوں اور استعفیٰ دیتا ہوں چنانچہ مولانا عبد الہادی صاحب نے اس کو بھی چاک کر دیا پھر ان الفاظ میں لکھا۔ چونکہ مجھے بالفعل ملازمت کرنا منظور نہیں ہے لیکن بخوشی خاطر بلا جبر واکراہ استعفیٰ دیتا ہوں۔ لکھ کر دستخط کردیئے۔

کلکٹر نے کہا لفظ بالفعل سے اگرچہ وجہ ظاہر ہوگئی ہے مگر خیر استعفیٰ دیجئے اور جایئے مولانا عبد الہادی بغیر سلام کئے استعفیٰ پیش کر کے گھر آگئے۔

(وقائع نصیر خانی ۶۶۔۶۷ مطبوعہ ایجوکیشنل کراچی)

داؤد خاں:

خداداد نے اخبار الصنادید، ص: ۵۷ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں شاہ عالم خاں اور حسن خاں دو بھائی افغانستاں سے ہندوستان کے علاقہ کھیڑ آئے اور یہاں ملازمت اختیار کرلی، اور زندگی بسر کرنے لگے۔ اس ملک میں بہت پہلے سے افغانوں کی آمد ورفت رہی ہے، بعض یہاں تجارتی سلسلہ میں آئے، اور بعض نے ملازمت اور صنعت وحرفت اختیار کی۔ لیکن اسے بدقسمتی کہیئے کہ ان دونوں بھائیوں کو اس ملک کی فضاء اور یہاں کے ہنگامے راس نہیں آئے۔

شاہ عالم کے یہاں ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

چنانچہ انہوں نے ایک خوبصورت لڑکے کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جس کا نام داؤد تھا۔ شاہ عالم اس لڑکے کو اپنے وطن افغانستان لے گئے۔ اور تجارت و دیگر ذمہ داریاں بھی داؤد کے سپرد کر دیں۔ جس کو داؤد بحسن وخوبی انجام دیتا رہا۔ اورنگ زیب کا بیٹا معظم بہادر شاہ کے عہد حکومت میں داؤد خاں افغانستان سے اپنے وطن کھیڑ آیا۔ خداداد آگے چل کر عمادالسعادۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ داؤد خاں وطن پہونچ کر تلاش معاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

چند روہیلے جو ملازمت کے سلسلہ میں یہاں آئے تھے۔ وہ انتہائی تنگ دستی اور افلاس کا شکار تھے۔ اور گردش ایام نے انھیں بھی اپنی آغوش میں جکڑ رکھا تھا۔ جب داؤد کی ملاقات ان لوگوں سے ہوئی تو اس نے ان سب کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اتفاق سے انہی دنوں ایک ہندو اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ رتھ کے ذریعہ گنگا اشنان کیلئے ہری دوار آیا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں مروارید، اور گردن میں طلائی طوق تھا، اور بازوؤں پر طلائی بازوبند بندھے ہوئے تھے۔ جس دن یہ ہندو بریلی کی طرف چلا جو اس کا وطن تھا تو چند روہیلے بھی ہری دوار سے اس کے تعاقب میں چلے داؤد خاں کے ساتھ تو روہیلے پہلے سے تھے۔ چنانچہ ان روہیلوں کو بھی ساتھ لیا اور اس ہندو کے رتھ کا تعاقب شروع کر دیا جب یہ قافلہ ایک ایسے جنگل میں پہونچا جہاں بانسوں کی گھنی جھاڑیاں تھیں، راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے سپاہی پیچھے رہ گئے۔ کیونکہ ان کے پاس سفر کا سامان بھی تھا۔ اور رتھ کے ساتھ صرف چھ سات آدمی تھے۔

داؤد خاں کا قافلہ تعاقب میں تھا ہی۔ انہوں نے موقع غنیمت جان کر سب کو گھیر لیا۔ اور انہیں وہیں ختم کر دیا اور تمام جواہرات اور طلائی زیور اتار لئے۔ اس رتھ میں ایک ٹپاری بھی رکھی ہوئی تھی جس میں نوے اشرفیاں تھیں وہ بھی اپنے قبضہ میں کیں، اور رتھ کو وہیں چھوڑا۔ رتھ کے بیل ایک روہیلے کے سپرد کئے۔ اور عام راستہ سے ہٹ کر جنگل میں داخل ہوئے اور اسی دن سے اپنی قیام گاہ بنائی۔ اور لوٹ مار شروع کر دی۔

آہستہ آہستہ تھوڑی مدت میں اتنی طاقت بڑھ گئی کہ اسی سوار اور تین سو پیادوں کی جماعت اکٹھی ہوگئی۔ اور ایک کچی گڑھی سکونت کیلئے اسی جنگل میں تعمیر کی۔ پھر خداداد۔ سید ولی اللہ مصنف تاریخ فرخ آباد کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس گڑھی کا نام سبگڈھ رکھا تھا۔

سلطان محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان میں حکومت کے ضعف کی وجہ سے علاقہ کٹھیر میں ہر ایک زمیندار خود مختاری اور خودسری کا دم بھرنے لگا۔ زمیندار افغانوں کی مدد سے باہم جنگ وجدل وفساد کرنے لگے نریت سنگھ تھام پیلی ضلع رامپور سوار کے قریب مدار سہائے اور چھمن چند موضع مدکر پرگنہ پر سیر وغیرہ میں نقارہ حکومت بجارہے تھے۔ داؤد خاں نے اتنی قوت پیدا کرلی تھی کہ اس کے ساتھ دو پٹھانوں کی جمعیت تھی۔ انہوں نے موضع مدکر پرگنہ پر سیر سرکار بدایوں کے زمیندار کے پاس پہنچ کر ملازمت کرلی۔ ادھر تعمیر کرلی کہ میدان رتن گڑھ نے ایک بار کنجن سنگھ زمیندار راجپوتانہ پرگنہ جو جو محلّہ پر حملہ آور ہوا اور خوب لوٹ مار کی۔

کنجن سنگھ نے مدار سہائے نے اور چھمن سے اس ظلم کا شکوہ کیا اور مدد چاہی۔ مدار اسہائے نے اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ بہت سے راجپوت اور پٹھانوں کو جمع کیا اور داؤد خاں کا نام بھی اس جمعیت میں شامل کر کے کنجن سنگھ نے کابر اور بانگونی کی خوب لوٹ مار کی۔ کھیم کرن بھاگ گیا۔

بہت سے آدمی اور مویشی پر قبضہ کرلیا

مدار سہائے نے ان سب قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ مگر ایک خوبصورت لڑکا جو موضع بانگولی میں داؤد خاں کے ساتھ آیا تھا مدار اسہائے کو اس کا علم نہیں ہوا تھا۔ یہ لڑکا داؤد خاں کے پاس رہا اس لڑکے پر شفقت پدری کی طرح فرزند کی سی پرورش کی اور اس کا نام علی محمد خاں رکھا۔ (ملک خداداد صفحہ ۱۷)

علی محمد خاں

داؤد خاں کی شہادت کے بعد مجلس مشاورت سرداری کے انتخاب کیلئے منعقد ہوئی۔ داؤد خاں نے صرف ایک لڑکا چھوڑا تھا۔ بہت ہی کم سن تھا۔ سرداری کی ذمہ داریاں بے شعوری کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ باتفاق رائے علی محمد خاں کو سردار کیلئے منتخب کیا گیا۔

علی محمد خاں بچپن ہی سے سپاہ گری، نیزہ بازی، تیراندازی، شہسواری، وغیرہ تمام ہنر میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ سردار داؤد خاں کی صحبت میں فنون سپاہ گری، اور ملکی سازشوں، سیاستوں، سے واقف کار اور ایسی تعلم پائی تھی کہ ایک آموزیدہ جرنل شمار کیے جا سکتے تھے۔

اور ان کے مزاج میں بچپن ہی سے سرداری کی بو تھی۔ اور لیاقت وصلاحیت بھی رکھتے تھے۔ جوں ہی سرداری کا سہرا سر سے بندھا تو حسن انتظام وتدبیر سے چار پانچسو روہیلوں کو زیرنگیں کر کے حکومت کرنا شروع کر دی۔ اور اپنے تمام سرداروں اور سپاہیوں کو لیکر پہاڑ سے چلے آئے اور مرادآباد پہونچے۔

نواب عظمت اللہ

جب علی محمد خاں مع سردار وسپاہی مرادآباد پہونچے۔ یہاں نواب عظمت اللہ خاں سے جو کھیڑ کے فوجدار تھے تمام سرگذشت سنادی۔ نواب عظمت اللہ خاں نے علی محمد خاں کو اپنی فرزند کی جگہ دی اور پدری شفقت کا معاملہ کرتے ہوئے تسلی دی چونکہ یہ کم سن تھے اور اپنے یہاں رسالہ دار مقرر کر کے چند پرگنہ رسالہ وغیرہ کی تنخواہ میں بطور جاگیر مرحمت فرمائے۔ اور کئی پرگنہ بطور جائداد کے عنایت کیئے۔

علی محمد خاں نے اپنا مسکن قصبہ باؤلی مقرر کیا جس قدر ابتک کے رفقاء وہمراہی پٹھان متفرق ہو گئے تھے وہ پھر سے ان کے آغوش میں جمع ہو گئے۔

(روھیل کھنڈ مراد آباد صفحہ ۱۷ و ۱۸)

نواب عظمت اللہ خاں نے جس قدر جائداد علی محمد خاں کو عطا کی تھی وہ علی محمد خاں کیلئے ناکافی ثابت ہوئی۔ علی محمد خاں نے نواب صاحب کی خدمت میں عرض و نیاز کی کہ جو وظیفہ آپ نے مقرر کیا ہے وہ گزر بسر کیلئے کافی نہیں عظمت اللہ خاں نے جواب میں اختیار دیتے ہوئے کہا کہ تم کو جو بہتر معلوم ہو وہ کام کرو۔ علی محمد خاں نواب عظمت اللہ سے علیحدہ ہو گئے۔ اور مع اپنے رفقاء کے راجہ لاکر کے ملازم ہو گئے۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ ریاست رام پور کی تحصیل شاہ آباد کے علاقہ میں لاکر ایک جگہ کا نام ہے۔ جو شہر رامپور سے اکیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس زمانہ میں یہ راجہ ہندوستان کا معزز سردار شمار ہوتا تھا۔

علی محمد خاں اور آنولہ

درجن سنگھ راجپوت آنولہ کا زمیندار تھا۔ یہ شخص نہایت قوی، بہادر تھا۔ علی محمد خاں کے اقتدار و ترقی کیلئے ایک رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اعلانیہ طور پر حملہ آور ہونا مصلحت ملکی کے خلاف تھا۔ درجن سنگھ کے ملازم نے زر کثیر کی طمع میں اس کا کام تمام کر دیا۔ جبکہ درجن سنگھ کے ورثاء کریا کرم (تجہیز و تکفین) میں مصروف تھے علی محمد خاں نے اسکی حویلی پر حملہ کیا اکثر راجپوت مارے گئے۔ اور بقیہ نے راہ فرار اختیار کی۔ علی محمد خاں نے قبضہ کر کے حویلی منہدم کر کے از سر نو تعمیر کرائی اور آنولہ کے متصل موضعات پر قبضہ کر لیا۔ نواب عظمت اللہ خاں حاکم کٹھیر نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔

(روھیل کھنڈ مراد آباد صفحہ ۱۸ و ۱۹)

بانی روھیل کھنڈ

علی محمد خاں روھیلکھنڈ کے بانی ہیں۔ اور فرمانروائے رام پور کے مورث اعلیٰ ہیں یہ وہی علی محمد خاں ہیں۔ جو سردار داؤد خاں کی زیر تربیت رہے تھے۔ ان کو لڑکا بنالیا تھا۔

سردار داؤد خاں کو رلجہ کایوں نے ادھکاری حاکم کاشی پور کے نواب عظمت اللہ خاں ناظم کٹھیر سے سازش کرنے کا غلط الزام تراش کر قتل کرادیا تھا۔

اس فتح کے بعد نواب علی محمد خاں نے اپنی آزاد بادشاہت کا اعلان کر دیا شیخ سعادت اللہ بدایونی کو ریاست کے بخشی عہدہ پر فائز کیا۔ اور بخشی الممالک محمد سعادت اللہ خان بہادر دربار کے خطاب سے نوازا۔ اور رائے کاغل کو ریاست کا دیوان عام مقرر کیا۔ اور اپنی تیس چالیس ہزار افغان روہیلہ فوج وسپاہ پر دوندے خاں کو سپاہ سالار اعظم مقرر کیا۔ اور امور سلطنت کیلئے اس کے علاوہ انتخابات کئے گئے۔ سونے کے کنگورے دروازہ پر نصب کرائے اور سرخ رنگ کے خیمے سلاطین ہند کے طریق کے موافق تیار کرائے اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ جس کے ثبوت میں یہ شعر مشہور ہے۔

سکہ زر ہر گل کٹھیر طبل زرد پیلی

بادشا ہے شد روہیلہ نام او محمد علی

(روہیل کھنڈ مراد آباد صفحہ ۲۴، ۲۵، ۲۶)

شاہ روہیل کھنڈ کا انتقال

علی محمد خاں نے ۳ رشوال ۱۱۶۱ھ میں اس دنیائے فانی سے کوچ کی۔ چوالیس سال کی عمر پائی۔ علی محمد خاں نہایت وجیہ، دلیر، سخی، عقیل، صاحب الرائے، حنفی المسلک حکمراں تھا۔

آنولہ

علی محمد خاں کا دار الخلافہ آنولہ تھا۔ اس زمانہ میں یہ بہت بڑا شہر تھا۔ ایک پختہ قلعہ تھا جسکے گنبد روشن تھے۔ ستر سو مسجدیں آباد تھیں۔ اور بہت سی خانقاہیں آباد تھیں ۱۱۸۰ھ میں نواب شجاع الدولہ کے حملہ کی زد سے یہ شہر اجڑ کر خراب وخستہ ہو گیا۔ اور مسجدیں بھی ویران ہو گئیں۔ (روہیل کھنڈ مراد آباد صفحہ ۳۲)

شاہ علی محمد خاں کی اولاد

انہوں نے چھ لڑکے چھوڑے ۔ ۱...... عبد اللہ خاں ۲...... فیض اللہ خاں ۳...... سعد اللہ خاں ۴...... محمد یار خاں ۵...... اللہ یار خاں ۶...... مرتضی خاں اور چار لڑکیاں چھوڑیں۔ سعد اللہ خاں ۱۱۶۲ھ ۱۷۴۹ء میں شاہ علی محمد کی وصیت و باتفاق سرداران روھیلہ مسند نشیں ہوئے۔

نواب حافظ رحمت خان

۱۷۶ء میں سرداران روھیلکھنڈ نے حافظ رحمت خاں کو اپنا حکمراں مقرر کیا۔

نواب دوندے خاں کا حسب نامہ

قیس نام کا ایک نوجوان تھا جو مدینہ منورہ چلا گیا تھا۔ وہاں وہ اسلامی نام عبد الرشید سے پکارا گیا۔ اور خالد بن ولید نے اپنی لڑکی سارہ سے عبد الرشید کی شادی کر دی۔ افغانوں کا سلسلۂ نسب عبد الرشید سے ملتا ہے۔ ان کا بڑا لڑکا شرف الدین ان کا لڑکا ...... ان کا لڑکا داؤد خاں، بدل خاں، دولت خاں، شہاب الدین تھا۔ شہاب الدین کا لقب شیخ کوٹہ تھا۔ ان کی ایک بیوی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دوسری بیوی کے بطن سے آدم محمود خاں تھے۔ محمود خاں عرف موتی خاں کے پانچ لڑکے ہوئے۔ ۱...... حسن خاں ۲...... شاہ عالم خاں جو نواب حافظ رحمت خاں کے پدر ہیں۔ حسن خاں کے سات فرزند ہوئے۔ ۱...... بشارت خاں ۲...... نعمت خاں ۳...... خالد خاں ۴...... عابد خاں ۵...... صدر خاں ۶...... صلابت خاں ۷...... دوندے خاں۔

نواب دوندے خاں ۱۱۱۷ھ میں دودہ (افغان) میں پیدا ہوئے حافظ رحمت خاں پچازاد بھائی تھے۔ داؤد خاں کے اقتدار و ابتداء عروج میں واردِ روھیل کھنڈ ہوئے تھے۔ جب راجہ کمایوں نے تنخواہ دینے کے بہانے بلوا کر قتل کر دیا تو محمد علی پسر

داؤد خاں صغرسنی میں تھے بایں وجہ علی محمد خاں کو سردار مقرر کیا گیا تھا ۱۱۵۱ھ میں علی محمد خاں نے دوندے خاں کو شاہ دہلی کی خدمت میں ایک مقصد لیکر روانہ کیا۔ دوندے خاں چار ماہ دہلی قیام کے بعد واپس آئے۔

علی محمد خاں نے جب اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور ۱۱۵۶ھ میں راجہ ہرنند حاکم کھیڑ سے جنگ ہوئی۔ تو دوندے خاں کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس کے بعد دوندے خاں کئی مہم پر گئے فتح وکامیابی نے قدم چومے مثلاً جب ۱۱۶۲ھ میں قطب الدین مرادآباد فتح کرنے کے ارادہ سے دہلی سے روانہ ہوا۔ سرداران روھیلہ نے اس کے ارادہ سے مطلع ہوکر خطوط تحریر کیئے کہ جس طرح ہم سب باہم تقسیم کر کے راضی وخوشی ہیں اسی طرح تم بھی حدود متعین کرنے پر قناعت کرو لیکن قطب الدین محمد خاں رضامند نہیں ہوئے۔ تو تب دوندے خاں کے سپہ سالار کی ماتحتی میں روھیلہ فوج آنولہ سے مرادآباد دریائے رام گنگا کے کنارے پہونچی۔ قطب الدین کی فوج سے جنگ ہوئی۔ قطب الدین محمد خاں اور ان کی فوج کو شکست ہوئی، قطب الدین خاں اور کچھ ہمراہی مارے گئے۔ تب دوندے خاں فاتح ہوکر آنولہ واپس ہوئے۔

روھیلکھنڈ کی تقسیم

مرہٹوں نے نواب احمد خاں بنگش فرخ آبادی کے ورغلانے اور انکی مدد کے سہارے صوبہ وروھیلوں میں تخریب کاری وفساد برپا کیا۔ جسکی وجہ سے مستقبل میں حکومت کی بربادی وتباہ کاری اور خرچ پورا نہ ہونا ظاہر تھا۔

مدار المہام حافظ رحمت خاں نے اپنی دور اندیشی اور بڑے سرداروں کے مشوروں سے سب ملک روھیلکھنڈ کی تقسیم کی تاکہ ہر ایک سردار اپنی متعلقہ جائداد سے فوج کے خرچ کا ذمہ دار خود رہے۔

تقسیم شدہ جائداد

نواب دوندے خاں بہادر کے حصہ میں تقسیم شدہ جاگیر سنبھل مراد آباد امروہہ کاشی پور مع ٹھاکر دوارہ آئے بارہ ہزار سوار و پیادوں کے اخراجات میں تقسیم ہوئی۔

(روھیلکھنڈ تاریخ مراد آباد صفحہ ۳۳، ۳۵، ۳۸)

نواب دوندے خاں کا انتقال

جناب عزت الدولہ دلاور الملک دوندے خاں بہادر بہرام جنگ نے ۲ محرم ۱۱۸۵ھ میں دار فانی سے کوچ کی۔ اور تقریباً ستر برس کی عمر پائی۔ دوندے خاں انتہائی باوقار جاہ وجلال مستقل مزاج اور امور مملکت کے بہت پابند تھے۔ ان کے شجاعت ورعب سے روھیلوں کی دور دور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جس معرکہ میں شریک ہوتے تو جگری اور سرفروشی کے جوہر دکھاتے جس سے فتح ونصرت کی ضمانت بجھی جاتی آپ نے شجاعت کا نام روشن کیا۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ۱۱۷۷ھ میں پیدا ہوئے حافظ رحمت خاں کے چچازاد بھائی تھے۔ داؤد خاں کے ابتدائی دور میں دار روھیلکھنڈ مقرر ہوئے تھے۔ مقام پھولی میں دفن ہوئے۔

پھولی ضلع بدایوں کی ایک بارونق تحصیل ہے اس جگہ دوندے خاں کا شکستہ قلعہ اور مسجدیں، حمام اور پختہ عمارتیں ان کی یادگار ہیں۔

دوندے خاں کی اولاد

عزت الدولہ دلاور الملک دوندے خاں نے (۳) لڑکے چھوڑے (۱) محب اللہ خاں (۲) عظیم اللہ خاں (۳) فتح اللہ خاں بھائیوں میں باہم ملک ومال وغیرہ میں تنازعہ کے بعد دولت وتوپ خانہ کی تقسیم ہوئی محب اللہ خاں کے حصہ میں مراد آباد اور اس کا علاقہ آیا۔

اور سنبھل وغیرہ فتح اللہ کو تقسیم میں ملا۔ یہ فتح اللہ خاں حافظ رحمت خاں کے داماد تھے۔۔ غالباً سنبھل میں فتح اللہ سرائے ان ہی کے نام پر آباد ہے۔

عظیم اللہ خاں کو چند گاؤں ملے تھے۔ جسکی آمدنی سے وہ خود اور دوندے خاں کی ایک بیوی (بہو.جی) گذر اوقات کرتے۔

دوندے خاں کی دولڑکیاں تھیں ایک کی شادی نواب سعد اللہ خاں سے اور دوسری کی شادی نواب نجیب الدولہ سے کی تھی۔ (روہیل کھنڈ مراد آباد صفحہ ۶۱)

سرکار سنبھل

حکومت کے زوال وعروج میں شہروں کی آبادیاں مضمر ہوتی ہیں۔ اسی طرح شہروں کے اسمی تغیرات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ صوبہ کٹھیڑ اور روہیل کھنڈ میں لفظی تغیر ہے۔ یہ صوبہ ہندو راجپوتوں کے عہد میں صوبہ کٹھیر کہلایا اور مسلمانوں کے عہد اور شاہان مغلیہ کے دور سلطنت میں فرخ سیر کے زمانہ تک سرکار سنبھل کہلایا۔ فرخ سیر کے وزیر رکن الدولہ نے سنبھل سرکار کی جگہ مراد آباد کو صوبہ قرار دیا۔

۱۶۰۵ ...... ۱۵۵۶ پرگنہ امروہہ میں ۶۵۴ ...... ۳۲۰ بیگھ زمین قابل کاشت تھی۔ زمیندار سید تھے اور ۱۰۰۰ گھوڑ سوار اور ۵۰۰۰ پیادہ ۳۰ ہاتھی ان کی فوج میں تھے۔ یہ علاقہ سیدوں کے اثر رسوخ کا شاہد ہے ان میں سب سے زیادہ باعظمت ووقار سید میر عادل تھے۔ جو بدایونی کے دوست اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ اور ۱۵۷۵ میں بھکو کا گورنر مقرر کیا گیا دو سال بعد وہاں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد ان کا بیٹا ابوالفضل گورنر ہوا۔ اور دوسرے بیٹے سید عبدالقائم ۶۰۰ کے اور ۳۰۰ کے عبدالمعال اور ابوالحسن ۲۰۰ کے کمانداار تھے۔

نرولی

گوجر راجپوتوں کے زیر اقتدار تھی۔ جن کے پاس ۶۰ گھوڑے اور ۴۰۰ سپاہی

تھے۔۸۱۶۲۱ بیگھ زمین تھی جس کی قیمت ۲۰۸۰۹۳ دام میں کوتی گئی تھی۔

کندرکی

کائستھوں کے پاس تھی جن کی فوج کی تعداد نرولی کی فوج کی برابر تھی۔
۸۴۱۶۴ بیگھ زمین کو ۶۷۹۳۶ رقم میں کوتا گیا تھا۔

سہسپور

گولوں سے تعلق رکھتا تھا اور برابر فوج رکھنے کے حقدار تھے۔ اور ۵۴۸۴۵ بیگھ زمین کی ۹۴۴۳۰ رقم کوتی گئی تھی۔

اسلام پور کا علاقہ

وشنوئیوں کی عملداری میں تھا جو اپنی فوج میں ۱۰۰ گھوڑے اور ۲۰۰ سپاہی رکھتے تھے۔
۸۷۰۶۴ بیگھ زمین کے لئے ۶۶۰۹۴ رقم ادا کرتے تھے۔

مغل پور

لوگوں کی عملداری میں تھا جو ۶۸۳۷۶ بیگھ زمین کیلئے ۳۵۸۰۳۰۰ رقم دیتے تھے او ر اپنی مقامی فوج میں ۱۰۰ گھوڑے اور ۵۰۰ پیادہ رکھ سکتے تھے۔

رجب پور

رجب پور کے پاس ۴۰۳۴۶ بیگھ زمین ۶۱۲۹۷۷ رقم پر تھی۔ جو کھوکر راجپوتوں کے پاس تھا اور وہ اپنی فوج میں ۲۵ گھوڑے اور ۵۰ سپاہی رکھ سکتے تھے۔

سنبھل تگی

راجپوت برہمنوں پر مشتمل تھا۔ سب مل کر ۱۵۰ گھوڑے اور ۹۰۰ سپاہی رکھنے کا اختیار رکھتے تھے۔ پرگنہ کے زیر انتظام علاقہ ۲۵۲۸۵۰ بیگھ تھا جس کا خراج ۱۷۳۴۰۱۴۱ دام تھا۔

سرسی اور مجھولہ بھی اسی میں جوڑ دیئے گئے تھے۔ اگرچہ سرسی پر سیدوں کا تسلط تھا۔ ان کو ۲۰ گھوڑے اور ۲۰۰ سپاہی رکھنے کا اختیار تھا۔ ۵۲۴۰۱ بیگھ رقبہ کیلئے ۹۵۸۷۶۹ رقم ادا کی جاتی تھی۔ جبکہ مجھولہ پر گوجروں کا تسلط تھا جس کا رقبہ ۱۴۲۴۶۱ بیگھ زمین کیلئے ۱۷۳۷۵۵۶ رقم ادا کی جاتی تھی اور ان کی فوج میں ۴۰۰ سوار اور ۸۰۰۰ پیادے تھے۔

(سنبھل سروے صفحہ ۵۸، ۵۹)

۲۴ محرم ۱۱۵۶ھ میں بروز شنبہ دوپہر کو نواب علی محمد خاں فتح و کامرانی کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آنولہ میں داخل ہوئے۔ اس فتح کے بعد تمام علاقہ کٹھیر سنبھل، امروہہ، مرادآباد بریلی، شاہجہاں پور، اور شاہ آباد کلاں پر نواب علی محمد خاں کا قبضہ ہوگیا۔ اور ان مقامات پر اپنی طرف سے حاکم مقرر کئے۔ اس وقت سے یہ صوبہ روھیلکھنڈ کے نام سے مشہور ہوا۔

(تاریخ مرادآباد صفحہ ۲۴)

حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی

نواب فیض اللہ خاں نے اطباء دربار سے چائے کے مزاج کو اور نقصان کی بابت استفسار کیا جس کے بارے میں شدید اختلاف رائے ہوا اور حکیم مرزا علی اپنی اس رائے پر اڑ گئے کہ چائے درجہ گرم میں سوم اور خشک ہے، نواب صاحب کو ہرگز اس کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ یہ زہر کا کام کریگی جبکہ نواب صاحب انگریزوں میں متعدد بار چائے نوش کر چکے تھے۔ نواب صاحب نے انچارج دواخانہ کا شاہی حکیم عطاء اللہ عمی کشمیری کو حکم دیا کہ وہ اپنی والدہ سے چائے بنوا کر لائیں مرزا ابو علی کو اپنی بات خراب ہونے کا احساس ہوا اور انہوں نے چائے میں (خریق سیاہ) کٹکی شامل کرادی۔ جس کے پینے سے نواب صاحب کو خناق ہوگیا۔ دوسرے دن حالت بہت بگڑ گئی۔ اطباء دربار کو جمع کیا گیا جن کے نام حکیم بایزید نے تحریر کئے ہیں (۱) حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی (۲) حکیم احمد علی انصاری (۳) حکیم محسن خاں شاگرد حکیم

شریف خاں (۴) حکیم دیوکی نند (۵) حکیم عزیز الدین میرٹھی (۶) حکیم حافظ محمد یار خاں شاہجہاں پوری (۷) حکیم محمد ضیاء خاں (۸) حکیم واجد علی خاں (۹) حکیم صغیر علی (۱۰) حکیم عطاء اللہ غمی حکیم بایزید لکھتے ہیں کہ اطباء نے چائے میں زہر کی آمیزش کا شبہ ظاہر کیا۔ نواب محمد علی خاں کی تفتیش سے لالہ دیپ چند عطار نے یہ بتایا کہ والدہ حکیم غمی نے خریق سیاہ منگائی تھی جو حکیم مرزا ابو علی کے اشارہ پر چائے میں ڈال دی گئی۔ اس کے بعد مرزا ابو علی تو فرار ہو گئے اور نواب صاحب کا علاج کیا گیا نواب صاحب نے ٹھیک ہو کر سارے معالجین کو انعامات سے نوازا ان میں سرِ فہرست حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی تھے۔

۱۸۵۷ء میں سنبھلیوں کے مجاہدے

سنبھل کو مغل حکومت میں معراج ارتقاء حاصل تھا۔ مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ سنبھل کی اہمیت زوال پذیر ہوتی چلی گئی اور فطری طور پر اس زوال کی بدولت تعلیمی و تہذیبی پسماندگی نے سنبھل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سنبھل کی اہمیت گھٹنے کی وجہ سے تمدنی پستی پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے تحریکی حالات کی تفصیل سے کتابیں خالی ہیں اور سنبھل کے حصہ لینے والے افراد کا ذکر چند کے علاوہ نہیں ملتا۔ جبکہ سرکاری ریکارڈ میں سینکڑوں سنبھل کے افراد کے نام درج ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد متعدد کتابیں لکھی گئیں جیسے روشن مستقبل۔ شہیدان وطن۔ اخبار الصنادید۔ اسباب بغاوت ہند۔ ہندوستان کا شاندار ماضی وغیرہ۔ مصنفین نے فیروز شاہ کے سنبھل آنے کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے ساتھ بابو نارائن خان محمود خاں اور خاں بہادر خاں کے ہمراہ ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور جہاں تمام ملک میں علماء نے جہاد کا جو پلان بنایا تھا اور اس کے تحت ہر مقام پر تقریریں اور وعظ کئے ہیں وہاں ان میں مولوی سراج احمد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نیز نواب رام پور

کی مداخلت اور شہزادہ فیروز کا سنبھل آنا تفصیل سے ملتا ہے۔
سنبھل کے انقلابی حضرات کا ذکر بھی قدرے تفصیل سے پیش خدمت ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں اور سلطنت مغلیہ کا آخری دور:

مرزا مظہر جان جانان کا عہد مغلیہ سلطنت کا آخری دور ہے جو حکومت کے زوال اور انحطاط کا زمانہ تھا۔ مرزا جان جاناں کے سامنے حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا موصوف نے اپنے متوسلین، خلفاء، اور نوابین کو مکتوبات خط لکھے۔

ایک مکتوب مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو تحریر فرمایا کہ کفار مرہٹوں کے ہنگاموں سے مت ڈرنا۔ انشاء اللہ دوستوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے جتنی دفعہ سورہ لایلاف پڑھ سکتے ہو پڑھتے رہو اور کفار پر لشکر اسلام کی فتح کے لئے دعاء اور صرف ہمت واجب ہے مکتوب (۱۲۸ مرزا مظہر جان جانان صفحہ ۵۷)

اسی زمانہ کے حالات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر ہے۔

مکتوب بنام نواب ارشاد علی خاں سنبھلی

اس (اللہ) نے تم کو مصیبتوں سے بچالیا۔ تم نے موجودہ بادشاہ سے جو توسّل کیا ہے۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ان دنیاداروں کا مفصّل حال ہم کور باطنوں کو کیسے معلوم ہو اور اگر معلوم ہو تو اس کا لکھنا موجب فساد ہے اتنا بھی کبھی تمہاری خاطر لکھ دیتا ہوں۔

(ایضاً صفحہ ۵۷)

یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت مغلیہ برائے نام رہ گئی تھی۔ غریبی اور تنگ دستی کا دور دورہ تھا۔ جان و مال وعزت وآبرو کچھ بھی تو محفوظ و مامون نہ تھا۔ رعایا سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص پریشان تھا۔ ویران اور پریشانی کا یہ عالم تھا کہ دلی جیسے شہر میں لوگ اپنی جان لیکر ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔ بادشاہ کے گرد و پیش دشمنوں کا ہجوم تھا۔ غریبوں پر ظلم وستم ہو رہے تھے۔ مسافر اور راہ گیر لوٹے جاتے تھے اور ان کی درد بھری آوازیں

اور پکاریں سننے والا کوئی نہ تھا۔ سیاسی انتشار وشورش کا اثر پورے ملک پر پڑا ہوا تھا صوبے خود مختار ہو گئے تھے۔ جاٹوں۔ مرہٹوں، اور سکھوں نے زور پکڑ رکھا تھا لوٹ مار سے تباہ کاریاں پھیلی ہوئی تھیں۔

مولوی ثناء اللہ سنبھلی کے نام دوسرا خط

مرزا مظہر جان جاناں پر آشوب زمانہ میں اپنے مرید مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو پر آشوب زمانہ کی پریشانیوں کی بابت اور کفار مرہٹوں کے حملوں اور شر سے محفوظ رکھنے کیلئے اطمینان دلاتے ہوئے مکتوب ۲۸ میں اس طرح سے تحریر فرماتے ہیں۔ خاطر جمع رکھئے تعلیم وطریقہ اور درس کتب میں پابندی سے مشغول رہئے۔ ہمارے طریقے کے بزرگوں اور حضرت مجددؒ کے ختم کو ہر روز حلقہ کے بعد لازمی طور پر پڑھئے۔ خدا سے امید وار اور اس کے علاوہ ہر ایک سے ناامید ہو جائے کفار مرہٹوں کے ہنگاموں سے مت ڈریئے انشاء اللہ دوستوں کو نقصان نہیں پہونچے گا ان مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے جتنی دفعہ لایلاف پڑھ سکتے ہو پڑھئے اور کفار کے لشکر پر اسلام کی فتح کے لئے دعاء اور صرف ہمت واجب ہے غافل نہ رہنا۔ (ایضاً صفحہ ۹۸۷)

سکھوں کی غداری اور فسادات

سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں کفار سکھ کی غداری اور فسادات پھیلانے اور لوٹ مار کرنے کے واقعات کا صحیح اور سچا نقشہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مکتوب ۳۱ میں ملتا ہے جو مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو تحریر فرمایا ان کی قتل وغارت گری کے حالات واضح ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں دل کو ایک صدمہ سخت پہنچا ہے۔ پچھلے مہینہ کفار سکھ تھانیسر کے قلعہ پر قابض ہو گئے اور انہوں نے خوب قتل وغارت گری کی مولوی قلندر بخش جیو سلمہ، مع بیوی اور بچوں کے لٹ لٹا کر اور جانیں بچا کر نکل آئے۔ عجیب کیفیت ہوئی

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ بالکل بے سروسانی کی وجہ سے اس (تھانیسر) کے نواح میں مقیم ہیں اور ہم تک نہیں پہونچے۔ اس مصیبت کے علاوہ شرح کی بات یہ ہے کہ خصوصیت کے باوجود ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔ کیونکہ بے استطاعت ہیں۔ خدا اس کی تلافی کرے۔ (ایضاً از صفحہ ۹۹ مرزا مظہر جان جانان)

مکتوب سوم بنام مولوی ثناء اللہ سنبھلی

ختم حضرت مجدد رضی اللہ عنہ ہر روز بعد صبح لازم گیرید و نجناب اوامید وار واز غیر ناامید باشید واز آشوب کفار مرہٹہ اندیشہ نہ کنید انشاء اللہ تعالیٰ دوستاں را مضرتی نخواہد رسید وبرائے دفع بلیہ ہا در قرأتِ سورہ لایلاف ہر قدر توانید اکثار نمائید ودر فتح ونصرت لشکر اسلام بر کفار وعام صرف ہمت واجب است وغافل نہ باشید اگرچہ احوال مسلمانان این قوم معلوم اما حق اسلام بر ہمہ امور مقدم مست۔ اس مکتوب کا ترجمہ مذکور ہو چکا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کی سنبھل آمد

آپ سلسلہ نقشبندیہ کے اجل متاخر مشائخ میں سے ہیں۔ اس زمانہ میں سیاسی ابتری حد کمال کو پہونچی ہوئی تھی۔ مرہٹی گروہ کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مرزا صاحب نے روھیلکھنڈ میں اکثر دورے کیے۔ اہالیان روھیلکھنڈ کثرت سے مرزا صاحب کے سلسلہ بیعت وارادات میں منسلک و مریدین تھے۔ مرزا صاحب سنبھل مراد آباد وغیرہ مقامات پر تشریف لائے تاکہ مرہٹوں کے خلاف اس علاقہ کے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔(۱)

اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے والد مرزا کے نام پر ان کا نام جان جاں رکھا اسی نام سے مشہور ہوئے مرزا صاحب کا اصل نام شمس الدین ابن مرزا جان ہے۔ اور تخلص

---

(۱) مرزا صاحب کا اصل نام شمس الدین ابن مرزا جان ہے۔

مظہر ہے آپ محمد بن حنیفہ کی اولاد میں ہیں۔ ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ میں پیدائش ہے۔ مرزا صاحب کے والد ایک جید عالم تھے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور حدیث کی سند مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے حاصل کی۔ سلسلہ نقشبندیہ میں شاہ نور محمد بدایونی (جو دہلی میں مقیم تھے) خدمت میں ۷ سال کسب سلوک کر کے خرقۂ خلافت واجازت حاصل کی شاہ نور محمد بدایونی کے انتقال کے بعد حضرت شاہ سعد اللہ حضرت عابد سنائیؒ سے فیوض حاصل کئے۔ مرزا صاحب کی اکابرین واسلاف میں نمایاں شان تھی۔ آپ کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا۔ بے تعلقی رہی زندگی بھر نہیں بتایا۔ کسی دوست یا کرائے کے مکان میں رہتے۔ کھانا کسی کے گھر نہ پکواتے نہ کھاتے۔ ا......

طبیعت میں انتہائی لطافت اور غیر معمولی نازک مزاج ودل گداختی تھی۔ مرزا صاحب نے بادشاہ شاہ عالم کے عہد میں اس دار فانی سے کوچ کیا مرزا صاحب کو نواب نجیف خاں کے ایک نادان شیعہ فولاد خاں نے محرم ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء میں شہید کر دیا۔ اس کا یہ عمل مذہبی تعصب کی وجہ سے تھا۔ شب میں تنہا پا کر بندوق سے وار کیا۔ شاہ عالم نے اس سانحہ کی خبر پا کر انگریز ڈاکٹر معالجہ کیلئے تجویز کیا۔ اور نجیف خاں کو تاکیدی حکم دیا کہ قاتل کو گرفتار کر کے قصاص کیلئے حاضر کریں۔ مرزا صاحب نے اس وقت بادشاہ کو یہ مضمون لکھا دست شیعہ کے زخم کا علاج عیسائی سے کرانا اپنے کی غیر سے شکایت ہے۔ جس کو میں اچھا نہیں سمجھتا اور فقیر کا قاتل اگر گرفتار ہو جائے تو اس کو فقیر ہی کے حوالہ کر دیں تاکہ بطریق معافی خود قصاص لے لوں۔ مظہر صاحب زخم سے برآ نہیں ہو سکے۔ محرم ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء میں جام شہادت نوش کیا۔

(علم وعمل صفحہ ۲۲۸......۲۲۸۱)

شہزادہ فیروز شاہ سنبھل میں

۲۰/۲۱ اپریل ۱۸۵۷ء کو شہزادہ مراد آباد جاتے ہوئے ننھے خان کے باغ میں

ٹھہرا اور مراد آباد سے واپسی میں صوفی والے باغ میں قیام کیا جو سرائے ترین سے دوسو قدم کے فاصلے پر ہے۔ کیا اچھا ہو کہ دونوں باغوں کو شہزادہ کے نام سے موسوم کر کے محفوظ رکھا جائے۔ قاضی حامد علی تحصیلدار نے شہزادہ کو رسد بجھوائی اور ان ہی کی صلاح سے دعوت کی گئی۔ ان کے علاوہ امام الدین ہادی وکیل سرشتہ دیوانی۔ مولوی سراج الدین احمد وغیرہ نے رسد دینے میں تعاون کیا۔

سنبھل شہزادہ کی دوبارہ آمد:

شہزادہ فیروز کی دوبارہ آمد پر امام الدین اور علی بہادر خان اور کریم بخش پیشکار وغیرہ نے شہزادہ سے ملاقات کی۔

یہاں ایک مقدمہ کا حصہ دلچسپی کا باعث ہوگا ایک گواہ قادر بخش کا بیان ہے، کاغذ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے، فہرست حامد علی تحصیلدار سنبھل اقتباس ملاحظہ ہو۔ اظہار قادر بخش خاں حلفے، باپ کا نام ایزد بخش ذات شیخ رہنے والا سنبھل، پیشہ روزگار عمر ۳۵ برس کے ناخواندہ۔

سوال :۔ جب فیروز شاہ سنبھل میں گیا کس نے اس کی دعوت کری جو کچھ جانتے ہو بیان کرو؟

جواب: جب اول دفعہ فیروز شاہ سنبھل میں آئے خواجہ وزیر علی ناظم سنبھل نے سپاہیوں اپنے رسالے سے کہا کہ منع کر دو کہ فیروز شاہ کو رسد نہ دیوے۔ سپاہیوں نے فیروز شاہ کے آدمیوں کو رسد نہ دی۔ تب قاضی حامد علی تحصیلدار نے دیپا سرائے کے آدمیوں کو بلا کر فہمائش کی کہ حصہ رسد آدمیوں فیروز شاہ کو دو۔

شیخ غلام محمد اور امام بخش اور پیر بخش اور کریم بخش خدا بخش اور پیر بخش نے رسد آدمیوں فیروز شاہ کو دی۔

سرائے ترین کے بہادر خان

دوسری دفعہ جب فیروز شاہ مرادآباد سے سنبھل کو گئے تب بہادر خان رہنے والے سرائے ترین کے آدمیوں نے فیروز شاہ کی دعوت کردی۔

سوال۔ کس طرح تم کو معلوم ہوا کہ تحصیلدار نے فہمائش دیپا سرائے والوں کے واسطے دینے رسد۔

جواب۔ تمام سنبھل میں یہ بات مشہور ہے۔اور سب آدمی جانتے ہیں۔

سوال۔ غلام محمد وغیرہ کون ہیں؟

جواب۔ شیخ ہیں اور دیپا سرائے میں رہتے ہیں۔

سوال۔ کس سبب سے حامد علی نے واسطے دینے رسد فہمائش کری

جواب۔ اس کا حال ہم کو معلوم نہیں۔

ان بیانات سے صرف اتنا جرم معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شہزادہ فیروز کو رسد دی تھی۔

سنبھل کے انقلابی افراد

سنبھل کے وہ حضرات جنہوں نے جنگوں میں حصہ لیا اور تحریک انقلابی رہنماؤں کی فوج میں شامل ہوکر خدمات انجام دیں۔ان کا تذکرہ سرکاری ریکارڈ میں ملتا ہے۔ چندوسی کے ساکن بابو رام نرائن کی اس جنگ سے متعلق ہے جو ۲۹ رمئی ۱۸۵۸ء میں اسلام نگر میں (بدایوں) میں ہوئی اور بابو رام نرائن اس میں کام آئے۔غریب پرور سلامت جناب عالی۔تحقیق دریافت ہوا ہے کہ میاں احمد اللہ خان واکبر خان ساکن سرائے ترین و بابو نرائن ساکن چندوسی بجماعت ایک ہزار (۱۰۰۰) پیادہ سوار قوم مسلمان ساکن سرائے ترین و سنبھل ووادی وچندوسی ونرولی ضلع مرادآباد واسلام نگر متعلقہ ضلع بدایوں ومع چہار ضرب نواب بہ ارادہ غارت گری ضلع بدایوں مقام اسلام نگر قیام پذیر ہیں۔مورچہ اور کمیتل ملحق السواد چندوسی کے ہے صاحبزادہ موصوف اور علی

اصغر خاں رام پوری نے لگا دئے ہیں ، الٰہی آفتاب دولت و حشمت کا چمکتا ہوا۔
فدویان بھا گیرت سنگھ و گنگا سنگھ سواران ملازم سرکار از مقام چندوسی معروضہ ۲۸ رمئی
۱۸۵۸ء اس دفتر کے عملہ کی طرف سے یہ نوٹ لکھا گیا ہے۔ جناب عالی یہ کاغذ بعد
اندراج روزنامہ اس وقت یہ پاس فدوی عدالت فوجداری سے آیا ہے اور بالائے حکم
لکھا ہے کہ دو پرواز نوشتہ شد۔ کاغذ پر مذکورہ لوگوں کی جائداد قرق کرنے کا حکم ہے ضلع
مرادآباد کے تقریباً چونسٹھ ملازمین سرکار کی فہرست میں جو باغی قرار دئے گئے سنبھل
کے حسب ذیل ہیں۔ حامد علی تحصیلدار سنبھل پھانسی مئی تا جولائی ۱۸۵۸ء کرم بخش
پیشکار سنبھل پھانسی مئی تا جولائی ۱۸۵۸ء محمد عظیم الدین حسن منصف سنبھل حوالات
مئی تا جولائی ۱۸۵۸ء امام الدین وکیل سر رشتہ دیوانی پھانسی مئی تا جولائی ۱۸۵۸ء

سنبھل کے از خود حاضر ہونے والے افراد: یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو وکٹوریہ کے
اعلان معافی کے بعد جو لوگ حاضر ہوئے ان میں چند افراد کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ سرفراز خان پٹھان سنبھل پیشہ نوکری۔

۲۔ حسن بیگ ولد عبداللہ مغل سنبھل بذریعہ نوکری خان بہادر خان باغی کہ مفرور
تھا۔ اپنے مکان پر ہے۔

۳۔ ہدایت اللہ شیخ بذریعہ نوکری احمد اللہ خاں باغی مفرور تھا حاضر ہوا۔

۴۔ کریم خان ولد حسین علی خان چودھری ساکن چودھری سرائے سنبھل
بذریعہ نوکری خان بہادر خاں مفرور حاضر ہوا۔

۵۔ رحیم بخش چودھری ساکن چودھری سرائے سنبھل بذریعہ نوکری خاں بہادر
خاں مفرور تھا حاضر ہوا۔

(۶) جنگی خان ولد کلو خان پٹھان ٹھا کر دوارہ پیشہ کھیتی بذریعہ نوکری محمود خان
مفرور تھا حاضر ہوا۔

سنبھل کے روپوش ہونے والے افراد

بعض کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنبھل کے بہت سے باغی افراد مفرور ہو گئے۔ ایک درخواست میں لکھا ہے کہ واضح ہو کہ جب سے فوج سرکاری اس ضلع میں آئی ہے تب سے مسمی خلیل خان بجرم بغاوت مفرور ہے جائداد اور زرعی وغیر زرعی اس کی اس ضلع میں جو کچھ واقع تھی وہ سب قابل ضبطی متصور ہو کر معرض قرق میں آئی۔

(نومبر ۱۸۵۷ء)

اس کے علاوہ چند اور لوگ جو مفرور ہوئے: ان کے اسماء گرامی یہ ہیں ہدایت اللہ، اکبر خان، احمد اللہ خان نظام علی خان، قاسم علی خان، غلام محی الدین خان، سدو خان، شیخ نیاز علی وغیرہ جن کی جائداد تفصیل کے ساتھ کلکٹری میں بھیجی گئیں، خلیل خان اور جلال الدین خان کے مکانات نیلام ہوئے۔ ان کے علاوہ چند لوگ جنکی جائیدادیں ضبط ہوئیں: بموجب ریکارڈ یہ ہیں۔ نظام الدین خان، غلام محسن الدین خان، ہدایت اللہ ولد محمد خان، ہدایت اللہ ولد سعادت خاں، اکبر خاں، احمد خاں ولد مرتضی خاں سرائے ترین، امام بخش، ظہور علی، عبد اللطیف، نعمت اللہ، دلیل خاں، ایوب خاں، نیاز علی خاں، بہادر علی خاں، رحم علی خاں (سرائے ترین)

انقلابی حضرات کی تحریک

بغاوت میں حصہ لینے والے افراد میں جناب امام الدین صاحب اور قاضی حامد علی صاحب کے نام نستباً نمایاں ہیں ان میں جناب امام الدین صاحب وکیل کے حالات تفصیل سے مذکور ہو چکے ہیں۔

سرکاری ریکارڈ میں

مذکورہ افراد کے علاوہ سرکاری ریکارڈ میں سنبھل کے سینکڑوں افراد کے نام ہیں

جو باغی قرار دئے گئے یہاں صرف سرائے ترین کے چند نام نقل کئے جاتے ہیں سدہو خاں ولد عبدالرحیم خاں، محب اللہ خاں ولد میر خاں، شہادت خاں، خلیل خاں ولد نعیم خاں۔ جلال الدین ولد خلیل خاں، عبدالقادر خاں، نادر خاں، ہاشم علی خاں، ثناء اللہ، چھدا ولد شیخ نیاز اللہ شیخ اللہ بخش ولد منان۔ اللہ دار خاں ولد قادر دار خاں، ہدایت اللہ ولد مجید خاں۔ صوفی مظفر خاں ولد عشرت خاں، محمد سعید ولد اکبر خاں، کریم الدین ورحیم الدین باغبان پسران شیخ منگا، رحم خاں عرف رحیما باغی، شیخ مشیت اللہ ولد امین الدین، رحمان خان وامان خاں، سرفراز خاں عرف سنو، سید علی ولد کرامت علی، دلاور علی ولد ہدایت علی نثار علی خاں ولد معراج علی خاں۔ نیاز علی خاں ولد مزاج علی خاں، قاسم علی خاں، حسن علی خاں، ہدایت اللہ ولد سعد اللہ خاں، محمد علی خاں ولد اکبر علی خاں۔ احمد خاں ولد حسن علی خاں، چھوٹے خاں ومحمد خاں ولد احمد علی خاں مذکور، کریم اللہ ولد رحیم اللہ، کالے خاں ولد بہادر خاں، کریم اللہ ومولا بخش، مظفر خاں شہامت خاں یہ دونوں ضلع بدایوں سے بحکم مجسٹریٹ رہا ہوئے، نادر خاں ولد کالے خاں، ہدایت اللہ ولد محمد خاں، تحصیل گنور ضلع بدایوں میں سپاہی تھے مجسٹریٹ بدایوں کے حکم سے اگست ۱۸۵۸ء میں رہا ہوئے، اکثر لوگوں کے مکانات خس پوش کے تھے جو نیلام ہوئے، حسن پور بلاری کے چند اشخاص کی جائیدادیں فرق ہوئیں نیز ہم مرادآباد کے اشخاص کا تذکرہ ترک کرتے ہیں۔

خاندان انصاریان

سنبھل کے جہاں بہت سے خاندان کا تذکرہ ہم نے کیا وہاں خاندان انصاریان ایک معزز علمی گھرانہ ہے اسمیں علماء وکلاء صلحاء پیدا ہوئے۔ اور دنیاوی وجاہت کے ساتھ علمی کارنامہ اور جنگ آزادی میں پیش پیش رہکر اور جام شہادت نوش فرما کر محبت وطن کا ثبوت دیا ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوبؓ سے جا ملتا ہے یہ اپنے کو انصاری لکھتے ہیں۔

منشی امام الدین شہید ہادی

منشی امام الدین شہید ابن بدر الدین ابن معز الدین ابن حیات الدین آپ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں نائب سپر منشی تھے، (پرائیویٹ سکریٹری) جب شاہ موصوف کے دربار میں حکیم احسن اللہ خاں اور الٰہی بخش کے درمیان ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں تو منشی امام الدین نے بددل ہوکر بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں استعفیٰ پیش کیا۔ لیکن شاہ موصوف نے چند وجوہ کی بناء پر منظور نہیں فرمایا اور اپنی جگہ بحال رکھا۔ کچھ ایام بعد شاہ موصوف سفر میں تشریف لے گئے تھے منشی امام الدین نے موقع کو غنیمت سمجھ کر استعفاء دربار میں دیکر اپنے وطن سنبھل آگئے جب شاہ موصوف سفر سے واپس ہوئے تو استعفاء منظور فرما کر امام الدین کو شاہ زادہ فیروز شاہ بخت کا وکیل مقرر کیا اور ۵۵ گاؤں کی جاگیر عطاء کی اور منشی موصوف کو طوطیٔ ہند کے خطاب سے نوازا چونکہ آپ بہت شیریں کلام تھے جو شخص پہلی بار ملاقات کرتا وہ آپ کی شیریں کلام سے بے حد متأثر ہوتا آپ کے اشاروں پر چلنے لگتا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی چنگاریاں تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھیں وہاں روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی اسکی زد میں تھا جبکہ مراد آباد میں مجاہدین نے انگریز کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا تو سنبھل کیسے بچ سکتا تھا۔ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو مجاہدین کی ایک جماعت نے تحصیل بلاری کو لوٹ لیا اور گاؤں والوں نے ان کا ساتھ دیا اور سنبھل و چندوسی میں لوٹ مار کی گرم بازاری رہی اور انگریزوں کا قلع قمع کیا تو انگریز کے خاص نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور نے سنبھل اپنی فوج بھیجی اور سنبھل پر نواب یوسف علی خاں کی اعانت سے پورا تسلط ہوگیا۔

تب رؤساء سنبھل نے بہادر شاہ ظفر کو حالات سے باخبر کیا اور سنبھل آنے کی دعوت دی شاہزادہ فیروز شاہ بخت دعوت پر سنبھل آیا جو بہادر شاہ ظفر کا بڑا لڑکا تھا ان کے

ہمراہ ان کی والدہ زینت محل بھی سنبھل آئیں موصوف کی آمد پر عیدگاہ کے میدان میں کیمپ لگا تمام اخراجات طعام کی کفالت جناب منشی امام الدین صاحب نے کی۔ مشورہ وامداد میں قاضی حامد علی خان صاحب تحصیلدار سنبھل۔

مولوی کفایت اللہ عباسی۔ مولوی غلام رسول صاحب اسرائیلی شامل تھے۔

(۱۸۵۷ء کے چند شعراء، ص: ۴۰۳)

اپریل ۱۸۵۸ء میں فیروز شاہ نے خان بہادر کی امداد اور روٴساء سنبھل کی اعانت سے سنبھل پر حملہ کیا تھا اور انگریز کے تسلط سے نکال کر اپنے زیر نگیں کر لیا۔ مولانا امداد صابری لکھتے ہیں کہ حکیم نجم الغنی رامپوری مؤلف اخبار الصنادید چونکہ نواب رام پور کے نمک خوار اور انگریزوں کے بھی بہی خواہ تھے انہوں نے مجاہدین کی شان میں جو الفاظ نازیبا استعمال کئے ہیں وہ انکی خوشامد پر مبنی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ نواب رام پور کی فوج مجاہدوں کو پسپا کرنے میں کامیاب رہی تحریر کرتے ہیں کہ ۱۵/ جون کو سنبھل میں فساد شروع ہوا اور موضع لکھوری کے جاٹ جن کے سرغنہ صاحب سنگھ اور چھدو تھے اور بیر پور کے میواتی اور بلال پور کے مولویوں نے مل کر سنبھل کا بڑا حصہ لوٹ لیا۔ حامد علی تحصیلدار سنبھل جان بچا کر مرادآباد چلے گئے خان صاحب وزیر علی سنبھل کے ناظم مقرر ہوئے یہ سنبھل کے باشندے تھے۔

منشی امام الدین کا ایک مکان مرادآباد دیوان خانہ محلہ لوہا گڑھ میں تھا آپ مرادآباد وکالت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

جب غدر ختم ہوا اور فیروز شاہ ۲۱/ اپریل کو مرادآباد چلے گئے ادھر انگریز کے نواب یوسف کی فوج کو شکست ہو چکی تھی پھر دوبارہ انگریز کا مرادآباد پر پورا تسلط ہو گیا اور مجاہدین آزادی انگریز کے خلاف انکے اقتدار کو ختم کرنے کیلئے میدان میں کود پڑے تھے یا فیروز شاہ کی مدد کی تھی تو ایسے لوگوں کو پھانسیاں دی جانے لگیں تو اسوقت منشی صاحب موصوف اپنے مکان دیوان خانہ محلہ لوہا گڑھ مرادآباد تھے منشی صاحب موصوف کو معلوم

ہوا کہ انکے کسی دوست کو پکڑ لیا گیا ہے اور خیال ہے کہ انکو پھانسی دی جائیگی تو منشی صاحب اپنے دوست کو انگریز کے پنجہ سے بچانے کی غرض سے مکان سے چلے اسوقت انگریز ڈپٹی وکلکٹر صدر اعلی کے پاس تھے مرادآباد محلہ گلشہید میں جہاں مجاہدین کو انگریز پھانسی دے رہے تھے۔ ابھی منشی صاحب راستہ ہی میں تھے کہ ڈپٹی کو بتایا گیا کہ جس شخص نے سنبھل میں مغل شاہ زادہ کو رسد پہنچائی اور فوج کی دعوت کی اور ہر طرح سے مدد کی وہ شخص آرہا ہے تو اس نے منشی صاحب کے آموجود ہونے سے قبل ہی صدر اعلی سے پھانسی کی اجازت حاصل کی لوگوں نے ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح سے منشی صاحب انگریز کے صدر اعلی سے ملاقات کرلیں جبکہ صدر اعلی بھی ملنے پر آمادہ تھا مگر ڈپٹی نے اس طرح برانگیختہ کیا کہ بالکل مہلت نہیں دی گئی اور نتیجہ پھانسی لگوادی اور منشی صاحب کو چونہ میں رکھ کر پانی ڈلوادیا یعنی منشی صاحب کو چونہ میں سوختہ کردیا۔

(۱۸۵۷ء کے چند شعراء صفحہ ۴۰۲،۴۰۳)

ان کو واپس تک نہیں کیا۔ منشی موصوف شہید کی تمام املاک جو شاہ ظفر نے ۵۵ گاؤں جاگیر میں دیئے تھے وہ مرادآباد و حسن پور تھے۔ اور منا ٹھیر کے مابین مواضعات تھے سب ضبط کرلئے گئے۔ آج انکی اولاد میں جو املاک ہیں وہ ننھیال کی طرف سے حاصل شدہ یا خریدے ہوئے ہیں۔

جناب منشی امام الدین ھادی انتہائی ذہین اور اپنے زمانہ کے یکتا وکیل تھے آپ آخر زمانہ میں بینائی کی نعمت سے محروم ہوگئے تھے اسی حالت میں ۷ ارسال تک وکالت کی انکا ایک واقعہ سنبھل کے باشندوں کی زبان زد ہے اور ان کے پوتے جناب محمد شفیع صاحب نے مجھے قلم بند کرادیا اور مولوی امداد صابری نے۔ ۱۸۵۷ء کے چند شعراء صفحہ ۴۰۲ پر لکھا ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مقدمہ کسی عدالت میں پیش ہوا آپنے اپنے موکل کی طرف سے وکالت کرنے کے بجائے دوسرے فریق کی طرف سے بحث شروع کردی ان کے موکل کو تعجب ہوا۔ اس نے ان کے کان میں کہا کہ

آپ تو میرے وکیل ہیں اور مجھ سے فیس لی ہے اور میری مخالفت میں بول رہے ہیں ۔ یہ فقرہ سن کر جناب منشی امام الدین ہادی صاحب چونکنے ہوئے اور وکالت کرتے کرتے بحث کا رخ پلٹ دیا اور جج سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے آپ کے سامنے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ مخالف وکیل پیش کر سکتا ہے جن کا جواب یہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے مخالف وکیل کے دلائل سے اپنے مؤکل کے حق میں فیصلہ کرالیا جب جج کو ھادی صاحب کا نابینا ہونا معلوم ہوا تو اس نے سوال کیا اس پر منشی صاحب نے جواب دیا کہ میں تو (۱۷) سال سے اسی حالت میں وکالت کرتا ہوں۔ اس کے بعد سے وکالت ترک کردی۔

جناب ھادی صاحب خاندانی وجاہت رکھتے تھے۔ متدین۔ علوم دینیہ میں دسترس رکھتے تھے سنبھل کے مشہور معزز لوگوں میں آپکا شمار تھا۔ فن شعر میں کمال رکھتے تھے ھادی آپکا تخلص تھا نمونہ کلام کیلئے ھادی صاحب کا ذیل میں ایک شعر لکھتے ہیں۔

جو رحمت کی ہے آدم پر تو ھادی کو بھی بخشے گا
وہ تیری شان غفاری جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

اور ننھیال کی طرف سے نواب عاشق حسن سے منسلک ہو جاتے ہیں جن کا سلسلۂ نسب عزیز اللہ سے جاملتا ہے۔

آپ کی اولاد میں بڑے بڑے دانشور اور علماء پیدا ہوئے۔ اور آپ نے ۳ لڑکے چھوڑے (۱) منشی عنایت اللہ (۲) منشی حمایت اللہ (۳) منشی حمید الدین

منشی حمید الدین

آپ منشی امام الدین صاحب کے تیسرے لڑکے ہیں آپ باوقار مہذب، بارعب متدین علماء نواز شخص تھے۔ آپکو دنیاوی وجاہت کے ساتھ علمی حلقوں اور عوام وخواص میں مقبولیت حاصل تھی۔ آپکے یہاں ہر طرح کے قضیے طے کیے جاتے تھے

آپکے وسیع مکان کے ہر چار طرف دروازے تھے جو آج تک ہیں آپکے یہاں لوگوں کا ازدحام رہتا تھا گویا مکان عدالت تھا، بقول آپکے پوتے جناب محمد شفیع صاحب نواب عاشق حسین کو وہ مقام حاصل نہیں تھا۔ آپ اسلاف کا نمونہ تھے۔ علماء خاص کر اکابرین دارالعلوم دیوبند سے والہانہ محبت وعقیدت رکھتے۔ اکابرین دارالعلوم کی آمد آپکے یہاں ہوتی۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم جو بانی دارالعلوم دیوبند کی آمد کا واقعہ ارواح ثلاثہ میں نقل کیا ہے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور آخر میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی آپ ہی کے مہمان ہوئے ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی سنبھل آمد

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی سنبھل آمد پر بطور تبریک چند اشعار کہے اور تمہیدی جملوں میں یوں گویا ہوئے۔

''میں ایک شخص حمید نام سنبھل کا رہنے والا ہیں لکھا پڑھا دہلی کی بول چال کہاں سے لاؤں۔ محاورات اہل زبان کہاں پاؤں۔ بہر حال معافی کا امیدوار اصلاح کا خواستگار ہوں''

ملاحظہ طلب:

منجملہ بحور کے ایک بحر متقارب بھی ہے جس کے تین وزن رکھے گئے ہیں اول ہر مصرعہ چار مرتبہ فعولن دوسرے چوتھی مرتبہ فعول تیسرے چوتھی مرتبہ فعل یا فاعل۔ میرے نزدیک ہر سہ اوزان میں سے جو وزن بھی ہو۔ بحر متقارب کا اطلاق رہے گا۔

مسدس کی ابتداء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:

تری عظمت وجاں اللہ اکبر

تری شان کا کچھ ٹھکانا نہیں ہے

مبرا ہے شرکت سے تیری خدائی
تجھے کچھ بھی جتا جتا نا نہیں ہے
تیرے آگے سر سب کے جھکنے ضروری
تجھے سر کہیں بھی جھکانا نہیں ہے
سوا تیرے در کے قسم تیرے در کی
گذارا نہیں ہے ٹھکانا نہیں ہے
بجز رحمت حق حمید حزیں کا
دفینہ نہیں ہے خزانہ نہیں ہے
حسب میں نسب میں وہ گھٹیا نہیں ہے
لیاقت میں یکتا زمین وزماں کا
وہ آیا وہ آیا جسے سن رہے تھے
تو آہی گیا فخر ہندوستاں کا
بس اب چین سے سو خوشیاں مناؤ
کرو منہ کالا اس آہ وفغاں کا
وہ بے خود کی تسکیں آنکھوں کی ٹھنڈک
تسلی وہ خاطر خستگاں کا
خدا اسکو قائم رکھے دیر تک
وہ ہادی ہے رہبر ہے سب گمرہاں کا

مولانا حمید الدین کی تحریر کا ایک ادبی نمونہ

مسدس بیخود

من نتائج موزونی طبع منشی محمد حمید الدین المتخلص بیخود رئیس سنبھل ضلع مرادآباد
از یکے خاندان ابوالفیض معروف بہ فیضی فیاضی وزیر جلال الدین اکبر بادشاہ منشی محمد

حمید الدین نے سنبھل ضلع مرادآباد سے شائع کی۔

اتفاق

کوئی لاٹھی نہیں ماری اور سر پھٹ گیا۔ کوئی شربت مفرح نہیں ہے کہ پیا اور ٹھنڈک پڑگئی، بلکہ اتفاق نام اس نتیجہ کا ہے جو قدرتی طور پر صرف ایک طرز عمل سے پیدا ہوتا ہے،

انسانی ہمدردی

ہمدردی پیدا ہوتی ہے دو طور پر ایک دکھ درد میں اپنے انسانی بھائیوں کا جائز طور پر شریک ہونا بلالحاظ مذہب اور مشرب وغیرہ دوسرے اوروں کی برائی سے زبان کا روکنا۔

منشی حمید الدین نے پانچ لڑکے چھوڑے (۱) منشی معین الدین (۲) وحید الدین (۳) منشی فرید الدین (۴) منشی نور الدین (۵) منشی ظہور الدین پانچوں لڑکے الولد سر لابیہ کے مطابق اپنے والد کا نمونہ تھے۔ اور اپنے وقت کے بڑے لوگوں میں آپکا شمار تھا جسمانی وجاہت کے ساتھ بارعب تھے۔ منشی فرید الدین کو اور منشی معین الدین کو بندہ نے دیکھا ہے۔

مولانا معین الدین سنبھلی

مولانا معین الدین فاضل دار العلوم دیوبند تھے اور ظہور الدین صاحب بھی فاضل دیوبند تھے سنبھل میں فرید الدین صاحب اور معین الدین صاحب کی اولاد موجود ہے۔ چونکہ یہ گھرانہ علمی گھرانہ تھا اس لئے ادب وشائستگی وتہذیب پائی جاتی ہے۔ مولانا معین الدین قوم وملت کا درد رکھتے تھے۔ مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں کے جب سے وہ مہتمم ہوئے تو دوبارہ مدرسہ میں طلبہ کی آمد شروع ہوئی اور خیال ہوا کہ مدرسہ اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آئیگا۔ ۱۹۷۹ء میں عربی درجات میں بندہ

کا بھی اس میں تقرر ہوا۔ ۵ر شوال ۱۴۰۰ھ میں جوں ہی مدرسہ تعطیل کلاں سے کھلا ادھر موصوف کی طبیعت علیل ہوئی اور شوال ۱۴۰۰ھ میں پیغام اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون آپ مدرسہ شاہی کی مجلس شوریٰ کے سرگرم رکن تھے آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاجبزادے عین الدین صاحب کو مدرسہ شاہی کی مجلس شوریٰ کا رکن چن لیا گیا ہے۔

سید محمد میر عدل:

شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب دربار اکبری بحوالہ ملا عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ آپ امروہہ علاقہ سنبھل کے رہنے والے تھے۔ آپ دانشمند عابد، زاہد، متقی، پرہیزگار تھے وہ لکھتے ہیں کہ ابتدائی حال میں وہ اور میرے والد سنبھل کے بزرگوں اور استاذوں کی خدمت میں تحصیل علم کرتے تھے غالباً شیخ حاتم اسرائیلی سنبھلی سے اکتساب علم کیا۔ چونکہ شیخ حاتم نے ستر سال تک درس دیا ہے۔ شیخ عزیز اللہ تلبنی جو عہد سکندری میں سنبھل آئے تھے۔ ان کے ارشد تلمیذ تھے۔ شیخ حاتم نے ظہیر الدین بابر و ہمایوں اور اکبر کا زمانہ پایا ہے۔ سید محمد میر عدل، میر سید جلال کے درس میں بھی ساتھ تھے۔ میر سید جلال حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے میر سید محمد صاحب تحصیل علوم کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہوئے۔ اور دربار اکبری میں میر عدل مقرر ہوئے۔ اس جلیل القدر منصب کو آپ نے نہایت عدل و انصاف وراستی اور امانت کے ساتھ انجام دیا۔ بھرے دربار میں غیر شرعی بات پر فضیحت فرمادیتے اور کوئی دم نہ بھرتا۔ مولانا محمد حسین لکھتے ہیں۔ کہ یہ منصب انہیں کے لئے مناسب تھا۔ پھر کسی کو میر عدل کہنا عقل کو رسوا کرنا ہے۔ قاضی و مفتی بلکہ قاضی القضاۃ ان کی بزرگی کی وجہ سے اور ادب سے اپنی جگہ رک جاتے تھے۔ حاجی ابراہیم سرہندی نے ایک موقعہ پر اکبر کا شوق دیکھکر فتویٰ لکھا کہ سرخ و زعفرانی لباس پہننا جائز ہے۔ اور سند

میں کوئی ضعیف غیر مشہور سی حدیث بھی لکھدی علماء بھی پیچھے ہٹے۔ اور علماء کے جلسہ میں وہ فتویٰ پیش ہوا۔ انہوں نے حدیث مذکور میں صحت دوڑائی میر عدل موصوف ان پر بہت جھنجلائے۔ اور شاہی عین مجلس میں بد بخت۔ ملعون۔ اور گالی کے الفاظ ان کے حق میں کہہ کر عصا مارنے کو اٹھالیا۔ بھرے دربار فضیحت کی اور کوئی دم نہ مار سکا۔ لب نہ ہلا سکا۔ یہ اٹھ کر بھاگ گئے۔ رکتے تو ضرور مار کھاتے۔ انکا وقار و ادب اس قدر دلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ کہ سب بجا و برحق سمجھتے۔

سنبھل بیرم خان کی جاگیر میں:

ہمایوں جب دوبارہ ہندوستان کو روانہ ہوا۔ اسوقت بیرم خاں قندھار میں تھا۔ وہ ہمایوں سے کب جدا رہ سکتا تھا۔ اس نے عرضی بھیجی کہ غلام اس مہم میں خدمت سے محروم نہ رہے۔ ہمایوں نے طلب کر لیا بلوا بھیجا بڑی فوج لیکر لشکر میں شامل ہو گیا۔ سپہ سالاری کا خطاب ملا۔ امراء کی فہرست میں سب سے پہلا شخص بیرم خاں ہی تھا، لاہور کو ہمایوں بغیر جنگ کے قبضہ میں لایا اور وہاں قیام کیا۔

افغان کہیں کہیں تھے مگر گھبرائے ہوئے تھے کسی جگہ مزاحمت کرنے کی ہمت نہ ہوئی ہمایوں آگے بڑھتا رہا تردی بیگ نے ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ مگر بیرم خاں نے کہلا بھیجا کہ مصلحت نہیں ہے، مقام ستلج پر خبر ملی کہ ۳۰ ہزار افغان ستلج پار پڑے ہیں خان خاناں اس وقت اپنی فوج لیکر روانہ ہوا۔ افغانوں نے شب میں خوب آگ روشن کی ترکوں نے تاک تاک کر نشانے مارے جس سے افغانوں کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی علی قلی خاں حاکم سنبھل کو خبر ہوئی تو وہ دوڑا اور بھی سردار دوڑے، افغان بدحواس ہو کر دہلی کی طرف بھاگ نکلے۔ سارا مال و اسباب چھوڑ گئے۔ بیرم خاں نے فوراً خزانوں پر قبضہ کر لیا اور نفیس و عجائب گھوڑے وغیرہ اور عرضی لاہور روانہ کئے۔ ماچھی واڑہ میں اسوقت بڑی آبادی تھی بیرم خاں خود وہاں آیا اور سردار کو افغانوں کے

تعاقب میں جابجا روانہ کیا۔ دربار ہمایوں میں جو احوال واجناس وعرضی پیش ہوئیں اور نظر سے گزریں سب خدمتیں مقبول ہوئیں۔ اور خان خاناں کے خطاب پر یار وفادار اور ہمدم غمگسار کے الفاظ بڑھائے گئے اور اس کے تمام نوکر اشراف وغیر اشراف سب ہی کے نام شاہی دفتر میں درج ہو گئے۔ اور بیرم خاں خانی وسلطانی کے خطابوں سے زمانہ میں نامدار ہوئے۔ اور سنبھل کی سرکاران کی جاگیر میں لکھی گئی۔

(دربار اکبر صفحہ ۱۶۶)

اسد خاں حاکم سنبھل

۸۱۰ھ ذی قعدہ میں جبکہ ناصر الدین محمود کے مقرر کردہ برن کے حاکم ملک میر ضیاء پر ابراہیم شرقی نے حملہ کیا۔ ملک میر ضیاء قلعہ سے نکل کر ناصر الدین محمود کے مقابلہ میں آیا لیکن پہلے ہی حملہ میں شکست کھا گیا اور قلعہ کے اندر جا کر چھپ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ناصر الدین کے سپاہی قلعہ میں داخل ہوئے اور حریف کو قتل کر ڈالا۔ اسی موقعہ پر ناصر الدین سنبھل جا پہنچا۔ اس وقت سنبھل کا حاکم تاتار خاں تھا اس نے ناصر الدین کے آجانے پر بغیر کسی جنگ وجدل کے ہی میدان چھوڑ دیا۔ پھر ناصر الدین نے اسد خاں کو سنبھل کا حاکم مقرر کیا اور خود دہلی واپس چلا گیا۔ (تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۹۲)

سنبھل پر سکھوں کا حملہ

۱۷۸۳ء ۲۰۰۰ سکھوں نے جمع ہو کر چار مشہور سرداروں کی قیادت میں سنبھل کو لوٹنے کے ناپاک ارادہ سے رام گھاٹ اور راج گھاٹ کے درمیان سے گنگا پار کرنے کی کوشش میں تھے۔ وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہے۔

ان کی قوت توڑنے اور ان کے رخ کو لوٹانے اور ارادہ کے ناکام بنانے میں مرزا محمد قاسم خاں کی دوراندیشی دعالی ہمتی۔ وشجاعانہ حملہ کو پورا دخل ہے۔

مرزا محمد قاسم خان نواب آصف الدولہ کے عامل تھے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ

اس طرح دی ہے ۱۷ر جنوری ۱۸۳ ء کو سکھوں کی بے شمار فوج قرو ح رام گھاٹ اور راج گھاٹ پر دکھائی دی۔ جسکی قیادت چار معزز سردار کر رہے تھے، جہاں پر ندی کچھ کم چوڑی ہے۔ میں نے فوراً سکھوں کی یلغار روکنے کیلئے چند دستوں کو ترتیب دیکر پیادہ اور گھوڑ سواروں کو روانہ کیا۔ کہ سکھوں کو ندی پار کرنے سے باز رکھیں۔ اور تعاقب کر کے ان کا منہ پھیر دیں۔ نیز تمام کشتیوں کی حفاظت کرنے اور سرحد پر لاکر بندش کا حکم دیا۔

۱۷ر جنوری کو مخالف کی فوج اور میری فوج کے مابین ایک معاہدہ کی تیاری ہوئی۔ راج گھاٹ جہاں پر ندی کچھ کم چوڑی ہے اور میری رہائش گاہ سے چار کوس دور ہے۔ میں ۱۸ر کی صبح کو اپنے ساز وسامان اور فوج کے ہمراہ راج پور کے قلعہ میں پہنچا۔ جو مرزا سعید الدین عمر کے زیر نگرانی تھا پیادہ و گھوڑ سوار فوج کو لیکر راج گھاٹ کی جانب بڑھا طلوع آفتاب سے قبل پہنچا۔ شکرِ غنیم میں ۲۰۰۰ فوج جمع تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ لوٹ مار کی غرض سے شامل ہوئے تھے اور انہوں نے ندی پار کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بروقت پہنچ کر ان کے ارادوں کو ناکام کر دیا۔ ایک گھمسان کی معرکہ آرائی ہوئی۔ جو شام تک جاری رہی۔

مرزا محمد قاسم خاں کا بیان ہے کہ میں زیادہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن جب رات کی تاریکی کے پردہ و چادر ڈالنے پر دشمن کی فوج میدان سے لوٹ گئی۔ میں اپنے بہادر سپاہیوں کے ساتھ رات بھر دشمن سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے بیدار رہا۔ چوکسی کی اور میرا یہ عمل صرف اپنی حفاظت کیلئے نہیں تھا بلکہ شاہ معظم کی حکومت کے استحکام کی خاطر جنگ لڑی۔

ہماری مستعدی نے دشمنوں کو اپنی خاطر سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور ۱۹ر تاریخ کو سورج طلوع ہونے سے قبل صبح دشمن اپنی جگہ چھوڑ کر خورجہ اور شکار پور کی طرف بھاگ نکلا۔ اس علاقہ کے سوداگروں اور ان کے خاندان کے لوگ جان بچانے کیلئے اپنے ساز وسامان کے ساتھ محفوظ جگہ جانے لگے،

سنبھل اور باشندگان سنبھل کی خاطر میں ان کے تعاقب کیلئے پہنچ گیا۔ میرے ساتھ ایک فوج اور دو تین توپیں تھیں۔ مجھے ندی پار کر کے ان باغیوں کو شکست دیکر اس بغاوت کی سزا کا مزا چکھانا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے قبضہ میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ میں نے یہ مناسب جانا کہ اسی طرف رہکر مخالف پر کڑی نظر رکھی جائے۔ لیکن اس سے سکھوں نے دہشت پسندانہ حرکت چھوڑ دی۔ جس سے لوگوں نے چین کے سانس لئے۔

آخر کار میں نے خداداد بہادری اور دانشمندی سے انہیں شکست دی اور ان کے منصوبوں کو پامال کر کے ان کی کوشش کو ناکام کیا۔

میں سوچتا تھا کہ وہ جلدی علاقہ خالی نہیں کریں گے۔ قیاس تھا کہ دو ماہ میں لوٹ جائیں گے اور گرمیوں میں پھر فوج کشی کر سکتے ہیں،

مرزا محمد قاسم خاں نواب آصف الدولہ کی بروقت شجاعانہ۔ جراٴت مندانہ۔ کاروائی۔ عالی ہمتی نے سنبھل مرادآباد و نواحی علاقوں کو باغی سکھوں کی لوٹ مار و تخت و تاراج و دہشت گری سے محفوظ رکھا اگر مرزا محمد قاسم خاں کی مذکورہ کاروائی بروقت عمل میں نہ آتی تو باشندگان سنبھل اور نواحی علاقہ کو جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا اور ایسی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا جس کا تدارک ناممکن ہوتا۔

قریشیوں کے چودھری سے مدد طلب کرنا:

نواب یوسف خاں انگریز کے حامی وطرفدار تھے ان کو شکوک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ گو بظاہر مرادآباد پر ان کا قبضہ تھا۔

شہزادہ فیروز شاہ جب ۷؍ رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ مطابق ۲۲؍ اپریل ۱۸۵۸ء سنبھل آیا۔ اہل سنبھل نے تعاون کیا سنبھل سے مرادآباد داخل ہو کر عیدگاہ کے قریب قیام کیا۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء ص ۳۲۶)

...... چونکہ نواب رام پور کی دست اندازی اور غداری کرنے پر لوگوں کو بہت

ملال تھا، خاص کر نواب مجو خاں کی خواہش تھی کہ مرادآباد سے نواب رام پور کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے چونکہ بچہ بچہ نواب کا مخالف اور شاکی تھا۔

شہزادہ فیروز کی خبر سن کر مجاہدین کی ہمتیں بلند تر ہو گئیں اور خوشی کی لہر دوڑ گئی جوش پیدا ہوا تدبیریں اور منصوبے بنائے جانے لگے، ادھر سے غلام ناصر خاں۔ موسی رضا اور مولوی شاہ علی فیروز شاہ کے پاس پہنچے۔ آنے کا سبب معلوم کیا اس پر شہزادہ نے کہلایا کہ راستہ بھول گیا ہوں روزہ دار ہوں افطار کے بعد چلا جاؤں گا، اسی دوران شہزادہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ شہزادہ کی فوج اصول جنگ سے واقف کار اور ماہر تھی نواب رام پور کی فوج نے شہزادہ سے شکست کھائی بھاگنے والوں میں پہلا شخص غالب علی رسالہ دار تھا۔ نیز فوج کے سربراہ موسی رضاء اور غلام ناصر بھی بری طرح زخم خوردہ ہوئے۔ جب یہ حالت پیش آئی تو مولوی شاہ علی نے شیوخ قصبان کے چودھری سے مدد چاہی انہوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اور فرنگی مدد کا طعنہ دیا۔ تو مولوی شاہ علی کو خفت ہوئی اور شہزادہ کی فوج شہر مرادآباد میں پھیل گئی، انگریزوں کے حامیوں کی گوشمالی کی گئی۔ جس سے مجاہدین میں بڑی قوت وطاقت پیدا ہوئی نواب یوسف خاں کو فیروز شاہ کے مرادآباد پر قبضہ کرنے سے بہت دکھ ہوا۔ یہاں تک کہ ان سے دو وقت تک کھانا نہیں کھایا گیا۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء صفحہ ۳۲۷)

جاٹوں کی سنبھل میں تحریک:

نواب مجو خاں حاکم سنبھل مقرر ہوتے ہی صاحب سنگھ اور چھدو لکھوری کے جاٹوں نے سنبھل اور گردونواح میں تحریک کو اور بھی قوت دی غداروں کو سزا دے کر چندوسی میں اپنی حکومت قائم کر لی جنگی خان اور سردار خاں دیورنگا اہیر ٹھاکر کے محلات پر قابض ہوئے تو انگریزوں کے حامی جلاوطن ہو کر مختلف مقامات پر چلے گئے۔

(۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء۔ صفحہ ۳۲۴)

سنبھل کے نواح میں تحریک کے خلاف محاذ قائم:

نواب ولی داد خاں مالا گڈھ (بلند شہر) کے نواب نے خان بہادر خان کے مشورہ سے نواب رام پور کا زور توڑنے کیلئے حملہ کیا۔ مگر نواب کی فوج تحریک کو دبانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ جب چندوسی سہسپور، بلاری وغیرہ میں حالات نے تیزی پکڑی تو اصغر علی خاں کی ماتحتی میں ان مقامات پر فوج روانہ ہوئی حکیم سعادت علی خاں ساتھ تھے۔ سنبھل اور اس کے نواح چندوسی، سہسپور، بلاری بسولی میں نوابی فوج نے تحریک آزادی کے متوالوں کے خلاف محاذ قائم کر کے ان کی قوت کو پوری طرح کچل دیا۔ (الجمعیۃ ۱۹ نومبر ۱۹۵۶ء)

سرسی کا ہجوم:

ہندوستان میں مسلم اقتدار کی بنیاد شہاب الدین غوری سے ہوتی ہے چنانچہ ۱۲۰۲ء میں قطب الدین ایبک جو شہاب الدین کا غلام ہے اس نے سنبھل کو فتح کیا۔ اسی دور میں مخدوم جلال الدین قطب الملک کی سرسی آمد ہوئی اور قیام پذیر ہوئے، آپکے نواسہ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جسکی تاریخ ۶۹۷ھ ہے، آپ کے مزار کے چاروں طرف احاطہ ہے جو چھوٹی اینٹ کا بنا ہوا ہے ۲۷ / ربیع الثانی کے آخری جمعہ کو ہر سال دھوم دھام سے ایک میلہ لگتا ہے اس میلہ کو ہجوم کے جمعہ سے یاد کیا جاتا ہے گویا کہ آپ کی یادگار میں عرس کے طور پر لگتا ہے، جسمیں قرب وجوار خاص کر سنبھل وسرائے ترین کے لوگ شریک ہو کر اس کی رونق بڑھاتے ہیں اور اہل سرسی دل کھول کر مہمانی وضیافت کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر خاص اہتمام کرتے ہیں۔ اس دن پورے علاقہ سے مذبوحہ جانوروں کی زبانیں دستیاب نہیں ہوتیں کیونکہ مزار پر نذر کے طور سے چڑھائیں جاتی ہیں۔ مرد عورتوں کا مجمع ہوتا ہے اور خرافات ہوتی ہیں۔

سنبھل کی مشہور و معروف لائبریریاں

عاشق پبلک لائبریری سنبھل

اس لائبریری کو سید علی ابن حامد علی تحصیل دار سنبھل نے ۱۹۲۲ء میں قائم کیا۔ جو اسوقت ضلع مجسٹریٹ مسٹر وائٹن کے نام سے منسوب ہوئی یہ لائبریری پہلے سنبھل میونسپل بورڈ کے وسیع و عریض ہال میں تھی۔ عمارت اپنی نہ ہونے کی وجہ سے اخبار بینی اور کتب و رسائل کے مطالعہ کیلئے کوئی باقاعدہ دارالمطالعہ (ریڈنگ روم) نہ تھا۔ نواب ساجد حسین خاںؒ نے اپنے دور چیرمینی میں ۱۹۵۷ء میں اپنے والد ماجد نواب عاشق حسین خاں کے نام سے منسوب کیا ۱۹۵۷ء کو ایک قرارداد کے ذریعہ مسونسپل بورڈ سنبھل سے لائبریری کیلئے ۶۰۰ سو روپیہ سالانہ امداد کی درخواست کی گئی ۳ رنومبر ۱۹۵۷ء کو مسٹر لطیف الرحمٰن کی زیر صدرات ہونے والی میٹنگ میں لائبریری کا صدر متفقہ طور پر ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کو منتخب کیا گیا۔ موصوف کی کوشش سے میونسپل بورڈ سے ملنے والی ۶۰۰ کی امداد ۱۲۰۰ کردی گئی۔ ۱۸ رجنوری ۱۹۵۸ء میں ہونے والی ایک میٹنگ میں لائبریری کیلئے ایک بلنڈنگ ہال تعمیر کرانے کی تجویز منظور کی گئی، جس کیلئے میونسپل بورڈ سنبھل نے لائبریری کی عمارت کیلئے نگر پالیکا سے ملحقہ اراضی ۹۹ سال کیلئے پٹے پر لائبریری کو دی۔ تعمیر کیلئے عوام و ممبران سے چندہ کیا گیا۔ ۱۹ راپریل ۱۹۷۹ء کو ریاستی وزیر عبدالحلیم خاں صاحب نے سنگ بنیاد رکھا، سنبھل کے مشہور ٹرانسپورٹر راجہ عبدالرشید نے گراں قدر عطیہ دیا۔ لائبریری کا مرکزی ہال راجہ رشید اردو ریڈنگ ہال کے نام سے منسوب ہوا۔ ۲۱ رنومبر ۱۹۸۱ء کو وزیر مملکت مسٹر ضیاء الرحمٰن انصاری نے اس کا افتتاح کیا۔ لائبریری کے دوسرے محبہ کنندگاں کے نام سے منسوب و موسوم ہیں۔ عاشق لائبریری میں مختلف علوم و فنون۔ مذہبیات، ادب و شاعری پر مشتمل تقریباً ۲۵۰۰۰ سے زائد کتب کا ذخیرہ موجود ہے لائبریری کا انتظام اور کتب کا رکھ رکھاؤ قابل تعریف ہے، لائبریری کی ترقی میں سابق لائبریرین جناب بدرالدین احمد انصاری کا

بڑا دخل ہے وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۹۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے اس وقت سید محمود علی لائبریرین کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ (عوام ...... ۲۱/۵/۱۹۹۸)

عاشق لائبریری اپنی افادیت اور علمی اثاثہ کے لحاظ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اتر پردیش کی لائبریریوں میں یہ ایک ہے اس لائبریری کی ترقی میں جناب سعادت علی صدیقی مرحوم کی کوشش و فکر کو بڑا دخل ہے جناب سعادت علی صدیقی علمی فضائل کے ساتھ امور انتظامیہ سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اگر موصوف کے متعلق یوں کہا جائے کہ وہ جس میدان میں قدم اٹھاتے پوری طرح اٹھاتے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جاتے۔ تو بے محل نہ ہوگا۔

ان کے کارناموں میں سے ایک عاشق لائبریری بھی ہے جبکہ سعادت علی کا سنبھل وطن نہیں تھا لیکن سنبھل سے محبت اور لائبریری کیلئے انتھک کوششوں کے نتیجہ میں آج اتر پردیش میں بلند مقام رکھتی ہے اور علمی اثاثہ کی بنا پر اہل علم میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جارہی ہے۔ انہوں نے لائبریری کی باضابطہ تنظیم جدید کی، نیا فرنیچر اور کتابیں فراہم کیں اور الماریاں بنوائیں۔

نیشنل لائبریری سنبھل

یہ لائبریری محلہ دیپا سرائے سنبھل نزد روضہ والی مسجد واقع ہے ۱۹۵۶ء میں قائم ہوئی، حضرت مولانا محمد اسمٰعیل، ڈاکٹر برق صاحب حماد احمد، مسعود الحسن صاحب امیر صاحب و دیگر حضرات اس کی تاسیس میں شریک تھے،

۱۹۵۸ء میں ایک مشاعرہ ہوا، جس میں جنرل شاہ نواز تشریف لائے۔ اور پھول برسا کر ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ اس لائبریری میں اردو، ہندی، انگریزی کے اخبار آتے ہیں نیز رسائل بھی، اس میں مطالعہ کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

علامہ اقبال پبلک لائبریری

یہ لائبریری بھی محلہ دیپا سرائے میں واقع ہے ۱۹۹۸ء میں قائم کی گئی،

عبدالغفار صاحب اس کے نگران وسرپرست ہیں اس لائبریری میں اخبار ورسائل کا مطالعہ کرنے والوں کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ نیز یہ امید قائم ہوئی کہ اس سے وابستہ حضرات ترقی دیگر علمی ذخیرہ (کتابیں) جمع فرمائیں گے اور آگے چل کر ایک بڑی لائبریری کی صورت اختیار کرے گی۔

خلیل پبلک لائبریری سرائے ترین

اس کا قیام ۲۰۰۰ء میں عمل میں آیا۔ یہ لائبریری جناب عقیل الرحمٰن صاحب کے والد محترم خلیل الرحمن خان کے نام سے موسوم کی گئی۔ اور اس میں اخبارات ورسائل آرہے ہیں ابتداء ہی میں بہت سی کتابیں جمع ہوچکی ہیں ہر فن وموضوع کی کتابیں جمع کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس کے منتظم جناب بدرالدین صاحب سابق لائبریرین عاشق لائبریری ہیں۔

چھنن کی بارات

جہاں بے شمار حوادثات کا وقوع ہورہا ہے وہاں ایک حادثہ سنبھل میں پیش آیا جو اہل سنبھل کی زباں زد اور مشہور ہے جس سے ہر چھوٹا و بڑا۔ مرد و عورت متعارف ہے اس کو تاریخی حیثیت حاصل ہے وہ چھنن کی بارات ہے سنبھل محلہ محمود خاں سرائے میں ایک بڑھیا کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سرائے ترین سے اس کی شادی ہونا طے پائی تھی۔ تاریخ مقررہ پر دولہا بننے کی تمام تر رسومات ادا کرنے کے بعد باراتیوں کے ہمراہ ہو کر چل دیا۔ جب بارات آدھا راستہ طے کر چکی محلہ چودھری سرائے پہنچی تو ٹرک سے ٹکر لگی اور جان بحق ہوگیا اس واقعہ کو سنبھل کے ایک صاحب قلم جناب نیرنگ ؔ نے نظم میں قلمبند کیا ہے۔

نظم

نیرنگ کچھ خبر بھی ہے سنبھل میں کیا ہوا	☆	ایک طرف حشر حشر سے پہلے بپا ہوا
ایک دل کو آکے موت نے پیروں سے مل دیا	☆	ایک پھول کھل رہا تھا چمن میں مسل دیا
ساحل پہ آکے ڈوب گئی کشتی غریب	☆	آکر الم نے گھیرا ہوئی جب خوشی نصیب

ارمان دل کے دل میں للچا کے رہ گئے ☆ کھلنے نہ پائے پھول کہ مرجھا کے رہ گئے
دل تھام کے یہ قصۂ حیرت اثر سنو ☆ ناقابل بیاں ہے حالت مگر سنو
محمود خان سرائے میں بڑھیا تھی ایک غریب ☆ قسمت سے ایک بیٹا ہوا تھا اسے نصیب
سب گھر میں تھا عزیز اور چھنن تھا اس کا نام ☆ رکھتی تھی اپنے دل سے لگا کر اسے مدام
کی پرورش تھی اس کی بڑے لاڈ پیار سے ☆ وہ خوش تھی اس عنایت پروردگار سے
ارمان یہ تھا کہ بیٹے کی شادی رچائے گی ☆ اس کا بیاہ کر کے دلہن گھر میں لائے گی
القصہ دولہا پہنچا جوں ہی نصف راہ پر ☆ آتے ہوئے ٹرک پہ پڑی اس کی ایک نظر
گھوڑا سنبھل سکا نہ وہ گھبرا کے رہ گیا ☆ سائیں بھی فریب نظر کھا کے رہ گیا
گھوڑا وہ بدکا آ گیا جس دم ٹرک قریب ☆ اس کا الٹ پلٹ کے وہیں رہ گیا نصیب
ٹکرا کے دولہا گر گیا فوراً زمین پر ☆ اور سر پہ ایک پہیہ ٹرک گیا اتر
اس گل بدن کا زخموں سے سر چور ہوگیا ☆ سہرا بھی اس کا خون سے معمور ہوگیا
کچھ سن سکا کسی کی نہ وہ اپنی کہہ سکا
اس حادثہ کی پہنچی جو چاروں طرف خبر ☆ اک ازدحام ٹوٹ پڑا آ کے بے خطر
جو دیکھتا تھا آ کے یہ نظارہ دردناک ☆ رنج والم سے ہوتا تھا دل اس کا چاک چاک
القصہ ایک حشر تھا چاروں طرف بپا ☆ ہر آنکھ میں تھے آنسو ہر ایک دل میں درد تھا
میت عشا کے بعد اٹھی ازدحام سے ☆ چھنن کی پھر بارات چڑھی دھوم دھام سے
منزل جو اس کی تھی اسے پہنچا دیا گیا ☆ نزدیک ملک پیر شاہ دفنا دیا گیا

گڑھ مکتیشر میں بزرگ کا قرار گڑھ مکتیشر میں خادمہ شیخ پنجو

گڑھ مکتیشر میں عہد اکبری کے ایک بڑے بزرگ اللہ بخش کا مزار ہے۔ شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیشر چالیس سال تک ارشاد و ہدایت میں مشغول رہے۔ بڑے متوکل بزرگ تھے۔ جو اہل اللہ کی صفت ہے۔ کہ ان کو دیکھ کر اور صحبت میں خدا یاد آ جائے۔

شیخ اللہ بخش کی صحبت میں بھی خدا یاد آتا تھا۔ موصوف جب ستر برس کی عمر میں پہنچے تو سنبھل کے علماء وصلحاء واتقیاء سے ملاقات اور سیر کی غرض سے سنبھل پہونچے تو سنبھل میں ایک بڑھیا بڑی عابدہ زاہدہ تھی جو شیخ پنجوں کی خدمت کیا کرتی تھی۔

ہمیشہ روزہ رکھا کرتی۔ پنتیس سال سے بیوہ تھی۔ اسکی غذا صرف دودھ تھی۔ اسی پر دارومدار تھا وہ بڑھیا غائبانہ شیخ اللہ بخش کی بڑی معتقد تھی۔ اس موقع پر اس نے درخواست کی کہ مجھے بھی راہِ خدا بتائے۔ شیخ اللہ بخش نے فرمایا کہ جب تک تو سنت رسول کی پیروی نہ کریگی کہ کسی کے نکاح میں نہ آئے گی تو اس وقت تک یہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

شیخ کی بات اس کے دل میں اتر گئی۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے کو شیخ کی زوجیت کیلئے پیش کیا۔ حضرت کے عقد میں آ گئی۔ ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں بھی اپنے ایک دوست محمد قاسم دہلوی کے ہمراہ شیخ اللہ بخش کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے ان کو بڑا خوش مجلس اور خوش تقریر پایا۔

(علم وعمل صفحہ ۳۲۵۔۳۲۶ وقائع عبد القادر خانی)

سنبھل کے اخبارات ورسائل

اس مضمون کے تحت سنبھل سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کا ذکر ہے سنبھل سے شائع ہونے والے اخبارات کا تعارف پیش ہے۔

(۱) تجارت

سنبھل سے شائع ہونے والے اخبارات میں ایک تجارت ہے یہ ہفتہ روزہ اخبار ہر ماہ کی ۲۔۱۱۔۱۸ اور ۲۶ کو شائع ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر مشرا تھے اس کا سالانہ چندہ ۴ سو تھا اس اخبار کا سال اجرا ۱۹۲۴ء ہے۔ اخبار کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھے نام کے ساتھ یہ شعر چھپا ہوا تھا۔ ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر۔ تو وہ خوف وذلت کے

حلوے سے بہتر۔ تجارت اخبار اپنے نام کی مناسبت سے اشتہارات کیلئے وقف تھا۔

آفتاب

سنبھل سے شائع ہونے والے اخبارات میں ایک آفتاب ہے۔ آفتاب کو دوسرے اخبارات سے زیادہ اہمیت کا حامل سمجھا گیا ہے اور روھیلکھنڈ کے مشہور اخبارات میں شمار کیا گیا ہے۔ آفتاب ۱۹۲۶ء میں جاری ہوا جس کے پروپرائٹر ایڈیٹر جناب اعجاز احمد تھے۔ آرائش گلشن کے نام سے شائع شدہ روداد مطبوعہ ۱۹۲۸ء اخبار آفتاب ہفتہ وار کے عنوان سے یہ اشتہار درج ہے جس سے اخبار کے بارے میں یہ معلومات ملتی ہیں ۱۹۲۶ء سے ملک وقوم کی جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ آفتاب ہندوستان کا ایک ایسا ہمہ گیر اخبار ہے جو اپنے ہردلعزیز مضامین کی وجہ سے ہندوستان ودیگر ممالک میں عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ آفتاب ہر ماہ کی انگریزی ۲-۹-۱۶ اور ۲۳ کو شائع ہوتا تھا۔ شمارہ نمبر ۹ دسمبر ۴۳ء جلد نمبر ۱۸ اور شمارہ نمبر ۴۵-۴۶ صفحہ اول کی پیشانی پر روہیل کھنڈ کا مشہور اخبار آفتاب لکھا ہوا تھا جس کے ساتھ یہ شعر بھی چھپا ہے۔

ظلمت سرائے دہر میں پھیلے گی روشنی
لو آسمان علم پہ نکلا ہے آفتاب

پیشانی کی دائیں طرف سالانہ قیمت والیانِ ریاست سے ۲۵ روسا حکام سے ۱۰ر معززین سے ۵ر عوام سے ۳ر روپیہ اور ممالک غیر سے ۸ شلنگ اور بائیں جانب تاریخ اجرائے اشاعت کے ساتھ یہ اطلاع بھی تھی احکامات سرکاری باقاعدہ مشتہر ہوئے ہیں ایک ایک کاپی اخبار فریقین مقدمہ کو بغرض اطلاع دفتر سے بھیجی جاتی ہے۔

المہدی

سنبھل سے شائع ہونے والے اخباروں میں سے ایک المہدی ہے۔ جس کے

بارے میں جناب سید سعادت علی صدیقی مرحوم رقم طراز ہیں کہ المہدی کے چند بوسیدہ اوراق راقم کو دستیاب ہوئے ہیں جن پر ۱۵ر فروری ۴۲ء کی تاریخ درج ہے یہ اوراق جلد ۱۵ کے شمارہ نمبر ایک کے ہیں جو مہدی حسین زیدی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں شائع ہوا تھا۔ سید مہدی حسین زیدی کی پوتی بیگم خورشیدہ جہان زیدی کی تحریر کے مطابق المہدی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اور ۱۹۴۱ء میں بند ہو گیا ماہنامہ صحیفۂ دیوا شریف کے ایک شمارہ کے تبصرہ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ المہدی ۱۹۲۴ء یا اس سے قبل منظر عام پر آ چکا تھا۔

المہدی کے ایڈیٹر منشی سید مہدی حسین وارثی المعروف جادو رقم سنبھلی تھے، ایک صحیفہ وارثی میں یہ عبارت لکھی ہے کہ المہدی جو سنبھل مراد آباد سے ہفتہ وار سولہ صفحات پر نہایت آب و تاب سے زیر ایڈیٹر منشی سید مہدی حسین وارثی المعروف جادو رقم سنبھلی جو اخباری دنیا میں مشہور اور تجربہ کار ہیں۔ شائع ہوتا ہے۔ سنبھل کے اخباروں میں یہ ایک ہی اردو پرچہ ہے جو اخبار کے نام کا مستحق ہے۔ جو مسلمانوں کی اخباری ضرورت کو حتی المقدور احسن طریقے سے پورا کرتا ہے۔

کسی کی دل آزاری اور بیجا حمایت نہیں کرتا جسکے مضامین دلچسپ اور مفید، جس کی خبریں معتبر اور تنقیدات بے لاگ اور منصفانہ ہوتی ہیں بایں ہمہ چندہ سالانہ صرف ۳ر روپیہ ۴ر آنہ ہے اگر اس پر بھی ملک و قوم قدر نہ کرے تو بے حد افسوس ہے۔

المہدی کے پہلے ایڈیٹر سید مہدی حسین کے بعد ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد عبد الاحد وارثی مینجری کے فرائض انجام دیتے تھے اور سید مہدی حسین کی وفات کے بعد ادارت کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔

شہاب مبصرین کی نظر میں:

شہاب کے اجراء پر ہدیہ تبریک و تہنیت۔

مکرمی و معظمی جناب ایڈیٹر صاحب ''شہاب'' السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔

آپ کی مفید خدمات کا جو تازہ ثبوت شہاب کی شکل میں مہیا ہوا اعتراف کرتے ہوئے شہاب کے اجراء پر ہدیہ تبرک وتہنیت پیش کرتا ہوں۔میری دلی تمنا ہے کہ شہاب کو دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہو اور وہ دن جلد آئے جس دن کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کے خریدار نظر آئیں اور یہ نعمت غیر مترقبہ ہر گھر میں جلوہ افروز ہو۔ایم ایس رحیم (جونا گڈھ کاٹھیاواڑ)

شہاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے

محترم جناب ایڈیٹر صاحب ''شہاب'' دام اقبالہ۔السلام علیکم مزاج مبارک۔ مؤدبانہ التماس ہے کہ آپکا ارسال کردہ اخبار شہاب خاکسار کو ملا۔اول سے آخر تک بہ نظر تعمق مطالعہ کیا گیا واقعی شہاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے امید ہے کہ عنقریب یو پی کا ایک مایہ ناز اخبار ثابت ہوگا۔ایک ایک حرف اس کا مفید اور کارآمد پایا۔بیکار مضمون یا بھرتی کی کوئی خبر درج نہیں۔اخباروں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ دو ایک باتیں کارآمد اور مفید شکل ہاتھ آتی ہیں اور باقی سب بیکار ہوتی ہیں۔اخباروں کے مطالعہ میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس کا اکثر حصہ بیکار جاتا ہے۔شہاب میں جو چیز دیکھی گئی مفید پائی۔میں اس کا فائل نہایت احتیاط سے رکھونگا۔میرے نام جاری فرمادیں ممنون ہوں گا۔خاکسار احسن (الہ آباد)

شہاب کیا ہے کوزہ میں دریا بند کیا ہے

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب ''شہاب''۔السلام علیکم۔اخبار شہاب ملا یاد آوری کا شکریہ۔شہاب کیا ہے کوزہ میں دریا بند کیا ہے۔میری رائے یہ ہے کہ آپ اس کے نمونہ بکثرت تقسیم کریں۔اخبار بیں طبقہ اس اخبار کو خوش آمدید کہے گا اور ہر جگہ اس کے بکثرت خریدار پیدا ہو جائیں گے جناب علی خانداں جس کا مرتبہ عزو شرف میں ثریا تک

بلند ہے۔اس کے خوشہ چین ہر جگہ بکثرت موجود ہیں ان سب کے پاس نمونے ارسال فرمائیں آپ کے پر دادا حضرت العلامہ مولانا سراج احمد اسرائیلی کے تلامذہ تک اور جاننے والے ابتک موجود ہیں ان کو بھی فراموش نہ کیجئے۔ جناب کے جد امجد حضرت العلامہ شمس العلماء مولانا خلیل احمد صاحب اسرئیلی چونکہ مدت مدید تک علیگڈھ کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔اس لئے ان کے توہزاروں شاگرد ہندوستان کے چپہ چپہ پر موجود ہیں جو بڑے عہدوں پر اور منصبوں پر فائز ہیں۔ان سب کے پاس شہاب ارسال کیجئے امید ہے کہ ان میں سے کوئی انکار کی جرات نہیں کرے گا۔جناب والد ماجد کے علمی کمالات کے خوشہ چین بھی کم نہیں ہیں ان کو بھی یاد فرمائے۔شہاب کو تو جناب کے والد ماجد کی سرپرستی حاصل ہے کہ جنکے علمی کمالات اور عملی ملکات کی مثال تلاش کرنی عبث ہے جن کے فیض پذیر ہر جگہ موجود ہیں اور دوسروں کو فیض پہنچا رہے ہیں۔جو علم طب میں طبیب اعظم حکیم عبدالمجید خاں صاحب دہلوی کے خاص شاگرد مانے جاتے ہیں۔اور جنہیں علم طب میں حقیقتاً اجتہاد کا درجہ حاصل ہے اور خود آپ کے شاگردوں کا حلقہ بھی کیا کچھ کم ہے اپنے شاگردوں کو بھی شہاب سے روشناس کیجئے۔اگر میری اس ناچیز رائے پر عمل کیا گیا تو مجھے امید ہے کہ شہاب کی اشاعت آناً فاناً بیرون تک پہنچ جائے گی۔سید شرافت حسن (مظفر نگر)

سنبھل کے فسادات

پورے ملک کی طرح سنبھل بھی ماضی میں باہم محبت و پیار امن وآشتی اور انسانی ہمدردی ورواداری کا گہوارہ تھا۔یہاں مسلمان وہندو نہایت میل ومحبت کے ساتھ رہتے تھے،

لیکن جس طرح فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ ہمارے ملک میں کوئی نیا مسئلہ نہیں رہا تو وہاں سنبھل بھی اس سے خالی نہیں ہے۔آج سنبھل کا شمار ملک کے حساس ترین علاقوں

میں کیا جاتا ہے۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد سے منافرت، تعصب اور شرو انگریز کی شرارتوں اور فتنہ نے یہاں جنم لیا۔ آزادی کے بعد سے منافرت کی مسموم ہوائیں آئے دن اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ملک بھر میں جب بھی کوئی فرقہ وارانہ فساد رونما ہوتا ہے تو سنبھل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور ہر مرتبہ فساد کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔ اگر چہ اقلیت فرقہ اکثریت میں ہے، اس میں بھی شک نہیں کہ حکام حالات کے سدھار میں سمجھ داری سے کام لیتے ہیں تو فساد کی نوبت نہیں آتی،

سنبھل میں پہلا فساد

۱۹۲۴ء میں سورج کنڈ مقام میں ہندو مسلم بلوہ ہوا۔ جس میں چند افراد شدید زخمی ہوئے۔ کسی کی موت واقع نہیں ہوئی چونکہ انگریزی دور حکومت واقتدار تھا۔ بلوے کو سختی کے ساتھ دبا دیا گیا پھر انگریزی حکومت کے آخر لمحہ تک کسی فتنہ پرور کو سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا اور نہ فساد نے جنم لیا۔

دوسرا فساد

ملک کی آزادی اور تقسیم وطن کے بعد ۱۹۴۸ء میں محلہ کوٹ غربی جناب نہال الدین صاحب کی دوکان کا اسباب لوٹ مار کرنے اور نذر آتش کرنے نیز ان کے گھر کی عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی خبریں شہر میں گشت کر گئیں۔ جس سے حالات کشیدہ ہوئے محلہ میاں سرائے اور محلہ کٹرہ موسی خاں میں ایک بلوہ ہوا جس میں چند افراد قتل ہوئے۔

پھر ۱۹۵۶ء میں ایک شدید بلوہ ہوا جس میں مسلمانوں کے جانی و مالی بہت زیادہ نقصانات ہوئے۔ پھر جنتا حکومت کے دور میں ایک ایسا ہی شدید بلوہ ہوا جس میں خاص تھانہ کے سامنے ۱۰۰ ار مسلمانوں کا بہت زیادہ مالی نقصان ہوا۔ جس نے بریلی ڈویژن کے کمشنر شری شیام لال کو انکوائری کے لئے مقرر کیا وہ تحقیق کر رہے

تھے اور کافی معلومات فراہم کر چکے تھے کہ جنتا حکومت ختم ہوگئی اور اندرا گاندھی کی حکومت پھر سے قائم ہوئی تو انکوائری کمیشن بھی ختم کر دیا گیا۔

پھر ۱۹۸۰ء میں خاص عید کے دن شہر مرادآباد کی عیدگاہ میں پولس مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی اور جانور چھوڑے گئے اور مسلمانوں کو ظلماً شہید کیا اس کی اطلاع ملنے پر سنبھل میں کافی کشیدگی پھیل گئی۔ عام اطلاع کے مطابق بہت تیزی کے ساتھ یہ بات گشت کر گئی کہ محلہ بیگم سرائے میں ایک بچہ مار ڈالا گیا اس خبر سے سنبھل میں فساد ہو جانے کا بہت اندیشہ تھا۔ اس اطلاع کے ملتے ہی سنبھل کے معزز حضرات جن میں نواب زادہ مجاہد حسین خاں اور خالد حسین خاں موقع پر پہنچے سنجیدگی سے کام لیا افسران سے وعدہ لیا کہ تحقیقات کر کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے اس طرح حالات پر قابو میں پایا گیا لیکن بعد میں کوئی تحقیقات نہیں ہوئی۔

پھر ۱۹۸۶ء فروری میں اجودھیا ضلع فیض آباد کی بابری مسجد کے سلسلہ میں سنبھل میں کافی کشیدگی تھی اس وقت کے پولس افسر نے بڑی محنت و کاوش سے حالات کو کنٹرول میں کیا مگر محلہ ٹھیر کے کچھ شرپسندوں نے ان افسراں کے خلاف ناجائز حرکتیں کیں۔ اس سلسلہ میں کئی لوگ تھانہ میں بند بھی ہوئے لیکن اس حادثہ کا خمیازہ ان افسران کو ذلت اور تبادلہ کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

۱۹۷۶ء میں شرپسند جامع مسجد میں رات کے وقت داخل ہونے میں کامیاب ہوئے اور امام مسجد کو شہید کیا جس سے شہر سنبھل کی فضا مسموم ہوئی اور شرپسند عناصر ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ سنبھل کی تاریخ میں امام جامع مسجد کو شہید کرنا اور مسجد کی بے حرمتی کرنا یہ اہل شہر کیلئے نہایت سنگین حادثہ تھا جس سے لوگوں کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے تھے اس کے بعد اہل سنبھل چوکنا و بیدار ہو گئے نیز مسجد پر ہمیشہ سے پولس کا پہرہ رہتا ہے، یہ فساد سنبھل کے لئے خونی فساد تھا اس کے بعد سے متعدد بار کرفیو لگا اور فساد ہوئے لیکن افسران و حکام نے جبکہ شہر کی فضا کو سازگار بنائے

رکھنے میں ٹھوس اقدامات کیے اور پولس وانتظامیہ نے بہتر اور موثر کردار ادا کیا۔ تو شر پسند عناصر نے اپنے منہ کی کھائی اور شر انگیز میں ناکامیاب ہوئے۔

۱۹۹۵ء میں ہولی کے دن محلہ منگل پورہ کی مسجد میں نماز جمعہ کے وقت مسجد کی دیوار اور نمازیوں پر رنگ ڈالا گیا جس سے لوگوں کے جذبات ابھر آئے ایک ہفتہ حالات بہت سنگین تر رہے۔

چکی کا پاٹ

جہاں سنبھل میں بہت سے آثار قدیمہ ہیں وہیں ایک چکی کا پاٹ بھی کافی مشہور ہے۔

جو حضرات، سیر و تفریح، تلاش معاش، یا اپنے حلقۂ احباب وعزیز واقارب سے ملنے سنبھل جاتے ہیں، تو وہ چکی کے پاٹ کو ضرور دیکھتے ہیں۔

یہ ایک اوباش اور جعلساز ضعیفہ کی یادگار ہے!

زمانہ قدیم سے لوہے کی کیل میں چکی کا پاٹ چھوٹی اینٹ کی دیوار قریب ۶۰ فٹ اونچائی پر چسپاں ہے یہ دیوار قلعہ کا شمالی حصہ ہے۔

آج تک وہ بازار کی جگہ چکی کے پاٹ سے مشہور ہے۔

یہ ایک پُر فریب ومکار، عیّار وفتنہ پرور بڑھیا کی عجیب وغریب داستان ہے، اس ضمن میں ایک شعر ملاحظہ فرمالیجیے!

پر ابھی دھو کے میں یادگار خلق ابتک
ہدی میں نام کا سکہ ہے آج تک باقی

سنبھل کئی مرتبہ آباد و برباد کیا گیا ہے۔ جبکہ سنبھل کی آبادی صرف اندرون قلعہ میں باقی تھی۔ شہر پر کئی صدیوں سے ویرانی کے بادل چھائے ہوئے تھے، جہاں شہر خموشاں کی سی ویرانی تھی۔

گویا ایک ویران صحرا تھا، جہاں غاروں، درختوں کے جھنڈ، پگڈنڈیوں، اور

خاردار جھاڑیوں کے علاوہ کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ یہاں مسافروں کی آمد ورفت ایک خطرناک موڑ اختیار کئے ہوئے تھی۔

ایسی صورت میں صرف قلعہ ہی مسافروں کیلئے آرام گاہ کی ایک محفوظ جگہ تھی۔ رات کی تاریکیاں جب مسافروں کو اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کرتیں تو مسافر قلعہ کے اندر رات بسر کرتے تھے، قلعہ کے آہنی دروازے پر شاہی حکومت کی جانب سے انتظام ہوا کرتا تھا۔ قلعہ سے متصل ایک سرائے تھی، جس میں بڑھیا اور اس کے قوی وہیکل سات جوان بیٹے رہتے تھے۔ رات جب اپنے شباب کی آخری سیڑھی پر قدم رکھتی تو وہ بڑھیا چکی چلانا شروع کردیتی۔ اس نے کچھ مرغ پال رکھے تھے، اس کے لڑکے مرغوں کو چراغ دکھاتے تو مرغ بولنے لگتے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق قلعہ کے دربانوں کو دھوکہ ہو جاتا، صبح صادق کا وقت ہو گیا ہے، اور وہ دروازہ کھول دیتے، اور بیرونی مسافر نکل پڑتے، اس عیار بڑھیا نے دو اصطلاحیں مقرر کر رکھی تھیں، اگر دو چار مسافر ہوتے تو اس طرح پر بھیک کا سوال کرتی، (اکلے دو کلے کا اللہ بھلا ہے) یہ آواز سن کر اس کے لڑکے مسافروں کا سارا سامان لوٹ لیتے۔ اور ان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ یہ صورت حال ایک طویل مدت تک جاری رہی۔ اور بہت سے مسافر بے خطاء لقمہ اجل بنتے رہے۔ اور اگر دس پندرہ مسافروں کا قافلہ ہوتا تو بڑھیا کا بھیک کا سوال یہ ہوتا۔ (جماعت کرامات، کچھ اللہ کے نام پر بڑھیا کو بھی دیتے جاؤ) اس آواز سے اس کے بیٹے سمجھ جاتے، اب ڈاکہ زنی کا موقع نہیں ہے، ایک طویل عرصہ اسی صورت گزر جانے پر یہ راز عیاں ہو گیا۔ اس کی اطلاع ایک شاہی پرچہ نویس کو ہو گئی اس نے فوراً ہی ساری رُوداد سے شاہِ وقت (دہلی) کو آگاہ کر دیا۔ حکومت وقت نے اطلاع کے فوراً بعد ایک لشکر اس بڑھیا کے خاتمہ کیلئے سنبھل روانہ کر دیا۔ فوجی جوان مسافرین کو قلعہ میں رات بسر کرنے کیلئے ٹھہر گئے اور بقیہ جوان رہزنوں کی جگہ سے کچھ فاصلے پر گھات میں لگ گئے۔ اور وقت کا انتظار کر

نے لگے۔ جب رات صبح سے گلے ملنے کے قریب ہوئی تو بڑھیا نے چکی چلانی شروع کر دی اور بیٹوں نے مرغوں کو چراغ دکھا دیا، تو دربانوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ ۹ فوجی جوان قلعہ سے باہر نکلے بڑھیا نے چند آدمی دیکھ کر (اکلے دو کلے کا اللہ بیلی ہے) کی صدا بلند کی، یہ آواز سن کر اس کے ڈاکو بیٹے اپنے انجام سے بے خبر رہزنی کے لئے نکل پڑے، فوجی جوانوں سے مقابلہ ہونا ہی تھا، اچانک فوجی جوان جھاڑیوں سے نکل پڑے اور ساتوں بیٹوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اور مکار بڑھیا کی چوٹی پکڑ کر قلعہ کے شمالی دروازہ پر جہاں چکی کا پاٹ لٹکا ہوا ہے مکار بڑھیا کی گردن تن سے جدا کر دی اور اس کی چکی کی کیل قلعہ کے دروازہ کے بازو میں نصب کر کے اس کی چکی کا پاٹ بطور یادگار لٹکا دیا گیا۔

آج ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰۰۲ء تک وہ چکی کا پاٹ لوہے کی کیل میں یادگار کے طور پر چسپاں ہے اس کو دیکھنے کے بعد عبرت ناک واقعہ کی یاد دوبارہ تازہ ہو جاتی ہے۔

دوسری روایت!

سنبھل کے عوام میں یہ مشہور ہے۔ قلعہ سنبھل کی دیوار کی اس بلندی پر کیل نصب کی دوسری قلا میں چکی کا پاٹ لٹکا دیا اور اپنے ہم فن نٹوں سے یہ دعوی کیا ہے جو بھی میری طرح ایک قلا میں چکی کا پاٹ اتار لائے اور دوسری قلا میں کیل اکھاڑ لائے وہی شخص قلعہ سنبھل میں نٹ کا تماشا دکھلائے اور جو اس پر قادر نہ ہو اسکو قلعہ سنبھل میں نٹ کا تماشا کرنا ہرگز روا نہیں۔

(احسن التواریخ) شوق زیدی)

محرم کا تعزیہ!

جہاں سرزمین سنبھل پر صدیوں سے نیزہ کا انوکھا تہوار بڑی دھوم دھام سے منا یا جاتا ہے۔

وہیں تعزیہ داری بھی عجیب وغریب نوعیت کی حامل ہے۔ اور اسے تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان کے بہت سے مقامات پر شیعہ نوابین رہے ہیں انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں شیعہ مذہب کی خوب تبلیغ کی اور سیدھے سادھے، بے لوث مسلمانوں میں (ایرانی) تعزیہ داری کی روح پھونک دی۔ جس سے مسلمانوں، خاص کر نام نہاد اہل سنت میں اعتقادی اور عملی برائیاں، اور فرسودہ رسومات ایسی جڑ پکڑ گئیں ہیں اب اگر انہیں اکھاڑنے کی کوشش کی جائے تو اس کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی۔ کیونکہ جو چیز جتنی پختہ ہوگی اتنا ہی زیادہ وقت اس کے اکھاڑنے میں لگے گا۔ حالانکہ ان کی جڑوں کا پھیلاؤ اتنا گھنا ہو گیا ہے، ان کو ایک لخت اکھاڑ کر نہیں پھینکا جا سکتا۔

بہر حال بعض حضرات تعزیہ داری کو عبادت کا ایک اہم جز سمجھ کر کرنے لگے۔ سنبھل میں بلا تفریق عقائد کے سب ہی رسم تعزیہ میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ ویسے تو ہندوستان میں اکثر مقامات، جیسے کلکتہ، بمبئی، لکھنو، میں تعزیہ داری کی رسم بڑی دھوم دھام سے اور مختلف طریقوں سے منائی جاتی ہے۔

سنبھل کی تعزیہ داری کی نوعیت جداگانہ ہے۔ اس قسم کی تعزیہ داری کی رسم ہندوستان میں کہیں نہیں منائی جاتی۔

جبکہ سنبھل کے عوام شیعہ مذہب سے نا آشنا ہیں شیعیت سے پاک ہیں اور سنی عقائد رکھتے ہیں۔ سنبھل میں ۲ رفیصد شیعہ حضرات ہیں۔ شیعت نے سیدھے سادھے عوام کو اپنے دام میں جکڑ رکھا ہے۔ جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی چل رہے ہیں۔

محرم کی ۷ر تاریخ کو "علم"، اور جھنڈے، صبح دس بجے سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک جم غفیر اکھٹا ہو جاتا ہے۔ گھر، گھر مہمانوں کی آمد ورفت ہوتی ہے، علم دیکھنے والوں کا ایک لامتناہی ہجوم ہوتا ہے۔ یہ علم شہر کی مخصوص شاہراہوں سے گزر

تا ہے اور راستوں پر ان کا پورا قبضہ ہوتا ہے، جیسے وہ ان کے اپنے راستے ہوں اگر راستہ میں کوئی چیز علم کے درمیان حائل ہوئی تو وہ ضلع انتظامیہ کے حکم پر اس کو صاف کرایا جاتا ہے۔ جب جا کر یہ جلوس آگے بڑھتا ہے۔

علم کی شکل وصورت ایک بڑے بانس کا جھنڈا ہوتی ہے۔ جس کو خوبصورت ملبوسات میں سجا سنوار کر بارونق بنایا جاتا ہے، سلما، ستارے، گویا یہ چیز اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور اس جھنڈے کی دونوں جانب تلواریں لٹکائی جاتی ہیں۔ بعض علم پر کئی کئی ہزار روپے صرف ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف ڈھول اور تاشوں سے سارا شہر گونج اٹھتا ہے۔ ایک ڈھول ۵-۶ رفٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہوتا ہے، بڑے بیل، اور بھینس کی کھال کو آہنی سلاخوں کے ذریعہ کھینچا جاتا ہے۔

یہ ڈھول بیل گاڑیوں پر رکھکر شہر میں گشت کے دوران بجائے جاتے ہیں اس کی گونج قرب وجوار تک سنائی دیتی ہے۔ اس کے آگے علم لیکر چلتے ہیں اور یہ علم سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔

اس دن لوگ جگہ جگہ چوراہوں پر، شربت، روٹی، بریانی، کھچڑا، وغیرہ تیار کر تے ہیں محلّہ کوٹ غربی کے مسلمان تو ے رمحرم کی نیاز کو دین کا ایک اہم ستون سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس محلّہ کا جو بے علم طبقہ ہے اس کو دین سے کوئی لگاؤ نہیں، وہ اس محرم کی رسومات ہی کو دین کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔

۸ر تاریخ کو سرائے ترین میں شام ۴ بجے سے مہندی اٹھنے کا عمل شروع ہو کر صبح تک رہتا ہے۔ سرائے ترین کی مہندیاں بہت خوبصورت بنی ہوتی ہیں۔ مہندیوں پر خوب روشنی ہوتی ہے۔ ڈھول تاشوں کی آواز کوسوں دور تک سنائی دیتی ہے۔ مرد اور عورتیں ساری رات گشت کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔

۹ر تاریخ کو دن میں کوئی عمل نہیں ہوتا۔ البتہ آنے والی دسویں شب کو شہادت

کی شب سے پکارتے ہیں۔ اس شب میں ہر محلّہ کے باشندوں کا مختلف عمل ہوتا ہے۔ ڈھول، تاشہ بجانے کے علاوہ کہیں حور (پتھر کی مورتی کی شکل میں) نکلتی ہے اور کہیں سر کٹا وغیرہ! اور تعزیوں کو نمائش کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔

تماشا بین رات بھر گشت میں رہتے ہیں

۱۰ محرم کی صبح سے ہی عید کی طرح خوشیاں منائی جاتی ہیں، عمدہ جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ہر گھر میں بریانی، زردہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر دس بجے سے تعزیہ داری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ایک تعزیہ کو ایک محلہ کے لوگ مل کر حسن، حسین کے نعروں کے درمیان اٹھاتے ہیں۔ سنبھل اور سرائے ترین میں قریب ۱۳ تعزیہ بڑے اور چھوٹے بے شمار ہوتے ہیں۔ ۶۰-۵۰ فٹ اونچائی کا اوپر کا حصہ گنبد نما ہوتا ہے، باقی نچلا حصہ چوکور ہوتا ہے۔ بڑی گاڑی پر رکھکر رسیوں سے جکڑ کر مخصوص راستوں ڈھول تاشوں کے ساتھ گزرتے ہیں۔ لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ جن راستوں سے یہ جلوس گزرتے ہیں ان راستوں کے بجلی کے تار پہلے ہی سے کھول کر الگ کر دئے جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے سنبھل کئی دن تک تاریکیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔

بہر کیف! بڑی شان وشوکت کے ساتھ تعزیہ شاہراہوں سے گزرتا ہوا کربلا (مقامی ایک مقرر جگہ) پہونچتا ہے اس کے کچھ حصہ کو توڑ پھوڑ کر اسکی کھپچیاں دفن کر دی جاتی ہیں۔ اور بقیہ حصہ واپس لے آتے ہیں۔ حقیقتاً جو چیز شرعاً ممنوع ہوتی ہے۔ وہ عقلاً بھی ممنوع ہوتی ہے ابھی تعزیہ کی اتنی عزت کی جارہی تھی اور پاؤں سے روند دیا گیا۔

طوطا مینا کی قبر!!

سنبھل میں جہاں بہت سے آثارِ قدیمہ ہیں، وہیں کچھ مشہور اور قابل دید چیزیں بھی ہیں اس زمرے میں طوطا مینا کی قبر بھی آتی ہے۔ یہ قبر سطح زمین پر تعویز کی شکل میں سرخ پتھروں کی ہے۔ اس پر قرآنی آیات بھی کندہ ہیں۔ اس پر تاریخ بھی

کندہ تھی۔ کچھ دنوں سے تاریخ کے نشان مٹا دیئے گئے ہیں۔ عوام میں یہ قبر طوطا مینا کے نام سے مشہور ہے۔ عید گاہ کے بالکل قریب ہے۔

شہر کے باشندے عیدین کی نماز ادا کر کے اس کا دیدار کرتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ ایک شیعہ کی قبر ہے۔

بہر نوع! اس سلسلے میں کوئی تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی ہے، یہ قبر طوطا مینا کی قبر ہے یا پھر کسی شیعہ کی۔

بال مبارک کی زیارت۔

سنبھل میں ویسے تو متعدد محلوں میں عرس ہوتے ہیں۔

مثلاً سرائے ترین ☆ محلہ منگل پورہ ☆ چودھری سرائے ☆ محلہ میاں سرائے ☆ محلہ کوٹ

مگر ہر ایک کی نوعیت جداگانہ ہے ۲۷ رجب کو محلہ کوٹ اونچے پر ایک عجیب قسم کا اجتماع ہوتا ہے دور دراز سے لوگ جوق در جوق آتے ہیں خاص کر اس محلہ کے افراد تو بہت ہی اہتمام کرتے ہیں۔ صبح ۷ بجے ۲۷/ رجب کو نعت خوانی۔ بلفظ دیگر قوالی ہوتی ہے۔ سامعین پوشاک بدل کر آتے ہیں۔ ایک گنبد ہے اس میں پتھر پر قدم مبارک کے نشان ہیں۔ اسی کے میدان میں قوالی اور لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور ایک بال مبارک شریف ہے جو شہزادہ ہمایوں کے عہد سے محفوظ ہے مذکورہ دونوں تبرکات کی زیارت کر کے آنکھوں کو ٹھنڈک دل کو سرور پہنچاتے ہیں جس بال شریف کی زیارت سے ہر سال اجتماع ہوتا ہے۔ بال مبارک حاصل ہونے کی اصل وجہ نہیں مل سکی البتہ موجودہ متولی جناب محمد حنیف نے بتایا کہ زندہ شاہ نے ایک نسخہ تجویز کیا۔ خدا تعالیٰ نے شہزادہ ہمایوں کو شفاء دی۔ ہمایوں نے زندہ شاہ سے معلوم کیا کہ آپ کیا طلب کرتے ہیں اس پر زندہ شاہ نے کہا کوئی ایسی نشانی عطا کر دیں جو بطور تبرک

ویادگار رہے، تب شہزادہ ہمایوں نے ایک بال شریف اور قدم مبارک عطا کیا۔ اسی تاریخ سے آج تک ۲۷/ رجب کو زیارت کیلئے ہجوم لگتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

شریعت کا درّہ

یہ درّہ شہنشاہ بابر کے عہد میں رائج ہوا تھا اور آج بھی کئی صدیاں گزر جانیکے بعد بھی رائج ہے، سنبھل اور سرائے ترین میں جب رمضان المبارک کا چاند نظر آتا ہے، تو وہاں کے متولی ایک خاص قسم کا لباس پہن کر شہر و قرب و جوار کا گشت لگاتے ہیں۔ اور اگر کوئی بھی شخص رمضان کا احترام نہ کرتے ہوئے۔ (انہیں کھاتے پیتے) نظر آ جائے تو اس کے درّہ لگاتے ہیں۔ پورے ماہ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ عید الفطر کے دن ایک شان وشوکت کے ساتھ عید کی نماز ادا کرنے جاتے ہیں۔ متولی کا گزر جن راستوں سے ہوتا ہے تو بچے ان سے درّہ دیکھنے کا اظہار کرتے ہیں تو وہ بچوں کی خواہش پوری کر دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہندوستان میں شاید ہی کہیں ہو، غالباً رام پور میں بھی یہ عمل ہوتا ہے۔ یہ درّہ شہنشاہ بابر کی یادگار ہے محلہ کوٹ غربی میں متولی کو عطا کیا گیا تھا۔ جو آج بھی اس خاندان میں موجود ہے۔

لال قبر کی تاریخی حیثیت

سرائے ترین میں پکّے باغ والے راستہ (روڈ) سے جب داخل ہوتے ہیں تو سرائے ترین کی آبادی کے شروع میں راما سنیما ہال کے قریب ایک قبر ہے یہ قبر پختہ اور لال رنگ کی ہے جو لال قبر سے مشہور ہے یہی نہیں بلکہ اسکے قریب کی آبادی اور مسجد بھی لال قبر والی مسجد سے متعارف ہے۔ یہ قبر واقعی اب لال رنگ کی اور پختہ ہے پہلے یہ قبر کچی تھی۔ صرف لال رنگ سے مشہور تھی۔

جب راما سنیما ہال کے مالک نے یہاں پکچر ہال بنانے کا ارادہ کیا تو اس نے پہلے وہاں کے لوگوں کو خوش کرنے کیلئے پہلا عمل یہ کیا کہ قبر کو پختہ کرایا پھر لال رنگ کرایا۔

واقعہ کی حقیقت کیا ہے

جیسا کہ مشہور ہی نہیں بلکہ زبان زد ہے کہ ایک بال بر اپنی دکان میں ایک بزرگ صاحب کے بال بنا رہے تھے اس دوکان کے دو حصہ تھے ایک اندرونی اور ایک ہال تھا۔ یعنی برآمدہ وہ برآمدہ میں بال تراش رہے تھے وہ بزرگ اسی ہال میں اندر کے حصہ میں گئے کچھ دیر بعد باہر آئے تو ان بزرگ کے جسم وسر پر خراش لگی ہوئی تھی بال برنے وجہ معلوم کی اول تو بزرگ صاحب نے بتانے سے انکار کیا۔ لیکن بال بر کے اصرار کرنے پر اسکی وجہ بتادی اور ساتھ ہی یہ کہدیا کہ یہ راز کی بات ہے اگر تم نے کسی سے اظہار کیا تو تمہاری قبر راستہ میں ہوگی۔ بال برنے راز کی بات کا اظہار کردیا۔ بایں وجہ ان کی قبر راستہ میں واقع ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی یادگار بیرق

سنبھل میں جہاں اسلاف و بزرگان دین کی یادگاریں ہیں وہاں ایک یادگار بیرق کا میلہ ہے سلطان الہند حضرت معین الدین چشتیؒ کی سنبھل آمد ہوئی ہے۔ سنبھل محلہ سرائے کبیر اور محلہ ملّانان کے درمیان ایک چبوترہ کی صورت میں ایک اونچا (بلند) ریگستانی ٹیلا واقع ہے۔ یہ چبوترہ شرقاً و غرباً دس گز اور جنوباً و شمالاً آٹھ گز ہے اور زمین سے پانچ فٹ اونچا ہے اس جگہ پر حضرت سلطان الہندؒ نے چلہ کشی کی ہے اس چلّہ کے مقام کا ذکر کتاب اسراریہ میں کمال الدین واسطی نے بھی کیا ہے ہر سال جمادی الثانی کی نویں تاریخ کو اس مقام چلّہ پر ایک چھوٹا سا میلہ خواجہ کی بیرق کے نام سے لگتا ہے کچھ دکانیں لگتی ہیں۔ اب سے قریب ۳۵ سال قبل جبکہ بندہ شمس العلوم میں حفظ کر رہا تھا خوب یاد ہے کہ اس وقت سنبھل اور سرائے ترین کے مدارس و مکاتب میں بیرق کی تعطیل ہوا کرتی تھی۔ اور نیزہ کی طرح عوام اس میں بھی جوق در جوق شرکت کرتے تھے۔ (احسن التواریخ)

ٹرک کا حادثہ

۱۳ اپریل ۱۹۸۸ء ایک ٹرک سنبھل سے مشرق چندوسی کے لئے روانہ ہوا تھا۔ جونوریوں سرائے اور سیف خان سرائے کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک عجیب وغریب حادثہ کا شکار ہو گیا۔ ٹرک ڈرائیور کا بیان ہے کہ ٹرک چلتے چلتے اڑنے لگا، اور مجھے گمان تک نہ ہوا اور ٹرک کا رخ بجائے چندوسی کی طرف ہونے کے خود بخود مغرب سنبھل کی طرف پھر گیا۔ ٹرک کا پچھلا حصہ ایک مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور اگلا حصہ زمین پر، اس عجیب وغریب واقعہ کو دیکھنے کیلئے قرب وجوار کے لوگ کافی تعداد میں پہونچے ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ اس واقعے کے متعلق کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہاں سے پیر شہید گزر رہے تھے انہوں نے ٹرک کو رکوایا جب ڈرائیور نے نہیں روکا تو پیر نے خود ٹرک کو پلٹ دیا۔

''واقعہ کی اصل حقیقت''

ہم نے اور آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب دریا یا سمندر میں بھنور آتا ہے تو ایک گول دائرہ سا بنتا ہے، اگر کشتی اس دائرہ میں آجائے تو غرق ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب ہوا چلتی ہے تو کبھی کبھی گول دائرہ والی شکل اختیار کر لیتی ہی۔ اور پھر اس دائرہ میں جو بھی چیز آجائیگی وہ ضرور گھومے گی۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہی صورت اس ٹرک کے ساتھ پیش آئی ہوگی۔

ترک برادری کی تحقیق

ہندوستان میں بہت سے مقامات پر ترک برادری پائی جاتی ہے۔ ضلع رام پور میں بھی یہ برادری ہے۔ خاص کر سنبھل کے ہر سرائے اور پورہ محلّہ میں یہ برادری آباد ہے۔ سنبھل میں تسلیم ہے کہ ہر ایک ترک برادری اپنے کو اصل ترک کہتی ہے۔ یہ حضرات محلّہ دیپا سرائے میں آباد ہیں۔ انکی شادی بیاہ کی تقریبات بھی اسی محلّہ تک محدود ہیں۔

سنبھل میں دوسرے محلّہ کے ترکوں کے یہاں بھی شادی بیاہ نہیں کرتے۔ یہ قوم سنبھل کے اس محلّہ میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ دولت مند، اہل علم، علوم ودینیات اور دیگر زندگی کے کاموں میں سب سے آگے ہیں۔ یہ جفاکش اور بہادر قوم ہے اس برادری میں کئی قدآور شخصیتیں بھی پیدا ہوئی ہیں، اور آج بھی ہیں، جیسے مولانا کریم بخش صاحب، مولانا عبدالمجید صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب، اور مولانا محمد اسماعیل صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی جائے پیدائش بھی سنبھل ہی ہے مولانا مبارک حسین صاحب بانی انجمن معاون الاسلام وغیرہ ان سب کا سارا خاندان سنبھل ہی میں آباد ہے شادی بیاہ، اور دیگر معاملات میں بھی سنبھل ہی سے وابستہ ہیں۔

ترک قوم کی تحقیق میں چند روایتیں ہیں! جو مسلمان فاتحین ہوکر ہندوستان میں آئے، ہندوؤں کی کتابوں اور ان کی گفتگو ومحاورہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہند آنے والے مسلمان ترک سے مشہور ہوئے۔ اسکی تین وجوہات ہوسکتی ہیں۔

(۱) عام مسلمان خواہ وہ کسی بھی برادری سے تعلق رکھتے ہوں ہندوستان میں ابتداء ترک سے مشہور ہوئے۔

(۲) فوجی جوان چاہے انکا تعلق کسی بھی برادری سے ہو ترک کہلائے۔

(۳) ترکستان اور روم کے مسلمان جو ترک قوم سے تھے ہندوستان میں بھی ترک مشہور ہوئے۔

تاریخ اور جغرافیہ میں ہے کہ یاجوج ماجوج ترکوں کی نسل میں سے ایک قوم کا نام ہے۔ یاجوج ماجوج ایک قوم کو کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں کسی ایک شخص کا نام تھا۔ پھر ان کی اولاد پر مستعمل ہونے لگا۔ (کتاب حزقیل باب ۳۸) (تفسیر حقانی)

بظاہر یاجوج ماجوج اس ملک اور اس قوم کو کہا جاتا ہے جو یاجوج بن یافث کی اولاد میں سے ہیں۔ اور بلاد شمال میں رہتے ہیں جن کو آج کل تاتاری اور چینی

تا تاری ترکستانی کہتے ہیں اور انہیں نسل کے لوگوں سے یہ ملک آباد ہے۔ (تفسیر حقانی)

ترک! یاجوج ماجوج کا ایک لشکر ہے جب ذوالقرنین نے دیوار قائم کی تو جو خارج میں رہے وہ تمام ترک انہیں سے ہیں۔

یاجوج کے ۲۲ر قبیلے ہیں۔ ذوالقرنین نے ۲۱ر قبیلوں پر دیوار قائم کی ایک قبیلہ خارج رہا۔ وہی ترک ہے۔ (مظہری)

اسکو ترک اس لئے کہا جاتا ہے کہ تمام قبیلوں نے ان کو خارج میں چھوڑ دیا۔ گویا ترک کر دیا۔ اھل تاریخ کا قول ہے کہ نوح علیہ السلام کی ۳ر اولادیں تھیں۔ (۱) حام (۲) یافث (۳) سام، سام عرب و عجم، روم، کے باپ ہیں۔ حام ابو حبشہ۔ زنج۔ نوبہ۔ اور یافث ابوالترک، یعنی ترک یافث بن نوح کی اولاد ہیں (مظہری)

سید مسعود غازی کے ہمراہ جو حضرات بغرض جہاد آئے اور فتح سنبھل کے بعد ساکنان سنبھل کے تحفظ وحمایت کیلئے قلعہ میں آباد کر گئے تھے وہی ترکوں کی نسلیں آج تک مختلف صورتیں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً کاشتکار، ارباب تجارت اور پیشہ ور۔

ترک کی آبادیاں

بہر حال یہ حضرات آج بھی سنبھل کے ۵۰ مقامات پر آباد ہیں۔ مثلاً ملک مرزا، مانڈی، منی کھیڑہ، موسی پور، ملک گونجتی، دھومی، مندالہ، میانسرائے، منڈی بیگم سرائے، حام پور، حیات نگر، بجمیادلی، جوگی پور، چودھری سرائے، خان پور، تمرداس سرائے، کوٹلہ، دیپا سرائے، ڈیرہ سرائے، سعدین پور، سکندر پور، نگلیا، سرائے ترین، شہباز پور، نگلہ، فیروز پور، گوبند پور، بیت پور، نئی سرائے، رکن الدین سرائے، سیف خان سرائے، کھیڈہ خورد، کھیڑہ کلاں، مرادآباد، محلہ قائم کی بیریاں وغیرہ، اور ضلع رام پور میں بھی پائے جاتے ہیں۔ شاہ آباد، امروہہ، بلاری، بدایوں میں بھی آباد ہیں۔

”دھماکہ“

جولائی ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ سرائے ترین محلہ نواب خیل میں ایک بم دھماکہ ہوا تھا۔ سنبھل ہی کے شرافت خان فوج میں ملازم تھے۔ وہ کہیں سے ھاون دستہ بنوانے کیلئے ایک لوہے کا ٹکڑا لائے تھے۔ اول تو وہ لوہے کا ٹکڑا کچھ دنوں تک لوہار کے یہاں پڑا رہا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد لوہار نے ہاون دستہ بنانے کے لئے اس لوہے کے ٹکڑے پر چوٹ پہنچائی تو وہ دھماکہ کے ساتھ پھٹ گیا۔ جائے واقع پر جتنے افراد بھی موجود تھے سب کی دھجیاں اڑ گئیں۔ مکانوں کی چھتیں اور درختوں کے ٹکڑے فضائے بسیط میں تیرتے دکھائی دیئے۔ پختہ عمارتوں میں شگاف پڑ گئے۔ اور جسم انسانی کے مختلف اعضا درختوں پر جھولتے دکھائی پڑے۔ مختلف مذاہب کی چالیس لاشیں بکھری پڑی تھیں، سارے ماحول پر ایک خوف (ہو) کا عالم طاری تھا۔ سخت سے سخت دل رکھنے والوں کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں، چاروں طرف آہ و بکا کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں، اس جانکاہ حادثہ پر سب ہی ماتم کناں تھے، سارا سنبھل شہر خموشاں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ غرض کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس کی آنکھ سے دو بوند پانی نہ بہا ہو، آج بھی اس خاندان کے کچھ افراد حیات ہیں، راقم نے ان سے ملاقات کرنے کے بعد ہی اس واقعہ کو قلمبند کیا ہے۔

سنبھل و سرائے ترین کی عیدگاہ:

سرائے ترین، چودھری سرائے، حیات نگر، وغیرہ دوسری سراؤں کے حضرات عید کی نماز یہیں ادا کرنے آتے ہیں، نہایت مستحکم اور کافی وسیع رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بہت بڑا چبوترہ ہے اس کے نیچے آم کا باغ ہے۔ احاطہ نہیں ہے۔ وضو کرنے کیلئے ایک کنواں ہے اسی سے متصل ایک پختہ عمارت کوٹھری کی شکل میں ہے۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہاں نقارے بجائے جاتے ہیں۔ جو اس بات کا اعلان ہے کہ نماز ادا ہو چکی، یعنی عید کے دوگانہ سے فراغت کا اعلان ہے۔

سلطان پور عرف چودھری سرائے۔

جس زمانے میں بنو امیہ اور بنو عباس باہم جنگ و جدل میں لگے تھے عرب میں رہنا دشوار ہو گیا تھا تو کچھ لوگ مدینہ منورہ وطن مالوف سے شہر کرمان میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں سے سلطان معز الدین محمد غوری (عرف شہاب الدین) کے ہمراہ ہندوستان آئے سلطان ناصر الدین کے دربار میں سید حضرات نہایت عزت واحترام سے دیکھے جاتے دربارِ سلطانی سے ان سید حضرات کو بڑے عہدے پر فائز کیا گیا تھا اور جاگیریں عطا کر کے نوازا گیا، اس کے علاوہ دیگر حکمراں بھی اس خاندان کو جاگیریں عطا کرتے رہے۔

فتح اللہ سرائے:

شید پور سرائے۔ عبد الباری سرائے۔ اسی خاندان کی آباد کردہ ہیں۔ (ایوان صقفل)

داؤد خاں حاکم سنبھل نے موضع سلطان پور بزرگ معروف و مشہور چودھری بہ سرائے سلطان ناصر الدین کے نام سے آباد کیا تھا یہ چودھری سرائے آج بھی سنبھل کی ایک سرائے ہے، اس میں ایک زمانہ سے اکثر چودھری حضرات آباد ہیں۔

حسین خاں سرائے

سنبھل کی باون سراؤں میں سے ایک سرائے ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں سنبھل کی ہر ایک سرائے کسی بزرگ یا حاکم و رئیس کے نام پر موسوم ہے اس سرائے کے بانی حسین خاں ہیں جو عہد مغلیہ میں منصب دار تھے اور شہر کے مشاہیر و معزز لوگوں میں شمار تھا۔ انہیں کے نام پر حسین خاں سرائے آباد ہوئی۔ یہ وہی حسین خاں ہیں جبکہ محمد سلطان مرزا کے بیٹوں ابراہیم مرزا، شاہ مرزا، محمد حسین مرزا، نے پہلی بار علم بغاوت بلند کر کے سنبھل پر چڑھائی کی تو خان خاناں و منعم خاں نے شکست دیکر بھگا دیا تھا۔ دوبارہ جبکہ بریلی خاں بانی محلہ بریلی سرائے ۹۷۶ھ میں شہنشاہ اکبر کی طرف

سے سرکار سنبھل کے حاکم تھے۔ اس کے ایک سال بعد سلطان مرزا کے بیٹے ابراہیم حسین دوبارہ سنبھل پر حملہ آور ہوئے حسین خاں نے نمایاں کردار ادا کیا ایک جمعیت جانبازوں کی اپنے ہمراہ لیکر قلعہ سنبھل کے قریب ان کی مدد کیلئے آپہنچے ادھر اہل قلعہ ابراہیم مرزا سے ہراساں اور خوف زدہ تھے۔ قلعہ بند کر لیا تھا۔ حسین خاں نے با آواز بلند خبر دی کہ میں حسین خاں ہوں تمہاری مدد کیلئے آیا ہوں۔ اس خبر سے اہل قلعہ کے حوصلے بلند اور ہمت بندھ گئی اور دروازۂ قلعہ کھول دیا۔ ابراہیم حسین کی بغاوت کو فرو کرنے اور سرکوبی کے متعلق شیخ فتح اللہ ترین خلیفہ سلیم چشتی کی قیام گاہ محلّہ دربار سرائے ترین میں دار المشورہ قرار پایا۔ یہ بستی مردم خیز ہے یہاں ہر دور میں بے شمار ایسی ہستیوں نے جنم لیا ہے، جنہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں گرانقدر خدمات انجام دیکر وطن کا نام روشن کیا یہ سرائے رؤسا و حکام و فن کار شعراء ادیبوں کا مسکن رہا ہے۔ زمانہ قدیم میں اسے دوپٹیوں کے محلّہ سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے کھنڈرات اس کی دیرینہ عظمت کا پتہ دے رہے ہیں، اور بہت سی نامور ہستیاں اس کے آغوش میں محو استراحت ہیں۔ (احسن التواریخ صفحہ ۷)

حیات نگر:

حیات نگر بہجوئی روڈ پر واقع ہے، سرائے ترین کا تھانہ حیات نگر ہی ہے اس کی آبادی دس ہزار کے قریب ہے۔ جیسا کہ سنبھل کے ہر محلّہ و سرائے کا نام کسی بزرگ یا حاکم کے نام پر رکھا ہوا ہے۔

حیات نگر کا نام بھی محمد حیات خاں حاکم سنبھل کے نام پر ہے، محمد حیات خاں عہد مغلیہ میں سنبھل کی حکومت پر فائز تھے،

ننھے خاں ساکن امروہہ۔ جو بڑے متولی اور نامور شخص تھے۔ امروہہ میں چند عمارتیں ننھے خاں کے نام سے موسوم تھیں یہ محمد حیات خاں حاکم سنبھل کے خسر تھے۔ (تاریخ امروہہ)

شیر خاں سرائے:

سنبھل کی باون سراؤں میں سے ایک سرائے ہے۔ اس سرائے میں سنبھل کے ایک بزرگ میرن شاہ کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرہ کے متصل حضرت میرن شاہ کی مریدہ بصری بیگم ہمشیرہ سید غلام حسین خاں نائب ریاست رام پور نے اپنے مرشد حضرت میرن شاہ کے مقبرہ کے متصل ان کے انتقال کے بعد ایک مسجد بطور یادگار تعمیر کرائی تھی، اور اسی نمونہ وطرز کی ایک مسجد امروہہ میں تعمیر کرائی۔ اور امروہہ احاطہ مسجد میں بصری بیگم مدفون ہیں۔ (تاریخ امروہہ ص ۱۰۷)

سنبھل کے چار حلقے:

سنہ ۱۹۳۳ء میں سنبھل چار حلقوں میں تقسیم تھا۔ آج بھی ان حلقوں کی آبادی ایک دوسرے سے فاصلہ پر واقع ہے۔

حلقہ نمبر ۱:

دیپا سرائے، تمرداس سرائے، نخاسہ ڈولی سرائے، مٹھبر خواص خاں، کھگو سرائے، شہباز پور سرائے، قاضی خاں سرائے، اکبر پور منڈی اعظم گنج سرائے منشی امام الدین،

حلقہ نمبر ۲:

میاں سرائے، حاتم سرائے، ڈیرہ سرائے، بھٹی سرائے، نواب پورہ، پھلوارئی سرائے، بیگم سرائے، ہلالی سرائے طشت پور ڈونگر سرائے، پنجو سرائے، کٹرہ موسی خاں حوض، بہدیسرہ چمن سرائے، جگت۔

حلقہ نمبر ۳:

کوٹ شرقی، کوٹ غربی، بدایوں دروازہ، سورج کنڈ۔ محلّہ ملانہ، بریلی سرائے

نالہ منو کا منہ، لاڈن سرائے، تہواری سرائے، چودھری سرائے، دہلی دروازہ، سرائے پختہ، محمود خاں سرائے، خاص سرائے۔

حلقہ نمبر ۴:

سرائے ترین میں پیلا کھدانہ نوادہ، باغیچہ، نظر خیل، امان خیل، کوٹلہ سرائے، محلہ چکلی، محلہ جھجران، کھواہان، ہجڑان، حوض کٹورہ، منگل پورہ، چاہ نایک، بارہ سینی، بارہ دری، برکھیریاں۔

تحصیل سنبھل پر ایک نظر:

سرحدیں۔ شمال میں امروہہ۔ جنوب میں ضلع بدایوں، مشرق میں تحصیل بلاری۔ مغرب میں تحصیل حسن پور۔

پھیلاؤ۔ ۸۔ ۶۰ کلومیٹر۔ ۲۵۶ کلومیٹر۔ ۴۸۔ ۱۵۵۶۔ ورک کلومیٹر بلا۔ ۱۔ اسمول۔ ۲ سنبھل ۳ پوانسا ۴ بجوئی۔ ندیاں۔ سوت، آوی

ریلوے لائن (۱) راجہ کا سہس پور سے آنے والی سرسی ہو کر سنبھل آ جاتی ہے (۲) چندوسی سے آنے والی بجوئی ہو کر علی گڈھ جاتی (۳) مراد آباد سے سرسی ہو کر سنبھل آتی ہے

پکی سڑکیں

(۱) مراد آباد سے آنے والی سڑک سرسی ہو کر سنبھل پہونچتی ہے۔
(۲) سنبھل سے پورنسا ہوتی ہوئی بجوئی کو، بجوئی سے چندوسی کو پکی سڑک جاتی ہے
(۳) سنبھل سے حسن پور جانے والی پکی سڑک ہے۔
(۴) سرسی سے بلاری تک پکی سڑک ہے۔
(۵) بجوئی سے راج گھاٹ تک پکی سڑک بن گئی ہے۔

۶۔ بہجوئی سے سنبھل تک پکی سڑک ہے۔

۷۔ سڑک سنبھل سے جویا ہوتی ہوئی امروہہ جاتی ہے۔

۸۔ پکی سڑک سنبھل سے چندوسی جاتی ہے۔

۹۔ بہجوئی ہوتی ہوئی علی گڑھ جاتی ہے۔ سنبھل سے نگلی، اُجھاری، حسن پور، گجرولہ ہوتی ہوئی دہلی اور میرٹھ روڈ ویز جاتی ہے۔

۱۰۔ سنبھل سے اعظم پور بلند شہر بس جاتی ہے۔

ڈاک خانے۔ تجارتی منڈیاں

ڈاک خانہ:۔ سنبھل، اسمولی، بہجوئی، سرسی، قاسم پور

تجارتی منڈی: سنبھل، بہجوئی۔ بہجوئی میں کانچ کے برتن کا کارخانہ اور لوہا ڈھالنے کی بھٹیاں ہیں۔

مشہور چیزیں

سنبھل کے تعلیمی ادارے

۱۔ شنکر بھوشن شرن جنتا انٹر کالج ۲۔ برج رتن سندر آریہ کنیا انٹر کالج

۳۔ چنداولی انٹر کالج، چنداولی ۴۔ کسان انٹر کالج۔ اسمولی

۵۔ جواہر لال میموریل نوٹیفائڈ ایریا انٹر کالج سرسی ۶۔ بہجوئی انٹر کالج، بہجوئی

۷۔ انٹر کالج بہجوئی ۸۔ انٹر کالج لکھوری

۹۔ ضیاء العلوم ہائر سیکنڈری اسکول سرائے ترین ۱۰۔ بی۔ڈی ہائر سیکنڈری اسکول سرائے ترین

(۱۱) گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول سنبھل

(۱۲) آچاریے نکتیش حکیم رئیس سرسوتی ہائر سکنڈری اسکول سنبھل

(۱۳) گرلز ہائر سکنڈری اسکول حیات نگر

(۱۴) سرورے ہائر سکنڈری اسکول کولی

(۱۵) ...... ہائر سکنڈری اسکول چھچیرا

(۱۶) جنت نشاں ہائی سکنڈری

(۱۷) میر جمال پبلک اسکول میانسرائے

(۱۸) راشٹریہ کنیہ انٹر کالج حیات نگر

(۱۹) فیض گرلز انٹر کالج سرائے ترین

(۲۰) مہاتما گاندھی میموریل ڈگری کالج (ایم جی ایم) سینکڑوں جونیر اور پرائمری اسکول۔ عربی، فارسی ادارے

سنبھل میں دینی مدارس

مسلمانوں کا سب سے پہلا مدرسہ حقیقت میں مکۃ المکرمہ میں دار ارقم تھا اور بعد ہجرت مدینہ منورہ صفہ ایک چبوترے کے نام سے پہلا مدرسہ ہے۔ یوں تو جملہ صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے فیض حاصل کیا خاص کروہ صحابۂ کرامؓ جن کا کوئی گھر ور نہیں تھا ان کی تعداد کم وبیش سو ۱۰۰ ر تک رہتی تھی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ فیض حاصل کیا۔

ہندوستان میں سلطنت اسلامی میں جہاں دور دراز سے علماء ہندوستان آئے اور علوم اسلام کا رواج ہوا۔ اور اسلامی علوم فارسی میں منتقل ہوئے آج بھی بہت سا علمی ذخیرہ فارسی میں موجود ہے۔ خاص کر سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سرکاری زبان فارسی قرار دی گئی اور عہد مغلیہ میں فارسی کو عروج حاصل ہوا۔ ہندوستان کی تاریخ کا تمام

تر ذخیرہ فارسی میں ہے۔

لیکن تعلیم و تعلم کا طریقہ موجودہ زمانہ کی طرح مدارس کیلئے جداگانہ تھا مدارس کی عمارتیں بنانے کا دستور نہیں تھا، خاص کر تحریک آزادی کے وقت سے ہندوستان بھر میں دینی مدارس نئے انداز سے قائم کئے گئے۔

سنبھل میں پہلا مدرسہ

سلطان سکندر لودھی علم دوست شخص تھا۔ علماء کی قدر کرتا۔ علماء کا ایک گروہ ہمیشہ اسکے ساتھ رہتا اُن کے مشورہ سے وہ کام کرتا سلطان نے سنبھل کو جب دار الخلافۃ بنالیا تو سنبھل میں ایک دینی مدرسہ (ادارہ) قائم کیا جس کا محل وقوع بازار کلاں سبزی منڈی عاشق اسکول بلڈنگ کے قریب تھا جس میں عرب ایشیا۔ ایشیا کوچک عرب کے علماء کو بلا کر معلم رکھا گیا اس ادارہ کے پرنسپل میاں عزیز اللہ تھے اس وقت سے سنبھل کو علمی مرکزیت حاصل ہوئی۔ میاں عزیز اللہ سنبھل میں آفتاب علم بن کر طلوع ہوئے جس کی شعائیں آج تک تابانی بخش رہی ہیں۔ اس مدرسہ میں فیض علم حاصل کرنے والے پہلے شخص قائم اسرائیلی سنبھلی ہیں۔

مدرسہ سراج العلوم

یہ مدرسہ آج بھی ویرنیہ قیام کا پتہ دے رہا ہے اسکا محل وقوع اور عمارت پختہ ہے یہ مدرسہ شاجہاں کے عہد میں قائم ہوا۔ عروج کے بعد زوال پذیر ہوکر ایک عرصہ سے مکتب کی شکل میں قائم تھا۔

۱۹۰۲ء میں حضرت مولانا سراج احمدؒ جو اپنے وقت کے جید عالم تھے اور خدمت دین کا مخلصانہ جذبہ رکھتے تھے ان کی مساعی جمیلہ سے ۱۹۰۲ء میں ایک زبردست علمی دینی ادارہ کی شکل اختیار کی۔ انکے بعد مولانا خلیل احمد شمس العلماء جو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے پروفیسر اور شعبہ دینیات کے انچارج تھے، انہوں نے اس مدرسہ کو ترقی کی

نئی راہوں پر ڈالا۔ انکے بعد اس کے سرپرست حضرت مولانا سعید احمدؒ ہوئے۔ موصوف علم وتقوی میں اسلاف کا نمونہ تھے انکے دور اقتدار واہتمام میں یہ مدرسہ مغربی یوپی کے مدرسوں میں ایک بڑی درسگاہ ہوگئی۔ پھر آج سرپرست حضرت مولانا حبیب احمد صاحب ہیں اور قابل فخر علمی کارنامے انجام دیئے اسکے فیض یافتہ حضرات میں سے حضرت مولانا محمد اسماعیلؒ سنبھلی سابق شیخ الحدیث مدرسہ آنند گجرات مفتی مشرف حسین سابق شیخ الحدیث مدرسہ امروہہ، اعظم قاضی ریاست بھوپال مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان یہ مدرسہ اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے سراج العلوم کے فیض وتعلیم سے سینکڑوں علماء ومشائخ ومبلغ اور اہل قلم پیدا ہوئے۔

مدارس دینیہ کا قیام مسلمانوں کیلئے نعمت عظمی ہے اسلامی تہذیب ومعاشرت کے جو آثار آج ہندوستان میں نظر آرہے ہیں وہ مدارس کی برکت ہے انہیں مدارس سے علم دین اور شریعت کی روشنی ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔

شمس العلوم:

مدرسہ شمس العلوم۔ سرائے ترین کا ایک قدیم ادارہ ہے۔ جس کے اول مہتمم جناب مولانا حبیب احمد صاحب شاہجہاں پوری تھے۔ شمس العلوم کی ابتداء اکبر والی مسجد سے ہوئی۔ کچھ دنوں بعد حافظ خدا بخشؒ کے مکان میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا پھر باقاعدہ مدرسہ کیلئے ایک عمارت خریدی گئی جہاں آج مدرسہ قائم ہے اور وہی خدمات انجام دے رہا ہے مدرسہ شمس العلوم کی بنیاد رکھنے میں جہاں بستی کے معزز حضرات وجید شخصیات جیسے غلام قادر خان حاجی عبد العزیز۔ سمیع اللہ خاں، حکیم رضا حسین وغیرہ حضرات کو بڑا دخل ہے وہاں جناب حافظ عبد الرحمٰنؒ پیر غیبی مرد آبادی کو بھی بانی کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۳۳۹ھ میں مذکورہ حضرات کے ہاتھوں مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی اور شمس العلوم نام متعین ہوا۔

حضرت قاری عبدالحق صاحب کے ہمراہ حضرت مولانا حبیب احمد صاحب شاہ جہاں پوری سرائے ترین سنبھل تشریف لائے۔ مدرسہ کا نظم ونسق چلانے کیلئے اتفاق رائے سے مولانا حبیب احمد صاحب کو مہتمم مقرر کیا گیا۔ مولانا نے سرائے ترین ہی بودوباش اختیار کرلی حضرت مولانا کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے جناب حافظ محمود صاحب مہتمم مقرر ہوئے۔

شمس العلوم کے اساتذہ:

قابل ذکر اساتذہ میں قاری عبدالحق صاحب حافظ خدا بخش صاحب مولانا وحکیم نصیر احمد مولانا عبدالرشید صاحب سنبھلی اور مولانا محمد حیات صاحب ہیں۔

شمس العلوم کا فیض دور دراز تک پھیلا۔ سینکڑوں حفاظ اور بڑی تعداد میں جید علماء علم حاصل کرکے بلند مقام پر پہونچے۔ جن میں مولانا سلیمانؒ، مولانا اختر شاہ خاں صاحبؒ مولانا وحکیم آفتاب علی خاں صاحب مولانا ظریف احمد صاحب مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی استاذ دارالعلوم دیوبند۔ مولانا عبدالستار سلامؔ قابل ذکر ہیں نیز راقم الحروف نے شمس العلوم کے احاطہ میں رہ کر حصول علم کیا ہے۔ شمس العلوم کو ایک خصوصیت یہ حاصل ہے کہ جہاں اسوقت کے جید علماء قدم رنجہ فرماتے ہیں وہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی دوبار تشریف لائے ہیں شمس العلوم ایک قدیم وبڑا ادارہ ہے۔ اکابرین کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس کا فیض نمایاں رہا ہے۔

اہتمام کی ذمہ داری:

حضرت الاستاذ جناب حافظ فرید الدین خاں صاحب مدظلہ پر ہے اور نائب مہتمم جناب حاجی محمد شفیع عرف بھورے صاحب ہیں۔

مدرسہ علوم شرعیہ:

بستی کے معزز رئیس جناب احمد اللہ خاں نے اپنی جائداد میں ایک دینی درس گاہ قائم کی جس کا نام مدرسہ علوم شرعیہ رکھا۔ اسوقت کے قابل اساتذہ نے اس میں تدریسی خدمات انجام دیں نیز بیرونی طلبہ نے بھی اس میں اکتساب علم کیا ہے جیسے (مولانا ریل) محمد صادق صاحب پنجاب سے حصول علم کیلئے آئے تھے۔ جن کا ذکر تفصیل سے اس تاریخ کا جز ہے۔ اس مدرسہ میں حضرت مولانا عبد الوحید صاحب سنبھلی نے تدریسی خدمت انجادی حضرت مولانا محمد حیات صاحب نے تحصیل علم کیا۔ اور مولانا موصوف نے علوم کی تکمیل وفراغت کے بعد اس میں استاذ کی حیثیت سے معلم کے فرائض انجام دیے ہیں۔ جناب احمد اللہؒ خاں نے اس مدرسہ کیلئے باغ اور جائداد اور زمین وقف کردی تھی۔ احمد اللہؒ خاں کے انتقال کے بعد جناب دولہ خاں متولی ہوئے اوران کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے بن خاں کی تولیت میں جائداد آئی۔ مدرسہ کی عمارت بڑی پختہ آج بھی مرور زمانہ کے باوجود موجود ہے۔ لیکن نصف صدی سے تعلیم و تعلم منقطع ہے ایک مدرسہ کی عمارت وجود اس کی قدامت کی زبان حال سے خبر دے رہی ہے۔ واللہ اعلم۔

دار العلوم محمدیہ:

یہ مدرسہ ایک قدیم درسگاہ ہے، دیپا سرائے روضہ والی مسجد سے ملحق ہے۔ سنبھل کے بہت سے علماء کو یہاں سے شرف تلمذ حاصل ہے مولانا محمد حسین صاحبؒ بہاری استاذ دار العلوم دیوبند بھی اس کے فیض یافتہ تھے بہت سے علماء کو یہاں سنبھلی کے درس وتدریس کی خدمت انجام دہی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ۱۸۵۳ء میں قائم ہوا۔

مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خان:

اس مدرسہ کا یہ نام تاریخی نام ہے ۱۳۰۵ھ میں مطابق ۱۸۸۷ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مبارک ہاتھوں سے بنیاد رکھی گئی تھی اس مدرسہ میں سنبھل اور بیرون سنبھل کے طلبہ خاص کر پشاور کے طلبہ نے علم حاصل کیا ہے۔ اور وقت کے جید علماء نے درس وتدریس کی خدمت انجام دی ہے بندہ عبد المعید راقم الحروف کا تقرر حضرت مولانا معین الدین صاحب نے ۱۹۷۹ء میں کیا تھا چند سال تدریسی خدامات انجام دیں۔

وحید المدارس:

یہ مدرسہ سنبھل کی قدیم درس گاہ ہے۔ جو سنبھل کی ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا عبد الوحید صاحبؒ کی نسبت پر نام رکھا گیا۔ سن تاسیس ۱۳۵۷ھ ہے، اس کے پہلے مدرس حضرت مولانا محمد آفتاب علی خاں تھے قرآن کریم حفظ وناظرہ کی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی ہے اور اب ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

ناشر العلوم:

یہ درس گاہ ۱۹۷۲ء میں قائم کی گئی ابتداً تعلیم مسجد محلّہ پیلہ کھدانہ کئی سال تک جاری رہی ۱۹۸۰ء میں باقاعدہ ناشر العلوم کے نام سے مدرسہ کی تعمیر عمل میں آئی مولانا سلیمان صاحب اس مدرسہ کے بانی اور اول مدرس ہیں مولانا موصوف کی انتھک کوشش وحسن نیت وللّٰہیت کے نتیجہ میں بہت کم مدت میں پروان چڑھا۔

انجمن معاون الاسلام:

اس ادارے کے بانی ہونے کا شرف حضرت مولانا مبارک حسین محمودیؒ کو حاصل ہے ۱۹۱۱ء میں مولانا موصوف نے ایک دینی ومذہبی ادارے کی بنیاد ڈالنے کا

منصوبہ تیار کیا۔ اور اس کا اظہار اہل وطن (سنبھل) سے کیا۔ مسلمانوں نے آپ
کے منصوبہ کو بسر و چشم قبول کیا اور ہر ممکن تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی سال ایک
ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا نام انجمن معاون الاسلام تجویز ہوا۔ حضرت مولانا
مبارک حسین صاحب نے مدرسہ کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے مشائخ و اکابر
ملت کو دعوت دی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت
مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے
مدرسہ کے قیام پر اظہار مسرت کیا اور ترقی کی دعاء سے نوازا۔

۱۹۱۳ء میں مدرسہ کیلئے ایک آراضی خرید لی گئی نیز آراضی کے متصل ایک
مکان خریدا گیا ۱۹۱۶ء میں تعمیر کا آغاز ہوا۔ نیز تحریک خلافت کے دور میں انجمن سیاسی
سرگرمیوں کا مرکز رہا مولانا موصوف بحیثیت مہتمم و سرپرستی آخر دم تک خدمات انجام
دیتے رہے اور اس کی ترقی میں کوشاں رہے۔ اور ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔

سرزمین عرب پر جانیوالی پہلی جماعت ۱۹۵۸ء میں گئی

دین کی تبلیغ کا کام آج کل پوری دنیا میں جوش و خروش کے ساتھ جاری ہے۔
اور یہ کام اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ امیروں کی کم یابی کی وجہ سے دسترس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔
سب سے پہلے جو جماعت عرب گئی تھی اس میں سنبھل اور مرادآباد کے افراد شامل تھے۔
جناب حاجی سعید احمد صاحب مرادآبادی امیر جماعت تھے۔ ان میں سرائے ترین
سنبھل کے جناب حاجی اللہ دیے صاحب بھی تھے مورخ کے غریب خانہ سے متصل
ان کا مکان ہے، اور قریبی تعلقات رہے ہیں۔ موصوف نے مصر کے عجائب خانہ میں
فرعون کی لاش کا دیدار بھی کیا ہے، گویا یہ فخر بھی سنبھل کو حاصل ہے۔

کولڈ اسٹور:

(۱) الہدیٰ کولڈ اسٹوریج اینڈ جنرل ملس۔ بہجوئی روڈ سنبھل پرویز خان صاحب
(۲) دیوی کا کولڈ اسٹوریج۔ بہجوئی روڈ سنبھل تیج رام سنگھ آریہ
(۳) آریہ کولڈ اسٹوریج۔ بہجوئی روڈ سنبھل رام کیسر آریہ آر۔ کے
(۴) نوری کولڈ اسٹوریج اینڈ جرنل ملس۔ بہجوئی روڈ حاجی محمد یامین قریشی عرف بڈا
(۵) آدم کولڈ اسٹوریج۔ رسول پور روڈ سرائے ترین سنبھل دیوندر آریہ
(۶) اینڈ جرنل ملس۔ بہجوئی روڈ سنبھل ساہورام کارسرن کوٹی وال
(۷) قریشی کولڈ اسٹوریج اینڈ جنرل ملس۔ بہجوئی روڈ سنبھل حاجی محمد احسان قریشی
(۸) ترین کولڈ اسٹوریج اینڈ جنرل ملس۔ بہجوئی روڈ سنبھل حاجی محمد شفیق عرف کوثر خان
(۹) انڈیا کولڈ اسٹوریج اینڈ جنرل ملس، یڈ آئس کریم فیکٹری آدم پور روڈ سنبھل حاجی سعید قریشی
(۱۰) اویس کولڈ اسٹوریج اینڈ آئس فیکٹری۔ آدم پور روڈ سنبھل حاجی محمد زبیر
(۱۱) روشن کولڈ اسٹوریج اینڈ آئس فیکٹری۔ حسنپور روڈ سنبھل ستہ پال تیا گی
(۱۲) طاہر حسین کولڈ اسٹوریج اینڈ آئس کریم فیکٹری۔ حسنپور روڈ، محمد قاسم
(۱۳) حبیب کولڈ اسٹوریج۔ نخاسہ سنبھل محمد حبیب
(۱۴) قریشی کولڈ اسٹوریج۔ مرادآباد روڈ سنبھل حاجی رحم الٰہی قریشی
(۱۵) واجد سنس کولڈ اسٹوریج۔ مرادآباد روڈ سنبھل عبید الرحمٰن
(۱۶) شنکر کولڈ اسٹوریج آئی آئس کریم فیکٹری۔ مرادآباد روڈ سنبھل امرناتھ سنگھل
(۱۷) جے کے کولڈ اسٹوریج۔ مرادآباد روڈ سنبھل جگدیش سرن کنیہ لال
(۱۸) اگروال رام کولڈ اسٹوریج اینڈ آئس کریم فیکٹری۔ سنبھل بابورام
(۱۹) بلال کولڈ اسٹوریج۔ جویا روڈ سنبھل بابو محمد عرفان صاحب

(۲۰) محمدی کولڈ اسٹور تج این آئی اسکریں فیکٹری۔ جویا روڈ سنبھل
محمد کلو عاقل صاحب

(۲۱) کولڈ اسٹور۔ چندوسی روڈ سنبھل

پیداوار:

(۱) پھل:

ہندوستانی پھلوں میں آم عمدہ اور لذیذ پھل ہے۔ سنبھل میں آم کے باغات کی کثیر تعداد ہے۔

(۲) بیر:

سنبھل میں بیر کے باغات بھی بہت ہیں، یہاں کا بیر لذیذ ہوتا ہے، متعدد انواع کے بیر کے درخت ایک ہی باغ میں پائے جاتے ہیں۔ دیگر مقامات پر بھی "سنبھل کے بیر" کے نام سے فروخت کیے جاتے ہیں۔ کثیر تعداد میں یہاں بیر پیدا ہوتا ہے۔

(۳) سبزی:

آلو وغیرہ کثیر مقدار میں پیدا ہوتا ہے اور دیگر سبزیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) مینتھا:

پیپر منٹ کے تیل کی بھی کافی پیداوار ہے، سینکڑوں فیکٹریاں ہیں۔

(۵) غلہ: گندم وغیرہ

(۶) میٹھا:

راب، شکر، شیرہ، یہاں کی رَتل گزک بہت عمدہ اور ذائقہ دار ہوتی ہے تحفۃً دور دراز بھیجی جاتی ہے۔ نکتی کے لڈو بھی یہاں کے بہت مشہور ہیں۔

(۷) صنعت وحرفت:

سینگ کی کنگھی چھڑی، لال، ٹیول، چوڑی، کنگن یہاں کی دریاں بھی بہت مشہور ہوتی ہیں۔ اور یہاں ورق نقرہ (چاندی کے ورق) بھی بنتے ہیں۔

''سینگ کی دستکاری''

سنبھل سینگ کی دستکاری کے لئے بھی کافی مشہور ہے۔ یہ وہاں کا قدیم کام ہے۔ روزانہ تقریباً ۱۲۵ کوئنٹل سینگ کام میں آتا ہے۔ ۱۸۸۰ میں ۳۵۰ کوئنٹل یومیہ مصرف میں آتا تھا۔ سینگ سے کئی قسم کی اشیاء تیار ہوتی ہیں۔ کاریگر اپنے اہل وعیال کے ساتھ روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ ۲۲ مرتبہ کام کی باریکیاں دیکھنے کے بعد یہ کنگھی تیار ہوتی ہے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کتنا مشکل اور محنت کا کام ہے۔ کنگھی تیار ہونے پر شام ہی کو فروخت کرنی پڑتی ہے، چونکہ اس میں کچھ کاریگر ایسے ہوتے ہیں ''روز کنواں کھودنا اور پانی پینا'' اگر وہ ایسا نہ کریں تو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ جائیں۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر کنگھی کو اسی روز فروخت نہ کیا گیا تو اس کے اینٹھ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ کاریگر دن بھر کی محنت کے بعد ۳۰۔۳۰ روپیہ کما لیتے ہیں۔ چونکہ یہ کسی کے محتاج نہیں ہے اس لئے جب کاریگر کا دل چاہا کام کر لیا اور اگر دل نہ چاہے تو کام بند ہے۔ عید اور خوشی کی تقاریب کے دوران تو ایک ہفتہ کام بند رہتا ہے۔ اور جب ہفتہ بھر کی چھٹی کے بعد کام شروع ہوتا ہے تو کاریگر تکان اور بوجھ محسوس کرتا ہے۔ اور انہیں وجوہات کی بناء پر کنگھی کے کاریگر مقروض رہتے ہیں۔

''سینگ کی منڈی''

سرائے ترین کی آبادی تقریباً ایک لاکھ کی ہے، ہر مذہب وقوم کے لوگ وہاں آباد ہیں۔ دستکاری میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں البتہ سینگ کی خریداری اور فروخت اکثر قریشی برادران کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان بھر سے بھینس، بیل، اور بھینسے کے سینگ لاتے ہیں۔ ویسے تو ہر وقت سینگ دستیاب رہتا ہے۔ لیکن منڈی میں شام چار سے سات بجے تک فروخت ہوتا ہے۔

''سوداگری''

شام کے چھ بجے سے کنگھی کا بازار لگتا ہے، اور رات تقریباً دس بجے تک بازار کھلا رہتا ہے۔ سوداگری کا کام اکثر سیفی برادری کرتی ہے۔ اور پورے ہندوستان میں سپلائی کرتے ہیں۔

''سینگ کا کھاد''

یہ کھاد زمین میں قوت پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی سینگ کے کھاد ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ۲۰۰ روپئے کوئنٹل اس وقت قیمت ہے۔ کچھ لوگ کھاد کی فروخت و خریداری کا کام کرتے ہیں۔ سینگ کے کٹ پیس بھی کھاد کے کام میں آتے ہیں۔ کنگھیاں عموماً عورتیں استعمال میں لاتی ہیں۔ جوئیں نکالنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

''تیل کی کنگھی''

یہ ایک قسم کی کھوکھلی کنگھی ہوتی ہے، جس میں تیل ڈالدیا جاتا ہے۔ جس سے حسب ضرورت سر میں تیل آتا رہتا ہے۔

''رزق رسانی''

خدا تعالیٰ ہی رازق ہے، وہ ہی رزق دیتا ہے۔ انسان کا کام ہے عمل کرنا اور اسکا اجر دینا خدا کے ہاتھ ہے۔ کاشتکار کا کام صرف زمین میں بیج ڈالنا ہے، اور اس کی سینچائی کرنا ہے، بیج کا پودا اگنا اور پھر پھل دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح کنگھی کی دستکاری کو خدا نے روزی کا ذریعہ بنایا ہے۔ ورنہ تو ۴۰-۵۰ پیسے کی کنگھی کثیر تعداد میں تیار ہوتی ہے جو کسی کار کی نہیں ہوتی۔

ہنڈی کرافٹ میں سنبھل سرائے ترین کا نام روشن ہے

عالمگیر اورنگ زیبؒ کے عہد سے سنبھل سرائے ترین میں سینگ کی دستکاری کا آغاز ہوا۔ ابتداء ایک مدت تک صرف سینگ کی مختلف قسم کی کنگھیاں تیار کیجاتی رہیں جس کا تفصیلی ذکر گوشگزار ہو چکا۔ سرائے ترین میں سینگ کی صنعت کے علاوہ کوئی دوسری صنعت نہیں تھی۔ جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام ہوا۔ اس کے افسران جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور مختلف مقامات پر بغرض سیر و سیاحت پہنچے اور شہر بہ شہر دورے ہوئے چونکہ سنبھل بھی ایک قدیم شہر ہے اس کی در و دیوار اس کی قدامت کا آج بھی پتہ دے رہے ہیں۔ اس لئے افسران کا سنبھل بھی ورود ہوا ان لوگوں کے ہاتھوں میں اکثر رول اور لکڑی کی چھڑی ہوتی تھی۔ سرائے ترین کے کاریگروں نے سینگ کا رول تیار کر کے انگریز افسران کو پیش کئے پھر سینگ کی چھڑی تیار ہونا شروع ہوگئی ۱۹۵۵ء تک سینگ کی کنگھیاں اور چھڑی تیار ہوتی رہیں اور پورے ملک ہندوستان میں سپلائی ہوتی رہیں ۱۹۵۶ء میں حکومت اتر پردیش نے محلہ نذر خیل میں ایک ٹریننگ سینٹر ہنڈی کرافٹس (صنعت) سکھانے کیلئے کھولا۔ جس میں حافظ عبدالرحمن اور حافظ حبیب الرحمن کام سکھانے کیلئے مقرر کئے گئے۔ شروع میں دس لڑکے کام سیکھتے تھے۔ ان دونوں حضرات کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ انہوں نے قوت فکری کو عملی جامہ پہنایا۔ بہت کم مدت میں مختلف قسم کی اشیاء و آئیٹم تیار ہو کر منظر عام آنا شروع ہو گئے۔ سینگ کے ساتھ لکڑی پیتل ہڈی وغیرہ سے اشیاء تیار ہونے لگیں۔ ٹریننگ سینٹر ہنڈی کرافٹس کی عمارت بوسیدہ ہو کر منہدم ہوگئی ادھر یہ کام بہت تیزی کے ساتھ بستی میں پھیل گیا ۱۹۶۰ء میں ڈبے، گلے کے ہار، کڑے بُندے، سینگ و ہڈی پیتل لکڑی وغیرہ سے تیار ہو کر دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ ہونے لگے۔ پھر یہاں کے کارخانہ دار مال تیار کر کے دہلی، بمبئی وغیرہ کے ایکسپورٹرس کو سپلائی کرنے لگے۔ اس وقت سرائے ترین کی ایک لاکھ کی آبادی کے لوگ اس صنعت

وحرفت سے متعلق اور وابستہ ہیں۔ کچھ لوگ باہر سے سینگ، ہڈی لکڑی، پیتل وغیرہ لاتے ہیں اور کچھ لوگ تیار شدہ اشیاء کی سپلائی کرتے ہیں اور اکثر لوگ جولری (زیوارات) بکس، ڈبیاں، ڈبے، ٹیبل لیمپ مچھلی اور درخت کی صورت میں موم بتی دان، گلے کے ہار۔ متعدد نوع کی مالائیں۔ انگوٹھی، بندے حتی کہ مور، شیر اور دوسرے۔ بہت سے جانوروں کی سینکڑوں آئیٹم تیار کر کے اپنی فن کاری صنعت وحرفت میں نمایاں کام ونمونہ پیش کر رہے ہیں، تیار شدہ چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، تیار شدہ آئیٹم عجائب خانہ کی زینت ہی نہیں بلکہ ہر گھر اور بیٹھک کو ان سے مزین کیا جاتا ہے، حکام حضرات اور سیاح لوگ خاص کر انگریز سرائے ترین سنبھل از خود آ کر بچشم خود دیکھ کر خریدتے ہیں۔ ہندوستان کے ایکسپورٹ کرنے والے یہاں کے جولری آئیٹم خرید کر دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ جیسے ہانگ کانگ' امریکہ، کناڈا، پیرس، جرمن، لندن، تھائی لینڈ، اکثر انگریزی حکومتوں میں یہاں کا مال ایکسپورٹ ہوتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایکسپورٹ کاری گر سے بہت کم قیمت پر مال خریدتے ہیں اور خود بہت زیادہ نفع پر مال بھیجتے ہیں یہاں کے کاری گر جتنی محنت ومشقت وفن کاری سے مال تیار کرتے ہیں ان کو ان کی محنت ومزدوری کا صلہ نہیں ملتا معمولی مزدوری ملتی ہے چند گنے چنے سکہ کا کاریگر روٹی کپڑے کا بندوبست بھی بہتر طریقہ سے نہیں کر سکتا جوں کا توں رہتا ہے، یہاں کے ایکسپورٹ لوگ دہلی، بمبئی، مدراس، کلکتہ، احمد آباد، آگرہ، میرٹھ، رامپور، اودھے پور، جے پور اور سورت جیسے شہروں میں سپلاتی کرتے ہیں یہ ایکسپورٹرس لوگ چند ہی دنوں میں مالا مال ہو جاتے ہیں۔ بہر حال سرائے ترین کے کاری گر اپنی صلاحیتوں اور فن کاری سے سینکڑوں آئیٹم اور عمدہ خوبصورت اشیاء تیار کرتے ہیں جس کے سبب آج کی دنیا میں سنبھل کا نام روشن ہے۔

"عمل بہت بڑا واعظ ہے"

ایک صاحب گھٹنے کھول کر کنگھی تیار کر رہے تھے۔ قریب ہی ایک مولانا کا

مکان تھا۔ موصوف اپنے وقت کے ولی تھے۔ جب مولانا کا گزر ادھر سے ہوا تو مولانا نے سلام نہیں کیا۔ واپسی پر سلام کیا۔ یہ بات ان صاحب نے مولانا کے انتقال کے بعد بتائی کہ جب مولانا کا گزر ادھر سے ہوا تو میں گھٹنا کھولے ہوئے کام کر رہا تھا واپسی پر گھٹنے ڈھکے ہوئے تھے تو انہوں نے سلام کیا تو معلوم ہوا کہ عمل تقریر سے بڑا واعظ ہے۔

"بابری کنواں"

سنبھل سرائے ترین کی عیدگاہ ایک ہی ہے، عید کے دوگانے سے فارغ ہونے کے بعد لوگ اس کنویں کو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ کنواں عجیب وغریب نوعیت کا ہے۔ اس طرح کا کنواں آج تک دیکھنے میں نہیں آیا اس کنویں کا دس فٹ چوڑا زینہ اور ۴۰۔۵۰ فٹ لمبا گہرا پانی کی سطح تک پہونچا ہے اور پختہ اینٹوں کی تعمیر ہے۔ پانی کی سطح سے متصل سرنگوں کی شکل کے کمرے ہیں جس کو مورخ نے بھی دیکھا ہے۔ بقول حاجی عبدالقیوم صاحب ۱۹۳۰ء میں اس کنویں کی صفائی کرائی گئی تھی۔ کیونکہ کنواں بند ہو گیا تھا۔ صفائی کے دوران کنویں سے بہت سی انسانی کھوپڑیاں اور مختلف جسمانی اعضاء برآمد ہوئے تھے۔ سنبھل میں کئی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کنواں سلطانہ ڈاکو کی پناہ گاہ تھا۔ آج بھی وہ سنبھل کے آثار قدیمہ میں سے ہے۔

"گیدڑ دعا کرتے ہیں"

سرائے ترین محلہ نواب خیل کے نواب صاحب شمس الدین خان کا غریب وبیکس لوگوں کی مدد کرنے کا انداز جداگانہ تھا۔ موسم سرما میں جب رات کو گیدڑ بولا کرتے تو نواب صاحب اپنے ملازمین سے معلوم کرتے کہ بھئی یہ گیدڑ کیوں بول رہے ہیں۔

ملازموں کی طرف سے جواب دیا جاتا کہ حضور یہ جاڑے کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں، ان کے بولنے کی یہی وجہ ہے۔ سرائے ترین میں ہفتہ میں دو بازار لگتے ہیں نواب صاحب اپنے ملازمین کو حکم دیتے کہ لحاف خرید کر ان کو پہونچا دو۔

ملازمین لحاف خرید کر خود استعمال کرتے یا کسی مجبور کو دیدیا کرتے۔لحاف پہونچانے کے دوسرے دن جب گیدڑ پھر بولے تو نواب صاحب نے ملازمین سے پھر معلوم کیا کہ اب یہ کیوں بول رہے ہیں ملازمین نے جواب دیا کہ حضرت کے لئے دعا کر رہے ہیں،ان کا یہ انداز تھا مدد کرنے کا۔

کیا چاندی کے روپئے بھی سوکھا کرتے ہیں؟

نوابین نواب خیل نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ چاندی کے روپئے دھوپ میں سکھا دیئے جائیں، چنانچہ چاندی کے روپئے کچھ مقداریں تول کر سوکھنے ڈال دیئے گئے۔سوکھنے کے بعد شام کو وزن کر کے دیکھا گیا تو جتنے سوکھنے سے پہلے تھے اتنے ہی سوکھنے کے بعد نکلے۔نواب صاحب نے کہا کہ سوکھنے سے تو وزن ہلکا ہونا چاہئے تھا دوسرے دن پھر یہ عمل دہرایا گیا۔شام کو وزن کیا گیا تو کچھ کم ہوا۔نواب صاحب کے معلوم کرنے پر ملازمین نے جواب دیا کہ حضرت زیادہ سوکھ جانے سے وزن کم ہوگیا ہے۔دراصل اس میں سے کچھ غریب غرباء لے لیتے یہ عطیہ کا انداز تھا۔

”بنگلہ دربار“

سرائے ترین محلّہ دربار کے بیچ میں ایک چوکور عمارت ہے ۱۲۳۵ھ کی تعمیر ہے جو بنگلہ کے نام سے موسوم ومشہور ہے۔یہ قدیم عمارت اپنی نوعیت کی عجیب عمارت ہے۔اس کے متصل ایک بڑا کنواں ہے جو ضلع مرادآباد کا سب سے بڑا کنواں ہے۔بنگلہ کی تاریخ اس کے ایک پتھر پر کندہ ہے۔یہ وہی بنگلہ ہے جس میں نواب امیر علی خاں والی ٹونک کے والد محترم جناب محمد حیات خاں قرآن کریم اور دینیات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔اور شاہ فتح اللہ ترینؒ کے عرس کے موقع پر فقیروں اور درویشوں کا قیام رہتا تھا۔اسی کے ایک کمرہ میں حضرت مولانا و حکیم محمد آفتاب علی خاں صاحبؒ مطب کیا کرتے تھے۔

کتبات پر ایک نظر

۱۱۶۰ تا ۱۷۷۵ء کے تاریخی کتبات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ کتبات سنبھل کی تاریخ کے علاوہ سنبھل کے مشاہیر علماء صوفیاء اور عمارات کے متعلق بیش بہا معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان کتبوں سے یہاں کے ادب اور فنون لطیفہ کے ارتقاء پر بھی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاریخ سنبھل کے لئے یہ کتبات اہمیت رکھتے ہیں۔

ان کتبات کے علاوہ سنبھل میں اور کتبے بھی ہیں۔ لیکن بے توجہی کی بنا پر ضائع ہوگئے ہیں نیز یہ کتبات سنبھل کی سیاسی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ کتبات جس عمارت سے منسلک ہیں ان کی تعمیرات کی تاریخ اور فن تعمیر کے ارتقاء سے متعلق معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ سنبھل کی تاریخی حیثیت سمجھنے کے لئے ان کتبات کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

قطعہ تاریخ

مکان یعقوب علی خان صاحب وکیل آنریری مجسٹریٹ بڑادوارہ

سکر قوم زمانہ یا یزندے | کاندر عجم وز بہترین است
ایوان بلند داشت بگذاشت | او رفت بروضہ برین است
یعقوب علی خان عالی | از تخمۂ او کہ بر زمین است
گردش براز لباس تجدید | چونکہ بچہرہ حسین است
ہم جست است اثر سنین تعمیر | ولی گفت کہ خانہ ترین است

یعقوب علی خان کون تھے؟

سرائے ترین محلہ کوٹلہ میں بڑا دوارہ کے نام سے ایک بڑی شاندار اور وسیع عمارت ہے جو اپنے وقت کا ایک محل ہے وہی یعقوب علی خان کا دولت کدہ ہے اگرچہ اس کی شان و عظمت و شوکت کا پتہ مذکورہ قطعہ سے ہو رہا ہے لیکن جن حضرات نے اس عمارت کو سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ سرائے ترین کی شاہی عالیشان عمارت ہے۔ ۲۹ ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو تنظیم الحفاظ کا عظیم الشان اجلاس اسی کے وسیع میدان میں ہوا۔

یعقوب علی خان کی شخصیت وہ ہے جن کی وجہ سے سنبھل کا تعارف ہوا۔ آپ انگریزی حکومت میں وکیل آنریری مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہو کر جہاں کہیں رہے شمع انجمن بن کر رہے۔ آپ کی حق گوئی اور انصاف پسندی کمزوروں اور مظلوموں کی فریادرسی کے واقعات زبان زد ہیں۔

انتقال:

۲۵ ر مئی ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۳ھ بروز جمعہ آپ نے انتقال کیا۔

پسماندگان میں ایک لڑکا محمود علی خان چھوڑا ہے۔

کتبہ دربار جامع مسجد سرائے ترین

سرائے ترین محلہ دربار جامع مسجد میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔ سکندر لودھی کے عہد کا یہ کتبہ فارسی زبان میں بخط ثلث تحریر ہے۔ کتبہ پر مسجد کی تعمیر کی تاریخ بارہ ربیع الاول ۹۰۹ھ ۴ ر ستمبر ۱۵۰۳ء ہے مسجد کی تعمیر شاندار ہے کتبے کے مطابق مسجد کی تعمیر میاں داؤد ابن ملک اختیار خان جو سلطان سکندر لودھی کے چاشنی گیر تھے نے تکمیل کرائی۔ ۱۹۰۰ء میں ایک برآمدہ کی تعمیر عمل میں آئی۔

کتبہ جامع مسجد سنبھل

یہ کتبہ جامع مسجد سنبھل کی مرکزی محراب کے نیچے لگا ہوا ہے کتبہ کے مطابق بابر کے حکم سے اس کے خادم ہندو بیگ نے یکم ربیع الاول ۹۳۳ھ ۶/دسمبر ۱۵۲۶ء کو اس مسجد کی تعمیر کرائی۔
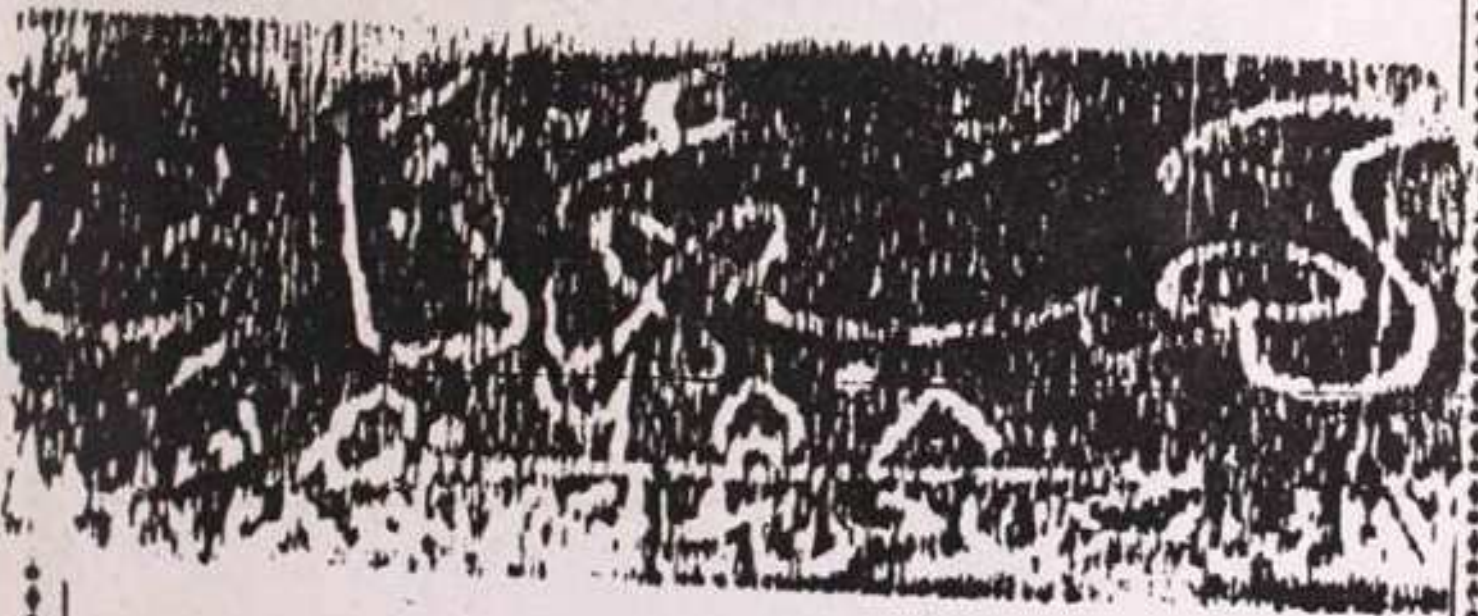
جامع مسجد سنبھل میں بابر کے کتبے کے علاوہ اور بھی کتبے لگے ہوئے ہیں۔

کتبہ نمبر ۱

یہ کتبہ سنبھل سے چھ میل دور قصبہ سرسی جو شیعہ سادات کی ایک مشہور بستی ہے، کی مسجد جو کعبہ ثانی کے نام سے مشہور ہے، میں لگا ہوا ہے۔ مقامی سادات کے مطابق اس مسجد کی تعمیر سید زید نے ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں کرائی تھی جو سید جمال الدین شاہ کے ساتھ کرمان سے سرسی آئے تھے یہ کتبہ بعد میں لگایا گیا تھا۔ کیونکہ کتبہ کا خط نستعلیق ہے ۱۲۶۰ء جو مسجد کا سن تعمیر ہے سے مطابقت نہیں رکھتا۔

طول وعرض ۴۵+۲۵ سینٹی میٹر

عبارت

کعبہ ثانی ۶۵۸ھ

باہتمام محمد عسکری حسن سعید حسین

نوٹ: ۶۵۸ھ کعبہ ثانی کا مادہ تاریخ بھی ہے۔

کتبہ نمبر ۲

یہ کتبہ بھی ہمیں سرسی سے ملا ہے۔ سید مخدوم شاہ کے احاطۂ مزار کی مغربی دیوار میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔ سید مخدوم شاہ کا مزار مرجع خلائق وعوام ہے۔ کتبہ کی پہلی سطر تعمیر مسجد کی مشہور حدیث سے ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کتبہ مسجد سے متعلق ہے، جو بعد میں احاطۂ کی دیوار میں لگا دیا گیا ہے۔ کتبہ ایک مسجد کی تعمیر کا ذکر فیروز شاہ کے عہد میں کرتا ہے۔ کتبہ میں نہ تو تاریخ ہے اور نہ فیروز شاہ کا پورا نام ہے لیکن اندرونی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر سلطان فیروز شاہ تغلق

کے عہد ۱۳۵۷ء تا ۱۳۸۸ء کے مابین اور غالباً ۱۳۸۰ء سے متعلق ہے کٹھیر کے علاقے کی ایک بغاوت کو فرو کرنے کیلئے سلطان فیروز شاہ تغلق نے خود بدایوں کے گردونواح میں فوج کشی کی تھی اور مہم کے بعد انتظام کیلئے ملک داؤد خان کو سنبھل کے علاقے کا حاکم مقرر کیا تھا۔

کتبے کا خط نسخ ہے۔

طول وعرض ۳۷ + ۲۴ سینٹی میٹر ہے۔

عبارت

۱: (قال رسول اللهﷺ من بنیٰ مسجداً لله بنی الله لهٗ قصراً فی الجنة)

۲: (ناصر الدنیا و الدین ابی المظفر فیروزشاه السلطان)

۳: جلاله العبد الضعیف الی عفو الله الراجی

کتبہ نمبر ۳

یہ کتبہ محلہ نالہ قصبان میں سید پچاسے کے مزار کے قریب سماع خانے

کے سامنے ایک قبر پر ایک چوکور پتھر پر کھدا ہوا ہے۔ اس پتھر کے چاروں طرف عبارت ہے۔ جو زیادہ تر قرآن کریم کی آیات ہیں۔ صرف شمال کی جانب تاریخی عبارت موجود ہے۔ جانب شمال ہمیں فرزند علی اور سلطان بایزید کا نام اور تاریخ انتقال ۹۴۰ھ ۱۵۳۴ء لکھا ہوا ملتا ہے۔ فرزند علی ابن سلطان بایزید کو ہم تاریخی طور پر متعین نہیں کر سکے۔ ۱۵۳۱ء میں اپنی تخت نشینی کے بعد مغل بادشاہ ہمایوں نے مرزا عسکری کو سرکار سنبھل کا انتظام سپرد کیا تھا۔ غالباً فرزند علی کا تعلق مرزا عسکری کے عملے سے تھا۔

طول و عرض: ۲۳+۱۵ سینٹی میٹر ہے۔

عبارت

(۱) فرزند علی ابن سلطان بایزید

(۲) ولوالدیہ فی ۹۴۰ سنہ

کتبہ نمبر ۴

یہ کتبہ پنجو سرائے کی مسجد جس میں شیخ پنجو کا مزار واقع ہے اس کے دروازے پر لگا ہوا ہے۔ لال پتھر کے اس کتبے میں دو سطریں ہیں۔ پہلی سطر میں آیۃ الکرسی

تحریر ہے۔ دوسری سطر جو فارسی میں ہے اس میں کتبے کا متن درج ہے۔

کتبہ میں شیخ پنجو کی تاریخ انتقال کا ذکر ہے۔ شیخ کا انتقال ۹۶۹ھ (۱۵۶۱ء/۱۵۶۲ء) میں ہوا۔ اور ان کے مزار کی تعمیر ان کے صاحبزادے منصور نے کرائی۔ ابوالفضل اور ملا عبدالقادر بدایونی دونوں عہد اکبری کے علماء کے ذکر کے تحت شیخ پنجو کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آئین اکبری میں ابوالفضل شیخ پنجو کا ذکر دنیاوی اور دینی علوم دونوں کے ماہر کی حیثیت سے کرتا ہے۔ شیخ پنجو ملا عبدالقادر بدایونی کے والد کے مربی بھی تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب سنبھل میں ۱۵۳۰ء میں ہمایوں بیمار ہوا تھا تو بابر نے شیخ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ کتبہ کا خط نستعلیق ہے۔

دوسری سطر میں تین اشعار ہیں۔

طول وعرض: ۵۸ + ۲۳ سینٹی میٹر ہے۔

عبارت

سطر اول۔ آیت الکرسی

سطر دویم۔

(۱) محیط فضل و عرفاں شیخ پنجو
کہ چوں او رفت عالم گشتہ دل ریش

(۲) پے تاریخ فوت او نہادم
سر خود را بروی زانوے خویش

(۳) چو او درویش دانشمند بودہ
شدہ تاریخ دانشمند درویش

(۴) بانیہ حقیر منصور ابن عبد اللہ
معروف شیخ پنجو ۹۶۹ھ

کتبہ میاں حاتم سنبھلی حاتم سرائے
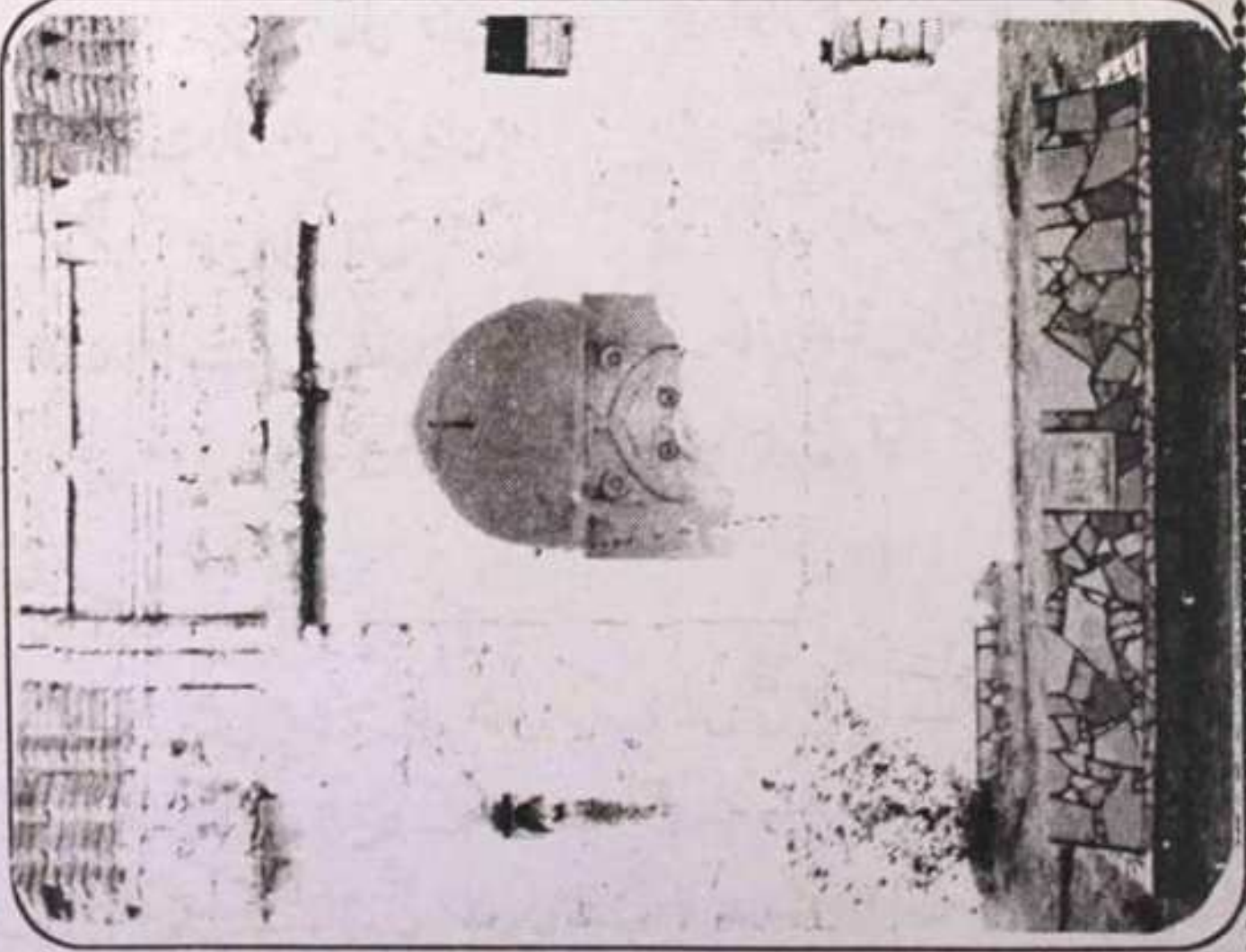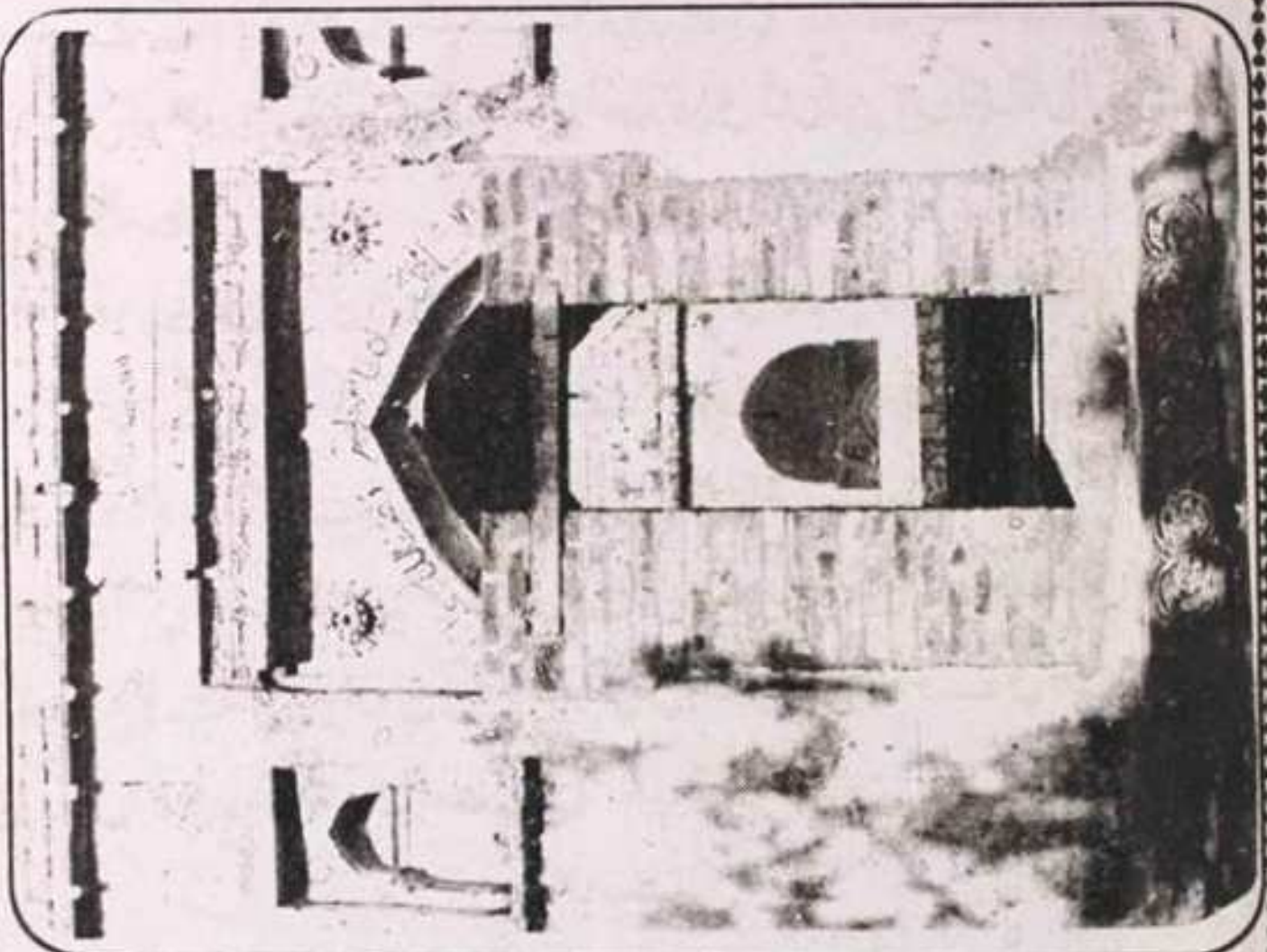
یہ کتبہ سنبھل کے محلہ حاتم سرائے میں میاں حاتم سنبھلی کے مقبرے کے دروازے کے اوپری حصہ پر کندہ ہے۔اس کی بلندی صحن مقبرہ سے کافی زیادہ ہے۔ کتبہ میں دو سطور ہیں جن میں کل پانچ اشعار فارسی میں تحریر ہیں کتبہ میں عمارت کی شان و عظمت کا ذکر ہے۔

عمارت کا نام ''خیر المنازل'' تحریر ہے۔جس کا مادہ تاریخ (۱۵۶۲ء) ہے۔ جو اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ بھی ہے۔ مقبرے کی عمارت گو کہ اب شکست و ریخت کا شکار ہو چکی ہے۔ پھر جو بھی آثار باقی ہیں اس سے یہ انداز لگانا مشکل نہیں کہ اپنی اصلی حالت میں یہ مقبرہ سنبھل کی شاندار عمارت میں سے ایک رہی ہوگی۔ گنبد گر چکا ہے لیکن دیواروں کی تعمیر اور اس کی بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے کتبہ کا چربہ نہیں اتارا جا سکا لیکن عبارت کی نقل حسب ذیل ہے۔

عبارت:

تعالی اللہ بریں عالی عمارت — کہ انوار الٰہی ہست نازل
چہ طرحے دارد ایں کز دیدن او — در فرحت کشادہ گشت بر دل
بچشم مردمان اہل بینش — بود ذروہ زقصر چرخ فاضل
فلک را نیست بال ایں قدر و رفعت — کہ سازد خویش را باوی مقابل
بدیں ضوبی چو شد تعمیرش آخر — شدہ تاریخ او ''خیر المنازل''

کتبہ نمبر ۶

سنبھل میں چھٹا کتبہ محلہ عثمان سرائے میں شیخ عثمان کے لوح مزار پر کندہ ہے۔ شیخ عثمان کا مزار جو گنگا کے کنارے واقع ہے۔ابتدائی پانچ سطور نثر میں اور بقیہ فارسی نظم میں ہے۔کتبہ شیخ عثمان کی تاریخ وفات کے علاوہ شیخ کے فضل و کمال پر

بھی روشنی ڈالتا ہے۔ شیخ کی تاریخ وفات ۹۸۰ھ (۲/۳/۱۵۷۲ء) تحریر ہے۔ جو "رفت مردانہ" کا مادہ تاریخ بھی ہے۔

شیخ عثمان میاں حاتم سنبھلی کے ہم عصر بزرگ تھے بدایونی کے مطابق شیخ عثمان اور میاں حاتم کا ایک دوسرے سے ربط وضبط بھی تھا۔

میاں حاتم اپنے مریدوں کو شیخ عثمان کے پاس استفادہ کیلئے بھیجا بھی کرتے تھے۔ شیخ عثمان کا تعلق علاقہ بنگال سے تھا۔ وہ شیخ عثمان بنگالی کے نام سے مشہور ہیں۔

طول وعرض: ۴۶+۲۰ سینٹی میٹر ہے۔

عبارت

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۲) تاریخ قدوۃ العٰلمین زبدہ

(۳) العارفین سیفِ زبان

(۴) رضوان مکان مولانا

(۵) کمال الدین بندگی شیخ عثمان

(۶) شیخ عثمان کہ بود مخزن علم

(۷) ھمچو گنجینۂ بویرانہ

(۸) عالمی عاقلی چو اُو نہ گزشت

(۹) نکتہ دانی دریں کتب خانہ

(۱۰) خواستم سال خویش از مردان

(۱۱) ہمہ گفتند رفت مردانہ

(۱۲) سنۃ ۹۸۰ھ

تحریر کتبہ نمبر ۶
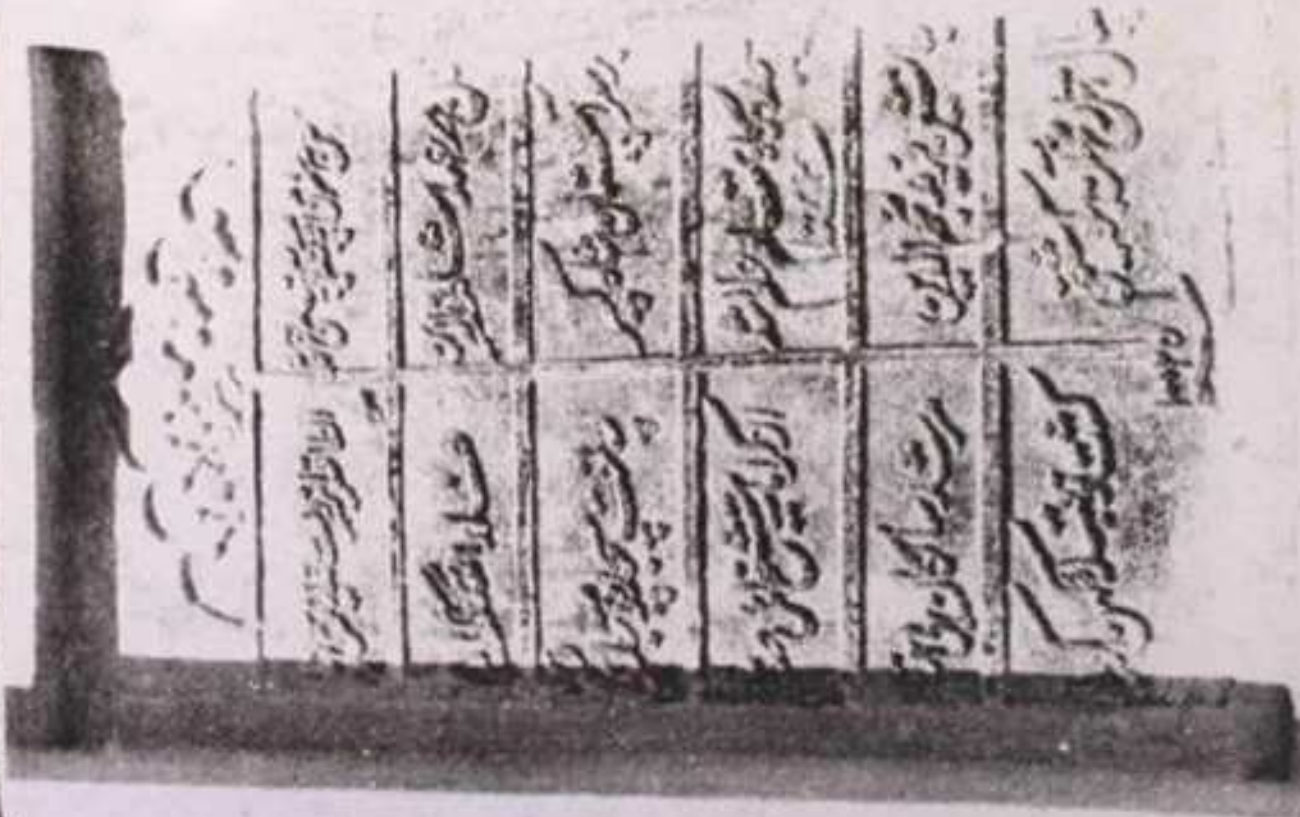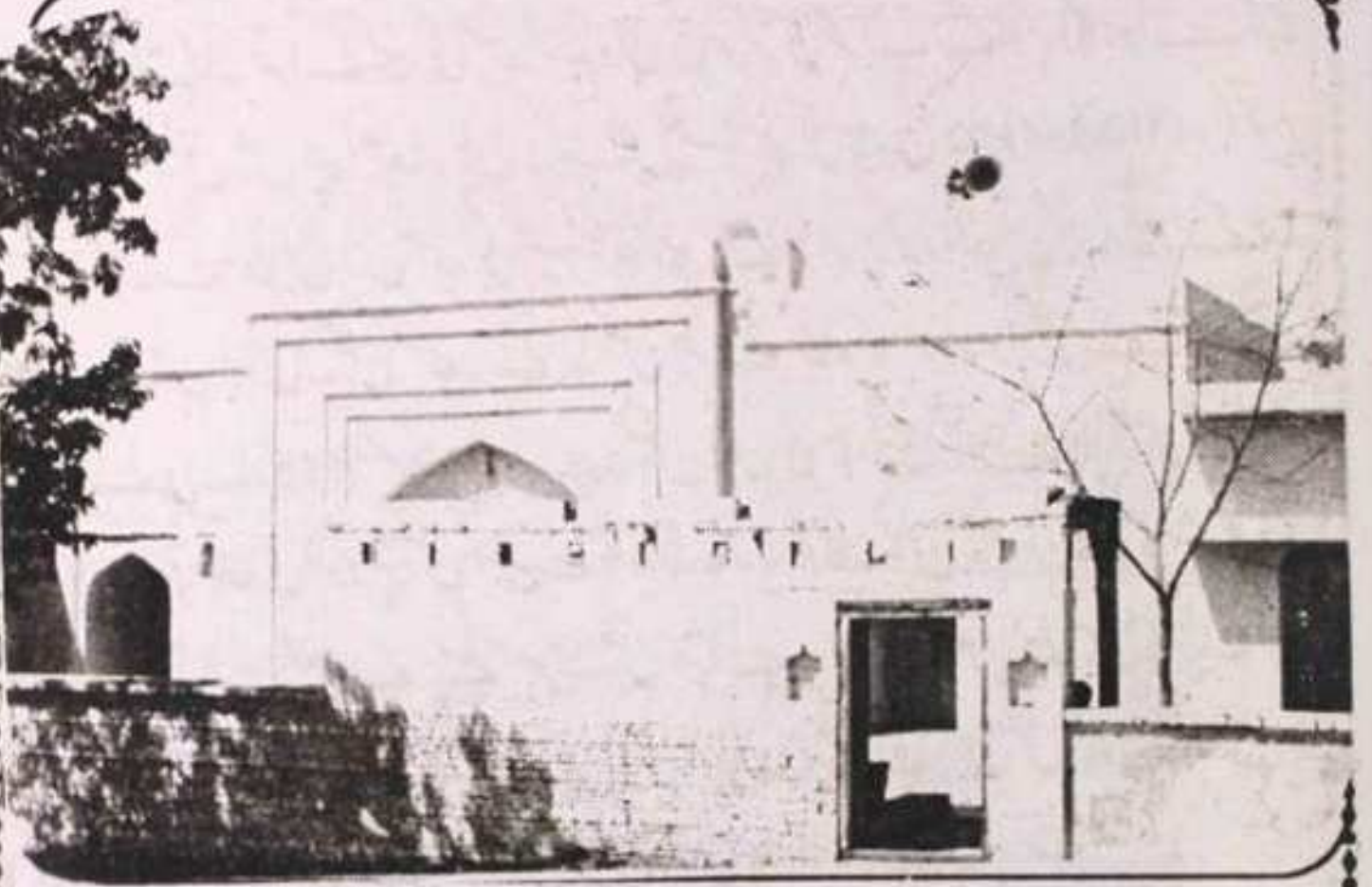
کتبہ کبیر کی سرائے

کتبہ نمبر ۷

یہ کتبہ محلہ سرائے کبیر کی مسجد گنبدوالی کی مرکزی محراب کے اوپر لگا ہوا ہے۔ کتبہ میں خط نستعلیق میں چھ اشعار ہیں۔ کتبہ میں تعمیر مسجد کی تاریخ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۵ء) تحریر ہے۔ کتبہ کے مطابق اس مسجد کی تعمیر شاہ کبیر کے مزار پر نورالدین جہانگیر کے عہد حکومت میں ہوئی۔ صحن مسجد کے بائیں طرف شاہ کا مزار واقع ہے۔ مسجد تعمیر کروانے والے کا نام نجم الدین ہے۔ لیکن اس کی تاریخی شخصیت کا تعین نہیں کیا جاسکا۔ غالباً مقامی طور پر کسی حیثیت کا مالک رہا ہوگا۔ لیکن مضمون کتبہ کا شاعر شیخی جس کا نام آخری شعر کے پہلے مصرعہ میں ملتا ہے یہ وہی شاعر ہے جس کا ایک کتبہ ہمیں جامع مسجد سنبھل کے منبر کے داہنی طرف ملتا ہے جس کی تاریخ ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) ہے تزک جہانگیری میں ہمیں سنبھل کا ذکر ملتا ہے۔

طول وعرض ۵۶+۴۰ سینٹی میٹر

عبارت

صحن و سرائے و مسجد زیبا و خانقاہ — الطاف ایزدیست خدایا توی پناہ

کان در عہد شاہ نورالدین (کذا) — خلد اللہ ملکہ ابداً

بر سر آستان شاہ کبیر — ساخت مسجد چو مسجد اقصا

سجدہ گاہ تمام عالم شد — از کرامات شیخ اہل صفا

جانشیں فریاد نجم الدین — مرشد سالکان بے ہمتا

سال تاریخ آن بگو شیخی — گشت نو قبلہ کہن گویا

۱۰۲۵ھ

کتبہ نمبر ۷

یہ کتبہ محلہ میاں سرائے میں مسجد بندگی شاہ عزیز اللہ کے داخلی دروازے پر لگا ہوا ہے۔ یہ کتبہ نواب امین الدولہ نے اپنے جد امجد حضرت عزیز اللہ شاہ تلبنی کے مزار پران کی یاد میں لگوایا۔

میاں عزیز اللہ تلبنی

شاہ میاں عزیز اللہ نے اپنے بعد لائق شاگردوں کی ایک ایسی جماعت چھوڑی تھی جس نے علم کی روشنی کی مشعل کو ایک مدت تک سنبھل میں روشن رکھا اور سنبھل دانشوروں کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ صحن مسجد میں شیخ عزیز اللہ کا مزار واقع ہے۔

کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

(۱) مظہر لطف وکرم نواب والا منزلت
برمزار جداعلی مسجدے آباد کرد

(۲) بسکہ حسن نیت از اعمال بالنیات داشت
زین بنائے خیر روح بندگی راشاد کرد

(۳) بندگی حضرت عزیز اللہ کہ علم الیقیں
عالمے را روبحق آں قبلۂ ارشاد کرد

(۴) خوانداذکر ربک سال بنائش را مسیح
۳ ۴ ۱ ۱ ھ

سال اتمام از معظم کعبۂ میر ایجاد کرد
۷ ۴ ۱ ۱ ھ

(۵) لیکن ازامداد (کلی) بیت تاریخش جلیل
گفت امین الدولہ بیت اللہ را بنیاد کرد

کتبہ نمبر ۹

محلہ میاں سرائے کی مسجد کی دیوار میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ میں پانچ سطریں فارسی نثر کی ہیں۔ لال رنگ کے پتھر کی عبارت کافی خستہ حالت میں ہے۔ کتبہ کی تحریر کے مطابق مزار اور مسجد کی تعمیر جس کے اب کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ شیخ بھیکھ

نے جو دیوان محمد صادق انصاری کا پروردہ ہے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں مکمل کی۔ کتبہ کے مطابق مغل بادشاہ احمد شاہ کی تخت نشینی کے دوسرے سال تعمیر مکمل ہوئی۔ محمد صادق انصاری نواب امین الدولہ کے ورثاء میں ہیں محمد صادق انصاری محمد شاہ کے زمانے میں دیوان مالیات تھے۔ نواب امین الدولہ کی حویلی میں ان کے ورثاء آج بھی موجود ہیں۔

طول وعرض: ۴۲+۲۰ سینٹی میٹر

عبارت

۱۔ ھو

۲۔ لا اله الله محمد رسول الله

۳۔ ایں مسجد مقبرہ بنا نمودہ شیخ بھیکھا پرورش یافتہ خداوند

۴۔ رضوان دستگاہ در جوار رحمت باری دیوان محمد صادق انصاری

۵۔ بہ یازدہ ربیع الاول سنہ ۲ جلوس والا احمد شاہی مطابق سنہ ۱۱۶۳ ہجریہ اتمام یافت۔

کتبہ قلعہ فیروز پور   کتبہ نمبر ۱۰

قلعہ فیروز پور سنبھل سے پانچ میل شمال میں مرادآباد روڈ پر واقع ہے۔ یہاں ایک کتبہ لگا ہوا تھا جواب لکھنؤ کے اسٹیٹ میوزیم میں محفوظ ہے کتبہ کے مطابق شیش محل کے تہہ خانہ میں بارہ لاکھ دام، ہیرے جواہرات اور تلواریں دفن ہیں۔ کتبہ کی تاریخ چار شعبان اور اورنگ زیب کا دوسرا سن جلوس ہے۔ (۱۶۵۹ء)
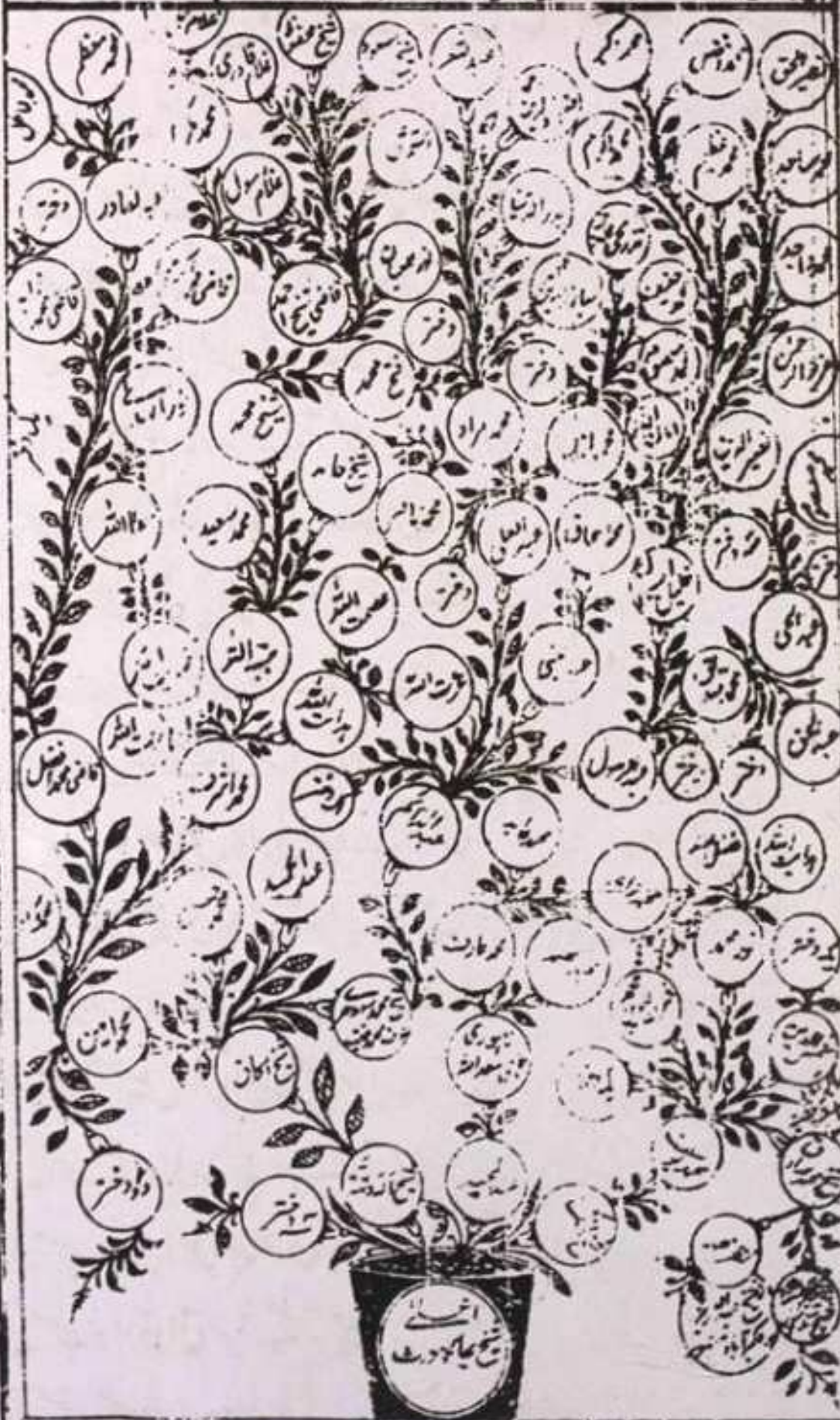
سنبھل وسرائے ترین کی مساجد

۱۔ مسجد مرکز والی محلّہ جھجران سرائے ترین

۲۔ مسجد بہادر خان محلّہ برکھیریان سرائے ترین

۳۔ مسجد پھول باغ محلّہ برکھیریان سرائے ترین

۴۔ مسجد درزی والی محلّہ پھواھان سرائے ترین

۵۔ جامع مسجد دربار سرائے ترین

۶۔ مسجد بڑادوارہ محلّہ کوٹلہ سرائے ترین

۷۔ مسجد کوٹلہ والی پرانی محلّہ کوٹلہ سرائے ترین

۸۔ مسجد جدید محلّہ کوٹلہ سرائے ترین

۹۔ مسجد لال قبر محلّہ کوٹلہ سرائے ترین

۱۰۔ مسجد بُدئی عباس کالونی سرائے ترین

۱۱۔ مسجد پکا باغ والی پکا باغ سرائے ترین

۱۲۔ مسجد طرہ باز خان نذر خیل سرائے ترین

۱۳۔ مسجد تحصیل دار والی باغیچہ سرائے ترین

۱۴۔ مسجد کھنی والی باغیچہ سرائے ترین

۱۵۔ مسجد حاجی والی جھالری جامن سرائے ترین

۱۶۔ مسجد نوادہ والی سرائے ترین

۱۷۔ مسجد چھوارے والی چکلی سرائے ترین

۱۸۔ مسجد اتوار کی پینٹھ، پینٹھ اتوار سرائے ترین

۱۹۔ مسجد بازار گنج بازار گنج سرائے ترین

۲۰۔ مسجد عائشہ رحمت نگر نوادہ سرائے ترین

۲۱۔ مسجد بنگلے والی حوض کٹورہ سرائے ترین

۲۲۔ مسجد بھوڑا سرائے ترین

۲۳۔ سنہری مسجد بارہ دری سرائے ترین

۲۴۔ لال مسجد پینٹھ اتوار سرائے ترین

۲۵۔ موتی مسجد بارہ دری سرائے ترین

۲۶۔ مسجد راؤ والی چاہ نائک سرائے ترین

۲۷۔ مسجد خان ساماں والی سرائے ترین

۲۸۔ بسم اللہ مسجد منگل پورہ سرائے ترین

۲۹۔ مکہ مسجد منگل پورہ سرائے ترین

۳۰۔ مدینہ مسجد منگل پورہ سرائے ترین

۳۱۔ مسجد شہتوت والی منگل پورہ سرائے ترین

۳۲۔ مسجد نخاسہ والی منگل پورہ سرائے ترین

۳۳۔ مسجد رستم خان محلہ نواب خیل سرائے ترین

۳۴۔ مسجد مقبرہ والی محلہ نواب خیل سرائے ترین

۳۵۔ اکبری مسجد سرائے ترین

۳۶۔ مسجد منیہاران سرائے ترین

۳۷۔ مسجد پنی گران سرائے ترین

۳۸۔ نورانی مسجد بھوڑا سرائے ترین

۳۹۔ جامع مسجد نوح خان حیات نگر

۴۰۔ مسجد مینڈو خان حیات نگر

۴۱۔ مسجد ترکان حیات نگر

۴۲۔ مسجد اکبری حیات نگر۔

۴۳۔ مسجد سیفیان حیات نگر

۴۴۔ جامع مسجد حیات نگر

۴۵۔ مسجد ترک والی حیات نگر سنبھل

۴۶۔ مسجد بڑھئی والی حیات نگر سنبھل

۴۷۔ مسجد انصاری حیات نگر سنبھل

۴۸۔ مسجد یعقوب العلوم والی، حیات نگر سنبھل

۴۹۔ مسجد کوپ حیات نگر

۵۰۔ مدینہ مسجد انجمن د۔ پاسرائے

۵۱۔ بایزید مسجد چوک د۔ پاسرائے

۵۲۔ روضۃ والی مسجد د۔ پاسرائے

۵۳۔ میاں صاحب والی مسجد د۔ پاسرائے

۵۴۔ مسجد نیاریان د۔ پاسرائے

۵۵۔ مسجد ایک مینار والی د۔ پاسرائے

۵۶۔ مسجد ٹھنڈھی کوٹھی ڈیر والی د۔ پاسرائے

۵۷۔ مسجد قبرستان والی د۔ پاسرائے

۵۷۔ فصیل والی مسجد د۔ پاسرائے

۵۸۔ مسجد خورشید وکیل والی د۔ پاسرائے

۵۹۔ مسجد تلنگوں والی د۔ پاسرائے

۶۰۔ مسجد ترکوں والی د۔ پاسرائے

۶۱۔ مسجد رائے ستی والی د۔ پاسرائے

۶۲۔ مسجد نئی آبادی والی د۔ پاسرائے

۶۳۔ مسجد کالے کھیڑے والی د۔ پاسرائے

۶۴۔ مسجد چوکی والی د۔ پاسرائے

۶۵۔ مسجد منشی جی والی کوٹلہ د۔ پاسرائے

۶۶۔ مسجد برجوں والی د۔ پاسرائے

۶۷۔ مسجد والی د۔ پاسرائے

۶۸۔ مسجد بنگلہ والی د۔ پاسرائے

۶۹۔ مسجد تیلیوں والی د۔ پاسرائے

۷۰۔ مسجد نائیوں والی د۔ پاسرائے

۷۱۔ مسجد خاں صاحب والی د۔ پاسرائے

۷۲۔ مسجد تکیہ والی د۔ پاسرائے

۷۳۔ مسجد بقر قصاب والی د۔ پاسرائے

۷۴۔ مکہ مسجد کھیڑا د۔ پاسرائے

۷۵۔ مسجد ضمیر العلوم والی د۔ پاسرائے

۷۶۔ مسجد کھیڑے والی قدیم د۔ پاسرائے

۷۷۔ مسجد کھیڑے والی جدید د۔ پاسرائے

۷۸۔ ثمن شہید مسجد د۔ پاسرائے

۷۹۔ مسجد حاجی صغیر والی د۔ پاسرائے

۸۰۔ مسجد باغ والی د۔ پاسرائے

۸۱۔ مسجد نخاسہ والی د۔ پاسرائے

۸۲۔ مسجد خواص خاں سرائے

۸۳۔ مسجد پنجوسرائے مرکز تبلیغی جماعت پنجوسرائے سنبھل

۸۴۔ مسجد پنجوسرائے پنجوسرائے سنبھل

۸۵۔ مسجد بندگی میاں میاں سرائے

۸۶۔ مسجد روضہ والی میاں سرائے

۸۷۔ مسجد نواب محمود والی میاں سرائے

۸۸۔ مسجد نوابان میاں سرائے

۸۹۔ مسجد ترکاں میاں سرائے

۹۰۔ مسجد علی شاہ مدرسہ حمیدیہ میاں سرائے

۹۱۔ مسجد باغ والی کھاری کنواں میاں سرائے

۹۲۔ مسجد کٹرہ موسیٰ خاں کٹرہ موسیٰ خاں میاں سرائے

۹۳۔ مسجد دھوبیان کٹرہ موسیٰ خاں میاں سرائے

۹۴۔ مسجد میرن شاہ جمن سرائے سنبھل

۹۵۔ مسجد کمبوخان جمن سرائے سنبھل

۹۶۔ مسجد قطب جمن سرائے سنبھل

۹۷۔ مسجد ایک مینار ڈونگر سرائے

۹۸۔ مسجد باغیچہ ڈونگر سرائے

۹۹۔ مسجد بھورے شہیدؒ ڈونگر سرائے

۱۰۰۔ مسجد کمبوہ والی ڈونگر سرائے

۱۰۱۔ بڑی مسجد ہلالی سرائے

۱۰۲۔ مسجد تالاب والی ہلالی سرائے

۱۰۳۔ مسجد چاندوالی بیگم سرائے

۱۰۴۔ قدیم مسجد نئی سرائے

۱۰۵۔ مسجد بلال نئی سرائے

۱۰۶۔ نئی مسجد پھلوار پھلوار نئی سرائے

۱۰۷۔ مسجد زیارت والی نئی سرائے

۱۰۸۔ بڑی مسجد ڈیرہ سرائے

۱۰۹۔ چھوٹی مسجد ڈیرہ سرائے

۱۱۰۔ مسجد ملک شاہ منصفی روڈ

۱۱۱۔ مسجد گودام والی ٹھیر

۱۱۲۔ مسجد ملانان چودھری سرائے

۱۱۳۔ مسجد پلیہ والی چودھری سرائے

۱۱۴۔ مسجد پل والی چودھری سرائے

۱۱۵۔ مسجد بابا فخر الدین چودھری سرائے

۱۱۶۔ مسجد حافظان کوٹ غربی

۱۱۷۔ مسجد بڑوالی کوٹ غربی

۱۱۸۔ مسجد ایک مینار کوٹ غربی

۱۱۹۔ مسجد زاہد بیگ کوٹ غربی

۱۲۰۔ مسجد متولیان کوٹ غربی

۱۲۱۔ مسجد عباسیان کوٹ غربی

۱۲۲۔ مسجد تحصیل دار کوٹ غربی

۱۲۳۔ مسجد مصطفےٰ علی نمبر دار کوٹ غربی

۱۲۴۔ مسجد انار والی کوٹ غربی

۱۲۵۔ مسجد خدا بخش کوٹ غربی

۱۲۶۔ مسجد کرم خان کوٹ غربی

۱۲۷۔ مسجد منشی فضل رب کوٹ غربی

۱۲۸۔ مسجد حکیم جی والی کوٹ غربی

۱۲۹۔ مسجد حافظ اکرام علی کوٹ غربی

۱۳۰۔ مسجد سکوں والی کوٹ غربی

۱۳۱۔ مسجد ایک رات کوٹ شرقی

۱۳۲۔ مسجد سرتھل دروازہ کوٹ شرقی

۱۳۳۔ مسجد ولی جان کوٹ شرقی

۱۳۴۔ مسجد فتح لال مسجد کوٹ شرقی

۱۳۵۔ مسجد بنی اسرائیل کوٹ شرقی

۱۳۶۔ مسجد قاضی علی میر کوٹ شرقی

۱۳۷۔ جامع مسجد کوٹ شرقی

۱۳۸۔ مسجد نالہ والی کوٹ شرقی

۱۳۹۔ مسجد مردھوں والی کوٹ شرقی

۱۴۰۔ مسجد چنائن سنبھل

۱۴۱۔ مسجد موہی پور سنبھل

۱۴۲۔ مسجد منڈلائی سنبھل

۱۴۳۔ مسجد بلقہ سنبھل

۱۴۴۔ مسجد خان پور سنبھل

۱۴۵۔ مسجد جلال پور سنبھل
۱۴۶۔ مسجد موسیٰ پور سنبھل
۱۴۷۔ مسجد موسیٰ پور سنبھل
۱۴۸۔ مسجد موسیٰ پور سنبھل
۱۴۹۔ مسجد موسیٰ پور سنبھل
۱۵۰۔ مسجد شہباز پور سنبھل
۱۵۱۔ مسجد بچھولی سنبھل
۱۵۲۔ مسجد چنپاولی سنبھل
۱۵۳۔ مسجد پھول سنگا سنبھل
۱۵۴۔ مسجد ناٹھیر سنبھل
۱۵۵۔ مسجد ناٹھیر سنبھل
۱۵۶۔ مسجد حسن پور جامع مسجد سنبھل
۱۵۷۔ مسجد تکیہ والی سنبھل
۱۵۸۔ مسجد ایک مینار والی سنبھل
۱۵۹۔ مسجد ملک دھولی سنبھل
۱۶۰۔ مسجد رائے بزرگ سنبھل
۱۶۱۔ مسجد رائے بزرگ سنبھل
۱۶۲۔ مسجد منگلہ سنبھل
۱۶۳۔ مسجد رجیٹہ سنبھل
۱۶۴۔ مسجد حسام پور سنبھل
۱۶۵۔ مسجد پنسوا خان سنبھل

۱۶۶۔ مسجد مانڈلی سنبھل

۱۶۷۔ مسجد مانڈلی سنبھل

۱۶۸۔ مسجد نیا فتح پور سنبھل

۱۶۹۔ مسجد ملک سنبھل

۱۷۰۔ مسجد ملک سنبھل

۱۷۱۔ مسجد سونا سنبھل

۱۷۲۔ مسجد سدیر پنور سنبھل

۱۷۳۔ مسجد سدیر پنور سنبھل

۱۷۴۔ مسجد پریاب لی سنبھل

۱۷۵۔ مسجد پریاب لی سنبھل

۱۷۶۔ مسجد تاج پور سنبھل

۱۷۷۔ مسجد مندالہ سنبھل

۱۷۸۔ مسجد مندالہ سنبھل

۱۷۹۔ مسجد مندالہ سنبھل

۱۸۰۔ مسجد مندالہ سنبھل

۱۸۱۔ مسجد مندالہ سنبھل

۱۸۲۔ مسجد محمود نگر سنبھل

۱۸۳۔ مسجد ہیبت پور سنبھل

۱۸۴۔ مسجد ہیبت پور سنبھل

۱۸۵۔ مسجد گومت پور سنبھل

۱۸۶۔ مسجد گومت پور سنبھل

۱۸۷۔ مسجد اسلم پور سنبھل
۱۸۸۔ مسجد لہرہ گمنگر سنبھل
۱۸۹۔ مسجد بھشتیوں والی لہرہ سنبھل
۱۹۰۔ جامع مسجد لہرہ سنبھل
۱۹۱۔ مسجد ریتیوں والی لہرہ سنبھل
۱۹۲۔ جامع مسجد مظفر پور سنبھل
۱۹۳۔ مسجد ڈھریٹہ سنبھل
۱۹۴۔ مسجد آڑھول سنبھل
۱۹۵۔ مسجد نصیر پور سنبھل
۱۹۶۔ مسجد سکندر پور سنبھل
۱۹۷۔ مسجد سکندر پور سنبھل
۱۹۸۔ مسجد منڈی سنبھل
۱۹۹۔ مسجد نوریوں سرائے سنبھل
۱۹۱۔ مسجد نوریوں سرائے سنبھل
۱۹۲۔ مسجد سیف خان سرائے سنبھل
۱۹۳۔ مسجد سیف خان سرائے سنبھل
۱۹۴۔ مسجد سیف خان سرائے سنبھل
۱۹۵۔ مسجد سیف خان سرائے سنبھل
۱۹۶۔ مسجد جوگی پور سنبھل
۱۹۷۔ مسجد قریشی کولڈ اسٹور مراد آباد روڈ سنبھل
۱۹۸۔ مسجد قریشی بون میل مراد آباد روڈ سنبھل

۱۹۹۔ مسجد نوری بون میل مرادآباد روڈ سنبھل

۲۰۰۔ مسجد بھوانی پوری سنبھل

۲۰۱۔ مسجد بلبلی عیدگاہ والی سنبھل

۲۰۲۔ مسجد سونا مارکیٹ کے قریب سنبھل

۲۰۰۔ مسجد باغ والی سنبھل

۲۰۱۔ مسجد منڈی سمیتی سنبھل

۲۰۲۔ مسجد فتح اللہ سرائے سنبھل

۲۰۳۔ مسجد کبیر کی سرائے سنبھل

۲۰۴۔ مسجد دہلی دروازہ سنبھل

۲۰۵۔ مسجد حیات نگر جنگل والی (عیدگاہ) سنبھل

۲۰۶۔ مسجد لاڈن سرائے سنبھل

مسجد طوبیٰ

یہ ایک مسجد قدیم ترین مسجد ہے۔ اس کی مغربی دیوار و محراب باقی و قائم تھی۔ ایک مدت سے اس کی تعمیر ثانی کا خیال تھا۔ نشانات قدامت کا پتہ دے رہے تھے۔ نیز حضرت مولانا قاری عبدالمعید صاحب ابن مولانا عبدالوحید صاحبؒ نے ایک دفعہ بعض حضرات سے اس کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ چونکہ ہر کام کا ایک وقت مقدر و مقرر ہے ادھر دلی خواہش تھی کہ تعمیر کا کام شروع کیا جائے۔ جیسے ہی تعمیر کا ارادہ کیا۔ لوگوں کو توجہ دلائی۔ تو حق تعالیٰ کی غیبی مدد و نصرت ہوئی۔ کہ کھودنے پر بنیادیں ظاہر ہوئیں۔ الحمدللہ انہیں بنیادوں پر ۱۶؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تعمیر ثانی شروع ہوئی۔ اور ۱۵؍اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پنج وقتہ نماز چار، پانچ صفوں میں بجماعت ادا کیجارہی ہے۔ نیز ۲۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء سے جمعہ کی نماز ہوئی۔ نمازیوں سے مسجد بھر جاتی ہے۔ اور

عیدین کی نماز بھی ادا کی جاتی ہے۔ یہ مسجد اپنی نوعیت و طرز کی جداگانہ مسجد ہے۔
ایک ہال ۳۴ فٹ ۴۶/ فٹ یعنی ۱۱/ صفوں کا ایک ہال ہے۔ ۲۲/ فٹ اونچائی ہے اور
صفوں کا ایک برآمدہ زیر تعمیر ہے۔ اس کا موسس و بانی راقم الحروف عبدالمعید ہے۔

تنظیم الحفاظ

وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر تنظیم الحفاظ کا قیام عمل میں آیا ۶/ نومبر ۱۹۹۹ء
بروز ہفتہ بعد نماز عشاء سرائے ترین کے اکثر حفاظ کرام جمع ہوئے کہ اصلاح معاشرہ
کے تحت تعلیم بالغان۔ ناخواندہ لوگوں کی تعلیم کا نظم کیا جائے۔ علمی، مذہبی، اخلاقی،
اصلاحی کاموں میں کوشش کرنے۔ اور رسم ورواج واسراف کی اصلاح کیلئے جدوجہد ہو۔
بیواؤں، یتیموں، اور غریب لڑکیوں کی شادی کرانے میں تعاون کیا جائے۔ نیز
سیرت واخلاق اور وقت ضرورت مختلف موضوعات پر جلسہ واجتماع کرایا جائے۔
محفل قرأت منعقد کرائی جائے۔ اوران جیسے مقاصد واغراض وامور پر بحث ومباحثہ
کے بعد تمام حفاظ کے مشورہ واتفاق رائے سے یہ بات طے پائی۔ کہ مذکورہ امور کی
انجام دہی کیلئے تنظیم کا قیام از حد ضروری ہے۔ ۱۲/ نومبر بروز جمعہ ۱۹۹۹ء بعد نماز عشاء
مسجد عائشہ میں میٹنگ ہوئی الحمد للہ تمام حاضرین کے اتفاق واتحاد رائے سے
تنظیم الحفاظ قائم کی گئی۔ بستی سرائے ترین کے قریب ۲۰۰/ حفاظ شریک ہیں۔

سرپرست: حضرت الحاج جناب حافظ فریدالدین خاں صاحب ہیں۔
بانی وصدر راقم الحروف عبدالمعید ☆ ناظم اعلیٰ: حافظ محمد ذاکر صاحب
نائب ناظم: حافظ محمد اعظم صاحب ☆ خزانچی: حافظ محمد شاہد صاحب

ارکان شوریٰ ☆ حافظ محمد ابراہیم صاحب ☆ حافظ محمد عمران صاحب ☆
حافظ محمد شاہد صاحب ولد حاجی عبدالعزیز ☆ حافظ محمد اکرم صاحب ☆ حافظ تحسین صاحب
☆ حافظ عبدالواحد صاحب ☆ حافظ محمد نفیس صاحب۔

سنبھل کی تاریخ پر ایک نظر

(۱) یورپ = روم کی لائبریری میں سرفہرست شہر سنبھل کا نام درج ہے۔

(۲) سنبھل چھ ہزار برس پرانا شہر ہے، جو چار ہزار برس قبل مسیح علیہ السلام آباد ہوا

(۳) سنبھل دہلی راجدھانی سے ۱۵۰ر میل دور مشرق میں واقع ہے۔

(۴) سنبھل مراد آباد شہر سے ۲۳ر میل یعنی ۳۵ر کلومیٹر دور جنوب میں واقع ہے۔

(۵) سنبھل ہندوؤں کے نزدیک متبرک جگہ ہے۔ اور کلکی اوتار کے ظہور کا مقام ہے۔

(۶) سنبھل کی تنزلی ۱۱۹۱ سے شروع ہوئی۔

(۷) سنبھل ۳۶ر مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔

(۸) بدایوں شہر سنبھل سرکار میں شامل تھا جو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ (ولادت ۱۲۲۱ء) کا مقام پیدائش ہے۔

(۹) ۱۹۵۸ء میں عرب جانے والی پہلی جماعت میں شہر و مراد آباد کے افراد شریک تھے حاجی سعید احمد مراد آبادی امیر جماعت اور حاجی اللہ دیئے سنبھلی شریک جماعت تھے۔

(۱۰) جامع مسجد سنبھل ۷۰۲ھ میں شاہ تغلق نے تعمیر کرائی ہے۔

(۱۱) اور ۹۳۲ھ میں ظہیر الدین بابر نے جامع مسجد کی توسیع کرائی۔

(۱۲) مولانا عبدالوحید سنبھلی نے حصول علم کیلئے لاہور کا پاپیادہ سفر طے کیا۔

(۱۳) نیزہ ایک ہزار سال پرانا قدیم (تہوار) میلہ ہے۔

(۱۴) ابوالفضل شاہ حاتم سنبھلی کے شاگرد تھے۔

(۱۵) شاہ مملوک والد ملا عبدالقادر بدایونی۔ شیخ پنجو سنبھلی کے خلیفہ تھے۔

(۱۶) شاہ حاتم سنبھلی نے ستر سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

(۱۷) سات ہزار فقہ کی کتابیں اس وقت آپ کے کتب خانہ میں موجود تھیں۔

(۱۸) سلطان ناصر الدین کے عہد میں ہندو مسلم فساد ہوا تو اس نے کوٹ شرقی میں ہندوؤں کو اور کوٹ غربی میں مسلمانوں کو تقسیم کر دیا۔

(۱۹) سلطان محمد شاہ دہلی ۱۱۵۸ھ ربیع الثانی مطابق ۱۷۴۱ء سنبھل آیا اور نواب امین الدولہ کے یہاں قیام کیا۔ بادشاہ کو جس چبوترے پر بٹھایا گیا اس کو لکی چبوترہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۲۰) ھمایوں صحت یاب ہو کر سنبھل آیا تو شاہ پنجو کو ایک موضع ملک کٹونی کا بود و باش کے لئے فرمان جاری کیا۔

(۲۱) مولانا خلیل احمد اسرائیلی شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے۔

(۲۲) چکی کا پاٹ آثار قدیمہ میں ایک تاریخی چیز ہے۔

(۲۳) پرتھوی راج سنبھل اور دہلی کا حکمراں بادشاہ تھا۔

(۲۴) سات (۷) سلاطین اسلام نے سنبھل کو اپنے قدوم سے شرف بخشا۔

سلطان محمد غزنوی، سلطان فیروز شاہ ۷۵۲، سلطان حسین والئی جون پور ۸۸۰ھ ھمایوں نصیر الدین ۹۳۶ھ، سلطان محمد شاہ۔ وغیرہ

(۲۵) درۂ شریعت سید اعظم خان کو بابر ظہیر الدین نے عطا کیا جو آج تک ان کی اولاد میں جاری ہے۔

(۲۶) مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کو خاندان انصاریان سے ربط رہا ہے۔ اور آپ کے دو خلیفہ ہوئے۔

(۲۷) (۱) مولوی ثناء اللہ صاحب (۲) مولانا مراد اللہ انصاری۔ (۱)

(۱) آپ ہی نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو زبان میں ترجمہ فرمایا۔

(۲۸) نواب عاشق حسین خاں کو جنگ عظیم کے خاتمہ پر انگریزی حکومت نے

خان بہادر کا خطاب عطا کیا جس کو حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی سنبھل تشریف آوری سے متأثر ہو کر نواب صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(۲۹) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ جب جیل سے واپس آئے تو پہلے نواب عاشق حسین خان سنبھلی کے یہاں تشریف لائے۔

(۳۰) نواب امیر علی خان سنبھلی کو جب معلوم ہوا کہ سید شہید کے داماد دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ میری لڑکی سے شادی کرلیں وہ خادمہ ہو کر رہے گی۔

(۳۱) انوار المحمود شرح ابوداؤد مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں سنبھل سے طبع ہوئی۔

(۳۲) سندھ سے سب سے پہلے دو بھائیوں کو علوم عقلیہ کے لئے ایک بھائی کو سنبھل اور ایک کو دہلی بھیجا گیا۔ (از مولانا مناظر احسن گیلانی)

(۳۳) سکندر بہلول لودھی ۹۰۷ھ میں سنبھل آیا۔ ۶ر رجب ۹۹۹ھ وفات ہوئی۔

(۳۴) شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی شیخ سلیم الدین چشتیؒ کے خلیفہ کلاں ہیں۔

(۳۵) ابوسعید ابن شیخ فتح اللہ ترین کی وفات ۹۷۵ھ میں ہوئی۔

(۳۶) گلشن ابراہیمی مصنفہ محمد قاسم فرشتہ کا اردو ترجمہ سلیس زبان میں تاریخ فرشتہ کے نام سے خواجہ عبدالحیٔ نے کیا ہے۔

(۳۷) ہمایوں کے دوبارہ واپس آنے پر اکبر کے تخت نشیں ہونے کے بعد تک سنبھل کا حاکم علی قلی خان تھا۔

(۳۸) سکندر بہلول لودھی نے آگرہ کو دار السلطنت قرار دیا تو اس وقت محمد قاسم کو سنبھل کا حاکم منتخب کیا۔ یہ ظہیر الدین بابر کے زمانے تک رہا۔ جب محمد قاسم عہدہ سے دست بردار ہوا تو شہزادہ ہمایوں سنبھل کا حاکم مقرر ہوا۔

(۳۹) دریا خاں علاء الدین جب سنبھل کا حاکم ہوا اس زمانہ میں میاں کمبوہ

بدایوں کے حاکم تھے۔انھیں غازی الملک کا خطاب ملا۔

(۴۰) نواب امین الدولہ میاں بندگی شاہ عزیز اللہ تلبنی احرار کے صاحب زادے ہیں۔

(۴۱) جامع مسجد سنبھل کی قطعہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پہلے سے مسجد تھی۔ جو منہدم ہوگئی تھی۔

(۴۲) سید فتح اللہ کرمانی نے اپنی جاگیر میں فتح اللہ سرائے آباد کی۔

(۴۳) اس زمانہ میں شیخ کبیر سنبھل تشریف لائے اور کبیر کی سرائے آباد کی۔

(۴۴) شیخ رکن الدین بابر کے ہمراہ تشریف لائے۔اور رکن الدین سرائے آباد کی

(۴۵) اسی عہد میں شاہ عالم کرمانی نے کرمانی سرائے آباد کی۔

(۴۶) عماد الملک شیر شاہ کا وزیر تھا۔بادشاہ کے نام پر شیر شاہ سرائے آباد کی۔

(۴۷) سنبھل کی قدیم آبادی کوٹ ہی ہے۔باقی باون سرائے چھتیس پورے کے نام سے جو محلات آباد ہیں۔وہ بادشاہوں کے زمانے کے آباد شدہ ہیں۔

(۴۸) مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر ہونے پر سنبھل کا آخری حاکم ننھے خاں گذرا ہے

(۴۹) جو وزیر کی علمداری میں تھا اس وقت سنبھل کی صوبے داری ختم ہو کر بریلی صدر مقام ہوا۔

(۵۰) عثمان شاہ بنگالی کا مزار کبیر کی سرائے میں ہے۔

(۵۱) شاہ فتح اللہ ترین سنبھل آئے سرائے ترین کو رونق بخشی۔

(۵۲) نواب امین الدولہ نے محلّہ میاں سرائے میں محل سرائے اور بازار تعمیر کرایا۔

(۵۳) نواب عاشق حسین ایک منتظم اور دیندار شخص اور سنبھل کی میونسپلٹی کے معزز چیئرمین تھے

(۵۴) اسٹیشن سنبھل حاتم سرائے اور روہیل کھنڈ کا آخری اسٹیشن ہے۔

(۵۵) سنبھل کو یہ بھی فخر حاصل ہے۔ کہ ہندوستان میں سب سے پہلے اردو میں قرآن کریم کی تفسیر یہیں لکھی گئی۔ جو ۱۸۷۷ء میں شاہ مراد اللہ انصاری نے تفسیر مرادیہ بنام خدا کی نعمت لکھی اور طباعت ہوئی۔

(۵۶) حضرت مولانا منظور نعمانی علیہ الرحمہ جن کا وصال ۱۹۹۸ء میں ہوا۔ عجیب مرضیٔ خداوندی ہے کہ پوری زندگی ''منظور نعمانی'' کے نام سے جانی پہچانی والی ذات کی تاریخ وفات بھی ''منظور نعمانی'' ہے۔ جنھوں نے ازراہ محبت قبل از طباعت تاریخ سنبھل کیلئے ۱۹۹۷ء میں مبلغ یکصد روپیہ مرحمت فرمائے اور اظہار مسرت کے ساتھ دعا بھی کرائی تھی۔ فالحمد لله علی ذلك

''سنبھل کے افق پر علوم کا طلوع''

جب کوئی جگہ اپنے سیاسی تغیرات وانقلاب کی سنگلاخ راہوں سے گزرتی ہوئی اپنے عروج پر پہونچتی ہے۔ تو وہ علم اور ثقافتی تبدیلیوں سے ہرگز ہرگز دور نہیں رہ سکتی۔ چاہے وہ اس سے بچنے کے لئے ہزارہا تدبیریں ہی کیوں نہ اختیار کرلے۔

سنبھل چونکہ عہدِ سکندری میں ۱۴۹۹ء سے ۱۵۵۶ء تک دار السلطنت رہا تھا اور مغل حکمراں ظہیر الدین بابر، ہمایوں اکبر کے دور میں جہاں سیاسی ماحول اپنے عروج پر تھا، جہاں یہ سیاسی ماحول تھا وہیں وہ علم وفن کی منزلوں پر بھی گامزن تھا۔

شیخ عزیز اللہ جنھوں نے لوگوں میں علم وفن کی روح پھونکنے کیلئے جہاں کافی محنت وجاں فشانی کی وہیں سنبھل کو ایوانِ علم کی ایسی بلندیوں سے روشناس کرایا کہ سنبھل کو دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگیا اس کے علاوہ منصف شہنشاہوں نے بھی عوام میں ملی بیداری پیدا کرنے کیلئے مدارس قائم کئے۔ نیز عہد اکبری تو علم کا ایک روشن دور تھا۔

''شیخ تاج الدین سنبھلی''

سنبھل کی مذہبی تاریخ میں سب سے اہم ان ہستیوں کا کردار رہا ہے، جنہوں نے عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل کی اور ایوانِ علم کی ایسی شمعیں روشن کیں جن سے آج تک علم کی شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ ہستیاں ایسی قد آور تھیں جن کے سامنے دوسرے پست قد دکھائی دیتے تھے۔ جن کی علمی قابلیت، ذہانت اور صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے علم کے ایوانوں میں ایسا تہلکہ مچایا کہ ان کی آواز ہندوستان کی دیواروں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ان دیواروں کو پھلانگتی ہوئی سمندر کے دوش پہ سوار عرب تک پہونچ گئی۔

سنبھل کی زرخیز زمین نے، مشائخ، شعراء، تنقید نگار، فلاسفر، اطباء، وکلاء، دانشور، نیز فنکار پیدا کئے۔ جن کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ ان کے دور میں سنبھل علم کا مرکز تھا۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک اور ہستی اُبھر کر سامنے آتی ہے اور وہ ہستی ''شیخ تاج الدین سنبھلی'' کی ہے ان کی جائے پیدائش سنبھل ہے۔ ان کے علمی کارنامے طالب علمی کے زمانے میں ہی ظاہر ہونے لگے تھے پاکیزہ طبیعت، خوش گفتار، خلوص و محبت کا پیکر، علوم نقلیہ اور عقلیہ پر عبور حاصل تھا۔

اپنے دور کے جید عالم تھے۔ آپ کی علمی شہرت دور دور تک تھی۔ آپ ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ اسی نقشبندیہ سلسلہ کو لے کر عرب گئے جس سے عربوں کو واقف کرایا۔ آپ کا انتقال مکۃ المکرّمہ میں ہوا۔ آپ شیخ الہ بخش سنبھلی کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ جو جونپور میر سید علی قوال کے خلیفہ تھے۔ پھر خواجہ باقی باللہ کے سب سے پہلے خلیفہ ہوئے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کا وطن کابل تھا اسم مبارک محمد رضی الدین تھا۔ لیکن باقی باللہ کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت کی شخصیت اور کارناموں سے کون واقف نہیں ہے۔

آپ نے علم بڑی تیزی سے حاصل کرنا شروع کیا اور ابھی علوم سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ کی توجہ حقیقت و معرفت کی طرف مائل ہوگئی اور مرشد کی تلاش شروع کردی، پہلے اپنے گردونواح کے مشائخ کی خدمت میں رہ کر تزکیہ نفس کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی تو شیخ مرشد کی تلاش میں جا بجا گئے۔ ہندوستان کے پہلے دورے میں سنبھل تشریف لائے۔ اور شیخ الہ بخش کی خدمت میں حاضر ہو کر روحانی رشتہ قائم کیا۔ غالباً اسی سفر میں شیخ تاج الدین سنبھلی سے ملاقات ہوئی۔ حضرت خواجہ ان کے علم سے متاثر ہوئے جب حضرت خواجہ دوسری مرتبہ ہندوستان تشریف لائے تو شیخ تاج الدین سے دہلی میں ملاقات ہوئی آپ حضرت خواجہ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہوئے۔

(سنبھل سروے، رود کوثر)

شیخ تاج الدین حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ اول ہیں۔ آپ کے خلفاء میں خلیفہ اعظم حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں اور شیخ الہ داد، خواجہ محمد نور، اور مرزا حسام الدین احمد بھی مشہور خلفاء میں ہیں۔ شیخ تاج الدین سنبھلی اور حضرت مجدد الف ثانی سلسلہ نقشبندیہ کے اہم ستون ہیں۔ اور گویا دونوں باہم شیخ زادہ پیر بھائی ہیں۔ جب شیخ تاج الدین سنبھلی اپنے مرشد کے ایماء پر عرب تشریف لے گئے تھے۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے آخر تک خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ جب حجاز سے کچھ عرصہ بعد اپنے وطن سنبھل واپس آئے تو ایک محبت بھرا پُر خلوص مکتوب ارسال کیا۔ آپ نے قدم رنجہ فرمایا ہے جلد تشریف لائیں کیوں کہ مشتاق مدت سے منتظر ہے اور بیت اللہ کی خبریں سننے کی آرزو رکھتا ہے۔ شیخ تاج الدین طریقۂ نقشبندیہ لے کر حجاز پہونچے اور وہاں بڑی شدومد کے ساتھ اس سلسلہ کی اشاعت کی۔ البتہ ان کا طریقۂ نقشبندیہ باقویہ تھا۔ اس میں جمالی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔

محمد اکرم نے علامہ مرتضٰی زبیدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ زبیدیؒ نفحۃ القدوسیہ

میں لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین سنبھلی نے بصرہ، یمن، احسا، نجد اور حجاز میں طریقہ نقشبند کو پھیلایا اور ان علاقوں میں ان کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ انھوں نے عربی میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اور تراجم بھی کئے ہیں۔ اور اہل عرب کو سلسلہ نقشبندیہ سے روشناس کردیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی مشہور تصنیف الرسالہ فی سلوک خلاصۃ السادات النقشبندیہ ہے۔ جس کی علامہ عبدالغنی النابلوسی نے مفصل شرح مفتاح المعیت فی طریقۃ النقشبندیہ کے نام سے لکھی ہے۔ اور ایک عربی رسالہ پیری مریدی کے جواز میں منکرین کے جواب و قائل کرنے کے لئے لکھا۔ تصوف کی کئی مشہور کتب کا ترجمہ کیا۔ مثلاً جامی کی نفحات الانس اور ملا واعظ کاشفی کی اشمات کا عربی میں ترجمہ کیا۔ رام پور لائبریری میں عربی ترجمہ کا ایک نسخہ موجود ہے۔ (رود کوثر)

شیخ تاج الدین سنبھلی کو حجاز میں غیر معمولی مقبولیت و کامیابی ہوئی جس کا ایک سبب یہ تھا کہ شیخ محمد علان جو اعیان و اکابر حرم میں سے تھے۔ اور سلسلہ نقشبندیہ سے دلچسپی پہلے سے تھی۔ آپ کے حلقہ ارادت میں آئے۔ اور عرب میں آپ کو شیخ الشیخ اعلان سے یاد کیا جانے لگا۔ حجاز میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ہندوستان اپنے وطن سنبھل تشریف لائے پھر ہجرت فرما گئے۔ اپنی عمر کا طویل حصہ حجاز اور عربستان میں بڑی مقبولیت کے ساتھ گزارا۔ ایک مرتبہ بصرہ، وکوفہ تشریف لے گئے تو حاکم بصرہ آپ کے مخلصین میں داخل ہوا۔ آپ نے بیت اللہ شریف کے قرب میں زمین خریدی اور وہاں سکونت اختیار کی۔ ۹۹ رسال کی عمر میں ۱۰۵۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور مکہ معظمہ میں مدفون ہیں۔ (رود کوثر)

آپ کے حالات میں ایک مستقل عربی کتاب لکھی گئی۔ جو بانکے پور لائبریری میں بتائی جاتی ہے۔ شیخ تاج الدین سنبھلی کے اشغالِ نقشبندیہ کے متعلق ایک عربی رسالہ ہے جس کا فارسی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب نے کیا تھا۔ اور

خواجہ باقی باللہ کے بڑے مداح اوران کے خواص طریقے کے پیرو تھے۔اور نقشبندیہ کے دوسرے شعبوں پر فضیلت دیتے تھے۔شاہ ولی اللہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

مخفی نماند کہ حضرت ایشاں (عبدالرحیم) از شعبات طریقہ نقشبندیہ آنقدر شعبہ خواجہ محمد باقی باللہ راپسند کردند و میل نمودند مثل ایں میل دیگر شعب نبود۔ ہمیشہ ارشاد و تربیت الیشان بایں شعبہ بودہ است۔ شیخ تاج الدین سنبھلی کہ اول خلفائے حضرت خواجہ بودند در آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ ہمانجا مدفون شدند وایں فقیر از متاخراں مشائخ اہلِ ہند ہیچ کس راندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد او باشند کرامات وے روایت کنند در میان اشغال شعب ہا قویہ کہ ہماں طریقہ نقشبندیہ است بے افراط وتفریط رسالہ عربیہ دارند و حضرت ایشاں (والدمن) ترجمہ آں رسالہ فارسیہ نوشتند ملتقط از عباراتِ سلف این فقیر ایں ہر دو را بخدمت حضرت ایشاں گذراندہ والحمد اللہ۔

بعض مؤرخین نے اور سنبھل کے رسائل میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو شیخ تاج الدین سنبھلی سے شرف تلمذ حاصل ہے یہ تحقیق پر مبنی نہیں تاریخ اس کا انکار کرتی ہے۔ چونکہ شیخ تاج الدین ۱۵۵۲ میں مکۃ المکرمہ میں مقیم تھے وہیں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہیں۔آپ حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ اول اور حضرت مجدد الف ثانی کے شیخ زادہ پیر بھائی ہیں۔حضرت مجدد کا زمانہ سنہ ۱۵ء عہد اکبری ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کا زمانہ سنہ ہے۔جو عہد۔

صحیح یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں ملاقات نہیں نیز ہم نے شاہ ولی اللہ صاحب کی جو فارسی میں عبارت نقل کی ہے اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ملاقات نہیں ہے۔

میاں شیخ عزیز اللہ تلبنی بندگی

یہ وہ شخصیت ہیں کہ جنھوں نے لوگوں میں علم دین کی روح پھونکنے کیلئے کافی محنت وجانفشانی کی وہیں سنبھل کو ایوان علم کی ایسی بلندیوں سے روشناس کرایا کہ سنبھل

کو دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوا اس کے علاوہ مغل شہنشاہوں نے بھی عوام میں علمی بیداری پیدا کرنے کیلئے مدارس قائم کئے نیز عہد اکبری تو علم کا ایک روشن دور تھا۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جا ملتا ہے آپ کی نسل میں نواب عاشق حسینؒ تھے آپ شیخ فتح اللہ شیرازی کے ارشد تلمیذ ہیں۔ جلال الدین حضرت ابوایوبؓ کے خاندان کے وہ پہلے فرزند ہیں جو ہندوستان آئے اور قصبہ سرسی میں قیام پزیر ہوئے۔ آپ کی اولاد میں حضرت بدرالدین جو آپ سے اس طرح منسلک ہیں کہ مخدوم بدرالدین ابن مخدوم شرف الدین ابن خواجہ طفیل احمد ابن خواجہ کلاں ابن خواجہ داؤد ابن خواجہ حامد ابن مخدوم جلال الدین، مخدوم بدرالدین بزمانہ سلطان فیروز تغلق دہلی آئے اور نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت کی اور قطب کی لاٹ کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام منصور کا مدرسہ رکھا جو اب تک دہلی میں قائم ہے۔ مخدوم بدرالدین نے دہلی و میرٹھ کے درمیان قصبہ برناوا کو سکونت بنایا ۷۸۸ء میں وفات پائی ایک لڑکا نصیر الدین چھوڑا۔ انھوں نے بھی برناوا میں بود و باش اختیار کی اور ۸۴۹ء میں وفات پائی یہیں مدفون ہوئے آپ نے تین لڑکے چھوڑے (۱) مخدوم علاؤالدین (۲) ملا مسعود (۳) عزیز اللہ۔

سلطان علاؤالدین خلجی حضرت مخدوم علاؤالدین سے کمال عقیدت رکھتا اور آپ کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوا آپ کے خاندان کی سکونت موضع سہالی لکھنؤ سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر تھی اس خاندان میں علوم دینیہ کا چرچا رہا اور بڑے بڑے تبحر علماء پیدا ہوئے۔ علوم کی ترویج میں برابر مشغول رہے مخدوم علاؤالدین کے ایک بیٹے مولوی قطب الدین تھے اورنگ زیبؒ کے عہد میں انہیں بھیانک بے رحمی سے انہیں کے مکان میں قتل کر دیا جو جید تبحر عالم تھے چنانچہ اورنگ زیبؒ نے ۱۶۹۱ء میں اس حادثہ کی خبر پا کر اس کی تحقیقات کا حکم نافذ کیا اور ساتھ ساتھ مرحوم کے خاندان کے نام فرمان جاری کیا کہ ایک وسیع الگ تھلگ مکان بود و باش کیلئے دیا جائے چنانچہ آج

تک وہ مکان فرنگی محل کے نام سے موسوم ہے۔ قطب الدین کے ایک صاحبزادے نظام الدین تھے جنھوں نے درس نظامی کی تدوین کی جو آج ہندوستان وغیرہ کے تمام مکاتب ومدارس۔ دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد بطور نصاب جاری وساری ہے۔ شیخ بدر الدین کے دوسرے صاحبزادے ملا مسعود تھے جو پانی پت میں سکونت پذیر رہے۔ آپ کی اولاد میں مولانا الطاف حسین حالی تھے جن کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ رہتی دنیا تک لوگ ان کو شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی سے یاد کرتے رہیں گے۔ اور خاندان ابوایوبؓ کا نام روشن رہے گا۔

تیسرے بیٹے شیخ عزیز اللہ تلبنی ہیں آپ شیخ فتح اللہ شیرازی کے شاگرد ہیں اور آپ سکندر لودھی کے زمانہ میں سنبھل آئے چونکہ سلطان سکندر علم دوست شخص تھا علماء کی قدر کرتا، علماء کا ایک وفد ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا اور ان کے مشورہ سے کام کرتا، سلطان کو عزیز اللہ تلبنی سے کمال محبت وعقیدت تھی۔ شیخ کا جب درس ہوتا تو خود درس میں دوسرے طلبہ کی طرح دوزانو باادب بیٹھتا۔ سلطان نے سنبھل کو جب دار الخلافہ بنایا چار سال تک سنبھل حکومت کی اور صدارت کے لئے شیخ عزیز اللہ تلبنی کو منتخب کیا دیگر علماء جیسے مولوی صدر الدین قنوجی، میاں عبد الرحمٰن سیکروی وغیرہ ممبر کی حیثیت سے تھے گویا آپ قاضی القضاۃ تھے چونکہ سکندر ایک صحیح العقیدہ اور پختہ مسلمان تھا اس نے سنبھل آکر نیزہ کی ڈھال نصب کرنے اور محرم کا تعزیہ بنانے اور اٹھانے سے منع کیا اور عورتوں کو مزاروں وقبرستان جانے سے روکا۔

یونیورسٹی

سلطان سکندر لودھی نے سنبھل میں ایک دینی مدرسہ (یونیورسٹی) قائم کی بقول حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے اسکی جگہ بازار کلاں سبزی منڈی عاشق اسکول بلڈنگ کے قریب وہ عمارت تھی۔ جس میں عرب، ایشیاء، ایشیاء کوچک عرب کے علماء کو بلا کر معلم رکھا گیا۔ (محل وقوع ٹھیر کے بازار کے قریب تھا) اس

یونیورسٹی کے پرنسپل میاں شاہ عزیز اللہ تلبنی تھے اس یونیورسٹی سے بے شمار علماء نے اکتساب علم کیا اس وقت سے ایک مدت تک سنبھل علم کا مرکز رہا اسکا فیض بر و بحر سے متجاوز ہو کر عرب پہنچا اس وقت کے مستفید ہونے والوں میں شاہ حاتم حلیم اسرائیلی اور شیخ عبداللہ عرف پنجو قابل ذکر ہیں۔

میاں عزیز اللہ تلبنی کا تذکرہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ اور متعدد مورخین نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ میں ان کے تفصیلی حالات میں قلم کو حرکت نہیں دیتا مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آپ ایک بالغ النظر، تبحر، غیر معمولی قابلیت وصلاحیت کے مالک تھے اور اپنی دماغی قوت اور پر خلوص علمی خدمات سے ادبی علمی محفلوں کو روشنی و تابانی بخشی اور علمی محفلوں اور حلقوں میں تہلکا مچا رکھا تھا، آپ روحانیت کا ایک ستون تھے اس کی روشن دلیل آپ سے فیض یافتہ شیخ عبداللہ عرف پنجو اور شیخ حاتم اسرائیلی شیخ عثمان بنگالی جیسے حضرات ہیں اور آپ کی اولاد میں علماء، فضلا، اتقیاء، دانشور، کاملین، بلند پایہ بزرگ، ممتاز شخصیتیں، نامور اہل علم، معلمین، حکما، افسران اور گورنر پیدا ہوئے۔

شاہ کابل

شاہ عزیز اللہ تلبنی سے شاہ کابل کو عقیدت تھی اس نے شاہ صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا جب شاہ صاحب مہمان ہوئے تو شاہانہ طور پر استقبال کیا اور بڑی قدر و منزلت کی شاہ کا استقبال دیکھ کر وزیر کے دل میں حسد کی آگ موجزن ہوئی۔ وزیر نے شاہ صاحب کی خدمت میں کسی درباری ملازم کے ذریعہ کہلوایا کہ بادشاہ معلوم کرتے ہیں کہ اگر کنیز وغیرہ کی ضرورت ہو تو پیش کی جائے۔ شاہ صاحب یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ مہمان کے ساتھ اس طرح کی گستاخی مناسب نہیں فوراً چلدیئے اور معتمد علیہ سے کہدیا کہ چونکہ شاہ نے ایسی بات کہی جس سے تکلیف ہوئی ہم جا رہے ہیں۔ شاہ کو شیخ کی خبر ملی فوراً تعاقب کیا۔ کچھ فاصلہ پر شیخ کو پالیا اور عرض کیا میں نے آپ کی خدمت میں ایسی بات

نہیں کھلوائی۔اس پر شیخ نے فرمایا کہ وزیر کی حرکت ہوگی وزیر نے جھوٹی معذرت کی شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے لکھا ہے کہ واپسی میں وزیر کا گھوڑا بدکا اور وزیر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

جب ہمایوں بیمار ہوا۔تو بابر نے سنبھل کے علماء سے دعا کرائی جس میں میاں شاہ عزیز اللہ اور شیخ حاتم اور شیخ عبداللہ پنجو شریک تھے۔

نواب امین الدین خاں

جن کو نواب امین الدولہ انتصار الملک، شجاعت جنگ کا خطاب ملا تھا اور ہفت ہزاری منصب حاصل تھا آپ نے راجہ مانگ رائے سے چارج لیا سرکار سنبھل کے گورنر تھے جنھوں نے ایک قلعہ تعمیر کرایا جو آج شکستہ حالت میں ہے اور قلعہ کے جنوبی دروازہ کے سامنے ایک بازار قائم کیا جس کا نام کٹرہ بازار رکھا اور اسی بازار میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اس کے امام مولوی ثناء اللہ سنبھلی خلیفہ مرزا مظہر جان جاناں کو مقرر کیا اور ان کا مزار بھی اسی مسجد میں ہے اور قلعہ کے غربی جانب میں ایک نہر دریائے سوت سے نکالی جو بھدیسرہ سے ملا دی اور ایک محلّہ نواب پورہ آباد کیا جس میں آج مختلف قومیں آباد ہیں ۱۷۴۶ء مطابق ۱۱۵۸ھ میں شاہ محمد سنبھل آیا اور نواب امین الدولہ کا مہمان ہوا۔گزٹ میں ہے کہ جس چبوترہ پر محمد شاہ رونق افروز ہوا وہ دیوان خاں کلاں میں ہے جو نواب محمود کے تصرف میں ہے وہ چبوترہ لکھی چبوترہ سے مشہور ہے چونکہ بادشاہ کی آمد پر ایک لاکھ روپیہ کی مسند تیار کی گئی تھی اس پر بادشاہ رونق افروز ہوا جب بادشاہ نے اپنا اگلا سفر جاری کیا تو وہ تمام رقم خیرات کر دی گئی۔

شاہ موصوف کے آنے کا سبب یہ تھا کہ آپ کے وزیر قمر الدین نے نواب علی محمد خاں سے اتنا برگشتہ کر دیا تھا کہ اس نے سرکوبی کے ارادہ سے سفر کیا چونکہ نواب امین الدین سنبھل کے گورنر تھے اور سات ہزاری منصب حاصل تھا انھوں نے سنبھل سے کچھ فوج اپنے ہمراہ لی۔

نواب کی شادی

نواب امین الدولہ کی شادی دیوان اورنگ کی صاحبزادی (فیض بی بی) سے ہوئی ان کے بطن سے نواب امین الدین خورد اور ایک صاحبزادی (لطیف بی بی) پیدا ہوئیں۔

ولایت حسین خاں

نواب موصوف کی اولاد میں نواب ولایت حسین خاں تھے جو آنریری مجسٹریٹ اور ممبر چنگی کے عہدہ پر فائز تھے۔

نواب عاشق حسین صاحب

ولایت حسین خاں کی وفات ۱۸۹۴ء میں ہوئی انہوں نے ایک لڑکا چھوڑا جن کو نواب عاشق حسین کے نام سے یاد کرتے ہیں آپ کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں ہوئی آپ سنبھل کے معزز گرانقدر لوگوں میں ہیں دنیوی وجاہت کے ساتھ خدا ترسی اور خدمتِ خلق خاص آپ کی شان تھی سرزمین سنبھل گویا آپ کی مرہون منت ہے آپ نے متعدد کنویں و مساجد مہمان خانے اور بازار لگوائے قومی ملی خدمات انجام دیں۔ صحیح العقیدہ عابد صوم صلوٰۃ کے پابند تھے۔

علماء بزرگانِ دین سے خاص تعلق رکھتے ،ابتدائی عمر میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند اور قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ ،مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی حضرت مولانا محمود حسن صاحب حضرت تھانویؒ وغیرہ حضرات سے والہانہ عقیدت رکھتے اور اکابرین کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔

آپ مجسٹریٹ اول رہے۔ لائف مجسٹریٹ رہے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۲ء تک تازندگی چیرمین رہے ۱۹۴۷ء میں حکومت برطانیہ نے نواب امین الدولہ سرکار سنبھل کا جانشین تسلیم کرکے نواب کا خطاب دیا پندرہ ہزار مال گزاری ادا کرتے اور کافی جائداد معافی لاخراج بھی

تھی اس کے علاوہ کثیر جائداد کے مالک بھی تھے آپ کا زمانہ دور شاہجہاں کہلاتا تھا متفقہ طور سے آپ ہندو مسلم نمائندے تھے کلکٹر، کمشنر، گورنر، آپ سے ملاقات کو آتے آپ ان سے بے تکلفی سے بات فرماتے آپ خود بھی باشرع تھے آپ کی اولاد میں باشرع فضلا، دار العلوم وحفاظ ہوئے جیسے۔نواب ساجد حسین خاں، نواب راشد حسین خاں۔

آپ کی سادگی

آپ موسم سرما میں سنبھل کے بنے ہوئے گاڑے کی قمیص و پاجامہ زیب تن فرماتے جب کسی مٹنگ یا نوابین کے دربار میں رونق افروز ہوتے تب بھی وہی لباس زیب تن رہتا۔

مدرسۃ الشرع

آپ ہی کی کوشش سے قائم ہوا سنبھل کو علمی مرکزیت اور معراج ارتقاء حاصل ہوئی آپ کے زیر اہتمام بڑے بڑے دور دراز سے علماء آئے معلّمی کے فرائض انجام دیئے۔ ابوداؤد کی ایک عربی شرح انوار المحمود بھی یہاں لکھی گئی، اس کے فیض یافتہ طلبہ بھی یہاں اپنے وقت کے جید عالم بنے۔

مولوی محبّ اللہ مکی

حرم شریف میں مولانا محبّ اللہ صاحب قیام فرماتے تھے ہمارے اکابرین کو ان سے عقیدت تھی اور برابر ربط رہا نواب عاشق حسین صاحب آں موصوف کی خدمت میں بطور ہدیہ کچھ رقم منی آرڈر کیا کرتے موصوف طبیعت کے بہت نازک وحساس تھے موصوف کی عادت تھی کہ جب کوئی منی آرڈر خدمت میں آتا اول اس کو سونگھتے پھر قبول فرماتے ایک بار نواب موصوف کا منی آرڈر پہنچا تو عادت کے مطابق سونگھ کر فرمایا کہ اس کو واپس کردو چنانچہ واپس کردیا گیا اس مجلس میں قاری عبدالحق صاحب سنبھلی بھی موجود تھے حاضرین مجلس کو تعجب ہوا چند دن بعد نواب صاحب کا دوسرا منی آرڈر جاتا ہے اور پشت

پر لکھا ہوا ہے پہلے منی آرڈر کی رقم دوسری مد کی تھی غلطی سے روانہ کر دی گئی معذرت خواہ ہوں۔ مولانا موصوف نے دوسرے منی آرڈر کو سونگھ کر قبول کر لیا۔

شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کو انگریز نے قید کر رکھا تھا جب شیخ الہندؒ جیل کی قید و بند سے رہا ہو کر باہر آئے تو سب سے پہلے جناب نواب عاشق حسین صاحب کے مہمان ہوئے۔

شجرہ

چونکہ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے آپ انصاری لکھتے تھے ان کے بزرگ شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری ہراتی ہیں وہیں سے ان کی نسل ہندوستان میں آئی اور تلبنہ ہوتے ہوئے دہلی پھر آخر میں سنبھل میں میاں عزیز اللہ تلبنی مقیم ہوئے جن کا ذکر اوپر آچکا۔

شیخ عبدالحلیم سنبھلی

آپ کا نام عبدالحلیم بن حاتم سنبھلی، آپ حنفی المسلک تھے، آپ کا شمار بڑے علما میں ہے، شہر سنبھل ہی میں آپ کی پیدائش ہے۔ آپ بڑے پایہ کے محقق فاضل تھے، ابتدا سے اپنے والد شیخ حاتم سنبھلی کی آغوش تربیت میں رہے اور تمام علوم کی تکمیل بھی انہیں سے کی قاعدہ سے آپ کو علوم ظاہری پر دستگاہ حاصل تھی۔ اور اصلاح ظاہری و قناعت و توکل میں والد کے نقشِ قدم پر تھے۔ شیخ حاتم کے انتقال کے بعد عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔ اہل سنبھل مستفیض ہوئے ۹۸۹ھ میں وفات ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر)

شیخ عبدالغنی سنبھلی

مولانا کی پیدائش سنبھل ہی کی ہے۔آپ نے علی شاہ احمد الشرعی چندیروی کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم میں مشغول ہو کر تکمیل کی اور انہیں کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوئے۔علم تکسیر میں آپ یکتائے زمانہ و ید طولیٰ رکھتے تھے۔اس وقت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔مولانا عبدالحیؒ صاحب ،نزہۃ الخواطر میں بحوالہ البحر الزخائر لکھتے ہیں کہ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔شیخ عبدالغنی کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہو سکی۔

شیخ محمد حسن سنبھلی

آپ کا نام محمد حسن بن ظہور حسن بن شمس علی اسرائیلی سنبھلی۔آپ کی جائے پیدائش و تربیت گاہ سنبھل ہے۔ابتدائی تعلیم سنبھل میں بعض علماء سے حاصل کی۔پھر رام پور پہونچ کر مولانا سعید الدین دہلوی اور ان کے علاوہ دوسرے علماء سے درسی کتابیں پڑھیں۔تکمیل کے بعد کسی مدرسہ میں استاذ مقرر رہوئے۔صاحب نزہۃ الخواطر حضرت مولانا عبدالحیؒ رقمطراز ہیں کہ لکھنؤ میں میری ملاقات مولانا محمد حسن سنبھلی سے ہوئی تھی۔وہ غضب کے ذکی و قوت حافظہ رکھتے تھے۔اور دور اندیش تھے۔حلیم الطبع ،بڑے پایہ کے محقق و فاضل تھے۔

قدرت نے انھیں غیر معمولی قوت و صلاحیت و زور قلم عطا کیا تھا۔طرز تحریر عمدہ انداز بیان دلچسپ و موثر تھا علوم ظاہری میں دسترس حاصل تھی۔اپنی ذہانت و قابلیت اور علمی خدمات سے روشنی و تابانی بخشی۔اور جو شخص اماموں کی تقلید کا قائل نہیں ہوتا اس سے سخت تعصب رکھتے۔مولانا عبدالحیؒ لکھتے ہیں کہ مجھے آپ کی تصانیف میں جن کتابوں کا علم ہے۔وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) ایساغوجی کی شرح ہے۔جو آپ کی ایک دن کی تصنیف ہے۔

(۲) شرح میزان المنطق ہے اس کا دوسرا نام منطق الجدید ہے، اس شرح میں صغری کبریٰ کو ترتیب دے کر حد اوسط کو حذف کر کے نتائج کا بہت سہل طریقہ بیان کیا ہے۔

(۳) القول الوسیط ہے۔

(۴) سوانح الزمن۔ شرح سلم العلوم مولانا حسن،

(۵) نظم الفرائد شرح شرح العقائد

(۶) شرح اصول الشاشی

(۷) ہدایہ پر تعلیقات بسیطہ ہیں۔

(۸) تنسیق النظام شرح لمسند الامامؒ

(۹) مسند امام ابوحنیفہؒ پر حاشیہ بسیطہ ہے۔

مذکورہ تمام کتابیں طبع ہو کر ہندوستان میں شائع ہوئیں۔ اور جو کتابیں طبع نہیں ہو سکیں۔ صرح الحمایۃ علی شرح الوقایہ۔ آپ کی تصانیف میں یہ عمدہ تصنیف ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ تصانیف کثیرہ ہیں۔ صر الحمایۃ کے مقدمہ میں خود لکھتے ہیں کہ ۱۰۰ ار تصنیفات ہیں ان میں سے ایک کتاب مابین المجمل والمفصل والصغیر والکبیر ہے۔ یوم چہار شنبہ ۱۳ ار صفر ۱۳۰۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ سرزمین سنبھل میں آرام کی نیند سو رہے ہیں۔

شیخ قدرۃ اللہ سنبھلی

شیخ کا نام قدرۃ اللہ بن قبول محمد سنبھلی۔ آپ شیخ کرم اللہ شہید کی نسل میں سے ہیں، آپ نے درسی کتابیں حضرت مولانا غلام طیب بہاری سے پڑھیں اور مدت تک استاذ کی خدمت میں رہے۔ پھر شیخ قیام الدین چاندپوری سے علم الشعر سیکھا۔ شیخ قیام الدین کی ان پر کامل توجہ رہی جس کے نتیجہ میں آپ کا شمار بڑے شعراء میں ہوا آپ قابل مصنف بھی تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے ہندی اشعار کا ایک دیوان ہے۔ اور

اہل ہند کے شعرا کے ذکر میں ایک کتاب ہے۔ آپ جید عالم ہی نہ تھے بلکہ قابل مصنف اور شعر گوئی میں عبور رکھتے تھے۔ سنبھل کے اندر ۱۲۴۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر)

مولانا قطب الدین سنبھلی

آپ کا نام قطب الدین بن غلام فرید سنبھلی۔ آپ کی پیدائش سنبھل ہے۔ اپنے والد محترم کی آغوش میں رہ کر تربیت پائی اور علم حاصل کیا۔ اور آپ جید عالم، بہت سے علوم وفنون میں دستگاہ رکھتے تھے۔ اپنے ہم عصر علماء میں فوقیت رکھتے تھے۔ آپ کے بہت سے شاگرد ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر مولانا محمد بن داؤد سنبھلی ہیں۔ (نزہۃ الخواطر)

شیخ محبوب علی سنبھلی

آپ کا نام محبوب علی ہے حنفی المسلک تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں لکھنؤ گئے اور مدرسۃ الشیخ پیر محمد لکھنؤ میں کچھ ایام قیام فرمایا آپ نے ایک کتاب (ہدایۃ الجمعۃ) کے نام سے تصنیف فرمائی اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ قائم کرنا جائز نہیں۔ و نکرہ فی ثلاثۃ مقامات کراھۃ تحریمۃ۔ ایک شہر میں تین جگہ جمعہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ مولانا لطف اللہ لکھنوی نے اپنی کتاب صولۃ الاسد علی اعداد التعدد میں مذکورہ مسئلہ کی تردید کی ہے۔ مولانا محبوب علی نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت محدث شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ دہلوی سے آیت کریمہ وما اہل لغیر اللہ کی تفسیر میں تسامح (غلطی) واقع ہوئی ہے۔ نیز حضرت مولانا اسمٰعیل شہید بن شاہ عبدالغنی دہلوی کی کتاب (تقویت الایمان) کو تفریۃ الایمان لکھا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی تاویلیں کی ہیں۔ موصوف کے قلم کو لغزش ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر)

مولانا خلیل احمد سنبھلی

آپ کا نام خلیل احمد بن سراج احمد الاسرائیلی سنبھلی ہے آپ حنفی تھے۔ ہندوستان

کے بڑے علماء میں آپ کا شمار تھا۔ آپ نے مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور دوسرے علماء سے پڑھا۔ تکمیل کے بعد علیگڈھ مدرسۃ العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی۔ نہایت پاکیزہ طبیعت، حسنِ اخلاق کے پیکر تھے۔ ہمیشہ قناعت کے ساتھ درس وتدریسِ خدمت میں مشغول رہے۔ آپ کی ایک تصنیف آیات اللہ الکاملۃ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ ہے آپ کی وفات ۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۰ھ میں ہے۔

(نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۳۳)

شیخ عبداللہ سنبھلی عرف پنجو

آپ کا نام شیخ کبیر عبداللہ بن عثمان بن عطاء اللہ المودودی الامروہی ثم السنبھلی آپ کا لقب شمس الدین کمال الدین تھا۔ اور آپ شیخ پنجو کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں اسی نام ولقب سے ذکر کیا ہے۔

"شیخ پنجو سے مشہور ہونے کیوجہ"

یہ بیان کیا ہے کہ ان کے والد محترم کا انتقال ان کے دادا کی حیات میں ہی ہو گیا تھا اور وہ بچے تھے تو عطاء اللہ نے (ان کے انتقال کے بعد) اپنے پوتے (شیخ عبداللہ) کو اپنی تربیت میں لے لیا اور ان کے والد مرحوم کے قائم مقام کر دیا۔ چونکہ عطاء اللہ کے پانچ لڑکے تھے۔ انہوں نے اپنے مال وجائیداد کا پانچواں حصہ ان کو دیدیا۔ تو وہ اس وجہ سے شیخ پنجو کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کیوں کہ فارسی میں پنج کے معنی پانچ کے ہیں اور پنجو میں واؤ نسبتی ہے۔ آپ کی پیدائش ۸۶۶ھ شہر امروہہ میں ہوئی اور علم وعمل کے گہوارے میں تربیت ہوئی۔ جب ان کے دادا کا انتقال ہو گیا تو سنبھل چلے آئے۔ اور شیخ علامہ عزیز اللہ تلبنی کی خدمت میں ایک مدت رہ کر علم حاصل کیا پھر دہلی چلے گئے دہلی میں شیخ علاؤ الدین چشتی دہلوی کی ایک زمانہ تک صحبت میں رہ کر سلوک کا راستہ طے کیا پھر امروہہ واپس ہوئے تھوڑی ہی مدت میں امروہہ سے ہجرت کی اور تن تنہا لوگوں

سے دور رہ کر جنگل میں رہے اس صحرائی زندگی میں دس سال گزار دیئے پھر سنبھل میں اقامت پزیر ہوئے آپ کو ابتدائی حالت میں وجد سمع کا شوق تھا پھر کیفیت بدل گئی۔

(نزہۃ الخواطر ج ۴)

آپ کے نام پر آج تک ایک محلہ پنجو سرائے کے نام سے آباد ہے اور مسجد بھی آپ کے نام سے مسجد پنجو سرائے موسوم ہے سنبھل کا تبلیغی مرکز اسی مسجد میں ہے۔ آپ کی وفات ۹۶۹ھ میں ہے مسجد کے صحن سے متصل ایک مقبرہ سنگ سیاہ کا تعمیر شدہ ہے اسی میں آپ محوِ استراحت ہیں۔ اس کا ایک دروازہ صحن مسجد کی طرف جانب غربی میں ہے۔

"السید محمد بن منتخب الامروہی"

آپ کا نام محمد بن منتخب بن کبیر چاند بن منتخب الصبتن الامروہی آپ بڑے عالم تھے اور میرِ عدل سے مشہور تھے آپ سید شریف الدین چشتی نقوی کی نسل سے تھے۔ آپ کی پیدائش و پرورش امروہہ ہوئی۔ علم حاصل کرنے کی غرض سے سنبھل آئے۔ شیخ حاتم بن ابی حاتم سنبھلی سے علم حاصل کرنے میں مشغول ہوئے ایک مدت تک آپ کی خدمت میں رہ کر کتب درسیہ پڑھیں، اور حدیث شریف دوسرے علوم سید جلال الدین بدایونی سے حاصل کیے ان کی خدمت میں رہ کر علم میں کمال حاصل کیا فتویٰ و تدریس کی صلاحیت پیدا ہوگئی تو اکبر شاہ تیموری ہندوستان کے بادشاہ نے (دارالعدل) کی امارۃ کا ولی مقرر کیا اور (ایک طویل مدت تک اس خدمت کو انجام دیا)

"شیخ مجود محمد بن الحسین سنبھلی"

اپنے زمانے کے مشہور قاری تھے۔ آپ سات قرائتوں میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے آپ کے شاگردوں میں عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی ہے آپ کی وفات ۹۵۹ھ میں سنبھل میں ہوئی۔ آپ کی تاریخ میں ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۴)

خاندان اسرائیلی کی ہندوستان آمد بعدہ سنبھل آمد

مصنف تاریخ اسرائیل موسوم بہ جواہر اسرائیلی رقمطراز ہیں کہ: حافظ محمد عجائب ابن ہلالی القان خواجہ اسحاق مرید شاہ ابراہیم شامی خلف فرید ولد رکن الدین ولد شیخ مبارک ولد معروف ولد شیخ نقی ولد شیخ تقی اسرائیلی تھے۔ آپ کے دادا خواجہ اسحاقؒ شہر کنعان سے ہندوستان تشریف لائے۔ اور لاہور کے قریب کوٹ قبول میں قیام پذیر ہوئے۔

یہاں ایک عرصہ دراز تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھ کر لوگوں کو علمی فیض پہنچاتے رہے۔ پھر وہ اپنے دونوں صاحب زادے شیخ عجائب و شیخ محمد عمر اور اپنے اعزاء واحباب کے ملازمت کی غرض سے دہلی پہنچ کر سکندر لودھی کے دربار میں حاضر ہوئے۔

سکندر کے وزیر مولانا کالو

سلطان سکندر لودھی کے وزیر مولانا کالو نے ان آنے والے حضرات کے حالات کی تحقیق وتفتیش کی۔ جس سے واضح ہوا کہ یہ سب آنے والے بنی اسرائیلی ہیں۔

شیخ عجائب سنبھلی کا عقد نکاح

سلطان سکندر کے وزیر کالو نے جب ان حضرات کی علمی صلاحیت زہد وتقدس اور حسب ونسب سے خوش ہو کر شیخ عجائب کا نکاح اپنی لڑکی سے کر دیا اور عہدہ کرداری (یعنی عامل) پر جو اس وقت منصب ہفت صدری کہلاتا تھا مقرر کیا۔ نیز دیگر اعزہ کو بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔

شیخ عجائب

مصنف جواہر اسرائیلی لکھتے ہیں کہ شیخ محمد عجائب مجذوب شخص تھے ایک دن حالت جذب طاری تھی اسی حالت میں برہنہ سر و پا باہر تشریف لائے۔

پنجہ وعشقت لباس پارسائی پارہ شد
طاعت صد سالہ ام تاراج یک نظارہ شد

اس وقت دہلی میں شیخ سماء الدین کمبوہ دہلوی ابن مولانا شیخ فخر الدین بڑے پائے کے بزرگ تھے جو رشد وہدایت واصلاح باطن میں شہرت یافتہ تھے۔

شیخ عجائب کی شیخ سماء الدین کی مجلس میں حاضری

شیخ سماء الدین اپنے مریدین کو تعلیم فرمارہے تھے اور ساتھ ہی ہر ایک مرید کو چار چار خرما عطا کر رہے تھے شیخ عجائب بھی اس مجلس میں آپہنچے۔ شیخ سماء الدینؒ کی ان پر نظر پڑی۔ اور بنظر عنایت دیکھا۔ شیخ عجائب کو چار خرما عنایت فرمائیں آپ نے وہ خرما گٹھلی سمیت کھالیں۔ نیز چار خرما اور عطا کیں وہ بھی گٹھلی سمیت کھا گئے کئی بار چار چار خرما عنایت کیں گٹھلی سمیت کھاتے رہے اس پر شیخ نے فرمایا شاید تم بھوکے ہو؟ آپ کیلئے کھانا منگوایا جائے۔ شیخ عجائب نے عرض کیا کہ بھوکا نہیں ہوں۔ چونکہ یہ خرما آپ کے برکات میں سے ہیں مجھے یہ زیبا نہیں کہ گٹھلی زمین پر ڈالوں۔

شیخ عجائب شیخ سماء الدین کے حلقہ مریدین میں داخل ہوئے

شیخ عجائب کو پہلی بار ملاقات میں شیخ سماء الدین سے عقیدت ہوئی اور اظہار بھی ہوا شیخ سماء الدین نے ان کو اپنی گود میں لے لیا اور اپنے حلقہ مریدین میں داخل کرلیا اور فیض باطنی سے شرف یابی بخشی۔ شیخ عجائب نے اپنے پیرومرشد کی خدمت میں رہ کر ریاضت ومجاہدے کئے۔

شیخ عجائب کی خدمت گزاری

منقول ہے کہ شیخ سماء الدین نے عید کے دن فرمایا کہ عید کا دوگانہ ادا کرنے کیلئے جانا ہے۔ پالکی لیجانے کے لئے کہاروں کو بلوانے کا اظہار کیا چونکہ عید کا دن تھا کہار بھی

عید کی تیاری میں مشغول تھے۔ کہار نہیں مل سکے تو شیخ عجائب اور جمال خان المخاطب شیخ جمال دونوں مریدین پالکی کو اپنے کاندھوں پر عیدگاہ لے گئے۔ شیخ سماء الدین کو اس کا علم تک نہیں ہوسکا۔ واپسی پر شیخ نے کہاروں کے متعلق استفسار کیا کہ کون ہیں؟ تب شیخ عجائب نے عرض کیا کہ کہار تو نہیں مل سکے تھے۔ ہم دونوں خادم ہیں۔

شیخ سماء الدینؒ کا شجرہ

شیخ سماء الدین کو فیض باطن حاصل ہے اپنے مرشد اور اپنے والد سید صدر الدین عرف راجو فتال سے اور سید راجو فتال کو اپنے والد سید احمد کبیر سے اور ان کو اپنے بھائی سید جلال الدین مخدوم جہاں نما سے اور مخدوم جہاں نما کو شیخ رکن الملۃ والدین ابو الفتح سے اور ان کو اپنے والد شیخ صدر الملۃ والدین عارف سے اور ان کو اپنے والد شیخ الاسلام مخدوم بہاء الدین ذکریا سہروردی ملتانی سے فیض وخلافت حاصل ہے۔

الشیخ عجائب السنبھلی

شیخ عجائب بن اسحاق اسرائیلی سنبھلی اہل طریقت میں آپ کا شمار تھا شیخ سماء الدین دہلوی سے علم طریقت حاصل کیا اور ایک طویل مدت تک آپ کی خدمت میں رہے جب شیخ سماء الدین دہلوی کا انتقال ہوگیا تو آپ نے دہلی سے کوچ کر کے سنبھل سکونت اختیار کی۔

نزہۃ الخواطر ج۴ ص ۲۲۴ میں ہے کہ آپ جید عالم تھے اور شاعر تھے۔ شعر گوئی میں آپ کا لقب ہلالی تھا آپ کی وفات ۹۳۰ھ میں سنبھل ہوئی۔

شیخ حافظ محمد عجائب کو خلافت اور سنبھل آمد

شیخ سماء الدین نے حافظ شیخ عجائب کو خلافت عطا فرما کر رشد وہدایت کے

لئے سنبھل بھیجا آپ سنبھل میں اصلاح باطنی، رشد وہدایت کے ذریعہ لوگوں کو ایک مدت تک فیض پہنچاتے رہے۔

شیخ عجائب کی وفات

۹۳۰ھ میں سنبھل انتقال ہوا۔ مزار شریف سنبھل میں ہے آپ کی تاریخ وفات شیخ ہادی ہے، آپ نے چار صاحبزادے چھوڑے۔ شیخ محمد امجد، خواجہ شیخ احمد، شیخ محمود، شیخ حامد۔ دو بھائی شیخ محمود و شیخ حامد کی اولاد سنبھل میں ہے۔

شیخ حامد کی اولاد میں شمس العلماء مولانا خلیل احمد پروفیسر مدرسۃ العلوم یونیورسٹی علی گڈھ ابن مولانا سراج احمد محدث، ولد شیخ غلام رسول شہید سنبھلی ہیں۔ اور محمد امجد بن شیخ محمد عجائب سنبھلی فاضل ورئیس سنبھل تھے۔

خاندان بنی اسرائیل

سنبھل میں جہاں خاندان انصاریان وخاندان نوابین وغیرہ کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے وہاں خاندان بنی اسرائیل بھی قابل ذکر ہے۔ اس خاندان کے چشم وچراغ آج بھی درخشاں ہیں۔ سنبھل کی مذہبی تاریخ میں سب سے اہم اور دلچسپ باب اس خاندان کی ہستیوں کا تذکرہ ہے۔ سلاطین اسلام کی آمد سے اس خاندان نے آج تک ہر دور میں علمی وادبی واصلاحی غیر معمولی خدمات سے روشنی وتابانی بخشی یہ خاندان اپنی عظمت وشرافت اور تبحر علمی میں خود اپنی مثال رہا ہے۔ علماء وصلحاء، مصنفین واعظین، مصلحین، شعراء، اور بڑے بڑے مشائخ پیدا ہوئے ہیں۔ کسی کو ملک الصلحاء اور کسی کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ خاندان بنی اسرائیل کو تاریخ سنبھل میں خاص اہمیت وفوقیت حاصل ہے۔ اور اس خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ اسرائیلی لکھتے ہیں اور لفظ اسرائیلی سے ہی یہ خاندان متعارف ہے۔ اور اس کا سلسلہ نسب ایک جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ ابن سلام

رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے سے قبل یہودی بڑے عالم تھے۔اور نسباً حضرت بنیامین بن حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔اس خاندان کے حضرات کے تفصیلی تذکرے سے یہ (کتاب تاریخ سنبھل) مزین ہےاور دوسری کتابوں میں بھی ان کے تذکرے وسوانح ملتی ہے۔

ہندوستان کے بہت سے شہروں میں خاندان بنی اسرائیل باہر سے آ کر آباد ہوئے اور عظیم الشان دینی اور علمی خدمات انجام دیں۔اس خاندان کے افراد بھی دہلی، میرٹھ، ہوتے ہوئی سنبھل آ کر آباد ہوئے۔اسکے تذکرے عربی کی قدیم و بڑی کتابوں میں ملتے ہیں خاص کر نزہۃ الخواطر علماء بنی اسرائیل کے تذکرہ سے مزین ہے۔نیز عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ میں مرقوم ہے ومن كتب الغير المعتبرة فتاوى ابراهيم شاهى من مولفات القاضى شهاب الدين الدولة آبادى كمانقله عبدالقادر البدايونى فى منتخب التواريخ عن استاذه العلامة اجل العلماء العهدالاكبر الشيخ حاتم السنبهل المتوفىٰ سنة ثمان وستين بعدتسع مائة (مقدمہ عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایۃ ص ۱۱)

کتب معتبرہ اور جن کتب کی تکمیل نہیں ہوئی ان کی تکمیل وشرح میں مصنفین مشغول ہیں ان کا ذکر ہے۔

ومنهم المولوى محمد حسن بن ظهورحسن بن شمس على من نسل عبدالله بن سلام الصحابى من اهل سنبهل بلدة من اضلاع مرادآباد

تلميذ خاص له المفتى عبدالسلام السنبهلى (ص ۲۹)

مولانا محمد حسن بن ظہور حسن خاندان بنی اسرائیل کے ایک چشم وچراغ تھے۔ ہر موضوع پر آپ نے کتاب تصنیف کیں ہیں آپ کی تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے۔جہاں اس خاندان میں تصانیفی خدمات نمایاں ہیں وہاں بڑے بڑے متقی پیدا ہوئے اور اچھے

ہوئے مسائل کا حل بیان کیا۔اسی خاندان سے جریدہ واخبار بھی شائع ہوئے ہیں جیسے شہاب ہفتہ روزہ ایک عظیم رسالہ شائع ہوتا تھا جیسا کہ اس کتاب میں اس کا بیان ہے۔

حضرت شاہ محمد ہلالی اسرائیلی

سنبھل میں جہاں باون سرائے ہیں ان میں ایک محلّہ ہلالی سرائے بھی ہے اور تمام تر سراؤں کے نام کسی بزرگ کے نام پر ہیں جیسے فتح اللہ سرائے شاہ فتح اللہ شیرازیؒ اور رکن الدین سرائے شاہ رکن الدینؒ کے نام سے موسوم ہے ایسے ہی ہلالی سرائے حضرت شاہ محمد ہلالی اسرائیلیؒ کے نام سے موسوم ہے آپ ہی نے اس محلّہ کو آباد کیا۔آپ خاندان بنی اسرائیل کے جد اعلیٰ۔ ملک العلماء شاہ حاتمؒ جن کو اپنے وقت کا ابوحنیفہ کہا گیا ہے۔ آپ کے بھتیجے ہیں۔شاہ محمد ہلالی کئی بھائی تھے ہر ایک بھائی کے نام پر ایک محلّہ آباد ہے۔ آپ کا سنبھل کے متقدمین میں شمار ہے آپ بڑے صاحب علم و فضل گزرے ہیں وہ اپنے ہم درسوں،اور ہم چشموں میں نمایاں اور ممتاز تھے۔علمی وفضائل کمال کے ساتھ متقی۔مکارم اخلاق کے مجسم پیکر تھی۔آپ کا مزار آپ ہی کی آباد کردہ بستی محلّہ ہلالی سرائے میں ہے۔

محمد شاہ فتح اللہ شیرازیؒ

آپ کا وطن شیراز ہے۔مغلیہ حکومت کے بانی بابر ظہیر الدین کے عہد میں جب کہ ہمایوں سنبھل کا حاکم تھا اس وقت سنبھل آمد ہوئی اور آپ کے نام پر ایک محلّہ کا فتح اللہ سرائے نام رکھا گیا۔ان کی طبیعت میں زہد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔نہایت متقی تھے آپ نے اصلاحی کاموں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔اسی محلّہ میں محو استراحت ہیں وفات ۹۹۷ھ ہے۔

شیخ محمد کبیر کلہ رواں فریدی شاہ ولایت

شیخ محمد کبیر جن کے نام پر کبیر سرائے موسوم ہے آپ نے اپنی ذہانت قابلیت،

صلاحیت سے غیر معمولی علمی واصلاحی خدمات سے روشنی وتابانی بخشی ہے۔آپ بھی ظہیر الدین بابر کے عہد میں سنبھل آئے اور کبیر سرائے آباد کی۔شیخ محمد کبیر بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے نبیرہ ہیں اور آپ اپنے آباد کردہ سرائے میں محو استراحت ہیں۔

شاہ علی متقی اسرائیلیؒ

آپ خاندان بنی اسرائیل میں ولی اللہ شمار کئے جاتے ہیں اور صاحب کشف کرامت ولی تھے۔آپ کی آباد کردہ بستی علی سرائے (منڈی) میں مزار ہے اور آپ کی اولاد میں حضرت مولانا ذکاوت حسینؒ مولانا وارثت حسینؒ مولانا لیاقت حسینؒ آپ کے احاطہ میں محو استراحت ہیں۔

(ارمغان فلاح ص ۵۳)

خاندان بنی اسرائیل کے علماء اور صوفیاء وعظیم شخصیات

مفتی محمد عبد الحکیمؒ اسرائیلی ،سید میاں رسول شاہ ،اور حضرت قاضی نجم الدین حضرت بدر الدین اور حضرت علامہ مفتی عبد السلامؒ اور حضرت مولانا محمد حسن اسرائیلیؒ ان کا مزار محلہ کوٹ شرقی میں ہے۔محمد حسنؒ اپنے وقت کے جید اور نامور عالم تھے جن کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ایک ۱۰۰ کے قریب ہے۔

شاہ عالم کرمانی

سنبھل کے بزرگوں میں ایک شاہ عالم کرمانیؒ ہیں۔آپ ہی نے کرمانی سرائے آباد کی۔قاضی علی پیر،اور شاہ عالم،اور قاضی پیر،پیران قاضی نجم الدین صاحب مشہور بزرگ کے خواہر زادے ہیں۔قاضی نجم الدین مرحوم کا مزار جامع مسجد کے مشرقی وشمالی گوشہ پر واقع ہے اور اسی احاطہ میں مولانا مفتی عبد السلام صاحب کے والد جو سنبھل کے نامور علماء میں شمار کئے جاتے تھے ان کا مزار ہے۔(ایوان مقفل ص ۱۴ تاریخ سنبھل)

شیخ حاتم سنبھلی

آپ کا نام حاتم سنبھلی ہے۔ حنفی مسلک کے تھے۔ ہندوستان کے مشہور علماء میں شمار ہوتا تھا۔ آپ متاخرین میں بڑے صاحب علم وفضل گزرے ہیں۔ مختلف فنون میں آپ کو مہارت تھی۔ علمی فضائل اور کمال کے ساتھ آپ وعظ وتبلیغ میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ مختلف مذہبوں کے لوگ طرح طرح کے اشکالات پیش کرتے آپ ان کا نہایت عمدہ طریقہ سے جواب دیتے۔ علماء کے مرجع اور علماء اسلام کے سردار تھے۔ ابتدائی تعلیم سنبھل میں بعض علماء سے حاصل کی۔ پھر شیخ عزیز اللہ تلبنی کے خدمت میں رہ کر تمام کتب درسیہ (معقولات، منقولات) کی تکمیل کی۔ اور طریقہ سلوک کی ابتداء آپ سے کی پھر شیخ علاوالدین دہلوی کے حلقۂ ارادت میں آئے۔ سنبھل میں مسلسل بقول (سنبھل سروے) ستر سال اور بقول (نزہتہ الخواطر) چالس سال درس وتدریس میں مشغول رہے۔ اور اہل سنبھل میں روح پھونکی۔ آپ کا درس شہرۂ آفاق تھا۔ مغل عہد کے چند مشہور عالم آپ کے شاگرد ہیں۔ جیسے ابو فضل ۱۵۵۱ء اور عبد القادر بدایونی سید محمد امروہی اور شیخ ابوالفتح خیر آبادی، شیخ عثمان بنگالی ان کے علاوہ بہت سے علماء نے استفادہ کیا بقول عبد القادر بدایونی شیخ حاتم اس وقت علم فقہ اور حدیث میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نیز بقول بدایونی کے وہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہم پلہ تھے۔ آپ کے نام پر ایک سرائے۔ حاتم سرائے کے نام سے قائم ہوئی اور سنبھل کے اسٹیشن بھی حاتم سرائے اسٹیشن کی بنیاد پڑی۔ آج تک ۱۹۸۸ء دونوں اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مفتاح العلوم وتلخیص المفتاح کی شرح کا مطالعہ کیا ۴۰ مرتبہ مطول پڑھی۔ دس سال تک برہنہ سر وپا پورے ملک خاص کر امروہہ وسنبھل کے گردونواح کا گشت کرتے رہے اس اثنا میں کبھی تکیہ اور بستر استعمال نہیں کیا۔ ریاضت وعبادت میں سرگرم رہتے اس میں مزہ اٹھاتے اس حالت سے

ولایت کے درجہ کو پہنچے۔آپ کی وفات شہر سنبھل ۹۶۹ھ میں ہوئی۔حاتم سرائے میں مدفون ہوئے۔ایک مقبرہ ہے آپ کی تاریخ وفات کندہ ہے۔شیخ عبدالقادر بدایونی نے تاریخ وفات (درویش دانشمند) لکھی ہے۔دوسری جگہ آپ کی تاریخ وفات ۹۶۸ھ میں (حق تعالیٰ کے کلام) کے اعداد وشمار بیان کئے ہیں (واللہ اعلم بالصواب) حکومت مغلیہ کی جانب سے شہر سنبھل کے مفتی وقاضی تھے۔آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے جانشیں ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر)

شیخ حاتم سنبھلی کی خدمت میں شیخ مبارک کا فتویٰ

شیخ مبارک جوابوالفضل اور فیضی کے باپ ہیں۔حنفی المسلک تھے۔ دربار اکبری میں جو علماء شیعہ وسنی جمع ہوئے اور ایک دوسرے کو طعن وتہمت لگاتے وہاں شیخ مبارک کو مہدویت کے ساتھ تشیع کی بھی تہمت لگ گئی مولانا محمد حسین مصنف دربار اکبری بحوالہ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ مبارک سے میں پڑھتا تھا،تو شیخ کا لکھا ہوا ایک مثنوی لے کر شیخ حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس زمانہ میں فاضل مسلم الثبوت تھے۔اور فقہ میں امام اعظم ثانی کہلاتے تھے۔شیخ موصوف نے مجھ سے معلوم کیا۔کہ شیخ کی مولویت کیسی ہے۔میں ان کی ملائی اور پارسائی فقر ومجاہدات وریاضت اور امر بالمعروف اور نہی عن منکر کا حال اپنے علمی احاطہ کے مطابق بیان کیا،شیخ اس زمانہ میں محتاط بھی تھے۔شیخ حاتم نے فرمایا کہ درست ہے میں نے بھی بہت تعریف سنی ہے مگر کہتے ہیں کہ مہدویت طریقہ رکھتے ہیں یہ بات کس طرح ہے؟ اس نے کہا کہ میر سید محمد کی ولایت وبزرگی تو مانتے ہیں مگر مہدویت نہیں مانتے۔شیخ حاتم نے عرض کیا کہ میر سید کے کمالات میں کس کو کلام ہے شیخ کی مجلس میں پیر سید محمد میر عدل بھی بیٹھے تھے،میری گفتگو میں وہ بھی متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ لوگ انہیں مہدوی کیوں کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ نیکیوں کی تاکید اور برائیوں سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں ، پھر پوچھا کہ میاں عبدالحی خراسانی ایک بار خانخاناں کے سامنے شیخ کی مذمت کر رہے تھے ۔ تم کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب ہوگا؟ میں نے عرض کیا ہاں ایک دن شیخ مبارک نے انھیں رقعہ لکھا تھا اس میں نصیحت کی بہت باتیں تھیں ، ان میں یہ تھا کہ تم مسجد میں نماز جماعت میں کیوں شامل نہیں ہوتے ہو میاں عبدالحی نے برا مانا اور جماعت کی تاکید سے یہ نتیجہ نکالا کہ مجھے رافضی کہا ہے ۔ میر عدل موصوف بولے کہ یہ استدلال تو ایسا ہے کہ کوئی کسی سے کہے تم نماز جماعت سے نہیں پڑھتے ، اور جو نماز جماعت سے نہ پڑھے وہ رافضی ہے ، تو تم بھی رافضی ہو ۔ اور ظاہر ہے کہ اس شخص کے مقدمہ کا کبریٰ مسلم ہے ۔ اس طرح یہ مقدمہ کہ شیخ امر بالمعروف کرتا ہے ، اور جو امر بالمعروف کرتا ہے وہ مہدوی ہے یہ بھی مسلم نہیں ہے غرض معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باب میں اس قسم کے چرچے خاص و عام میں رہتے تھے ۔ (دربار اکبری ص ۳۳۶ ۔ ۳۳۷)

شیخ ثناء اللہ سنبھلی

آپ کی جائے پیدائش سنبھل ہے ۔ ابتداء ہی سے پاکیزہ طبیعت تھے ۔ اور ہمیشہ علمی کاموں میں لگے رہتے آپ کی تعلیم و تربیت جس نہج اور معیار پر ہوئی اس نے بہت جلد علمی حلقوں میں متعارف کرادیا ۔ آپ کا مزاج خالص علمی تھا ۔ صبر و استقامت کے پیکر ، حنفی المسلک تھے ۔ دہلی حضرت شیخ شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلویؒ کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی ۔ اور سلسلۂ طریقت میں پہلے شیخ موسیٰ کے حلقہ عقیدت میں منسلک ہوئے ۔ پھر شیخ جانجان علوی دہلوی سے تکمیل کی ، آپ بہت بڑے ذاکر اور صاحب ریاضت تھے ۔ آپ درسِ حدیث میں مشغول رہتے اور فرماتے کہ حدیث شریف اور قرآن کریم کی درس و تدریس میں ایک نور ہے اور صفائی

قلب ہے اور سنتِ احمد ﷺ کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ (نزہۃ الخواطر ص ۱۱۵ ج ۷)

مولانا رستم علی سنبھلی

نام رستم علی بن طفیل علی الحسینی الرضوی سنبھلی ہے۔ آپ نے درسی کتابیں مفتی بلیغ العالم بن صبیح العالم مرشد آبادی سے پڑھیں۔ پھر سری دھر پنڈت بنارسی سے علم نجوم اور اس کے علاوہ دوسرے علوم حاصل کئے۔ نصیر الدین حیدر لکھنوی کے زمانہ میں ایک کتاب تصنیف کی اس کا نام زیج السلیمان جاہی رکھا۔ لیکن ان کی زندگی نے ساتھ نہ دیا داعیٔ اجل کو لبیک کہا آپ کے انتقال کے بعد امام الدین دہلوی نے ۱۲۷۳ھ میں تہذیب و ترتیب دی۔ آپ کی وفات ۱۲۶۲ھ میں ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر)

مولانا محمد علی سنبھلی

آپ کا نام علی محمد بن محمد داؤد الانصاری سنبھلی، سنبھل آپ کی جائے پیدائش ہے۔ شیخ قطب الدین بن فرید سنبھلی کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہ کر تحصیل علم کیا۔ اپنے باطنی جوہر و علمی و فنی کمالات کے لحاظ سے ہم عصر علماء پر بہت سے علوم و فنون میں فوقیت رکھتے تھے۔ آپ بڑے زبردست عالم تھے۔ اور تمام علوم میں دسترس حاصل تھی۔ علامہ تفتازانی کی کتاب تہذیب المنطق (تصورات) پر ایک بسیط شرح لکھی۔ (نزہۃ الخواطر)

مفتی عبد السلام اسرائیلی

آپ کی ولادت۔ کوچہ مفتیان محلہ کوٹ شرقی سنبھل میں ایک متمول جاگیردار و زمیندار علمی خاندان بنی اسرائیل میں ۱۲۴۶ھ میں ہوئی مفتی عبد السلام نے خود اپنی تاریخ ولادت قلم بند کی ہے۔ قطعہ تاریخ

لَوَلَدَتُ من فضل من لم یلد۔ولم یولَدُ المستعان الولی

لعام الولادۃ لی مصرع۔ولدت لترویج دین النبی

۱۲۴۶ھ

نیز لکھا ہے۔

سلام یوم ولدت ویوم اموت

۱۲۴۶ھ

مفتی عبدالسلامؒ کے والد ماجد عبدالقادر ہیں جو اپنے وقت کے جید عالم ہونے کے ساتھ متقداء شہر مفتی اور متولی مسجد و مدرسہ شاہی سنبھل تھے۔ زمینداری کے ساتھ آپ کا شغل درس وتدریس تھا۔ مفتی عبدالسلامؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ بہت کم عمری میں علوم متداولہ عربی وفارسی ودیگر علوم سے ۱۶ رسال کی عمر میں فراغت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں قابل ذکر مولانا عبدالقادرؒ حضرت مولانا قطب الدینؒ اور حضرت مولانا غلام فریدی۔ مولانا مفتی صدرالدین دہلوی ہیں۔

آپ کے اولاد میں ایک لڑکی تھیں جو مولانا ذکاوت اللہ سے منسوب ہوئی اور ایک فرزند مولانا مفتی ابوذر اسرائیلی تھے جو زہد وتقویٰ اور علم میں اپنے والد کے جانشیں ہوے جن کا تفصیلی ذکر تاریخ سنبھل کا جز ہے۔

شعر گوئی

مفتی عبدالسلامؒ صرف ایک عالم ہی نہیں تھے بلکہ ایک شاعر بھی تھے اور تخلص سلام تھا۔ فن شعر گوئی میں آپ کو امام کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے اشعار کے مجموعہ کو مفتی علی ہارون وارثی عرف چندا صاحب نے کاوش وتلاش کے بعد ارمغان فلاح کے نام سے طباعت کرایا ہے جو ۳۰۰ رصفحات پر مشتمل ہے چند اہل قلم فکر کی تقریظات سے مزین ہے حضرت مولانا عبدالسلامؒ کی ذات وشخصیت کو اس میں اجاگر کیا گیا ہے

خود آپ کا کلام آپ کے وجود و کارناموں پر روشن دلیل ہے۔

مفتی عبدالسلامؒ کے مزید حالات سے واقفیت کیلئے ارمغان فلاح کی طرف رجوع فرمائیں۔ جیسا کہ مفتی ہارون صاحب رقمطراز ہیں کہ:

مفتی صاحب کے کلام کا بہتر حصہ تلف ہوگیا۔ جو مضامین دستیاب ہوئے وہ ۱۳۰۵ھ میں اصل النصائح کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا اور ایک رسالہ مجمع بحرین کے نام سے ۱۳۱۵ھ میں شائع ہوا تھا یہ دونوں مجموعے بھی ارمغان فلاح میں شامل ہیں۔

مفتی عبدالسلامؒ اپنے عہد کے جید عالم تھے۔ منقولات و معقولات میں دسترس حاصل تھی۔ شرح وقایہ کا آپ نے حاشیہ لکھا۔ تصنیفی خدمت کے ساتھ تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ آپ کی مادری زبان اردو تھی لیکن فارسی، سنسکرت، ہندی پر مہارت حاصل تھی۔

وفات: پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ

سنبھل کے انصار حضرات ابوایوبؓ کی اولاد میں ہیں

حضرت ابوایوب انصاری کا نام خالد بن زید ہے نسباً خزرجی قبیلہ بنی غنم سے ہیں بیعت عقبہ ثانیہ اور بدر واحد اور تمام غزوات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ شریف ہجرت فرما کر تشریف لائے تو آپ کی اونٹنی ابوایوبؓ کے مکان کے سامنے حسب حکم خداوندی بیٹھ گئی۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کے مکان پر قیام فرمایا جب مسجد شریف اور حجرات شریفہ تیار ہوگئے تب وہاں سے حضرت اٹھ گئے۔ پہلے حضور انور ﷺ نے مکان کے نیچے کے حصہ میں قیام پسند فرمایا اور ابوایوب اوپر کے حصہ میں رہتے تھے۔ ایک دن اتفاقاً بالاخانہ پر پانی گر پڑا ابوایوب اور ان کی بیوی نے اس خوف سے کہ کہیں پانی نیچے نہ گرے اپنے کپڑوں میں جذب کرلیا پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ مناسب نہیں ہے کہ حضور انور تو نیچے حصہ میں رہیں اور ہم بالاخانہ

میں رہیں حضور اوپر تشریف رکھیں حضرت نے اپنا اسباب اوپر منتقل کر لیا۔ ابوایوب نے جہاد اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ فتوح شام اور دیگر لڑائیوں میں ہمیشہ شریک رہے۔ نیز حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ کے ساتھ جنگ صفین و مروان میں شریک رہے اسد الغابہ میں سب لڑائیوں میں شرکت لکھی ہے مگر جنگ جمل میں ابوایوب کی شرکت ثابت نہیں ہے جہاد کے لئے ملک روم میں تشریف لے گئے تھے وہاں وقت آ گیا اور سنہ ۵۰ یا سنہ ۵۱ یا سنہ ۵۲ میں وفات پائی اور قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب دفن ہوئے ابوایوب کی اولاد کے حق میں حضور انور نے عطائے علم و عمل کی دعاء فرمائی تھی۔

جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک ان کی اولاد میں علم باقی رکھا ہے اور حضرت ابوایوب انصاری کی اولاد میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی مشہور عالم اور یگانۂ عصر بزرگ گزرے ہیں ان کا نسب حسب ذیل ہے۔

شیخ الاسلام ابواسماعیل عبداللہ انصاری بن ابی منصور محمد بن ابی معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن ابی منصور بن ابی ایوب انصاریؓ

تذکرۃ الحفاظ میں علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ عبداللہ انصاری ۳۹۶ھ میں بمقام ہرات پیدا ہوئے۔ علامہ ابن تیمیہ بھی آپ کے بہت مداح تھے جیسا کہ علامہ تاج الدین بکی نے طبقات کبریٰ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوایوب کے صاحبزادہ ابومنصور بسلسلہ جہاد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خراسان تشریف لائے اور ہرات آ کر مقیم ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔

اسی وجہ سے شیخ الاسلام عبداللہ انصاری بھی ہرات میں مقیم تھے ۴۸۱ھ میں وفات پائی آپ کے پرپوتے خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ اسماعیل بن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری بطور جہاد ہندوستان تشریف لائے اور قریہ سرسل میں قیام پزیر ہوئے۔ اور آپ کی اولاد میں مخدوم بدرالدین بن مخدوم شرف الدین بن خواجہ فضیل بن خواجہ

نگلاں بن خواجہ داؤد بن خواجہ حامد بن خواجہ جلال الدین مذکور نے دہلی سکونت اختیار کی۔ علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کر کے عالم متبحر ہوئے اور (منارہ شمیہ) قطب کی لاٹ کے قریب مدرسہ تعمیر کرا کر درس وتدریس میں مصروف رہے۔ شیخ جلال الدین نے موضع برناوا قریب دہلی میں سکونت اختیار فرمائی۔ انھوں نے ایک صاحبزادہ نصیر الدین کو چھوڑا۔

مخدوم بدرالدین نے ۸۸۷ھ میں وفات پائی اور ایک صاحبزادے مخدوم علاؤ الدین یادگار چھوڑے۔ جنھوں نے ۲۱ شوال ۸۷۶ھ میں وفات پائی اور موضع شیخپور میں اپنے والد کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ مخدوم علاؤ الدین کے دوسرے دو بھائی اور تھے۔ ان میں سے ایک نے سنبھل قیام اختیار کیا۔ سنبھل کے انصار انہیں کی اولاد میں سے ہیں دوسرے بھائی جن کا نام ملا محمد مسعود تھا پانی پت میں مقیم ہوئے پانی پت کے علماء انصار انھیں بزرگ کی اولاد میں ہیں۔

حضرت سلطان الاولیاء محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کی اولاد کے حق میں دعا کی تھی کہ تاقیامت علم رہے اور آپ کے بھائی کے حق میں حصول عزت ومناقب کی دعا فرمائی تھی۔ آپ کے ان بھائی نے سنبھل ضلع مرادآباد میں قیام فرمایا اور وہیں آپ کی اولاد اس وقت تک موجود ہے۔ (اقتباس از تذکرہ علماء فرنگی محل۔ ص ۸۔۹)

سنبھل میں محلّہ تمرداس سرائے میں امام الدین ہادی شہید انصاری، حمید الدین انصاری ان کی اولاد میں شیخ فرید الدین انصاری، بدرالدین انصاری، ظہور الدین انصاری، معین الدین انصاری، فرید الدین کی اولاد میں شفیع الدین اور معین الدین کی اولاد میں معین الدین انصاری ہیں نیز نواب عاشق حسینؒ کا خاندان بھی انصاری خاندان سے ہے۔ انگریز نے نواب کے خطاب سے نوازا تھا۔ نواب زادہ محمد ساجد، نواب زادہ محمود، نواب زادہ حکیم محمد رئیس صاحب بھی اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔

شاہ مراد اللہ انصار سنبھلی

شاہ مراد اللہ انصاری۔ عرف غلام کاکی، جو ملک شاہ سنبھلی کی عرفیت سے معروف ہوئے۔ سنبھل کے قدیم انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کا سلسلہ نسب عزیز اللہ تلبنی تک ملتا ہے۔

یہ خاندان اول دن سے علم و دانش، فضل و کمال اور تقویٰ و پرہیزگار کے ساتھ دنیاوی وجاہت میں نمایاں رہا ہے، شاہ مراد اللہ بھی اپنے اجداد کی طرح علوم و فنون میں یکتا تھے۔ اور ان کا شمار جید عالموں میں ہوتا تھا۔ نقشبندی سلسلے کے مشہور شیخ تھے اور مرزا مظہر جان جاناں کے مرید و خلیفہ اور نہایت متوکل علی اللہ بزرگ تھے مرزا صاحب کے اجل خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب مرزا صاحب کی تربیت کی برکت سے طریقت کے انتہائی مقامات کو پہنچے۔ شاہ مراد اللہ انصاری بنگال تشریف لے گئے وہاں ان کے ذریعہ اصلاح و تذکیر کا بہت کام ہوا جیسا کہ مؤلف مقامات مظہری نے لکھا ہے کہ شاہ مراد اللہ سنبھلی نے بنگال کو فیض روحانی سے مالامال کیا اور وہاں کے ہزاروں مسلمان انکے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے اور طریقت میں منازل طے کیں۔ بنگال میں کسی جگہ ایک تقریب میں گئے تو وہاں ہزار ہا طالبان خدا نے ان سے طریقت و تعلیم حاصل کی۔ شاہ صاحب کے تربیت یافتہ اصحاب میں محمد غوث، محمد دانش اور محمد درویش خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شاہ صاحب نے جہاں تبلیغ و تحریک، درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے وہاں انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر اردو زبان میں لکھی جو اردو میں سب سے پہلی تفسیر ہے جو نہایت مقبول ہوئی اور خدا کی نعمت کے نام سے مشہور ہو کر طباعت ہوتی رہی ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر ناظرین پڑھ چکے ہیں۔ شاہ صاحب پہلے مفسر ہیں، جنھوں نے اردو زبان میں تفسیر لکھی اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں کے وصال ۱۰ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ سے پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔

(مقامات مظہری از شاہ غلام علی مجددی۔ ص ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۴)

شاہ مراد اللہ انصاری (۱) نقشبندی سلسلے کے مشہور شیخ تھے۔ انہوں نے اردو زبان میں قرآن کریم کے تیسویں سیپارے "عم یتساءلون" کی تفسیر لکھی جو نہایت مقبول ہوئی۔

تفسیر مرادیہ (۲)

شاہ مراد اللہ کی یہ تفسیر "تفسیر مرادیہ" کے نام سے بھی مشہور ہے اور یہ تفسیر (۲۴ر محرم ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) کو مکمل ہوئی جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔ حمد و شکر کا سجدہ لائق ہے، سزاوار ہے۔ پاک پروردگار کے تئیں۔ جس خداوند نے اپنے فضل و کرم سے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے عم سیپارے کی تفسیر ہندی زبان میں تمام کرادی اور اس عاصی گناہ گار مراد اللہ انصاری سنبھلی قادری نقشبندی حنفی کو یہ خدمت فرما کر توفیق بخش کر، اوس کے دل میں اپنے کلام کو بیان بخشا۔ زبان کو ہاتھوں کو، قوت بخشی۔ قلم کو کاغذ کے اوپر جاری کروایا۔ خیر کا کام پورا کر دیا پھر اس تفسیر کا نام "خدا کی نعمت" مقرر کروایا۔ یہ تفسیر محرم کے مہینے کی چوبیس تاریخ جمعہ کے دن گیارہ سو چوراسی برس ہجری تمام ہو کر

---

(۱) شاہ مراد اللہ عرف غلام کا کی، قصبہ سنبھل ضلع مراد آباد (یوپی انڈیا) کے مشہور انصاری خاندان کے رکن تھے جو دنیوی وجاہت اور علم و فضل کے لیے مشہور رہا ہے۔ وہ نقشبندی سلسلے میں بیعت اور مرزا مظہر جان جاناں کے اجل خلیفہ تھے۔ بنگال میں ان کے ذریعے اصلاح و تذکیر کا بہت کام ہوا۔ دیار بنگالہ میں شاہ مراد اللہ کے تربیت یافتہ اصحاب میں محمد غوث، محمد دانش اور محمد درویش خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں کے انتقال (۱۰۔محرم ۱۱۹۵/۱۷۸۱ء) سے پہلے شاہ مراد اللہ سنبھلی کا انتقال ہوا۔ شاہ صاحب شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اشعار کہیں کہیں تفسیر مرادیہ میں نقل کیے ہیں۔ ان کے صاحب زادے مولوی ثناء اللہ انصاری بھی حضرت مرزا جان جاناں کے مرید و خلیفہ اور نہایت متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔

ملاحظہ ہو (۱) مقامات مظہری از شاہ غلام علی مجددی ص ۷۰۔۷۱۔۳۔۲) معمولات مظہریہ از مولوی نعیم اللہ بہرائچی ص ۱۰۹؛ قرآن مجید کا ایک قدیم اردو ترجمہ از سید محبوب رضوی (ماہنامہ برہان، دہلی۔ جون ۱۹۶۷ء) ص ۳۲۵۔ ۳۴۷؛ لوائح خانقاہ مظہریہ مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ص ۸۳۔ ہوئی (۲) اور "خدا کی نعمت" کے نام سے چھپتی رہی ہے۔

پچاسی شروع ہوا تھا، جو تمام ہوئی۔(۱)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب محرم ۱۱۸۵ھ ۱۷۷۱ء میں طبع ہوئی اور شاہ مراد اللہ سنبھلی نے اس کا نام ''خدائی نعمت'' رکھا اور یہی نام تمام مطبوعہ اور خطی نسخوں میں ملتا ہے۔ مصنف علام نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ یہ تاریخی نام ہے۔ مگر مطبع ماہ عالم افروز کلکتہ (طبع ۱۲۵۱ھ) کے مصحح مولوی منصور احمد بردوانی کو یہ خیال ہوا کہ یہ تاریخی نام ہے اور ''خدائی نعمت'' سے ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ شاید اس کا نام ''خدائی نعمت'' ہو۔ کیونکہ ''خدائی نعمت'' سے ۱۱۸۵ھ حاصل ہوجاتے ہیں اگری کے علاوہ ہمزہ (۲) کے بھی دس عدد شامل کر لیے جائیں۔ مولوی منصور احمد بردوانی کی عبارت ملاحظہ ہو:

''اس تفسیر کا نام تمام نسخوں میں'' ''خدا کی نعمت'' لکھا ہوا پایا، مگر قیاس یہ ہے کہ وہ ''خدائی نعمت'' ہو۔ اور کاتبوں کی غلطی سے کاف کی کشش اس پر پڑ گئی ہو۔ کیونکہ حساب ابجدی میں اس کا عدد ۱۱۸۵ ہے اور یہ مادہ تاریخ تصنیف کا ہے، چونکہ حضرت قدس سرہ نے خاتمہ میں' کچھ ایسا نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے عاصی نے سب نسخوں میں جیسا پایا ویسا ہی رکھ چھوڑا (۳)

تفسیر مرادیہ کے خطی نسخوں (۴) میں مصنف کا ایک دیباچہ بھی ملتا ہے جو

---

(۱) تفسیر مرادیہ سب سے پہلے ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) میں ہوگلی میں اور بعد ازاں مولانا سید عبداللہ وغیرہ کے مطابع میں چھپی اور وہابی تحریک کے ناشرین اس تفسیر کو برابر چھاپتے رہے۔ یہانتک کہ حکومت نے اس کو ممنوعہ لٹریچر میں شمار کیا۔ ملاحظہ ہو۔ ہندوستان میں وہابی تحریک'' از ڈاکٹر قیام الدین۔ ص: ۳۰۵۔ (۲) تفسیر مرادیہ۔ از مراد اللہ سنبھلی (مطبع کریمی بمبئی۔ ۱۳۱ء) ص ۲۸۷۔ (۳) خاتمۃ الطبع تفسیر مرادیہ مطبوعہ ماہ عام افروز کلکتہ ۱۲۵۱ء وتین نثری نوادر از ڈاکٹر نجم الاسلام (نقوش لاہور) اپریل تا جون ۱۹۶۶ء ص ۱۵۱۔ (۴) تفسیر مرادیہ کے خطی نسخے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن، شیرانی کلکشن (پنجاب؟؟ لاہور) اور ڈاکٹر نجم الاسلام (شعبہ اردو حیدرآباد سندھ یونیورسٹی) کے ذاتی ذخیرے میں۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کا مخطوطہ ۱۲۵۶ھ کا مخطوطہ ہے۔ دیباچہ تفسیر مرادیہ (خطی مکتوبہ ۱۲۵۶ھ) (مملوکہ: ڈاکٹر نجم الاسلام، حیدرآباد سندھ)

مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں ہے۔ اس دیباچے سے سبب تالیف پر روشنی پڑتی ہے۔ دیباچے کا ضروری اقتباس ملاحظہ ہو۔

حمد و سلام کے بعد، یہ عاجز بندہ، عاصی گنہگار فقیر مراد اللہ انصاری قادری نقشبندی، اللہ تعالی کی رحمت کا امیدوار، مہربانی، کرم فضل کا آرزومند، منگتا خاکسار کہتا ہے۔ ایک دن اپنے دوستوں کے آگے قرآن مجید پڑھتا تھا۔ جن لوگوں نے متن قرآن کا پڑھا تھا، قرآن کے معنوں سے، قرآن کے بھیدوں سے، کچھ خبر نہ رکھتے تھے۔ ادن کو قرآن کی آیتوں کی تفسیر ہندی زبان میں سناتا تھا۔ سننے والے مردوبی بیان، بہت اخلاص سے، شوق سے سنتے تھے، خوش ہوتے تھے ایمان اور مسلمان کی قدر معلوم کر کر شکر کرتے تھے۔ اس حال میں بعضے اخلاص مندوں نے کہا جو ہم کو بھی قرآن کی آیتوں کی یہ تفسیر معلوم رہتی، سورتوں کے معنی یاد رہتے تو کیا خوب بات ہوتی۔ کیسا بڑا اللہ تعالی کا فضل ہوتا، اوس وقت اللہ تعالی نے ان کے سچے شوق اور اخلاق کی برکت سے اس عاجز بندے خاکسار کے دل میں یہ بات ڈال دی، جو اس ہندی تقریر کو، وہی بات جو عربی فارسی تفسیروں کے بیان میں زبان سے نکلتی ہے، اوس ہی تقریر کو کاغذ کے اوپر قلم بند کر کر 'لکھ کر' ان کو پڑھا دیجئے، تو دین کی عام باتیں ان کے اوپر خوب طرح سے معلوم ہو جاویں، یاد رہیں، کام آویں۔

(۱) اتفاق کی بات کہ شاہ مراد اللہ اور سیپاروں کی تفسیر نہ لکھ سکے، کیونکہ ان کے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں نے منع فرمادیا۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

"ایشان ارادہ کردند کہ تفسیر کلام اللہ بزبان ہندی بجہت تیسیر طالبان تصنیف نمایند، وحضرت ایشان منع فرمودند (۲) کہ اشاعت انوار طریقۂ موجب حصول اخلاص

(۱) نقوش لاہور، اپریل تا جون ۱۹۶۶ء۔ ص ۱۴۸۔ (۲) شیرانی کلیکشن (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) کے خطی نسخے میں سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیات کی تفسیر بھی موجود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شیخ مرزا مظہر جان جاناں کے ارشاد کی تعمیل میں یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

ومرتبہ احساں می شود، اوقات مصروف ہمیں شغل باید داشت وبجز ذکر ومراقبہ ہیچ امر نباید پرداخت۔(۱)

سورہ فاتحہ کی تفسیر کے بعد کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''شروع کرتا ہوں کہ عم سیپارے کی تفسیر اللہ کے نام کی برکت سے، جس نے ہم کو دنیا میں پیدا کیا اور روزی دی اور سب طرح کی نعمت بخشی اور بخشنے والا ہے ہر مومن اور مسلمان کو آخرت میں اور بہشت میں لے جانے والا ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے عم سیپارے میں پہلی سورت عم ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی، اس میں چالیس آیتیں اور ایک سو چہتر کلمے اور آٹھ سو ایک حرف ہیں۔ جب حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالی کی طرف سے پیغمبری کی خلعت پہنی اور پیغمبر ہوئے اور حکم سے حق تعالی کے مکہ کے سارے آدمیوں کو اپنی پیغمبری کی خبر دی اور ایمان لانے کو فرمایا اور بُت پوجنے سے منع کیا۔ اللہ تعالی کی بندگی بجالانے کے واسطے حکم فرمایا اور شرک سے توحید کی طرف بلایا۔(۲)

زبان وبیان

اس کی عبارت کا اکثر حصہ نہایت صاف اور رواں ہے۔ دو اقتباس ملاحظہ ہوں: پروردگار تعالی جس وقت آدمی مرنا چاہتا ہے اوس کی جان لینے کا حکم کرتا ہے، وہ آدمی اوسی وقت مرتا ہے، پھر کسی حکیم طبیب کی، دانا عقلمند کی، کچھ تدبیریں کام آتی نہیں۔ ہزاروں دوا کریں، حکمت کریں، منتر جنتر کریں، کچھ کام نہیں آتا۔ اس راہ سے سب

(۱) مقامات مظہری۔ ص ۷۱ (۲) مطبوعہ نسخوں میں سورۂ فاتحہ کی جو تفسیر اور ترجمے، وہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے منقول ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ناشر اول نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور ترجمہ بطور تمہید ''موضح قرآن'' سے نقل کر دیا ہے اور اس میں اشارہ بھی دیا ہے کہ الحمد تا آخر سورۂ فاتحہ دوسری کتاب سے ہے۔ اور آگے چل کر وضاحت کی ہے۔ یہ فائدہ اصل قرآن شریف مترجم ہندی کا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر مرادیہ (مطبع کریمی بمبئی۔ ۱۳۱۰ھ) ص ۲

لاچار، بے اختیار اپنے اپنے وقت میں آخرت کی طرف چلے جاتے ہیں۔(۱)

دینی بے راہروی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں بہت لوگ مسلمان کہلاتے ہیں، اپنے تئیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت جانتے ہیں، لیکن دین کے کام انہوں نے چھوڑ دیے ہیں۔قبروں کو سجدے کرتے ہیں، کافروں کی رسمیں بجالاتے ہیں، ہولی، دیوالی، دسہرہ کرتے ہیں۔ سیتلا، جتیہ، پنچانند، کالی، مہادیوی، بن بی بی، اولا بی بی کمال پری، شیخ سدو، زین خان، مانک پیر، ست پیر وغیرہ کو پوجتے ہیں۔ان کی منت چڑھاتے ہیں۔اور بہت باتیں ہیں جو مرد عورت سب کرتے ہیں۔ یہ نادانی کا سبب ہے۔دین کے علم سے جاہل، ناواقف ہیں(۲)۔

حضرت مولانا عبدالوحید صاحب

۵/ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں سرائے ترین سنبھل میں آپ کی پیدائش ہوئی ابتدائی تعلیم اردو اسکول میں ہوئی وہاں کا کورس ختم کرکے دنیوی کاروبار میں لگادیا گیا۔مگر علم کا شوق آپ کے دل میں جوش ماررہا تھا، عہد شباب میں شادی بھی ہوئی تھی، اس وقت علوم عربیہ پڑھنے کا آپ کے دل میں جذبہ پیدا ہوا۔موصوف نے ابتدائی تعلیم مدرسۃ الشرع محلہ کٹرہ موسیٰ خاں میں شروع کی۔چونکہ مدرسۃ الشرع سرائے ترین سے ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے روزانہ پڑھنے جاتے اور گھر واپس آنے میں اکثر وقت بجائے تعلیم کے آمدورفت

---

(۱) تفسیر مرادیہ، ص ۵۸

(۱) تفسیر مرادیہ، ص ۱۱۹

بعض ہندی الفاظ کا استعمال۔ صفحہ

انجان — حضرت کی بہن اوس جگہ انجان آنکلیں۔ ۳۴

لوکا — ایک لوکا باندھا جلانے کے واسطے۔ ۳۵

باگھ — ہزاروں جادو کے سانپ...... باگھ...... بنا کردیے۔ ۳۷

میں گذر جاتا۔ اور وقت ضائع ہوا تو آپ سنبھل سے قصبہ حسن پور ضلع مراد آباد کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں داخل ہوئے۔ اس مدرسہ میں حضرت مولانا احمد الدین خاں صاحب پڑھاتے تھے۔ موصوف اپنے وقت کے نحو اور صرف کے امام تھے۔ مولانا عبدالوحید نے مولانا موصوف سے نحو اور صرف کی تکمیل کی، بعدہٗ علوم عقلیہ کی ابتدائی کتابیں موصوف سے پڑھیں۔ پھر خیال کیا کہ علوم عقلیہ کسی ایسے استاد سے پڑھیں جو ان فنون کا امام ہو۔ معلوم ہوا کہ خیر آباد ضلع سیتاپور میں مولانا عبدالحق صاحب بہت مشہور اور ان فنون میں ماہر ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ برسوں تک طالب علم کو ان کتابوں میں اٹکائے رکھتے ہیں۔ جس کے لئے فرصت اور فارغ البالی ضروری ہے اور یہاں یہ دونوں چیزیں معدوم تھیں۔ اس لئے مزید تحقیق و تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ لاہور میں مولانا غلام محمد صاحب ان علوم کے امام کامل ہونے کے ساتھ وقت کے قدر شناس بھی ہیں۔

لاہور کا پیدل اور بغیر زادراہ سفر

تو آپ حسن پور ہی سے گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر ایک سرحدی طالب علم کو اپنے ہمراہ لے کر لاہور کے ارادے سے بغیر زادراہ توکل علی اللہ (اللہ پر بھروسہ کرکے) صرف دو پیسے لے کر پیدل چل دیئے۔ دن بھر چل کر رات کو کسی آبادی میں قیام کرتے اور وہ طالب علم مولانا کی ٹانگیں دباتا۔ اور مولانا اس کو کافیہ کا سبق پڑھایا کرتے۔ راستہ میں بہت سے عجیب و غریب واقعات پیش آئے۔ اس طرح پیدل چل کر تقریباً ایک ماہ میں لاہور پہونچے اور مولانا غلام محمد صاحب سے علمی تجربہ حاصل کیا۔ خصوصاً علم ہیئت میں بلند مرتبہ پایا۔ اسی دوران میں سنبھل کے دو عالم حضرت مولانا عبدالمجید صاحب اور مولانا کریم بخش صاحب اور امروہہ سے علی زیتی صاحب بھی لاہور پہونچ چکے تھے۔ اور ان حضرات نے بھی مولانا کے ہمراہ ہی ان علوم سے فراغت پائی۔ نیز حضرت شیخ المشائخ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ آپ اس زمانہ میں حضرت مولانا

عبدالوحید صاحب کے ساتھ لاہور میں پڑھتے تھے۔ یہ مدرسہ لاہور کی شاہی مسجد میں قائم تھا۔ اور نعمانیہ نام سے موسوم تھا۔ اور حضرت مولانا غلام صاحب کے عقائد واعمال وخوبیوں کا گہوارہ اور مظہر تھا۔

دارالعلوم دیوبند آمد

مذکورہ علوم سے فراغت کے بعد حدیث شریف میں صحاح ستہ کا درس حاصل کرنے کا وقت آیا۔ تو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا درس حدیث شہرآفاق ہو چکا تھا۔ یہ حضرات لاہور سے دیوبند آئے دارالعلوم میں داخل ہو کر صحاح ستہ اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ لاہور اور دیوبند کے قیام میں وطن سے کوئی تعلق نہیں رکھا حتی کہ خط وکتابت کا سلسلہ بھی منقطع رہا۔ دیوبند سے فراغت کے بعد اپنے والد جناب امیر اللہ کو خط لکھا جو مرثیہ خوانی اور میلاد خوانی میں مشہور تھے۔ اور دور دراز تک مثلاً آگرہ، لکھنؤ، پیلی بھیت، تک بلائے جاتے تھے۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ اب اللہ کے فضل وکرم سے علم دین حاصل کر چکا ہوں اور وطن حاضری کی اجازت چاہتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ آپ مرثیہ خوانی چھوڑ دیں چنانچہ والد محترم نے اس شرط کو منظور کر لیا اور پھر کبھی ان کاموں کی طرف توجہ نہیں کی۔

تدریس کا دور

فراغت کے بعد آپ نے سب سے پہلے سرائے ترین کے مدرسہ علوم اسلامیہ میں درس دیا۔ جو سرائے ترین کے رئیس احمد اللہ خاں صاحب رسالدار نے جاری کیا تھا۔ تقریباً پانچ چھ سال وہاں تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی۔

چنانچہ وہاں کے آپ کے مستفیدین میں سے ایک مولانا عبداللہ خاں تھے۔ جنھوں نے عرصہ تک ریاست چھتاری کے مدرسہ میں رہ کر تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی۔ ایک مولوی محمد دین خاں بھی تھے جو طب میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

موصوف کی عمر نے ساتھ نہیں دیا جلد رحلت ہوگئی۔ اس کے بعد خود رسالدار صاحب نے وہ مدرسہ مذکور توڑ دیا۔ دوسری بار مولانا کو امرتسر مدرسہ نعمانیہ کے مہتمم اور بانی مولانا نور احمد صاحب نے صدر مدرسی پر بلالیا۔ یہ مدرسہ شیخ بڑھا کی مسجد میں تھا، اس زمانہ میں مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانویؒ، مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی اس مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ تیسری جگہ امرتسر سے مینڈھو ضلع علی گڑھ مدرسہ یوسفیہ میں بلائے گئے۔ اور عرصہ دراز تک وہاں جملہ علوم وفنون، فقہ وحدیث کا درس دیا۔ بڑے بڑے فاضل تعلیم یافتہ آپ کے شاگرد ہوئے۔ ایک سال اس مدرسہ میں نواب صاحب نے جلسہ دستار بندی کرایا۔ جلسہ میں حضرت مولانا امروہی تشریف لائے پھر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے لئے درس وتدریس کے واسطے طلب کیا۔ چنانچہ نواب صاحب نے حضرت کی طلب پر اجازت دیدی، مولانا نے نائب صدر کی حیثیت سے مظاہر علوم سہارنپور میں حضرت سہارنپوری کی موجودگی میں درس دیا۔ مظاہر علوم کے شاگردوں میں بڑے بڑے فضلاء علماء علمی تجربہ حاصل کرکے آپ سے مستفیض ہوکر اعلیٰ درجہ پر پہونچے۔ مثلاً سلطان المشائخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور مہاجر مدنی، وزبدۃ السالکین حضرت مولانا محمد اسعد اللہ ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، وخلیفۂ مجاز حضرت تھانوی۔ اور حضرت مولانا فخر الحسن شیخ التفسیر واستاد حدیث دار العلوم دیوبند۔ حضرت مولانا صدیق احمد کشمیری، حضرت مولانا منظور احمد خاں مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوری، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنی، حضرت مولانا عبد الغنی صاحب، بارہ بنکوی، حضرت مولانا عبد الحق صاحب مگراہاٹی مجاز حضرت تھانوی، حضرت مولانا محمد حیات صاحب سنبھلی شیخ الحدیث وبانی جامعہ حیات العلوم مرادآباد، حضرت مولانا

محفوظ الرحمٰن صاحب نامی، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری، حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی اور خود حضرت کے خلف الرشید حضرت مولانا قاری عبدالمعید صاحب سنبھلی خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث محمد زکریا مدظلہ (بمبئی) وغیرہم، آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ ان تلامذہ کے کمال سے ہوسکتا ہے۔ آپ علوم نقلیہ کے علاوہ علوم عقلیہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خاص کر آپ علم ہیئت میں آلات کے قطعی محتاج نہیں تھے۔ کرہ کی جگہ ہاتھ کی مٹھی بنا کر پوری وضاحت فرما دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے مشکل سے مشکل کتابیں مثلاً، اقصرائی شرح اسباب وغیرہ کتابیں بغیر پڑھے بہ آسانی پڑھایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے حسن تدریس کی وجہ سے ایک مرتبہ حضرت تھانوی نے آپ کو تحریر فرمایا کہ خانقاہ امدادیہ کے لئے آپ جیسے ایک جامع مدرس کی ضرورت ہے۔ چند سال بعد حضرت مولانا محمد حسن صاحب مرادآبادیؒ کے زمانہ اہتمام میں جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد کے عہدۂ صدر مدرسی پر حضرت مولانا احمد شاہ حسن پوری کی سعی وطلب پر فائز ہوئے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مدرسہ یوسفیہ کے مہتمم عالی

جناب لیاقت حسین خاں کے بے حد اصرار پر مینڈھو تشریف لے گئے۔ نیز حضرت موصوف اس دوران میں ڈیڑھ دو برس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں بھی مدرس رہے۔ اور اس وقت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بانی تبلیغ، اکثر خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت تھانویؒ سے سلوک میں نسبت

حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ سے سلوک میں خاص نسبت تھی۔ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب، درمیان سال میں حضرت تھانوی سے خصوصی استفادہ فرماتے رہتے تھے۔ اور رمضان المبارک کا

مہینہ تو اکثر و بیشتر خدمت اقدس ہی میں گزرتا تھا۔ حضرت تھانوی کو مولانا سے نہایت انسیت و محبت تھی ۔ ایک بار مراسلت میں کچھ وقفہ ہو گیا تو حضرت اقدس تھانوی نے تحریر فرمایا کہ تم عبدالوحید تو تھے ہی وحید بھی ہو گئے ۔

حضرت تھانوی کی طرف سے سلوک میں کئی بار اجازت بیعت کیلئے اشارے ہوئے، مگر مولانا یہ کہہ کر انکار فرما دیتے کہ مجھ ناتواں ۔ سے اس کا تحمل نہ ہو سکے گا۔ آخر میں دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڑھ میں صدر مدرسی کی خدمت کئی سال تک انجام دی۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ تو آپ کو حضرت مولانا محمد حیات صاحب آپ کو وطن مالوف سنبھل سرائے ترین لے آئے۔ اور کچھ ماہ کی علالت کے بعد ابتداء رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون (ماخذ ولی کامل)

انداز تدریس شیخ کی زبانی

حضرت شیخ الحدیث محمد زکریا صاحبؒ نے آپ بیتی نمبر ۳ میں مولانا عبدالوحید صاحب کا انداز تدریس تحریر کیا ہے۔ کہ مولانا مرحوم کا ایک مقولہ اس ناکارہ نے کئی بار سنا نہایت نیچی نظر فرما کر بہت متانت سے کئی مرتبہ ہاتھ دائیں بائیں کر کے ارشاد فرماتے تھے کہ ہمیں اس کا یقین ہے بالکل اعتراف ہے نہ اس میں تواضع ہے اور نہ مبالغہ کہ ہم لوگ ان کتابوں کے پڑھانے کے ہرگز قابل نہیں۔ مختلف الفاظ سے اس مضمون کو دھراتے ۔ اور پھر ایک دم منہ اوپر کو جماعت کی طرف اسی طرح سے ہاتھ سے اشارہ کر کے زور سے فرماتے کہ یہ جو بیٹھے ہیں ہم سب سے بھی پڑھنے کے قابل نہیں۔

اوصاف

تحریرات میں دستخط اکثر اس طرح فرماتے (ہیچ مداں عبدالوحید عفی عنہ) سرمہ لگانے کی کثرت سے عادت تھی۔ آپ کا قد میانہ تھا، ہمیشہ نیچی نظر اور نظر قدم پر رکھتے

اور زبان ذکر سے تر رہتی۔

مولوی ریلؒ

سنبھل میں بہت سے ایسے علماء وصوفیہ کا ورود ہوا جو ہندوستان کے کسی غیر معروف مقام میں پیدا ہوئے۔ پھر انہوں نے سنبھل کو علم وعرفان کے نور سے منور کیا اور ان کی روشنی دور دور تک پھیلی۔

ان میں سے ایک نورانی وروحانی پیکر اور صوفی صافی بزرگ جن کی زیارت کی نعمت سے راقم بھی مشرف اور محظوظ ہوا۔ میری مراد مولوی ریل ہیں۔ ان کا نام محمد صادق تھا۔ مولوی ریل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا وطن اصل تو پنجاب ضلع ہوشیار پور تھا۔ بغرض تحصیل علم سنبھل آئے۔

مدرسہ۔ سرائے ترین میں مولانا عبدالوحید سنبھلی صدر مدرس کی حیثیت سے تھے۔ مولوی صادق اس مدرسہ میں داخل درس ہوئے۔ اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ زمانہ طالب علم سے ہی خوش قسمتی سے مولانا عبدالوحیدؒ جیسے محقق، عارف کامل کے گھر سے خاص روابط قائم ہوئے اور ان کے گھر کے ایک فرد شمار کئے جانے لگے۔ مولوی ریل کو مولانا سے عقیدت ہوگئی۔ جس کے ذریعہ بتوفیق خداوندی اصلاح ہوئی۔ اور عارف باللہ بن گئے۔

مولوی ریل علوم متداولہ کی تکمیل نہیں کر سکے، مستقل طور سے سنبھل سرائے ترین سکونت پزیر ہوئے۔ مولانا عبدالوحید کی ہمشیرہ سے عقد ہوا۔ ان کے بطن سے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چاروں کے عقد سنبھل ہی ہوئے۔ حضرت مولانا محمد حیات سنبھلی شیخ الحدیث حیات العلوم۔ اور مولانا وقاری عبدالمعید سنبھلی کو آپ کے داماد ہونے کی نسبت حاصل ہے۔

مولوی ریل کی وجہ تسمیہ

حسن پور ضلع مراد آباد کی تحصیل ہے جو سنبھل سے ۳۵ کلومیٹر فاصلے پر واقع ہے۔

مولوی ریل (محمد صادق) کا بسلسلہ درس وتدریس حسن پور قیام رہتا وہ حسن پور سے نماز عصر پڑھ کر سنبھل کے لئے چلتے۔ اور ایک گھنٹہ میں ۳۵ کلومیٹر کا سفر پیادہ طے کر کے نماز مغرب سنبھل ادا کرتے۔ لوگوں کو ان کی اس تیز رفتاری میں شک ہوا۔ تو آپ نے سنبھل کے لوگوں کو حسن پور کی تازہ پکی ہوئی گرم روٹی لا کر دکھائی۔

اس کی تصدیق ہونے پر ۳۵ رکلومیٹر کا پیادہ سفر ایک گھنٹہ میں طے ہونے کا یقین آ گیا۔ ایک دفعہ مولانا عبدالوحید صاحب کو سفر کے ارادے سے سنبھل حاتم سرائے ریلوے اسٹیشن پہونچنے پر یاد آیا کہ لوٹا گھر چھوٹ گیا، مولوی ریل آپ کو ٹرین میں سوار کرانے ہمراہ گئے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ سرائے ترین کا حاتم سرائے اسٹیشن سے ۷ رکلومیٹر کا فاصلہ ہے مولوی ریل نے مولانا سے کہا کہ میں ابھی لا کر دیتا ہوں اسٹیشن سے چل کر مولانا کے گھر سرائے ترین سے لوٹا لے کر واپس ہوئے تو ٹرین چھوٹ رہی تھی کھڑکی سے مولانا کو لوٹا دیدیا۔ گویا ۱۴ رکلومیٹر کا سفر صرف پانچ منٹ میں طے کرلیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات لوگوں کی زبان زد ہیں۔

مولوی ریل جہاں بزرگ، عارف باللہ، ولی کامل تھے ساتھ ہی ساتھ بارعب اور ایسے شجاع تھے کہ خوف آپ کے نزدیک نہیں آتا۔ پہلوان، لحیم وشحیم بڑے قدر آور شخص تھے۔

وہ عازم حرمین شریفین تھے اور یہ شاہ سعود سے قبل کا زمانہ تھا۔ سفر اونٹ سے طے کر رہے تھے۔ عرب کے بدو مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے مولوی ریل کو اونٹ پر سوار دیکھا تو تعاقب کا ارادہ کیا مولوی ریل نے ان کے بدارادہ کو بھانپ لیا ہمت اور نہایت بلند حوصلہ سے کام لیا اور پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ اور بدوؤں سے کہا میں تمہاری گرفت میں آنے والا نہیں میرا تعاقب مت کرو۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب

نہیں ہو سکتے وہ اس طمع میں رہے کہ ہم غالب آ جائیں گے۔ اور اسباب ہاتھ لگ جائے گا۔ مولوی ریل نے ان سے کہا اچھا تو تم دو باتوں میں سے ایک کرو۔ بھاگ (دوڑ) کر مجھے گرفت میں لو، یا مقابلہ کے لئے میدان میں آ جاؤ، بدوؤں نے اس خیال سے کہ بھاگنے ودوڑ میں ہم سے آگے نہیں نکل سکتے باہم دوڑ طے پائی، مولوی ریل نے جیسے ہی اونٹ کو بھگایا بدو چند قدم دوڑ پائے تھے کہ مولوی ریل دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھوں سے غائب ہو گئے اور نجات پائی۔ ایک دفعہ جنگل میں ایک ساتھ دو بھیڑیے ملے چونکہ بھیڑیا کان کا بہت کچا ہوتا ہے مولوی ریل نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ان دونوں کا کان پکڑ لیا۔ اور خوب گوشمالی کرتے ہوئے دونوں کے درمیان کچھ دور چلے پھر چھوڑ دیا۔

میرا بچپن تھا قریب ۷/۸ سال کی عمر ہوگی مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی ریل ہمارے محلّہ کی مسجد کی فصیل پر خاص کر بعد نماز عصر بیٹھا کرتے تھے۔ اور میں بھی ہم عمر بچوں کے ساتھ ہوتا۔ بچے مولوی ریل سے کہتے یارب دانت دکھادو، ان کے دانت مصنوعی تھے، وہ بچوں کی دلجوئی کے سبب دانت دکھاتے اور بچہ یارب کہہ کر پکارتے۔ جیسا کہ مولوی ریل کے نام سے مشہور تھے۔ ویسے ہی یارب کے نام سے مشہور تھے۔ درس وتدریس کے بعد ان کا سارا وقت نماز، روزہ، تلاوت، میں گزرتا اور لوگوں کی خاطر مدارات میں صرف کرتے ہر چھوٹے بڑے سے کشادہ جبیں سے ملتے اور ہر طبقہ میں ہر دلعزیز تھے وہ نورانی وروحانی پیکر ۱۹۶۴ء میں مولائے حقیقی کو پیارے ہو گئے۔ سرائے ترین کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا محمد اجملؒ

سنبھل کے ایسے علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے جس کے آباء واجداد میں بہت سے حضرات مرتبہ علم وکمال پر فائز ہوئے۔

حافظ وحاجی محمد اکمل شاہؒ کے گھر ۱۵ رمحرم ۱۳۲۲ھ کو پیدائش ہوئی اور ترک برادری

سے تعلق تھا۔ نام محمد اجمل رکھا گیا۔ والد محترم کی تربیت کے ساتھ تعلیم کا آغاز ہوا۔ دینیات کی کتابیں والد محترم اور بڑے تائے مولوی افضل شاہؒ سے حاصل کی اور نانا جان مولانا محمد عماد الدینؒ سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

پھر مرادآباد مدرسہ نعیمیہ میں چلے گئے زمانۂ طالب علمی میں وہاں مولانا محمد نعیم الدینؒ کے دولت کدہ سے خاص ربط قائم ہوا۔ اور مولانا کی شفقت کا مرکز بنے خارجی اوقات میں بھی اکتساب علم کیا جامعہ نعیمیہ کے مخصوص طلباء میں شمار ہوئے۔ علوم متداولہ کی تکمیل کی اور ۱۳۳۹ھ میں جامعہ نعیمیہ سے فراغت حاصل ہوئی فراغت کے بعد مزید دو سال تک شعبہ افتاء اور دیگر علوم وفنون کی تکمیل میں مشغول رہے۔

علم طریقت سے بھی لگاؤ تھا بایں وجہ مولانا الحاج الشاہ محمد احمد رضا خاںؒ سے شرف بیعت حاصل ہوا اور مولانا شاہ حامد رضا خاںؒ اور مولانا شاہ سید علی حسینؒ اشرفی کچھوچھوی نے اجازت خلافت بیعت سے سرفراز کیا۔

۱۳۴۴ھ میں مسجد جہان خاں والی میں ایک مدرسہ قائم کیا اس کا نام مدرسہ اسلامیہ حنفیہ رکھا اور کار تعلیم کا آغاز کیا اور کئی سال تک بلا معاوضہ درسی خدمات انجام دیں پھر ۱۳۴۹ھ میں اس کا نام مدرسہ اہل سنت اجمل العلوم تجویز کیا۔ تیس سال تک درس و تدریس کا شغل رہا اور ساتھ ہی افتاء کا کام بھی انجام دیا۔

علمی کمال وفضائل کے ساتھ تقریر وخطابت میں یکتائے روزگار تھے۔ دور دراز تقریر کیلئے بلائے جاتے مولانا صرف صاحب علم اور علم دوست ہی نہیں تھے بلکہ ان میں انتظامی قابلیت اور دنیوی سوجھ بوجھ بلا کی تھی انہوں نے اپنی خداداد فراست اور دور اندیشی سے ایسی عمدگی سے کام انجام دیا کہ ان کی خدمات نے علمی حلقوں میں متعارف کرا دیا ان کا مزاج خالص علمی تھا اور اپنی استعداد کا سکہ بٹھایا۔ اپنے زمانہ کے مشاہیر میں سے تھے علماء کی مجلس میں ہوئے۔ تو صدر نشیں! مولانا عقائد میں اپنے مسلک

کے ہم نوا ہی نہیں بلکہ پیشوا و مقتدا تھے!

تصنیفات: (۱) ردسیف یمانی (۲) عطر الکلام (۳) قول فیصل (۴) اجمل المقال (۵) فوٹو کا جواز در حق عازمان سفر حجاز (۶) ریاض الشہداء (۷) ردشہاب ثاقب (۸) فیصلہ حق و باطل۔ طائفہ حنفیہ۔ یہ کتب مطبوعہ ہیں۔ غیر مطبوعہ کتب میں فتاویٰ اجملیہ سات جلدوں میں ہے۔

۲۸ / ربیع الاول ۱۳۸۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ہمیشہ کیلئے جہان خاں والی مسجد مدرسہ اجمل العلوم میں میٹھی نیند سلا دیئے گئے۔

شیخ محمد حیات سنبھلی

سنبھل کی مذہبی تاریخ میں اہم اور دلچسپ باب ان ہستیوں کا تذکرہ ہے جنھیں عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جن کی معرکۃ الآرا تصانیف سے تشنگان علوم نے سیرابی حاصل کی جن کا فیض ہند و پاک سے تجاوز کر کے بحر و بر سے نکل کر عرب اور دوسرے ممالک پہونچا ان ہستیوں میں سے ایک شخصیت حضرت شیخ الحدیث محمد حیات صاحب نقشبندی خلیلی سنبھلی بانی جامعہ عربیہ حیات العلوم کی ہے حق تعالیٰ نے آپ کو ذہانت و قابلیت صلاحیت اور غیر معمولی دماغی قوت اور پر خلوص علم وحدیث کی خدمات سے روشنی اور تابانی بخشی تھی حضرت شیخ محمد زکریا صاحب سہارنپوریؒ کے انتقال کے بعد سے ہندوستان میں ۱۴۰۸ھ تک حضرت مولانا حیات صاحب کی سند حدیث سب سے اعلیٰ تھی۔ چونکہ آپ براہ راست حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مکی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور حدیث کی سند براہ راست حاصل ہوئی آپ کی شخصیت علوم عقلیہ و نقلیہ اور علم حدیث کا آخری ستون تھا۔ آپ کی زندگی ہمیشہ درس و تدریس اور تصحیح کتب تصنیف و تالیف میں گزری آپ علماء کبار کے مرجع اور علماء اسلام کے سردار تھے تمام علوم ظاہری میں کامل دسترس رکھتے تھے آپ کا ستارہ عروج

پر تھا۔ آپ ہم درسوں اور ہم چشموں پر ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہے ماہر علماء اور راسخ ٹھوس علماء پر فوقیت رکھتے تھے مختلف فنون میں آپ کو بڑی مہارت تھی تصنیفی کارنامے آپ کی زندہ یادگار ہیں آپ نے اپنی تصانیف میں نیا رنگ پیدا کیا جس سے تمام کتابیں نفع بخش اور مقبول ہیں اور تصانیف ملک اور بیرون ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

پیدائش

سنبھل محلہ سرائے ترین ۱۵ر فروری ۱۸۷۶ء میں بروز چہار شنبہ بوقت صبح پیدائش ہے آپ کے والد ملا ظہور ایک نیک طینت متقی اور زاہد شخص تھے آپ کے چند لڑکے پیدا ہوئے۔ سب فوت ہو گئے ملا ظہور صاحب آخر شب میں صالح اولاد کی دعا مانگا کرتے حق تعالیٰ نے ان کو تین لڑکیاں اور ایک لڑکا عطا کیا وہ لڑکا اللہ کو فوراً پیارا ہو گیا جب کہ ملا ظہور صاحب خود اس بچہ کو غسل دے رہے تھے۔ پڑوس کے ایک بزرگ جن کا نام نیاز اللہ خاں تھا۔ ملا ظہور صاحب کے مکان میں تشرف لائے ملا ظہور صاحب کی کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا تو بڑا صابر ہے۔ خدا تعالیٰ تجھ کو نعم البدل عطا کرے اب کے نومولود بچہ کا نام میں رکھوں گا چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کو ایک لڑکا عطا کیا تو نیاز اللہ خاں نے اس بچہ کا نام محمد حیات رکھا۔ آپ کی تربیت پر اول دن ہی سے ایک خاص توجہ رہی جس کے نتیجہ میں بچپن ہی سے تحصیل علوم کا ذوق موجزن ہوا آپ نے ابتدائی تعلیم محلہ چکلی مدرسہ علوم شرعیہ میں حاصل کی چونکہ فطرتاً ذہین تھے۔ بہت ہی کم مدت میں ابتدائی فارسی و عربی پڑھی پھر امرتسر مدرسہ نعمانیہ مسجد شیخ بڈھانہ میں داخل ہو کر دو سال تک مصروف تعلیم رہے۔ علمی ارتقاء مطلوب تھا۔ علمی تشنگی سے سیرابی حاصل نہیں ہوئی جس کے سبب متعدد مدارس میں علمی تشنگی بجھانے کے لئے داخل درس ہوتے رہے۔ اس کے بعد ضلع علیگڈھ شہر مینڈھو تشریف لائے وہاں مدرسہ یوسفیہ میں شرح جامی تک کی تعلیم حاصل کی چونکہ آپ کو علم میں کمال مطلوب تھا۔ آپ کو ان مدارس میں

سیرابی حاصل نہیں ہوئی طلب علم کا جذبہ موجزن تھا۔ جس نے مظاہر علوم جانے پر آمادہ کیا۔ اساتذہ سے رخصت لے کر مظاہر علوم میں داخلہ لیا۔ شروع ہی سے آپ تحصیل علم کے دل دادہ تھے۔ علمی جواہر زمانہ طالب علمی ہی میں نمایاں تھے۔ مظاہر علوم کے تمام اساتذہ کی توجہ آپ کی طرف خاص کر حضرت علامہ مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مکی سے شرف تلمذ حاصل ہوا انھوں نے اپنی تربیت میں لے لیا۔ ایسے محقق کے سایہ نے تعلیم و تربیت میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا بیس سال کی عمر میں تمام علوم عقلیہ ونقلیہ اور علم حدیث سے فراغت حاصل کی۔ مولانا فرمایا کرتے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اس وقت میں بذل المجہود تصنیف فرما رہے تھے حدیثوں کے ماخذ اور استخراج کیلئے کتابیں حضرت مولانا محمد زکریاؒ سے نکلوایا کرتے گویا کہ وہ اس **بذل المجهود** کی تصنیف میں معاون رہے پھر مولانا اپنے وطن سنبھل تشریف لے آئے یہاں کے قیام کی مدت میں حضرت تھانوی صاحبؒ کے ترجمہ قرآن کا حاشیہ نور القلوب کے نام سے لکھا جو آج کل کراچی سے طبع ہوا ہے یہ حاشیہ بھی آپ کی دوسری تصانیف کی طرح مقبول خاص وعام ہے۔ آج کل ہندوستان میں نایاب ہے اس عرصہ میں آپ کا عقد ہوا، اس عقد کے بعد سہارنپور مدرسہ مخزن العلوم تدریس کی خدمت کیلئے مقرر ہوئے۔ دوماہ کے بعد سہارنپور کے اساتذہ کرام کے ایماء پر لاہور تشریف لے گئے مدرسہ نعمانیہ چھتری بازار دو سال مسلسل تدریس کی خدمت انجام دیکر تشنگان علوم کو سیراب کیا۔ مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مکی کا حکم پہونچا رنگون چلے جاؤ۔ حکم ملتے ہی آپ رنگون تشریف لے گئے۔ وہاں شعبہ دینیات کی نظامت آپ کے سپرد کی گئی رنگون تدریسی خدمت کے ساتھ بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں میزان شعرانی کا ترجمہ اور حالت اکمال الشیم بہت قابل ذکر ہیں۔ رنگون سے دو سال بعد لاہور بلا لیا گیا۔ اسی طرح یہ چلتا پھرتا کتب خانہ علم وفضل کا آفتاب علم نبوت کی شعاؤں سے روشن کرتے ہوئے جامعہ عربیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کی مسند تدریس پر

جلوہ فگن ہوکر علم وحدیث ومعقولات ومنقولات سے تشنگان علوم کو سیراب کرتا رہا۔
یہاں ابھی دوسال ہی گزرے تھے کہ دارالعلوم میرٹھ عرصہ دراز سے آپ کی تدریس کی
خدمت کے لئے اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ اس کی مسند کو قرار بخشا پھر دوسال
مطبع مجتبائی دہلی میں تصحیح کتب کی خدمت میں مصروف ہوکر سیکڑوں کتابوں کی تصحیح فرمائی
اہل علم حضرات ان سے مستفیض ہوتے رہے ہیں اس کام سے فراغت پر مدرسہ اشرفیہ
ٹانڈہ کو قدم بوسی کا شرف بخشا لیکن وہاں کی آب وہوا ناموافق رہی وہاں سے مدرسہ
مصباح العلوم بریلی کیلئے تشریف لے گئے دوسال گلشن مصباحی کو گلزار بنایا کہ اچانک
جامعہ قاسمیہ نگینہ نے آپ کی خدمت تدریس کیلئے دامن پھیلایا آپ نے قدم رنجہ
فرمایا مگر جامعہ قاسمیہ کی خارجی فضاء آپ کی حساس طبیعت کیلئے ناگوار ثابت ہوئی جامعہ
قاسمیہ کو غم فرقت دینا پڑا۔ پھر مدرسہ امدادیہ مرادآباد نے بصد ناز مسند حدیث کیلئے منتخب کیا
چنانچہ بائیس سال تک درس حدیث سے تشنگان علوم کو سیراب کرتے رہے۔ اس کے
بعد حضرت کی چشم بصیرت مجاہدانہ بحث نے شہر مرادآباد کے محلّہ پیرزادہ کو اپنی مجاہدانہ
صلاحیتوں اور خداداد استعداد وتصرفات کو بروئے کارلانے کے لئے اور اصلاح کے
لئے منتخب کیا۔ باشندگان محلّہ جہالت کی گھٹاٹوپ تاریکیوں اور بدعات ورسومات
میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آپ کی مساعی جمیلہ وہ رنگ لائی کہ اس محلّہ سے بدعات
ورسومات کا خاتمہ ہوگیا۔ اور آپ ہی کے اسم گرامی پر ایک محلّہ کا نام حیات نگر رکھا گیا۔
اسی محلّہ میں آپ کا مکان ہے۔

حیات العلوم

۱۳۷۵ھ میں جامعہ عربیہ کی بنیاد رکھی گئی حضرت شیخ کی عظیم شخصیت اور آپ کا
درس بخاری شہرۂ آفاق تھا۔ نیز شہر کے عوام وخواص میں مقبولیت حاصل تھی۔ جوں
ہی جامعہ کی بنیاد رکھی گئی تمام شہر کی توجہ جامعہ کی طرف ہوئی ادھر طلبہ تشنگان علوم کی

جوق در جوق آمد شروع ہوئی حیات العلوم کی ترقی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ ابتداءً یعنی پہلے سال سے (دورہ) بخاری شریف صحاح ستہ کا درس شروع ہوگیا۔ شیخ محمد حیات صاحب خود مسند درس حدیث بخاری شریف پر متمکن ہوئے۔

آپ کی دوراندیشی تبحر علمی نے وقت کے جید علماء کا جامعہ میں تقرر کیا۔ جیسے مولانا عاشق الٰہی بلندشہری، مقیم (مدینہ منورہ) مولانا بشیر احمد مبارک پوری، مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی وغیرہ۔ بہت ہی کم مدت میں جامعہ نے تمام ارتقائی مناظر طے کئے اور تعلیم کا معیار بہت بلند رہا اور خود شیخ محمد حیات صاحب نے ۳۳ برس تک حیات العلوم میں بخاری کا درس دیا۔

آپ کے شاگرد

آپ کے ہزاروں تلامذہ ہندو پاک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ارشد تلامذہ میں سے حضرت مولانا فخر الحسنؒ مرادآبادی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مولانا گل محمدؒ ناظم تنظیم و ترقی دارالعلوم دیوبند مولانا عاشق الٰہی بلندشہریؒ مقیم مدینہ منورہ وغیرہ۔

آپ کی تصانیف

(۱) بہار فردوس (۲) انوار القلوب حاشیہ مترجم قرآن شریف حضرت تھانویؒ (۳) نور الانوار کا حاشیہ بعنوان سوال و جواب (۴) نسائی شریف کا حاشیہ (۵) تجرید بخاری (۶) بہار صنعت و حرفت (۷) ہدایۃ النحو کی شرح (۸) سعیدیہ شرح کافیہ پر کتاب معرکۃ الآراء تصنیف ہے جیسا کہ نحو میں کافیہ کو وہ حیثیت حاصل ہے۔ جو سورج کو کواکب پر وہی حیثیت کافیہ کی شروحات میں سعیدیہ کو حاصل ہے۔ تمام مدارس میں عام ہے۔ اساتذہ و طلباء مستفیض ہوتے ہیں۔ انکے علاوہ اور تصانیف و شروحات ہیں جن کی تعداد قریب سو (۱۰۰) ہے۔ تمام کتابیں نفع بخش اور مقبول ہیں۔ ملک و بیرونی ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضرت مولانا عبدالمالک صاحب

حیات العلوم کی بنیاد کے بعد حضرت مولانا عبدالمالک مکی ہندوستان تشریف لائے تو حضرت شیخ محمد حیاتؒ سے ملاقات ہوئی۔ دونوں بزرگوں کے مابین یہ ملاقات روحانی کشش کا مظہر ہوئی شیخ محمد حیاتؒ قطب زماں مولانا عبدالمالک کے دست مبارک پر بیعت ہوئے دوسرے ہی دن خلافت بھی عطا کی ۱۹۶۵ء میں بیت اللہ زیارت کیلئے تشریف لے گئے تو ملاقات پر مولانا عبدالمالک نے سند کی اجازت دی۔ شیخ محمد حیات کو سند حدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مکی سے حاصل تھی بلاواسطہ آپ کے شاگرد تھے۔

اولاد

آپ کے دولڑکیاں اور تین لڑکے (۱) مولانا محمد زکوۃ قلزم خلیلی شیخ کی حیات میں حیات العلوم کا نظم ونسق چلاتے رہے۔ شیخ کی وفات کے بعد اہتمام اور تمام تر ذمہ داریاں آپ پر ہیں۔ (۲) حاجی محمد برکات ہیں (۳) قاری محمد الیاس ہیں جو جامعہ حیات العلوم میں قرآن کریم کی تدریسی خدمت ۱۳۷۶ھ سے انجام دے رہے ہیں۔

حلیہ مبارک

طویل القامت چوڑا جسم تھا۔ رنگ گندمی۔ آپ کا کلام مختصر بڑا موثر ہوتا تھا۔ ایک ایک لفظ علیحدہ ہوتا۔

وفات

۱۷رنومبر بروز شنبہ بوقت ۲ر بجے ۱۹۸۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا مرادآباد محلہ پیرزادہ مقبرہ شیخ علاؤالدینؒ کی کروٹ میں ہمیشہ کیلئے میٹھی نیند سو گئے۔ قطعہ تاریخ وفات

ان الملك العليم يرفع العلم يرفع العلماء (آپ کی تاریخ وفات حضرت بھی ہے)

شیخ محمد حیاتؒ کی تصنیفات کی تفصیل

(۱) تعلیقات علی سنن ابی داود۔

حدیث شریف کی مشہور کتاب ابوداؤد شریف پر یہ ایک جامع حاشیہ ہے۔

(۲) تعطیر المشام ترجمہ اردو بلوغ المرام۔

بلوغ المرام حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب کا آسان اور سلیس زبان میں اردو ترجمہ ہے۔

(۳) تجرید بخاری اردو۔

یہ کتاب بخاری شریف کی احادیث تجرید اور ان کا اردو ترجمہ ہے۔ نیز اس کے شروع میں مولانا نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ جس میں امام بخاریؒ کے حالات، صحیح بخاری کی تاریخ اور اس کی مجموعی احادیث کی تعداد ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے جلد اول صفحات (۳۹۲) اور جلد ثانی کے صفحات (۴۳۲) ہیں اور مقدمہ کے صفحات (۷۶) ہیں اس کی اشاعت کتب خانہ الٰہی بخش جلال الدین لاہور ۱۹۳۲ء میں ہوئی ہے۔

(۵) نظم الدرر خلاصہ نخبۃ الفکر۔ نخبۃ الفکر اصول حدیث کی مشہور کتاب کا آسان زبان میں خلاصہ اور ترجمہ ہے۔

(۶) نور القلوب یعنی قرآن شریف مترجم بدو ترجمہ۔

اس ترجمہ کا تعارف ناشر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ اس میں زیر متن پہلا ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی کا ہے۔ دوسرا ترجمہ حضرت تھانویؒ کا ہے حاشیہ پر حضرت مولانا محمد حیات صاحب نے معتبر کتب اور مستند تفاسیر سے نہایت مفید مضامین جمع کئے ہیں۔ ناشر نے اس پر جو کلام کیا ہے وہ ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ ہم اس کو ترک کرتے ہیں البتہ اس تفسیر میں جن عنوانات پر کلام کیا وہ یہ ہیں۔

(۱) نزول کلام (۲) ربط الکلام (۳) توضیح الکلام (۴) متعلقات الکلام (۵)

نکات الکلام (۶) فقہ الکلام (۷) لغات الکلام (۸) روایات الکلام (۹) خواص الکلام (۱۰) فضائل الکلام (۱۱) تاریخ الکلام۔

اس تفسیر کے شروع میں ۳۰۶ صفحات پر ایک مقدمہ ہے اور تفسیر کے ۸۴۴ صفحات ہیں ماہ محرم الحرام ۱۳۵۴ھ میں اس عظیم کام کی تکمیل ہوئی اور شعبان ۱۳۷۳ھ میں مطبع مجیدی کانپور سے طبع ہوئی۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی نے کتابت کے فرائض انجام دیئے۔

(۷) نوٹ مختصر المعانی۔

یہ کتاب بحث مسند سے اطناب تک کے مضامین اور سوالات و جوابات کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے۔ مئی ۱۹۳۷ء میں کتاب لکھی گئی اور مطبع مجیدی کانپور سے شائع ہوئی (۱۱۲) صفحات ہیں سائز ۲۰/۲۶ ہے۔

(۸) شرح نور الانوار۔

یہ نور الانوار کی تلخیص و خلاصہ ہے ۱۳۵۶ھ میں مطبع مجیدی کانپور سے طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ (۱۶۴) صفحات پر مشتمل ہے۔

(۹) سعید الوجود ترجمہ شرح مسلم الثبوت۔

یہ کتاب اصول فقہ کی مشہور کتاب مسلم الثبوت کی شرح ہے۔ یہ کتاب بھی مطبع مجیدی سے شائع ہوئی۔

(۱۰) کفایۃ النحو شرح ہدایۃ النحو۔

اس کتاب کے بارے میں فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ رقمطراز ہیں کہ مولانا محمد حیات صاحب ایک پرانے تجربہ کار فن تدریس کے ماہر استاد ہیں انھوں نے متعدد کتب کے تراجم فرما کر طلبہ پر احسان فرمائے ہیں زیر نظر کتاب ہدایۃ النحو کا ترجمہ بھی ایسے طریقہ سے کیا ہے کہ قلیل الاستعداد طلبہ بھی بہت سہولت سے سمجھ سکتے ہیں متعدد بار یہ شرح مطبع مجیدی کانپور سے شائع ہوئی۔

(۱۱) اسرار الاسرار فی تشریح نور الانوار۔

یہ کتاب سوالات و جوابات کے طرز پر لکھی گئی ۱۳۵۴ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ (۳۱۴) صفحات پر مشتمل ہے یہ بھی مطبع مجیدی کانپور سے شائع ہوئی۔

(۱۲) بہار صنعت و حرفت۔

اس کتاب کا پورا نام رفع النقب عن وجہ النسب والکتب ہے۔ بہار صنعت و حرفت سے مشہور ہے۔ اس میں صنعت و حرفت، تجارت، وزراعت کی ترغیب، اور تمام جائز مروجہ پیشوں کی تفصیل کتاب وسنت کی روشنی میں کی گئی ہے اسکا پہلا ایڈیشن قومی کتب خانہ بریلی سے شائع ہوا صفحات (۱۱۱) ہیں۔

(۱۳) مواہب رحمانی ترجمہ اردو میزان شعرانی۔

یہ کتاب علامہ عبد الوہاب شعرانی شافعی کی تالیف میزان شعرانی کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کے شروع میں ۳۵ صفحات پر ایک مقدمہ ہے جس میں اجتہاد و استنباط۔ تقلید مطلق و شخصی پر کلام کیا ہے۔ ۱۳۴۳ھ میں شیخ الٰہی بخش کے کتب خانہ سے طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔ (۵۰۷) صفحات اور سائز ۲۰×۳۰ پر مشتمل ہے۔

(۱۴) تحفۃ المبلغین۔

یہ کتاب مبلغین حضرات کیلئے نصائح و پند سے آراستہ ہے۔ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ گجراتی اور بنگالی، تامل زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۱۵) ترجمہ شمس المعارف الکبریٰ۔

یہ کتاب تصوف و سلوک کی مشہور و معروف کتاب شمس العارفین کا اردو ترجمہ ہے یہ چار جلدوں میں مکمل ہوا اور کتب خانہ الٰہی بخش جلال الدین لاہور سے طبع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔

(۱۶) ترجمہ بخاری شریف مکمل۔

بخاری شریف کا ترجمہ اردو مکمل ہے۔ بقول مصنف بمبئی سے طبع ہوا۔

(۱۷) مختصر سیرت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

(۱۸) ترجمہ طحاوی شریف

(۱۹) بہار فردوس

(۲۰) ترجمہ اردو شموس الانوار۔

یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور کتب خانہ الٰہی بخش جلال الدین لاہور نے شائع کیا ہے۔

(۲۱) حاشیہ جلالین شریف عربی۔

(۲۲) شرح قطبی اردو

(۲۳) شرح تلخیص المفتاح اردو

(۲۴) شرح سبعہ معلقہ اردو

(۲۵) تذکرہ شیخ عطاء اللہ اسکندری۔

شیخ عطاء اللہ اسکندری کے اس کتاب میں مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں۔

(۲۶) ترجمہ تفسیر حسینی دو جلدوں میں تکمیل ہوکر مطبع مجیدی دہلی سے شائع ہوا۔

(۲۷) ترجمہ شامی اردو، شامی جلد اول کا یہ ترجمہ مطبع مجیدی دہلی سے شائع ہوا۔

(۲۸) ترجمہ فتاویٰ شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

(۲۹) ترجمہ نور الایضاح مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

(۳۰) حاشیہ پنج گنج اردو

(۳۱) حاشیہ اردو شرح تہذیب

(۳۲) شرح حجۃ اللہ البالغہ اردو

(۳۳) شرح گلستاں۔

(۳۴) شرح بوستاں۔

(۳۵) حاشیہ اردو علم الصیغہ۔

(۳۶) اخوان الصفاء۔

(۳۷) حواشی بہشتی زیور۔

یہ حواشی پاکستان سے ایچ ایم سعید کمپنی چوک کراچی سے شائع ہو چکے ہیں ۱۹۶۶ء کا مطبوعہ نسخہ دستیاب ہے۔

(۳۸) شذرات شرح مرقات۔

علامہ فضل حق خیرابادی کی مشہور کتاب مرقات کا اردو ترجمہ وتوضیح ہے۔ متعدد بار یہ کتاب طبع ہو کر مقبول عام ہوئی ہے۔

اخیر میں حضرت مولانا محمد حیات کی صرف ایک کتاب پر لکھی گئی تقاریظ کو سپرد قلم کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اکابر کی نظر میں بھی حضرت کی وقعت تھی۔ چنانچہ سعیدیہ شرح کافیہ کے متعلق تقاریظ ملاحظہ ہوں۔

تقاریظ:

حضرت شیخ الشیوخ منبع الفیوض نا متناہی آیہ من آیات الٰہی حکیم الامت مصور علوم خفی وجلی عالی جناب مولانا حافظ حاجی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی۔

از اشرف علی، مشفقانم سلمہم اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم محبت نامہ معہ حل اردو کافیہ منت بخش یاد آوری ہوا دل سے دعا دی آج کل میری طبیعت عوارض کی وجہ سے مضمحل زیادہ ہوگئی ہے اس لئے زیادہ کام نہ کرسکا صرف نکرہ ومعرفہ جو کہ مختصر بحث تھی دیکھی چونکہ شارح کا فضل وکمال مسلم ہے اس لئے اس کی خوبی میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا اور آپ کے حسن نیت افادہ طلبہ نے اس کی باطنی خوبی یعنی برکت میں اضافہ کر دیا اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور شرح کو مفید فرمادے البتہ عرض کرنا ضروری ہے کہ طلبہ اس کے محض مطالعہ کو کافی نہ سمجھیں بلکہ

کسی استاذ ماہر سے سبقاً سبقاً پڑھیں خصوصاً اس لئے بھی کہ اس میں بعض باتیں اوپر کی کتابوں کی بھی آ گئی ہیں اور شاذ و نادر کچھ طباعت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں اور کتاب میں نے منت و مسرت کے ساتھ قبول کر کے مدرسہ میں داخل کر دی ہے کہ آپ کو بھی خیر جاری کا ثواب ملتا رہے۔ والسلام

تقریظ:

مجموعہ برکات حق مبین وحق آگاہ عالی جناب

مولانا و مولوی مفتی محمد کفایت اللہ صاحب عم فیوضہ

صدر جمعیۃ العلماء ہند و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی۔

کافیہ عربی میں علم نحو کی ایک مشہور و مقبول اور متداول کتاب ہے جو تمام عربی مدارس میں داخل نصاب ہے عربی زبان میں اس کی شروح و حواشی بکثرت موجود ہیں مگر کافیہ پڑھنے والے ہندوستانی طالب علموں کیلئے وہ چنداں مفید نہ تھے ان کیلئے تو اردو زبان میں شرح یا حاشیہ درکار تھا اسی وجہ سے متعدد علماء نے اس طرف توجہ کی اور اردو میں کافیہ کی شروح و حواشی کا سلسلہ شروع ہو گیا جناب حاجی محمد شفیع صاحب خلف الصدق جناب حاجی محمد سعید صاحب مرحوم و مغفور مالک مطبع مجیدی کانپور نے بھی بروقت اس ضرورت کا احساس فرمایا اور جناب فاضل علامہ مولانا محمد حیات صاحب سنبھلی دام فیضہ سے کافیہ کی ایک مبسوط اردو شرح تیار کرا کے سعیدیہ کے نام سے شائع فرما دی میں نے بھی اس شرح کا جستہ جستہ مقامات سے مطالعہ کیا مولانا محمد حیات صاحب نے طلبہ کے افادہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے متوسط درجے کی شرح تحریر فرمائی ہے جو نہ زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے قوی امید ہے کہ طالبعلموں کو اس کے مطالعہ سے بہت فائدہ ہوگا اور جناب حاجی شفیع صاحب کو ان کی مخلصانہ مساعی اور بذل زر اور مولانا محمد حیات دام فیضہ کو ان کے علمی افادے و افاضے کا اجر عظیم ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ دہلی۔ ۲ رشوال ۱۳۶۰ھ

تقریظ:

شیخ الادب والفقہ ماہر علوم حقہ زبدۃ العلماء والفضلاء عالی

جناب مولانا محمد اعزاز علی صاحب دامت برکاتہ

مدرس مدرسہ عربیہ دارالعلوم دیو بند

حامداً و مصلیاً و مسلماً امابعد

میں نے سعیدیہ شرح کافیہ مصنفہ عالی جناب مولانا محمد حیات صاحب سنبھلی صدر المدرسین مدرسہ عربیہ امدادیہ مراد آباد کو اکثر مقامات سے دیکھا یہ کتاب حامل المتن ہے اس کی شرح اردو میں ہے شارح علام سے اس کا انتساب اس کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے ترجمہ سلیس اور نہ اس قدر مختصر کہ کافیہ کا مطلب سمجھنا دشوار ہو اور نہ اس قدر طویل کہ وادیٔ ناپیدا کنار کا مصداق ہو کافیہ کے ہر ضابطہ کے لئے ایسی عام فہم مثالیں دی گئیں ہیں کہ محروم ازلی طلبا کے علاوہ ہر طالب علم جو کچھ بھی اہلیت رکھتا ہے کافیہ کے علمی خزائن سے بہرہ ور ہو سکتا ہے میں دعا گو ہوں کہ موفق حقیقی مترجم اور شائع کنندگان کو جزائے خیر عطا فرمادیں آمین۔ محمد اعزاز علی عفی عنہ

تقریظ:

وحید الدھر فرید العصر محبی و مکرمی عالی جناب مولوی مفتی محمد وصی علی صاحب ملیح آبادی زاد اللہ مجدہ و کرمہ

ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

وسابق مدرس اول مدرسہ جامع العلوم پٹکا پور کان پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم میں نے کتاب سعیدیہ شرح اردو کافیہ کو بغور دیکھا فی الحقیقت مولانا مولوی محمد حیات صاحب نے کافیہ کے مشکل مقامات کو سہل اور سلیس اردو میں اس طرح کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اردو جاننے والے طلبہ

کیلئے کافیہ بالکل آسان ہوگئی ہے موصوف نے جس قدر مشقت اور عرق ریزی سے مسائل نحویہ کو تحقیق و تدقیق کر کے عام فہم اردو میں بیان کر دیا ہے اس کا اندازہ اس کے دیکھنے ہی سے ہوسکتا ہے کافیہ پڑھانے والوں کو اس شرح سے بہت مدد ملے گی اور اگر دو تین بار بالاستیعاب اس شرح کا مطالعہ ہو جائے تو علم نحو کی کافی استعداد پیدا ہو جائے گی۔ فقط

محمد وصی علی ملیح آبادی، عفی عنہ

تقریظ:

مجمع خوبی صوری و معنوی عالی جناب مولانا مولوی ابوالعماد شبلی صاحب دامت فیوضہ
مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

فن نحو میں علامہ ابن حاجب کی کتاب کافیہ اپنی جامعیت اور مسائل نحو پر حاوی ہونے کے باعث عربی خواں حلقوں میں کافی شہرت اور مقبولیت رکھتی ہے چونکہ اس کا اختصار اور حد سے بڑھا ہوا اعجاز اکثر اوقات طلبہ کے لئے تشویش و اضطراب کا موجب ہوتا تھا اس لئے ضرورت متقاضی تھی کہ مشکل اور پیچیدہ مقامات کی تشریح و تفصیل کر دی جائے چنانچہ عربی میں اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں لیکن جہاں تک یاد ہے اردو میں اب تک اس کی شرح نہیں لکھی گئی تھی خوشی کی بات ہے کہ مولوی محمد حیات صاحب سنبھلی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور سعیدیہ کے نام سے کافیہ کی ایک جامع اور مفصل شرح لکھ کر مسائل نحو کے فہم اور افہام کی ایک آسان راہ پیدا کر دی ہم نے کتاب کو مختلف مقامات سے دیکھا اور محسوس کیا کہ مصنف ممدوح نے مشکل اور الجھے ہوئے مسائل کے حل اور سلجھاؤ کی قابل داد کوشش کی ہے اور اب اس کے مطالعہ کے بعد کافیہ کا سمجھنا بہت آسان ہوگیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر سے نوازے اور طلبہ کو اس سے بیش از بیش فوائد حاصل ہوں۔

ابوالعماد شبلی مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۲؍اگست ۱۹۴۱ء

تقریظ

وارث الانبیاء سعادت انتباہ عالی جناب مولانا مولوی خلیل اللہ صاحب دامت برکاتہ
صدر مدرس و مہتمم مدرسہ مطلع العلوم ریاست رامپور

کتاب سعیدیہ شرح کافیہ اردو کو احقر نے جا بجا دیکھا طلبہ کے لئے بہت مفید معلوم ہوئی ایضاح المطالب کو مع شئ زائد لیا۔ ضروری ضروری باتیں جو دیگر شروح میں ایک جگہ نہیں ملتی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں مولوی محمد حیات صاحب سنبھلی کی عرق ریزی کا بہترین نتیجہ ہے مطبع مجیدی نے عمدہ کاغذ پر چھاپا ہے باوجود اس کے قیمت بھی ارزاں ہے طالب علم کو اس کے مطالعہ کے بعد بہت سی شرحوں سے استغناء حاصل ہو جاتا ہے۔ احقر نے جا بجا مطالب طلباء کو دکھائے انہوں نے پسند کیا زیادہ

والسلام مع الاکرام، الراجی الی اللہ
محمد خلیل اللہ عفا عنہ اللہ۔ مہتمم مدرسہ مطلع العلوم۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد حیات صاحب کی شخصیت جامع کمالات تھی۔

مولانا حبیب احمد شاہ جہاں پوری سنبھلی

مولانا حبیب احمدؒ کے والد محترم جناب حاجی کریم بخش ہیں۔ آپ دار العلوم دیوبند کے فضلاء میں سے ہیں نیز حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہم عصر ہیں، اور حضرت موصوف سے بیعت بھی تھے بیعت کے ساتھ محبت وعقیدت ہی نہیں بلکہ والہانہ تعلق بھی تھا۔

مولانا حبیب احمد صاحب کی سنبھل آمد

حضرت قاری عبد الحق صاحب کے والد محترم جناب عبد اللہ صاحبؒ جب سنبھل

سے شاہ جہاں پور جاتے تو حاجی کریم بخش ؒ کے دولت خانہ پر قیام پزیر ہوتے تجارت کے سلسلہ میں عبداللہ صاحب کا ایک مدت تک قیام رہا، جس کے نتیجہ میں باہم تعلقات یگانگت کے ہوگئے اور محبت کسی عزیز قریب سے کم نہ تھی۔ یہاں تک کہ دونوں حضرات کی اولاد میں یہ سلسلہ قائم رہا، ۱۹۰۸ء میں حضرت قاری عبدالحق صاحب حضرت مولانا حبیب احمد صاحب کو سرائے ترین سنبھل ہمراہ لائے اور آپ مولانا شاہجہاں پوری کے نام سے متعارف ہوئے۔

مدرسہ شمس العلوم

اس وقت اکبری مسجد میں ایک مکتب تھا، جو مدرسہ قرآن کے نام سے موسوم تھا بستی کے علم ودوست حضرات جیسے مولانا فقیر محمد خاں، اکرام اللہ صاحب، نیز حکیم محمد مبین خاں اور دیگر حضرانے مولانا حبیب احمد صاحب کی آمد پر مدرسہ قرآن کو منتقل کیا۔ اور موجودہ شمس العلوم کی آراضی خرید کر مدرسہ شمس العلوم قائم کیا، اور ۱۳۳۵ھ میں جناب مولانا حبیب احمد صاحب کو مہتمم مقرر کیا، اس وقت سے ۱۳۷۷ھ تک بحسن وخوبی اہتمام کی ذمہ داریاں پوری کیں اور ۱۹۵۹ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے جناب حافظ محمود صاحب مہتمم قرار دئے گئے ۱۹۷۳ء تک اہتمام کی ذمہ داریوں پر فائز رہے، آج بھی حافظ محمود صاحب بقید حیات ہیں اور یہ خاندان شاہ جہاں پوری کے نام سے متعارف ہے۔

مولانا مبارک حسین سنبھلی

(از قومی آواز ۴ر دسمبر ۱۹۸۶ء)

مولانا مبارک حسین صاحب ۱۸۷۸ء میں سنبھل کے محلّہ دیپا سرائے میں پیدا ہوئے والد کا نام شیخ احمد حسین تھا جو کھانڈ کے کاروباری حضرات میں انتہاء متمول درجہ رکھتے تھے پورے ایک موضع کے زمیندار تھے مذہبی رجحانات کے حامل اور فارسی کا اعلیٰ

ذوق رکھتے تھے۔

مولانا مبارک حسین نے ابتدائی تعلیم وطن میں ہی حاصل کی تھی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک پشاوری عالم بھی اتالیق مقرر کیے گئے جنھوں نے اپنے طالب علم کو فلسفہ منطق اور ہیئت پر عبور حاصل کرایا ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور دورہ حدیث پڑھا ۱۹۱۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

(ماخوذ از تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم مرتبہ سید محبوب رضوی ص ۱۱۴)

دارالعلوم دیوبند میں مولانا نے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا وہ ایک ذہین حساس اور سعادت مند طالب علم تھے مولانا محمود حسنؒ صاحب نے اپنے شاگرد کی فطری صلاحیتوں کو بھانپ لیا، اوران کی تربیت پر خصوصی توجہ دی یہ مولانا کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ ان کے دل میں بھی جذبہ حریت موجیں مارنے لگا، جو استاذ کا طرہ امتیاز تھا، انہیں خطابت کا ذوق طالب علمی کے زمانے سے ہی تھا مطالعہ ومشاہدے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی اور سنجیدگی آ گئی تھی اور یہ مرد مجاہد جذبہ قومی سے سرشار ہوا تھا دریں اثنا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی جوان کے ہم جماعت وہم سبق تھے کی صحبتوں نے ان کے دل میں مناظرہ کا ذوق بھر دیا، اور وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز مناظر کی حیثیت سے معروف ہو گئے ۱۹۱۲ء کے مناظرے میں جو بریلی میں ہوا اور جس میں مولانا ثناء اللہ اور بہت سے مقتدر علماء شریک تھے مولانا مبارک حسین نے اپنی جماعت کی نمائندگی کی اور زبردست کامیابی حاصل کی یہیں انہیں شیر اسلام کے خطاب سے نوازا گیا ۱۹۱۵ء میں انہوں نے خورجہ میں قاسم العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو آج بھی اہم دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس زمانے میں دارالعلوم میرٹھ میں صدر مدرس کی ضرورت پیش آئی تو مولانا مبارک سنبھلی صاحب کو وہاں صدر مدرس کی حیثیت سے بلایا گیا اس طرح ۱۹۱۹ء میں خورجہ سے میرٹھ

منتقل ہو گئے یہ وہ زمانہ تھا، جب تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا، مولانا مبارک حسین جو مولانا محمود حسن جیسے عالم جیالے مجاہد کے شاگرد رشید تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک مختلف اسفار میں شریک رہے تھے اس تحریک سے دامن کیسے بچا سکتے تھے، وہ نہ صرف یہ کہ اس تحریک میں شامل ہوئے بلکہ مجاہدانہ سرگرمیوں اور جوش عمل کے باعث قافلہ سالار بن گئے۔ انہیں ضلع میرٹھ کی خلافت کمیٹی کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا اسی زمانے میں شہر کے مختلف رہنماؤں ومجاہدوں کی گرفتاری کی وارنٹ جاری کر دیئے گئے، مولانا کا نام سرفہرست تھا، یہ بات بھی مشہور ہے کہ ان گرفتاریوں کے خلاف شہر میں بغاوت کے اعلان کے لئے جامع مسجد کے میناروں پر نقارے رکھے گئے اس اسکیم کے منتظمین میں مولانا بھی شامل تھے اس لئے مولانا کی سیاسی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی گئیں، دارالعلوم کے مہتمم ایک ریٹائرڈ پولیس سب انسپکٹر تھے۔ انہیں مولانا کی سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں پہلے تو انہوں نے مولانا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملنے پر ڈرانے دھمکانے کی سعی کرنے لگے۔

مولانا کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے انھیں مدرسہ سے سبکدوش کرنے کی جرأت تو ان میں نہ تھی، اس لئے ۱۹۲۰ء میں مدرسہ کے بند کرنے کا اعلان کر دیا، اس اعلان سے عوام میں انسپکٹر کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، اگلے ہی جمعہ کو مولانا مبارک حسین نے سلطان ناصر الدین محمود کی تعمیر کردہ عالی شان وسیع جامع مسجد میں مدرسہ چلانے کی استدعا کی۔ یہ استدعا ایک عظیم الشان جلسے میں کی گئی جس میں انہیں مدرسہ کا ناظم اعلیٰ بھی مقرر کیا گیا۔ اس طرح ادارہ دارالعلوم میرٹھ کا قیام عمل میں آیا جو اب تک قائم ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مونا تحریک آزادی میں پورے جوش وجذبے کے ساتھ شریک تھے اور مدرسے کے انتظام وانصرام کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے۔ انھوں نے نہایت ہمت وجرأت کے ساتھ ان حالات کا سامنا کیا ایک زمانہ تک انہوں نے مدرسہ سے کوئی

مشاہرہ نہیں لیا۔ بلکہ اکثر مواقع پر اپنی طرف سے مدد بھی کی۔مدرسہ کے سلسلے میں انھوں نے رنگوں اور برما کا بھی سفر کیا اور اسے ایک یادگار ادارہ کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہے۔مدرسہ میں جب طلباء کی تعداد بڑھنے لگی اور عمارت تنگ نظر آنے لگی، تو مولانا نے محلوں میں کچھ مکانات کرائے پر حاصل کر کے ضرورتوں کی تکمیل کی حاکم وقت چونکہ ان سے خفا تھے۔اس لئے ان مکانوں کے مالکوں و وارثوں کو تنگ کیا جانے لگا، مجبور ہو کر مولانا نے شہر کے وسط میں محلہ مشائخاں میں ایک وسیع قطعہ آراضی خریدی اور ۱۹۲۵ء میں مولانا انور شاہؒ کے دست مبارک سے دار الطلبہ کا سنگ بنیاد رکھوایا اور بہت جلد اسے سہ منزلہ عمارت کی شکل دے دی۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مدرسہ کی تعمیر میں غیر مسلم حضرات نے بھی عطیات دیئے یہ عمارت یادگار شیخ الہند کے نام سے موسوم ہے۔

جب جمعیت علماء ہند کا قیام عمل میں آیا، تو مولانا اس سے پوری طرح وابستہ ہو گئے۔ابتداء میں وہ ضلع میرٹھ کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اس کے بعد مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بنے حضرت مولانا احمد سعید، مولانا سجاد بہاری اور مولانا مفتی محمد نعیم بھی ان کے رفقائے کار میں سے تھے۔اس وقت میرٹھ کشاکش و کشمکش کا اہم مرکز بنا ہوا تھا۔اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف یہاں انگریزی فوج کی زبردست چھاؤنی تھی، تو دوسری طرف انگریز پرست خان بہادروں اور رائے بہادروں کی کمی نہ تھی ان حالات میں مادر وطن کے جیالے سپوت جہاد آزادی کی لو کو تیز کر رہے تھے جن میں مولانا مبارک حسین بھی پیش پیش تھے۔۱۹۳۶ء میں جمعیت علمائے ہند نے کانگریس کی سول نافرمانی تحریک میں شرکت کا فیصلہ کیا۔اور ایک بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گی، اور انتظام کی دیکھ ریکھ کیلئے ڈائرکٹر بنائے گئے تھے کہ سلسلے وار گرفتاری کے مشن کو جاری رکھیں اس تنظیم میں مولانا کا نمبر چوتھا تھا، نمبر آنے پر انھوں نے تحریک کے نظام کو اپنے ہاتھوں میں لیا نتیجے میں خود بھی گرفتار کر لئے گئے ان کی یہ گرفتاری دہلی کے ایک جلسے میں ولولہ انگریز تقریر کرنے

کے دوران عمل میں آئی اس کے بعد جب وائسرائے کی کونسل کی نشست کیلئے نواب زادہ لیاقت علی خاں امیدوار ہوئے تو ان کے مقابلے میں جمعیت علمائے ہند نے محمد احمد کاظمی کو اپنا نمائندہ بنایا۔ اور انتخاب کی تیاری کے سلسلے میں مولانا محمود حسن میرٹھ آئے اور دارالعلوم میں قیام کیا، انھوں نے مولانا مبارک حسین کو اس الیکشن کا انچارج مقرر کر دیا۔ تو مولانا نے یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی اور تندہی سے انجام دیا۔

جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے اتحادی فوجوں کے جنگ میں شرکت کا اعلان کر دیا جمعیت علماء ہند نے اس اعلان کی مخالفت کی اور اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا، مجوزہ اجلاس میرٹھ میں منعقد کرنے کی بات طے ہوئی۔ چنانچہ جمعیت کا یہ اجلاس دارالعلوم میرٹھ کی شاندار عمارت میں منعقد ہوا جس میں مولانا محمود حسن کے علاوہ ہندوستان بھر کے مقتدر علماء شریک ہوئے۔ یہ وہی تاریخی اجلاس تھا۔ جس میں مولانا عبیداللہ سندھی برسوں کی جلاوطن کے بعد شامل ہوئے۔ مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف بھی شریک جلسہ تھے۔ اس جلسہ میں بے مثال بے خوفی بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ میں غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا گیا۔

مولانا سنبھلی علم وعمل کا پیکر اور یقین محکم کی مجسم تصویر تھے۔ ایک طرف انہوں نے ملک وقوم کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا۔ تو دوسری طرف درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جو آج بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ مئی ۱۹۴۳ء میں ان پر لو کا حملہ ہوا جو فالج میں تبدیل ہو گیا۔ چند دن صاحب فراش رہ کر ۱۶ر۱۹۴۳ء کو صبح دس بجے راہی ملک عدم ہوئے۔ دارالاقامہ مدرسہ دارالعلوم میرٹھ کے صحن میں سپرد خاک ہوئے۔ ’’زینت آستان دارالعلوم‘‘ سے ان کی وفات کا سن برآمد ہوا ہے۔

مولانا سید احمد حسن سنبھلی

آپ مولانا محمد اسحاق سنبھلی ممبر پارلیمنٹ کے والد محترم ہیں ہمیشہ سے سنبھل کی مردم خیز خطہ زمین رہی ہے اس کی خاک کے ناچیز ذروں نے گوہر ہائے گراں مایہ کو اپنی آغوش میں چھپایا ہے۔ انہیں میں سے ایک مولانا سید احمد حسن ہیں۔

آپ ان چند اشخاص میں سے تھے۔ جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت وفضیلت کے ساتھ علمی حلقوں میں اپنی استعداد کا سکہ بٹھایا آپ اپنے زمانہ کے مشاہیر میں سے تھے! علمی فضائل وکمال کے ساتھ صاحب تصنیف بھی ہیں مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتابوں پر حاشیئے لکھے۔ مولانا محمد حیات شیخ الحدیث وبانی مدرسہ حیات العلوم نے مجھے مولانا احمد حسنؒ کی خدمت میں ایک دستی پرچہ دے کر بھیجا اور کچھ زبانی تذکیر بھی کی تھی پرچہ کا مضمون یہ تھا آپ نے کافیہ کی جو شرح لکھی تھی اس کی طباعت کرالیں اور اگر طباعت نہیں کرا سکیں تو حامل رقعہ کو مسودہ عنایت کردیں۔ ہم طباعت کرالیں گے۔ سوئے قسمتی مولانا احمد حسنؒ کے دولت کدہ پر حاضر ہوا مولانا احمد حسنؒ ایک مدت سے صاحب فراش تھے اتفاق سے مولانا اسحاق صاحب بھی مکان پر نہیں تھے مجھے یاد ہے مولانا محمد حیات نے فرمایا تھا کہ اس شرح میں بہت نوادرات ہیں اپنی نوعیت کی عمدہ شرح ہے طلباء کے لئے مفید ثابت ہوگی لیکن آج تک علم نہیں ہوا کہ وہ محفوظ ہے یا کیڑوں کی نظر ہوگئی کیوں کہ انکی اولاد میں کوئی علم کا دلدادہ نہیں۔ مولانا اسحاق صاحب سیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہیں!

مولانا کو علم طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ ابتداء میں ایک ایسے عارف کامل اور حکیم امراض باطنی سے تعلق ہی نہیں بلکہ شرف بیعت بھی حاصل ہوا جن کے ذریعہ بتوفیق خداوند لاکھوں کی اصلاح ہوئی اور ہزاروں عارف باللہ بن گئے وہ ذات اہل حق کے درمیان

حکیم الامت کے لقب سے جنھیں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام سے دنیا جانتی ہے مولانا کا حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ سے تعلق رہا اور خانقاہِ امدادی میں جہاں امراض باطنی کے مریضوں کا ہجوم رہتا تھا وہاں ایک مولانا سید احمد حسن بھی تھے لیکن فیض صحبت کے رنگ سے خالی رہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا احمد حسنؒ نے حضرت تھانویؒ کو پیر بایزید لکھا، حضرت تھانویؒ نے جواب میں موذی مرید لکھا۔ اس کے بعد سے مولانا کا علمی کارنامہ سامنے نہیں آیا۔ اور ایسی گمنامی کی زندگی گذاری کہ نا آشنا رہے اور ان کی موت وحیات کا پتہ تک نہ رہا۔

مولانا احمد حسن کی تصنیف

کرامات صحابہ

یہ کتاب مولانا احمد حسن سنبھلی کی تصنیف ہے حسب ارشاد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تصنیف کی۔ جس پر خود حضرت تھانوی کی تقریظ ہے وہ لکھتے ہیں!

بعد حمد وصلوٰۃ، میں نے اس رسالہ کو خود مؤلف مولوی سید احمد حسن سلمہ ونعمہ سے حرفاً حرفاً سنا اور جا بجا ضروری اور مفید مشوروں سے متفق طور پر کمی وبیشی کی گئی۔ اس کتاب سے میرا دل اس لئے زیادہ خوش ہوا کہ اس مضمون کو مدت ہوئی ضروری سمجھ کر خود لکھنا چاہتا تھا مگر ہجوم مشاغل سے وقت نہ ملا تو اس ضرورت کو پوری ہوتے ہوئے دیکھ کر جس قدر خوشی ہو تھوڑی ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاهب۔

کتبہ اشرف علی جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ

خاتمے پر مولوی سید احمد سنبھلی تحریر فرماتے ہیں کہ سرسری تلاش اور عدیم الفرصتی میں یہ رسالہ کہ جس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامتیں ہیں خدا کا شکر ہے کہ مکمل ہو گیا ورنہ مکمل نہ تھا کہ بہت بڑا ذخیرہ کرامات جمع ہو جاتا لیکن اب بھی بقدر ضرورت یہ بہت کافی ہے۔ جس دن حضرت سیدنا ہمارے امام حسینؓ کی کرامتیں لکھنا شروع کی تھیں اسی شب میں سیدنا فاطمہؓ اور رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوا اور دونوں کو ایک ہی مکان میں تشریف فرما دیکھا اور جس طرح احادیث میں ہے انشاء اللہ جنت میں بھی ایسا ہی ہوگا جناب سیدہؓ اور رسول اللہ ایک ہی دولت کدہ میں تشریف فرما ہوں گے۔

مولانا حمید الدین سنبھلیؒ

مولانا قاری حمید الدین سنبھلی مرحوم اکابر سنبھل کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے علم و فن کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور جو اپنے زمانہ حیات میں مشہور معروف بھی ہوئے اور قدر و منزلت سے بہرہ ور بھی ہوئے قاری حمید الدین اپنے عہد کے ممتاز عالم اور ماہرین تجوید و قرات تھے انھوں نے درس و تدریس کے ذریعہ علم و فن کی قابل قدر و قابل ذکر خدمت انجام دی اور اپنی غیر معمولی علمیت و لیاقت کا سکہ جمایا انھوں نے حصول علم و فنون کی خاطر ہند اور بیرون ہند کے سفر بھی کیے اور دین کی ترویج و اشاعت نیز علم و فن کے فروغ کیلئے ملک کے مختلف مقامات پر معلّمی کے فرائض بھی خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔

علم و فن کے مرکز سنبھل کے ان گنت جلیل القدر فن کاروں و تخلیق کاروں کی طرح مولانا قاری حمید الدین کے احوال بھی گوشہ گمنامی میں جا پڑتے اور ان کے سوانحی حالات بھی پردہ خفا میں چلے جاتے اگر مولانا امداد صابری دہلوی مرحوم اپنی مشہور تالیف، فیضان رحمت (شائع کردہ مدرسہ صولیہ مکہ معظمہ میں بہت تفصیل کے ساتھ ان کے

حالات کا ذکر نہ فرماتے مرحوم کے صاحبزادے مولانا برہان الدین سنبھلی مدظلہ، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تحریر کے مطابق قاری حمید الدین مرحوم نے حمید السوانح کے نام سے خودنوشت سوانح لکھی تھی جو شائع نہیں ہوسکی حمید السوانح کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے پیش نظر کوائف وحالات اسی خودنوشت سوانح حیات سے ماخوذ ہیں۔

قاری حمید الدین کے مورث اعلیٰ شیخ حسن رضا ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کے بانی شاہ بابر کے ہمراہ ہندوستان آئے موصوف فوج میں رسالہ دار کے عہدے پر فائز تھے شیخ حسن رضا عربی النسل اور عالی نسب تھے انھوں نے سنبھل کے قدیم شاہی قلعہ (کوٹ) میں رہائش اختیار کی سلطنت مغلیہ کے زوال پزیر ہونے کے بعد ان کی پانچویں پشت میں شیخ محمد بخش نے قدیم قلعہ کی سکونت ترک کر کے جدید قلعہ محلہ میاں سرائے میں رہنے کا فیصلہ کیا شیخ محمد بخش کے دوسرے فرزند سراج الدین جو ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے اپنے فضل وکمال کے باعث ملا سراج الدین کے نام سے مشہور تھے۔ یہ قاری حمید الدینؒ کے جد امجد ہیں ملا سراج الدین کے دولڑکے ہوئے بڑے بیٹے حکیم مولوی سعید الدینؒ (پیدائش ۱۸۶۰ء) ۱۸۸۷ء میں ریاست بھرت پور کے والی راجہ جسونت سنگھ کے محکمہ مال کے افسر مقرر ہوئے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کی دوسری شادی نواب زمرد خاں (مرادآباد) کے خاندان کے ایک فرد بخش اللہ خاں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ریاست کے ایک مقام ڈیگ میں دوشنبہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۳ء ایک بچہ کی ولادت ہوئی جس کا نام حمید الدین رکھا گیا۔ بچے کی بسم اللہ چار سال کی عمر میں ہوئی کم عمری میں قرآن پاک ناظرہ مکمل ہوگیا اس کے بعد حفظ قرآن شروع کیا لیکن ۱۹ جون ۱۹۰۱ء کو والدہ ماجدہ داغ مفارقت دے گئیں اور بچہ تعلیم وتربیت کیلئے دادا کے پاس بھیج دیا گیا۔ جہاں ماہرین فن وممتاز اساتذہ کی نگرانی وتربیت میں حفظ قرآن مکمل ہوگیا اور مشہور وتاریخی مدرسہ۔ مدرسۃ الشرع

(سنبھل) میں رسم دستار بندی ادا کی گئی اسی مدرسہ میں انھوں نے عربی اور فارسی پڑھنے کا آغاز بھی کیا ۱۹۱۵ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور وہاں شیخ القراء مولانا عبدالوحید الہ آبادی سے فن تجوید وقراۃ میں دستگاہ حاصل کی اور وہیں دورہ حدیث سے بھی (۱۹۱۷ء) میں فراغت ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا محمود حسن مالٹا میں قید فرنگ کاٹ رہے تھے۔ اور مولانا انور شاہ کشمیری موصوف کے جانشین تھے مولانا حمید الدین نے حدیث بخاری شریف انھیں سے پڑھی۔ دورہ حدیث کی تکمیل اور سند فاضل کے استحقاق کے بعد بقیہ علم وفنون کی تحصیل کیلئے وہ دوبارہ دیوبند گئے اور معقولات کی کتابیں پڑھنے کے علاوہ تجوید وقرأت اور فن طب بھی حاصل کیا پھر علالت کی وجہ سے سنبھل واپس آ گئے۔ بعد ازاں ۱۹۲۰ء میں مرادآباد میں قرأت کی تحصیل وتکمیل استاذ القراً قاری عبداللہ تھانوی کی خدمت میں رہ کر کی اور علم طب کے حصول کیلئے حکیم ہدایت علی لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ ساتھ ہی جامعہ قاسمیہ شاہی کے استاد حدیث مولانا سید فخر الدین سے علم الفرائض کی تکمیل کی ۱۹۲۰ء میں قاری عبدالرحمان مکیؒ اور قاری ضیاء الدین الہ آبادی نے جامع مسجد مرادآباد میں تجوید قرأت کی تکمیل پر موصوف کی دستار بندی کی۔ اسی سال مرادآباد کے مدرسہ طبیہ میں فن طب کی سند تفویض کی گئی ۱۹۳۴ء میں مولوی حمید الدین کو حرمین شریف کی حاضری اور وہاں کے قیام کی سعادت حاصل ہوئی ان کی علم کی تشنگی ابھی بجھی نہ تھی وہاں بھی حصول علم کی خاطر سرگرداں رہے خود نوشت سوانح حیات میں انھوں نے سفر حجاز کی منظر کشی بڑی خوبی سے کی ہے خصوصاً وہاں کے قیام میں فقر وافلاس کے دل دوز واقعات کی روداد درد واثر کے ساتھ بیان کی ہے مولانا اس عنوان کہ بندہ کی دیرینہ تمنا و آرزو یعنی دارالعلوم حرم کے مدرسہ صولتیہ سے فیض خصوصی کا بلاواسطہ حصول کے تحت مدرسہ میں داخلہ اور شیخ القرأ سے استفادے کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

اب تک دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ (زاد اللہ تعالیٰ تعظیماً و تکریماً) کے فیض یافتہ حضرات قراء سے یا ان کے شاگردوں سے بالواسطہ فیض حاصل کیا جاتا رہا لیکن عرصہ سے یہ تمنا و آرزو دل کی گہرائی میں تھی کہ کاش کے اللہ تعالیٰ کوئی ایسا سبب پیدا فرمادیں کہ دار العلوم حرم مدرسہ صولتیہ سے بلاواسطہ فیض یاب ہوا جاسکے یہ کوئی آسان و معمولی آرزو و تمنا نہ تھی کہ جلد حاصل ہوسکتی کہاں یہ ہندوستان کہاں حرم محترم۔ پھر کہاں اتنی وقتی گنجائش۔

غرضیکہ یہ حسرت و آرزو دل کی گہرائیوں میں پرورش پارہی تھی اور ظاہری اسباب کچھ نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص فضل و کرم و بندہ نوازی سے بندہ کو اس عالی مقام پر پہنچا کر سرفراز فرمایا۔ حضرت العلماء مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند مدظلہ العالی نے ایک گرامی نامہ حضرت مولانا شفیع الدین نگینوی مہاجر مکی خلیفہ حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے نام بندہ کو مرحمت فرمایا تھا وہ گرامی نامہ لے کر رباط میں، جہاں موصوف رہا کرتے تھے حاضر ہوا۔ والا نامہ پڑھ کر موصوف بے حد خوش ہوئے اور بندہ سے، بہت محبت اور خلوص سے پیش آئے اور فرمایا کہ جو کچھ بھی ضرورت و تکلیف ہو ضرور اطلاع کرنا۔ بندہ نے اپنی یہی آرزو و تمنا کا اظہار کیا کہ مدرسہ صولتیہ سے بلاواسطہ حصول فیض کا خواہش مند ہوں۔ چونکہ وہاں تک رسائی نہیں اسلئے راہبری فرمائی جائے حضرت مولانا نے فرمایا کہ باب عمرہ پر رئیس القراء مدرسہ شعبۂ تجوید و قرأت صولتیہ مکہ معظمہ رہتے ہیں۔ میں تم کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔

غرضیکہ اس طرح مدرسہ صولتیہ تک رسائی حاصل کی اور وہاں کے شیخ القراء سے استفادے اور حصول علم قرأت کی راہ پیدا ہوگئی۔ موصوف نے لکھا ہے کہ شعبان ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور دو تین دن کے بعد استفادے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ایسے ہونہار اور علم کی سچی طلب رکھنے والے سے کون استاذ متاثر نہ

ہوگا چنانچہ اساتذہ کرام نے ان پر خصوصی شفقت وعنایت کی نظر ڈالی اور دل جمعی سے تعلیم دینے کی سعی کی آخر کار قرأت عشرہ کی تکمیل کے بعد انہیں سند تکمیل سے نوازا گیا۔ ان میں شوق حصول علم اور جذبہ تکمیل فن اس قدر تھا کہ باضابطہ تعلیم کے سلسلے کے علاوہ بھی جہاں اور جب کوئی موقع ہاتھ آتا وہ تشنگی مٹانے کی راہ ڈھونڈ لیتے۔ ایک واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شروع شروع میں جب کہ بندہ مکہ معظمہ پہنچا ہی تھا کہ ایک نوجوان عرب قاری کو قرآن شریف پڑھتے سنا بھلا معلوم ہوا۔ ان کے مکان پر جا کر بندہ نے چند روز ان سے بھی مشق کی اور دریافت کیا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں؟ تو قاری عبداللہ صاحب مدرس مدرسہ صولتیہ کا نام بتایا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک پختہ کار ماہر فن تجوید اور عمر کے اعتبار سے بھی کہنہ سال ایک نوجوان کی شاگردی میں گرانی یا عار محسوس کرنے کے بجائے اس پر فخر محسوس کرتا ہے اسی سے ان کے جذبہ شوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مرحوم نے حصول تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کچھ سال مرادآباد میں بھی قیام کیا اور مطب شروع کیا لیکن ۱۹۲۲ء میں جب ان کے پیر ومرشد مولانا تھانویؒ مرادآباد آئے تو انھوں نے قاری صاحب سے فرمایا۔ علمی مشاغل کے مقابلہ میں یہ چیز (مطب) مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ پیر ومرشد کے حکم پر انھوں نے مطب بند کر دیا۔ اور تدریس میں مستقل مشغول رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء کو مدرسہ محمود المدارس بنارس میں، وہاں کے صدر مدرس کی دعوت پر معلّمی کے فرائض انجام دینے لگے۔

اسی زمانہ میں بنارس میں موصوف کی مساعی جمیلہ سے مشاہیر علماء کے اجتماعات بھی ہوئے جن میں ماہرین فن اساتذہ فارغ شدہ طلباء کی دستار بندی کرتے تھے

۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۴ء کے اجتماعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، قاری عبد الرحمان مکی، قاری ضیاء الدین الہ آبادی اور قاری عبد اللہ مراد آبادی جیسے اکابرین نے شرکت کی تھی۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے بقول۔ مولانا حمید الدینؒ بنارس میں اکابر کے نمائندے تھے۔

ہند اور بیرون ہند کے اسفار اور علم و فن کی نمایاں خدمات انجام دیتے رہنے کے باوجود وطن کو فراموش نہیں کر سکے اہل وطن کی خدمت اور ان میں تجوید و قرأت کی اشاعت کا خیال ان کے دل میں گھر کیے رہا۔ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے مکان کے نزدیک مدرسہ حمیدیہ تجوید القرآن کی بنیاد رکھی اس موقع پر رئیس شہر نواب عاشق حسین خاں مرحوم کی صدارت میں ایک یادگار جلسہ ہوا جس میں ضلع کے سبھی اکابر علماء نے شرکت کی۔ قاری حمید الدین نے اس مدرسہ کے فروغ اور علم تجوید و قرأت کی اشاعت کی لئے پوری زندگی وقف کر دی ۱۹۴۹ء میں قاری عبد اللہ صاحب کی ایماء پر غیر منقسم صوبہ سرحد کے مشہور شہر عیسیٰ خیل میں واقع مدرسہ معین الاسلام میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کی غرض سے کچھ مدت کے لئے سنبھل سے جدا ہوئے۔ اسی طرح کچھ عرصہ دہلی کے مشہور مدرسہ صدیقیہ میں بھی قیام کیا اور تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔

قاری حمید الدین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام فضل و کرم سے نوازا تھا۔ انہیں اپنے عہد کے جید علماء و ممتاز اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف عطا ہوا۔ اکابر وقت اور ماہرین فن سے استفادے کے موقع ملے۔ اس کے ساتھ ہی وہ خوش الحانی کی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے۔ جہاں جاتے لوگ گرویدہ ہو جاتے ایک مرتبہ بنارس میں وہاں کے راجہ کی صدارت میں مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا تو موصوف سے اصرار کر کے تلاوت کرائی گئی تلاوت سنتے ہی راجہ ادب سے کھڑے ہو گئے۔

موصوف کو ان معنوی صفات اور کمالات کے ساتھ ساتھ جسمانی وجاہت بھی عطا ہوئی تھی مؤلف، فیضان رحمت کی تصریح کے مطابق۔ موصوف سرخی مائل گورے رنگ اور چوڑے چہرے (ہلکے چیچک کے داغ) کے مالک تھے۔ جسم فربہ آواز سریلی اور بلند تھی۔ نہایت خوش اخلاق اور مرنجان مرنج۔ فیاض و مہمان نواز، خوش لباس اور وقت کے نہایت پابند تھے۔ باجماعت نماز کے اتنے رسیا و عادی کہ سفر میں بھی اس کا اہتمام کرتے۔ شب بیدار اور سحر خیز تلاوت قرآن بکثرت کرتے اور اکثر حفظ پڑھتے رہتے تھے۔ تراویح میں قرآن پاک سنانے کے اتنے پابند تھے کہ مسلسل ۴۵ برس یہ سعادت حاصل کی۔ شدید بیماری کے باعث معذور ہو جانے پر ہی محروم سعادت ہوئے۔

قاری حمید الدین مرحوم نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں اللہ تعالیٰ نے کافی اولادوں سے نوازا لیکن صرف تین اولادیں ہی حیات ہیں ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے۔ بڑے صاحب زادے مولانا برہان الدین سنبھلی جو دار العلوم ندوہ میں استاد اور معروف صاحب قلم ہیں چھوٹے بیٹے سلطان الدین ہیں، جو قمر سنبھلی کے نام سے مشہور شاعر ہیں۔ مولانا قاری حمید الدین نے تقریباً نصف صدی تک علم وفن، دین وقرآن کی خدمت کی اور ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ان کے تلامذہ ارشد کی تعداد کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ خود موصوف نے اپنے مخصوص و ممتاز تلامذہ کی فہرست میں تقریباً پونے دو سو نام شامل کئے ہیں جن میں اکثر نے استاذ کے فن میں قدرت کاملہ بھی حاصل کی۔

مختصر یہ کہ کتاب اللہ کا یہ خادم اور اپنے وقت کا ممتاز عالم علوم وفنون کی طویل و قابل قدر خدمات انجام دینے کے بعد ۲۵ رشوال ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۵ ر مئی ۱۹۵۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔

(اقتباس از عوام اخبار نومبر ۱۹۸۶ء)

مولانا محمد حسن سنبھلی

۱۸۹۵ء میں محلہ دیپا سرائے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صوفی احمد حسنؒ کا ایک نیک، خداترس اور سنبھل کے زمینداروں میں شمار تھا۔ صوفی صاحب کو تصوف سے خاص شغف تھا، خداتعالیٰ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ خود معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن ان کی تمنا و خواہش تھی کہ اولاد در اولاد اور مستقبل میں پورے خاندان کے اندر کوئی بھی جاہل نہ رہے، یا کم تعلیم یافتہ نہ ہو۔ چنانچہ ان کے تین لڑکے اپنے وقت کے جید عالم ہوئے۔ ان میں سے مولانا محمد حسن سنبھلی ہیں۔

مولانا نے درس نظامی کی تعلیم شرح جامی وغیرہ مدرسہ المحمدیہ سنبھل میں مولانا اخلاق رسول صاحب سے پڑھیں۔ ہدایہ وغیرہ مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے سنبھل میں مولانا محمد ابراہیم سنبھلی سے پڑھیں، اسی دوران انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی اور لاہور یونیورسٹی کے بعض عربی و فارسی کے امتحان مولانا خلیل احمد اسرائیلی استاذ علی گڈھ کالج سے اور دیگر اساتذہ سے فارسی پڑھ کر دیئے۔ اور سند حاصل کرنے کے بعد مولانا نے مقامی ہائی اسکولوں میں فارسی استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ جس کی وجہ سے درسِ نظامی کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ملازمت سے مستعفی ہوکر، پھر سے درسِ نظامی کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حصول علم میں مشغول ہوگئے ۱۳۴۵ھ میں باقاعدہ دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ آپ کے دارالعلوم کے اساتذہ میں سے حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پھر آگرہ کی کالج میں کئی سال تک فارسی کے استاذ رہے۔ وہاں کسی بناء پر ملازمت ترک کرکے مرادآباد ہندو انٹر کالج میں فارسی کے

استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ پھر جب ملک آزاد ہوا تو فارسی زبان کو متروک کر دیا گیا تو ۱۹۵۰ء میں مرادآباد ہی کے مسلم کالج کے فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۸۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد مولانا کا قیام گھر پر ہی رہا۔

بقول مولانا منظور نعمانی صاحب، آپ بڑے منظم اصول واوقات کے پابند تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت تھے۔ آپ کا اپنے وقت کے بڑے عالموں میں شمار تھا۔ علم تفسیر وحدیث پر عبور حاصل تھا، جب حضرت مولانا عبدالماجد صاحب کی تفسیر ماجدی پہلی بار شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی تو مولانا محمد حسن بدر نے بنظر عمیق مطالعہ فرما کر مفسر علام کو تفسیر سے متعلق مفید مشورے اور نوٹ ارسال کئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ان کی سپاس گزاری فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن حضرات نے کوتاہیوں پر مطلع کیا ان میں کے ایک مولانا بدر حسن سنبھلی ہیں۔ کہ بڑی مشقت اور تعب اٹھا کر مفصل یادداشتوں سے شکر گزار کیا، بدر صاحب تفسیر کے علاوہ تاریخ پر بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ولادت نبویؐ اور معرکہ کربلا کے موضوعات پر ایک قلمی مسودہ ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ آپ شاعر بھی تھے، مختلف مقامات پر آپ نے اشعار اور قطعات کہے ہیں، بدر سنبھلی ایک علمی دوست شخص تھے۔ اپنے لئے گمنامی کو پسند کیا اسی وجہ سے شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ تین لڑکیاں چھوڑیں نرینہ کوئی اولاد نہیں تھی۔ وفات ۱۹۷۸ء میں ہوئی اور سنبھل ہی میں دفن ہوئے۔ (الفرقان۔ ہماری زبان)

مولانا انتظام الدینؒ

آپ محلہ کوٹ کے رہنے والے خاندان عباسی سے تعلق رکھتے تھے آپ سادہ لوح نیک طبیعت تھے آپ نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ابتداء آپ قانون گو رہے بعد میں نائب تحصیل داری کے عہدہ پر فائز ہوئے اپنی ذمہ داری کو بحسن وخوبی پورا کیا کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا اور کبھی رشوت لے کر ہاتھوں کو معصیت میں

ملوث نہیں کیا جب ریٹائرڈ ہوئے تو علوم دینیہ حاصل کرنے کا جذبہ آپ کو دارالعلوم دیوبند لے گیا چونکہ آپ فارسی داں تھے اس سے عربی مطالعہ میں مدد ملی۔ چند سال دارالعلوم دیوبند رہ کر وہاں کے نصاب کی تکمیل کی اور بخاری شریف حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی۔ حضرت شیخ آپ کی عمر کا لحاظ کر کے اپنے داہنی طرف تپائی پر بخاری شریف کے درس میں بٹھاتے۔ دیگر اساتذہ بھی رعایت کرتے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد جامعہ حیات العلوم مرادآباد تقرر ہوا، جامعہ میں فارسی وعربی کا درس دیا۔ بندہ نے بھی موصوف سے گلستاں، میزان منشعب پڑھیں ہیں، موصوف طلبہ پر بڑے شفیق تھے سبق میں کوشش یہ رہتی کہ طلبہ کو درس گاہ ہی میں سبق یاد ہو جائے۔ اگر کوئی طالب علم حاضر نہیں ہوتا تو اس کو بلواتے۔ جامعہ کے تمام اساتذہ آپ کی بزرگی کی وجہ سے آپ کا احترام کرتے اور آپ حیات العلوم کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے۔

۱۷ سال حیات العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی تو مولانا معین الدین انصاری کی طلب پر سنبھل مدرستہ الشرع کٹرہ موسیٰ خان تقرر ہوا، ۳ سال تک تدریسی خدمت میں لگے رہے پھر مرادآباد فلاح دارین میں مدرس رہے آپ کا انتقال ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ میں اپنے وطن سنبھل محلہ کوٹ غربی عباسی ٹولہ میں ہوا اور یہیں دفن کئے گئے آپ کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بیوی سے دو لڑکے ہوئے (۱) انوار علی (۲) ابرار علی۔ ابرار علی پاکستان میں مقیم ہیں دوسری بیوی سے ایک لڑکی ہے بقید حیات ہیں۔

مولانا عابد حسین امام فارسی

محلہ دیپا سرائے میں پیدائش ہے۔ سن شعور کو پہنچے تو اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے میں جید علماء سے عربی ابتدائی اور متوسط کتب پڑھیں آخر میں دارالعلوم کی کشش ان کو کھینچ لائی، یہاں چند سال رہ کر علوم کی تکمیل کی اور

دارالعلوم سے فراغت حاصل کی آپ نے زمانہ طالب علمی میں اپنی خداداد ذہانت حصول علم میں غیر معمولی محنت وکاوش اور علمی استعداد کے لحاظ سے ممتاز حیثیت حاصل کی تھی آپ کو علوم متداولہ میں مہارت حاصل تھی لیکن فارسی اور ادب سے زیادہ شغف تھا سنبھل میں آپ کو امام فارسی کہا جاتا ویسے تو آپ کے بے شمار شاگرد ہیں خاص کر نحو وادب میں سینکڑوں شاگرد چھوڑے ہیں اہل سنبھل مسئلہ فارسی میں حضرت مولانا عابد حسین کی طرف رجوع کرتے تھے۔آپ کے درس وتدریس کا عجیب انداز تھا اور یہ کوشش رہتی کہ طلبہ کے ذہن میں بات اتر جائے ایام تعطیل اور خارجی اوقات میں گھر پر درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا، باذوق طلبہ کا آپ کے دولت خانہ پر استفادہ کیلئے تانتا بندھا رہتا طلبہ پر بڑے شفیق تھے، جہاں رہے مقبول اساتذہ میں سے شمار ہوتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں چند سال تدریسی خدمت انجام دی اس کے بعد سنبھل کے مختلف مدارس میں درس وتدریس کے ذریعہ اہل سنبھل کو علمی روشنی بخشی ۱۹۶۹ء میں مدرسہ محمدیہ دارالعلوم روضہ والی مسجد کے صدر مدرس تھے اس وقت بندہ نے اور رفیق قدیم مولوی عبدالستار سلام نے شرح جامی وغیرہ کتب پڑھیں آخر میں مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں میں تقرر ہوا زندگی کے آخری لمحات تک وہیں رہے گویا آپ کی پوری زندگی درس وتدریس میں لگی اور اسی کے ساتھ آپ کی عمر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا اور ۱۹۷۳ء میں وفات پائی۔

حلیہ مبارک

قد لانبا، چہرا چوڑا، رنگ گندمی اور پان کھانے کا زیادہ شوق تھا اور آپ خوش اخلاق متواضع تھے اور آپ کا کلام صاف اور ادیبانہ ہوتا۔

مولانا بشیر احمد صاحب

محلّہ دیپا سرائے میں آپ کا مکان تھا دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے مزاج میں نہایت سادگی تھی والد کے مطیع فرمانبردار تھے جب آپ کے والد مدرسہ سے درس دے کر واپس گھر آتے تو برہم ہو کر کہتے کہ چکی چلاؤ تو مولانا تعمیل حکم کیلئے چکی چلاتے گویا آپ اطاعت مند بیٹے تھے، ہلالی سرائے سراج العلوم میں جہاں جید علماء درس وتدریس میں مشغول تھے وہاں مولانا بشیر احمد صاحب سراج العلوم کے مقبول استاد تھے آپ نے پوری زندگی درس وتدریس میں گزار دی۔

مولانا عبد الرشیدؒ

محلّہ دیپا سرائے کے باشندہ تھے، اس محلّہ میں علماء کی کان ہے۔ سنبھل کے کسی دوسرے محلّہ میں اتنی تعداد و کثرت میں نہیں پائے گئے۔ اسی محلّہ میں زمانہ قدیم کے مشہور علماء میں مولانا کریم بخش و مولانا عبد المجیدؒ متاخرین میں مولانا محمد اسمٰعیل و مولانا قاری شبیر احمد والد مولانا عبد الرحیم سنبھلی، موجودہ علماء میں مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی علیہ الرحمہ قابلِ ذکر ہیں روضہ والی مسجد مدرسہ محمدیہ کے متصل مولانا عبد الرشیدؒ کا مکان تھا۔

ان کی ابتدائی تعلیم وطن سنبھل ہوئی، اور علوم متداولہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور حاصل کئے اور تمام علوم سے فراغت حاصل کی۔ مولانا اپنے ہم سبق طلبہ کے درمیان دورہ حدیث میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے، مظاہر علوم سے بطور انعام کے درس نظامی کے پورے کورس کی کتابیں اور حدیث میں چند شروحات ملیں، مولانا کی عمر کا بیشتر حصہ سرائے ترین مدرسہ شمس العلوم میں گزرا۔ اسی مدرسہ میں میں نے قرآن کریم کی تعلیم پائی یہ میرا بچپن کا زمانہ تھا، میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

ان سے متعلق عربی درجہ پنجم تھا وہ اپنے طلبا پر نہایت شفیق تھے ان کا طریقۂ تعلیم عمدہ تھا۔ ان سے فیض یافتہ حضرات آج بھی ٹھوس استعداد کے مالک ہیں، اور عربی پڑھنے والے حضرات میں مولانا اختر شاہ صاحبؒ اور مولانا حکیم آفتاب علی مدظلہ مولانا ظریف احمد مدظلہ قابل ذکر ہیں۔

اوصاف

نہایت کم گو، پابند شرع، متبع سنت، بزرگ، اوراد و وظائف کے پابند، ان کے تجربۂ علمی سے معاصرین بے خبر تھے، مشکل مسائل میں وہ ان سے رجوع کرتے اور جواب باصواب سے مستفید ہوتے، خواص تو خواص عوام بھی ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے، تدریسی خدمت کے ساتھ سرائے ترین لال مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیئے ایک ہفتہ میں جمعرات کے دن گھر جاتے۔ ان کے انتقال کے بعد سے آج تک لال مسجد کو ایسا متقی، سنجیدہ، گمنامی کی زندگی گزارنے والا، علم وعمل میں کامل انسان میسر نہیں ہوا۔

چند دن کی علالت طبع کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ تاریخ وفات ۱۹۶۸ء محلّہ دیپا سرائے کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

حضرت مولانا مفتی مشرف حسینؒ

آپ محلّہ دیپا سرائے کے باشندہ تھے۔ ابتدائی تعلیم سنبھل وطن حاصل کی اس کے بعد آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ اس وقت کے جید علماء سے پڑھا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے آپ نے بخاری شریف حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ سے پڑھی دار العلوم سے فراغت کے بعد سے تا آخر دم درس وتدریس میں منہمک رہے۔ کئی مدرسوں میں پڑھایا۔ مدرسہ چلہ امروہہ میں آپ شیخ الحدیث

کی حیثیت سے رہے اور بخاری شریف کا درس دیا مدرسہ حیات العلوم مرادآباد میں تقرر ہوا افتاء کا کام کیا اور حدیث شریف کی دوسری کتب صحاح ستہ کا درس دیا۔ نیز گجرات آنند میں بخاری شریف پڑھائی۔ آپ اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے عالمانہ شان آپ کے اندر تھی۔ نہایت پاکیزہ، ہمیشہ علمی کاموں میں لگے رہتے۔ آپ کی اولاد دیپا سرائے میں موجود ہیں مولانا مطلوب حسین قاسمی آپ کے داماد ہیں وفات ۱۹۸۴ء دیپا سرائے میں ہوئی وہیں دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا محمد عثمانؒ

دیپا سرائے میں رہائش تھی۔ ترک برادری سے تعلق تھا۔ حضرت مولانا سلطان صاحبؒ مجاہد آزادی کے بھائی تھے۔ آپ فراغت کے بعد سے مسلسل درس و تدریس میں رہے اور متعدد جگہ پڑھایا جیسے احمد آباد، مدرسہ انجمن معاون الاسلام سنبھل میں تعلیم دی بندہ عبدالمعید نے حضرت موصوف سے انجمن میں پڑھا ہے بایں طور بندہ کو شرف تلمذ حاصل ہے آپ بہت سنجیدہ تھے۔ ان کو علمی ذوق و فن میں مہارت خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ شرافت آدمیت، حسن اخلاق کا پیکر تھے۔ آخر دم تک خدمت دین میں لگے رہے یہاں تک کہ مولائے حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے۔

حضرت مولانا الطافؒ

آپ کا تعلق سرائے ترین کے ترین خاندان سے تھا، مولانا و حکیم محمد آفتاب علی خان صاحبؒ کے آپ ماموں تھے۔ اور مولانا آفتاب علی خاںؒ نے ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ محلہ دربار سرائے ترین گھر تھا۔ عالم ہونے کے ساتھ آپ نے طب بھی پڑھی تھی۔ آپ کا محبوب ترین مشغلہ طب تھا کہ آپ اس کے ذریعہ

خدمت خلق میں مصروف تھے۔ بقول حضرت مولانا آفتاب علی صاحبؒ آپ خوش اخلاق مہمان نواز اور قوم کی فلاح ورفاہ کی تحریک میں پیش پیش رہتے تھے، ان کا مدفن دربار احاطہ مولسری مقبرہ شاہ فتح اللہ ترین ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے۔

مولانا محمد ابراہیمؒ

آپ محلّہ حوض کٹورہ سرائے ترین کے باشندہ تھے۔ یہاں کے قریشی برادری سے تعلق تھا۔ ان کے بھائی جناب عبد الرحیمؒ کو بندہ نے سر کی آنکھوں سے بچپن میں دیکھا ہے۔ اور ملاقات ہوئی ہے۔ ان سے علمیت مترشح ہوتی تھی، ان کے صاحبزادے مولانا ابراہیم کے بھتیجے حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ہمارے تایا جید عالم تھے، اور انھوں نے اعزازی طور سے چند ماہ دیو بند پڑھایا ہے اس کے علاوہ متعدد مدارس میں رہے۔ آخر دم تک درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ مزید کہا کہ ہمارے تایا حضرت تھانویؒ کے ہم عصر تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ ان کے خاندان کے افراد اور اہل محلّہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی بڑا عالم گزرا ہے۔ جس کا یہ اثر ہے کہ خاندان میں علم دوست حضرات ہیں اور اہل محلّہ کے عقائد صحیح ہیں۔ وفات ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور قبرستان ابوسعید دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ بلند سے بلند تر درجات سے نوازے۔

مولانا مرتضیٰ خاں حیات نگری

حیات نگر سنبھل کا ایک محلّہ ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر کاشت کار ہیں اور یہاں کے غیر مسلم بنئے بڑے دولت مند ہیں۔ مولانا مرتضیٰ اسی محلّہ کے باشندے تھے آپ شروع ہی سے ذکی الحس، بڑے شائستہ مہذب تھے، دوسری طرف رنگین مزاجیوں میں بھی کمی نہیں تھی، مولانا نے ابتدائی تعلیم مدرسہ شمس العلوم حاصل کی۔

پھر دار العلوم دیو بند چلے گئے۔ وہاں وقت کے اکابر علماء سے اکتساب علم کیا۔

دار العلوم دیو بند سے فراغت کے بعد فن طب پڑھا، آپ نے آبائی کام کاشت کاری کے ساتھ مطب حکمت (طبابت) کے شغل کو اختیار کیا۔ علمی فضائل کے ساتھ انتظامی امور کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ نیز سیاسی امور میں نہایت سرگرم اور رفاہی کاموں میں پیش پیش رہتے۔ مدرسہ شمس العلوم کے سرپرست رہے اور حضرت علامہ مولانا محمد حیاتؒ نے حیات العلوم کی رکنیت کیلئے آپ کا انتخاب کیا۔ مولانا مرتضیٰ پاکستان کراچی تشریف لے گئے تھے وہاں دوسرا نکاح کیا اس کے بعد سنبھل و کراچی دونوں جگہ قیام رہتا ان کی اہلیہ سے ایک لڑکا ہے، سنبھل کی اہلیہ کے بطن سے کئی اولاد ہیں۔

وفات: بروز پیر ۱۹۹۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور حیات نگر تدفین ہوئی۔

حاجی عبد اللہ شاہ

حاجی عبد اللہ شاہ نو مسلم تھے، سرائے ترین بجیہ قوم سے تعلق تھا مولانا عبد الوحید کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا۔ مشرف باسلام ہو کر (معاش) زندگی گزارنے کیلئے اپنا آبائی شغل پرچون کی دوکان کھولی۔ محلہ جھجراں سرائے ترین مرکز کی مسجد کی دوکان میں کام شروع کیا اور اس کے متصل ایک مکان خریدا، آخر دم تک دوکان کا شغل رکھا حاجی محلہ کے متمول لوگوں میں شمار تھے، سرائے ترین کی مشہور شخصیت اور ممتاز شان حاصل ہوئی۔ پوری بستی سے لوگ سودا خریدنے آتے۔ پڑھے لکھے اور مہذب حضرات کیلئے آپ کی دوکان آماجگاہ تھی۔ بوڑھے کیا جوان بچوں کا تانتا بندھا رہتا دوکان پر عمدہ چیز اور ہر وقت ملتی تھی، بندہ راقم الحروف کا بچپن تھا چونکہ محلہ کی بڑی دوکان تھی سودا بھی خریدا ہے اور ان کی دوکان و مجلس کا پورا نقشہ ذہن میں ہے۔ نماز کے اوقات میں دوکان بند کر دیتے، حق تعالیٰ نے اس دوکان میں بہت کرامت عطا کی یکے بعد دیگرے تین حج کئے۔ ایک مع اہلیہ اور شیر خوار بچہ عبد القوی کے حج کیا۔

حاجی عبداللہ شاہ نے عبدالقوی کا نکاح کرایا اور ولیمہ میں پورے محلّہ کی دعوت ولیمہ کی تھی۔ مولانا عبدالوحیدؒ کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ سے عقد کیا وہ اپنے ہمراہ عبدالحمید کو لائیں تھیں جو مولانا محمد حیات صاحبؒ کے داماد ہیں۔ حاجی عبداللہؒ سے ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی جس کا نام عبدالقوی ہے۔

اوصاف

وہ تہذیب، مکارم اخلاق کے مجسم پیکر تھے۔ مہمان نواز، اور بڑے دلچسپ باغ و بہار کے آدمی تھے، نماز، روزہ کے عملاً پابند مشرف باسلام کے وقت سے ہو گئے تھے۔ غیرت ایمانی وحمیت دینی کی کمی نہیں تھی۔ ان کا ایک وصف مشہور تھا کہ تیل کی کھولتی ہوئی کڑھائی سے ہاتھ سے بغیر کسی آلہ کے پوری نکال لیتے تھے۔ لوگ آپ کی بڑی قدر ومنزلت کرتے۔ دینی امور میں معلومات حاصل کیں، لوگ طرح طرح کے اشکالات پیش کرتے آپ ان کے نہایت عمدہ طریقہ پر جواب دیتے۔ ان کی شخصیت اہل سنبھل کیلئے باعث فخر وناز ثابت ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔ قبرستان ابوسعید میں دفن کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ مراتب ودرجات سے سرفراز فرمائے۔

مولانا وقاری بشیر احمدؒ

آپ محلّہ دیپا سرائے کے باشندہ ہیں اور مولانا عبدالرحیم کے والد محترم ہیں۔ آپ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے شاگردوں میں ہیں۔ قاری صاحب کا علم بڑا پختہ اور مستحضر تھا۔ حق گوئی بیباکی ان کا ممتاز وصف تھا، شریعت حقہ کے مقابلہ میں کسی قسم کی لچک گوارہ نہیں تھی حضرت مولانا وقاری بشیر احمد علمی قابلیت وصلاحیت کا اندازہ ذیل کی منظوم سے بخوبی ہوتا ہے جو انہوں نے فرائض وواجبات وسنن کو اور ان کے اسرار وحکم منظّم کلام میں پیش کیا ہے۔ جو کتابی شکل میں سوم نہانی کے نام سے طبع ہو چکی ہیں۔

اصطلاحات (عقائد)

عقائد ہیں وہ اول جس کی ہے تعلیم فرمائی
اصول دین کی بیشک بہت تاکید فرمائی
ہے توحید ورسالت اور قیامت کا بہت مضمون
یہ تینوں ہی اہم ہیں انہی پر ہے بہت مضمون
عقائد ہی کو سب عالم اصول دین کہتے ہیں
اصول اسلام کے ان کو شریعت کے بھی کہتے ہیں

اعمال

دوم اعمال مخصوصہ ہیں جن کا ذکر فرمایا
کلام اللہ میں موقع بموقع ذکر ہے آیا
مگر اعمال بندوں کے دو قسمیں اپنی رکھتے ہیں
خدا کے حق تو ہیں بندوں پہ بندوں کے بھی ہوتے ہیں
یہ ظاہر میں دو قسمیں ہیں یہ ظاہر میں دورنگی ہے
بباطن سب میں ہے طاعت یہ ظاہر کی دورنگی ہے

حقوق اللہ

جو اللہ کے ہیں حق ان کو حقوق اللہ کہتے ہیں
گہے تہذیب نفس ان کو گہے تزکیہ کہتے ہیں

وجہ تسمیہ

جوکرتا ہے حقوق اللہ ادا وہ خوب کرتا ہے
مہذب نفس کو اپنے مزکی بھی وہ کرتا ہے
بہت تہذیب کی اخلاق سے ہاں رشتہ داری ہے
ملانا دونوں لفظوں کا یہاں پر خوب جاری ہے
حقوق اللہ سے آراستہ اخلاق ہوتے ہیں
ادا کرنے سے ان کے جان و دل آباد ہوتے ہیں

عبادت جانی

کبھی جاں سے ادا ہوتا ہے حق اللہ اے عاقل
کہ جیسے ہے نماز وروزہ ہونا تو نہیں غافل

عبادت مالی

کبھی مال ومتاع سے حق ادا ہوتا ہے اللہ کا
زکوٰۃ اک فرض ہے جیسے یہ حق بیشک ہے اللہ کا
جو ہوتا ہے ادا جاں سے عبادت جانی کہتے ہیں
ادائے حق مالی کو عبادت مالی کہتے ہیں

حقوق العباد

بیان حق میں بندوں کے حقوق اک لفظ لاتے ہیں
عباد اِک لفظ لا کر دونوں کو یکجا ملاتے ہیں
جو حق بندوں کے ہیں ان کو ادا کرنا ضروری ہے
دفع شر بھی ضروری ہے رحم کرنا ضروری ہے
تمدن میں خلل ہوتا ہے دو ہی کام کرنے سے
ظلم کرنے سے اور رحم وکرم کے بند کرنے سے
حسد، کینہ، عداوت، رنج کے باعث ہیں یہ دونوں
اصل قصے قضیئے اور جھگڑے کی ہیں یہ دونوں
نہ ہو گر ظلم دنیا میں منافع بھی رہیں جاری
امن کی زندگی ہو اور تمدن بھی رہے جاری
حقوق عبد کا اس وجہ سے تدبیر منزل بھی
رکھا ہے نام لوگوں نے کہ ہے تدبیر منزل بھی
کریں جو اہل خانہ باہمی حق پر عمل جاری
یہی تدبیر منزل ہے رکھو اس پر عمل جاری
ظلم کرنے سے اور رحم وکرم کے بند کرنے سے
بنے گھر سب بگڑتے ہیں منافع بند کرنے سے
دگر اک نام ہے کہتے ہیں سیاست مدن بھی اس کو
کرے تدبیر شہروں کی حکومت کرنی ہو جس کو
نہ ہو ظلم وستم ہرگز منافع بھی رکھے جاری
امن ہوگا حکومت میں حکومت بھی رہے جاری
تعدی ہو حکومت میں منافع بند ہو جائیں
تو لوٹیں بند حکومت کے جو قابو میں نہیں آئیں

فرض واجب سنّت نفل وغیرہ کا بیان

فرض

جو ہیں مثبت دلیل قطعی سے فرض کہتے ہیں
بلاشبہ جو ثابت ہو اسی کو فرض کہتے ہیں
جو فرضیت کا ہو منکر وہ کافر ہو ہی جاتا ہے
بغیر عذر چھوڑے جو وہ فاسق ہو ہی جاتا ہے
دو قسمیں فرض کی ہیں، فرض ادا کرنا ضروری ہے
کہ فرض عین ہے، فرض کفایہ بھی ضروری ہے
ہے فرض عین نام اس کا جو ہر اک پر ضروری ہے
بغیر عذر چھوڑا اگر تو فاسق بھی ضروری ہے
ادا کرنے سے دو اک شخص کے گر ہو سبکدوشی
کفایہ فرض کہتے ہیں نہ شبہ ہے نہ حق پوشی
اگر ہر شخص نے فرض کفایہ سے جو منہ موڑا
گنہگاری سے شیطان نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا

واجب

دلیل ظنی سے ثابت ہو واجب اس کو کہتے ہیں
کرے انکار جو اس کا نہ کافر اس کو کہتے ہیں
ولے چھوڑے بغیر عذر فاسق کہتے ہیں اس کو
عذاب نار کا ہی مستحق کہتے ہیں سب اس کو

سنت

کیا جس کام کو حضرت نے یا کہ حکم فرمایا
دل وجاں سے صحابہ کا ہوا اس پر یا عمل پایا
اسی کو کہتے ہیں سنت یہ حضرت کا طریقہ ہے
عمل کرتے ہیں اس پر مومنیں جن کو سلیقہ ہے
ہے سنت دو قسم کی جس کی گنتی کی یہی حد ہے
مؤکد ایک ہے ان میں دگر غیر مؤکد ہے
ہمیشہ گر کیا حضرت نے یا کہ حکم فرمایا
نہ چھوڑا بے سبب جس کو عمل دائم ہے فرمایا
مؤکد ہے یہی سنت نہ چھوڑا بے سبب جس کو
گناہ ہے گر کسی نے بے سبب چھوڑا اگر اس کو
کیا حضرت نے اکثر اور چھوڑا بے سبب گا ہے
یہی غیر مؤکد ہے کہ چھوڑا ہے جسے گا ہے
سنن ہیں یہ وہی جن کا زوائد نام جاری ہے
گنہ گرچہ نہیں ان میں عمل میں فضل باری ہے

نفل

فضیلت ہے اگر ثابت عمل ہے گر کوئی ایسا
ثواب ہے اس کے کرنے میں زوائد کا نہیں جیسا

جو چھوڑے گر کوئی اس کو گناہ اس کو نہیں ہوتا
نفل اس کو ہی کہتے ہیں گنہ جس میں نہیں ہوتا
تطوع، مستحب، مندوب بھی سب اس کو کہتے ہیں
عمل کرتے ہیں جو اس پر ثواب و اجر لیتے ہیں

حرام

دلیل قطعی ہووے اگر جس کام سے مانع
حرام اس کو ہی کہتے ہیں رکھے دل میں اسے سامع
کرے کوئی اگر اس کو تو فاسق اس کو کہتے ہیں
اگر ہوئے کوئی منکر تو کافر اس کو کہتے ہیں

مکروہ تحریمی

دلیل ظنی ہووے گر کسی بھی کام سے مانع
تو ہے مکروہ تحریمی اسی کا نام اے سامع
اگرچہ اس کے منکر کو کوئی کافر نہیں کہتا
جو کرتا ہے مگر اس کو گنہ کا مرتکب ہوتا

مکروہ تنزیہی

ثواب ہوتا ہے چھوڑے گر تو ہے مکروہ تنزیہی
نہیں مجرم ہے کرنے پر مگر اک ہے برائی ہی

مباح

نہ ہو اجر و گنہ جس کام کے کرنے نہ کرنے سے
مباح ہے۔ بس وہی خیار ہے کرنے نہ کرنے سے

مولانا عبد الحفیظؒ

محلہ دیپا سرائے روضہ والی مسجد کے قریب آپ کا مکان تھا ابتدائی تعلیم سنبھل میں حاصل کی پھر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور چلے گئے وہاں درس نظامی کی تکمیل کی اور حضرت شیخ الحدیث محمد زکریا صاحبؒ سے بخاری شریف پڑھی، فراغت کے بعد مظاہری کہلائے، علمی اور رفاہی کاموں کے ساتھ دوائیں فروخت کیا کرتے تھے، آپ بڑے دلچسپ باغ و بہار کے آدمی تھے عالمانہ شان آپ کے اندر نمایاں تھی۔ دیپا سرائے سنبھل ہی میں انتقال ہوا۔ داعی اجل کو لبیک کہہ کر آرام کی نیند سو گئے۔ اللہ تعالیٰ مراتب بلند فرمائے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا لائق علی سنبھلی

محلّہ ٹھیر ہلالی سرائے حوض والی مسجد کے نزدیک آپ کا مکان ہے، آپ کے خاندان کے افراد میں جناب محمد شاہد صاحب قابل ذکر ہیں اور منشی مقصود صاحب آپ کے داماد ہیں آپ نے اپنے ابتدائی تعلیم سنبھل میں حاصل کی بعدہ دار العلوم دیوبند چلے گئے وہاں اس وقت کے جید اساتذہ کرام سے اکتساب علم کیا علوم کی تکمیل سے فراغت کے بعد تدریسی لائن میں قدم رکھا اور اس میں کمال حاصل کیا دار العلوم میرٹھ جامع مسجد میں بخاری شریف کا درس دیتے، شیخ الحدیث سے پکارے جاتے، آپ کا اپنے وقت کے جید علماء میں شمار تھا، مقرر ہونے کے ساتھ آپ صاحب تصنیف بھی تھے، آپ کی ایک کتاب (ریان) کا راقم الحروف عبد المعید نے مطالعہ کیا ہے

جس سے آپ کے تبحر علمی کا اظہار ہوتا ہے۔آپ باوقار، ذی علم، علمی فضائل وکمال کے ساتھ یکتائے روزگار تھے۔آپ کی وفات ۱۹۷۵ء کے بعد میرٹھ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے ان کی اولاد میں دو لڑکے ۲ لڑکیاں ہیں ایک مولوی محمد آصف صاحب ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے بندہ کے ہم عصر ہیں اور میرٹھ جامع مسجد میں امامت وغیرہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مولانا سلیمانؒ

آپ حافظ خدا بخشؒ (محلّہ پیلا کھدانہ سرائے ترین سنبھل) کے صاحبزادے ہیں، والد محترم کی تربیت میں رہ کر دینیات وقرآن کریم حفظ کی تکمیل کی۔اور وطن ہی میں ابتدائی عربی تعلیم حاصل کی۔دارالعلوم سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔فراغت کے بعد بسلسلہ کاروبار بمبئی قیام رہا، پھر ہلدوانی مولانا محمد شاہ کے مدرسہ میں مدرس رہے، اور بھی مختلف مدارس میں تدریسی خدمت انجام دی۔۱۹۷۲ء میں سرائے ترین سنبھل میں ایک مدرسہ ناشر العلوم کے نام سے قائم کیا۔ابتداً کار تعلیم مسجد محلّہ پیلا کھدانہ میں کئی سال تک جاری رہا۔

۱۹۸۰ء میں باقاعدہ ناشر العلوم کے نام سے محلّہ پیلا کھدانہ میں مدرسہ کی تعمیر علم میں آئی۔مولانا کی حسنِ نیت وخلوص وللٰہیت اور انتھک کوشش کی، نتیجہ میں کار تعلیم نہایت بہتر رہا اور مدرسہ قلیل مدت میں پروان چڑھا، اسکے فیض یافتہ حفاظ ناظرہ خواں کی بڑی تعداد ہے۔یہ مدرسہ دینی تعلیمات میں سرگرم ہے جو مولانا سلیمانؒ کا یادگار کارنامہ ہے۔

۱۹/اکتوبر ۱۹۸۳ء میں مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات سے سرفراز فرمائے ان کے پسماندگان میں حافظ سراج احمد مقیم بمبئی میرے ہم سبق قابل ذکر ہیں۔

بابو محمد نور

محلّہ پیلا کھدانہ، سرائے ترین کے معزز شخص تھے۔ ان کے اندر عزت نفس خود اعتمادی تھی بلند کرداری کے دلدادہ تھے، عزم وارادہ کے مستقل تھے، ہر حال میں خوش رہنا ان کی زندگی کا نمایاں ترین وصف تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی شمع انجمن بن کر گزاری۔ آپ صاحب املاک وجائداد تھے ان کا شغل چمڑے کی تجارت تھی۔

اسلامی وضع وپوشاک میں ملبوس رہنے کے ساتھ پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ اپنے محلّہ کی مسجد میں پنجوقتہ اذان دیتے۔ خاص کر فجر کی اذان کی بڑی شہرت تھی، ابتدائی وقت میں اذان دیتے۔ بہت اطمینان سے اذان دیتے دور دراز تک آواز جاتی راقم السطور کا غریب خانہ ان کی مسجد سے تین محلے دور ہے میں خود فجر کی اذان کی آواز سنتا تھا۔ اور دوسری مساجد میں بابو جی کی اذان سن کر اذانیں شروع ہوتیں۔ اور راقم السطور کے والد محترم سعد اللہ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ آپ عدلیہ میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک جوری ممبر رہے۔ اور ۱۹۴۷ء میں آپ نے فریضہ حج ادا کیا ان کا تذکرہ نا تمام رہ جائے گا اگر ان کی چھڑی کا ذکر نہ ہو۔ جب چلتے تو چھڑی لے کر چلتے، چال میں متانت وسنجیدگی تھی قدم بھرا ہوار کھتے ۱۹۸۱ء میں انتقال ہوا۔ سرائے ترین میں سپرد خاک کیے گئے۔

پسماندگان میں ۳ لڑکے۔ محمد عرفان، فرقان عالم، سلطان عالم، چھ لڑکیاں۔ محمد عرفان ۱۹۸۵ء کے میونسپل بورڈ کے الکشن میں اپنے حلقہ کے ممبر منتخب کیے گئے راقم السطور سے یگانگت کے تعلقات رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا حبیب اللہؒ استاذ دار العلوم دیوبند

آپ محلّہ کوبجراں سرائے ترین کے باشندہ تھے، بستی کی علمی شخصیت تھی، آپ کا تذکرہ برابر گوش گزار ہوتا رہا ہے لیکن تفصیلی حالات کوشش کے بعد بھی معلوم نہیں ہو سکے، آپ کی فراغت دار العلوم سے تھی۔

نیز دارالعلوم کے درس وتدریس کا آپ کو شرف حاصل ہوا۔ مولانا حبیب اللہ نے تین سال ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دی حضرت مولانا ناظر حسین صاحب مدظلہ مہتمم خادم الاسلام ہاپوڑ نے مولانا موصوف سے دارالعلوم میں سلم العلوم اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ بندہ عبدالمعید مدرسہ شمس العلوم میں قرآن کریم پڑھتا تھا ان کا مکان مدرسہ سے ملا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم موصوف کی اہلیہ (جن کو ملآنی سے یاد کیا جاتا تھا) بقید حیات تھیں اور دولڑکے مولانا نے اپنے پسماندہ گان میں چھوڑے تھے۔ ہماری بستی سرائے ترین سنبھل کے تین عالم دین کو دارالعلوم کی تدریسی خدمت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ (۱) مولانا حبیب اللہ صاحبؒ (۲) مولانا عبدالرحیم صاحبؒ (۳) مولانا عبدالخالق صاحب تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مولانا مفتی محمد حسینؒ

آپ محلہ دیپا سرائے کے باشندہ تھے۔ ان کی عربی ابتدائی تعلیم سراج العلوم ہلالی سرائے میں ہوئی۔ اس کے بعد تکمیل تک مدرسہ اجمل العلوم میں علوم دینیہ وفنون سے فراغت حاصل کی۔ اجمل العلوم میں فراغت کے بعد تقرر ہوا یہاں ایک مدت تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ زندگی کے سات سال تبلیغی کاموں میں گزرے۔ نیز اہل سنت رسالہ کے ایڈیٹر رہے۔ معقولات ومنقولات کا درس دیا۔ مفتی اعظم سنبھل کے نام سے آپ پکارے جاتے تھے، علمی فضائل وکمال کے ساتھ آپ وعظ وتقریر میں بھی یکتائے روزگار تھے، علاقہ اور دور دراز سے تقریر کے لئے بلائے جاتے تھے، بہت سے آپ نے مناظرے بھی کئے۔ ہمیشہ علمی کاموں میں لگے رہے، اہل بریلی کے جید عالم (وپیشوا) رہنما تھے۔

وفات ۱۹۸۳ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے پسماندہ گان میں مناظر حسین صاحب اور مولانا اصاغر حسین صاحب ہیں۔

مولانا مقصود حسین ترکی رح

آپ محلہ میانسرائے کے رہنے والے تھے اور ترک برادری سے تعلق تھا۔
آپ نے ابتدائی تعلیم سنبھل وطن حاصل کی بعدہ دیوبند چلے گئے وہاں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد آپ علمی کاموں میں رہے پھر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں ایک بڑی مسجد میں امامت کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ وعظ و تبلیغ وخطابت کے ذریعہ بندگان خدا کو احکام شریعت بتاتے رہے اور ان میں علمی و دینی روح پھونکتے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں بندہ عبدالمعید نے بمبئی کا سفر کیا تھا تو آپ کا مہمان رہا۔ آپ مہمان نواز، خوش اخلاق اور بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ بمبئی میں آپ کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ مراتب سے سرفراز کرے۔

غلام احمد شوق فریدی (صاحب احسن التواریخ)

آپ کا نام غلام احمد ابن غلام محمد ابن شیخ محمد ابن محمد واصل ابن محمد ابن شیخ محمد ابن الشیخ پیر محمد نجم الدین ابن شیخ محمد ابن کبیر الدین کلہ روان ابن شیخ محمد گنج رواں بن شیخ احمد چشتی بن شیخ نورالدین ابن شیخ علاؤالدین بن شیخ بدرالدین سلمان ابن شیخ فرید الملۃ والدین گنج شکر۔

شوق فریدی محلہ کبیر کی سرائے سنبھل کے ایک علمی و معزز گھرانہ کے تھے جیسا کہ شجرہ سے واضح ہوتا ہے، نام غلام احمد اور تخلص شوق تھا، عربی و فارسی کی تعلیم سنبھل میں حاصل کی۔ اردو زبان میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فارسی و عربی میں دسترس حاصل تھی۔ اپنے وقت کے جید عالم تھے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ درجن کے قریب ہے لیکن نایاب ہیں۔ سنبھل کے تذکروں میں آپ کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف سنبھل کی تاریخ احسن التواریخ کے نام سے

۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا ایک ہی نسخہ پایا جاتا ہے، مصنف مقدمہ کتاب اور اختتام میں خود لکھتے ہیں کہ احسن التواریخ ۴ جلدوں میں نمبروار منظر عام پر آنے والی ہے جن کے مضامین سلطنت اسلام، سلطنت مغلیہ، اورنگ زیب عالمگیر، مقامات ہند مضافات سنبھل، فیروز پور کا قلعہ، نواب امین الدولہ، ریاست ٹونک کے نواب امیر علی، رام پور، وتاریخ مرادآباد درج ہوگی۔ لیکن صرف ایک ہی جلد دستیاب ہے۔ مترجم وقائع عبدالقادر خانی احسن التواریخ کے متعلق لکھتے ہیں کہ غلام احمد شوق فریدی نے سنبھل کی تاریخ احسن التواریخ کے نام سے لکھی ہے جو برقی پریس مرادآباد سے ۱۹۳۵ء میں طبع ہوئی یہ کتاب چندسنی سنائی روایات یا اٹلسوں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

(علم وعمل ص ۱۰۵)

مولانا محمد طاہر

سنبھل کے باون سرائے ۳۶ پوروں میں ایک سکندر پور ہے، مولانا طاہر کی جائے پیدائش سکندر پور ہے، ہوش سنبھالا تو قرآن کریم اور اردو دینیات سکندر پور میں پڑھی۔ فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم روضہ والی مسجد مدرسہ محمدیہ دارالعلوم میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم داخل ہو کر علوم کی تکمیل کی ۱۹۶۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اصلاحی کاموں کی انجام دہی میں سرگرم رہے۔ بعدہ بنگلور چلے گئے وہاں خطابت وامامت کے فرائض کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

مولانا غلام مرتضیٰ خان

غلام مرتضیٰ خان ابن غلام قادر خان متوطن سرائے ترین محلہ پینٹھ اتوار آپ کی ایک زمیندار خاندان میں پیدائش ہے، ہوش سنبھالنے پر تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم سرائے ترین سنبھل میں حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند چلے گئے وہاں اس وقت کے جید علماء واساتذہ سے اکتساب علم کیا اور ان حضرات کی صحبت سے پورا فائدہ

اٹھایا ۱۳۵۳ھ میں دار العلوم داخل ہوئے تھے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف پڑھ کر شرف تلمذ حاصل کیا ۱۳۶۱ھ میں فراغت ہوئی۔ فراغت کے بعد مزید دو سال تک دار العلوم قیام رہا۔ اور علوم کی تکمیل کی۔ اور مختلف امتحانات دیئے جیسے فاضل پنجاب یونیورسٹی و دہلی وغیرہ۔ آپ اپنے وطن سرائے ترین رہے چونکہ آپ ایک بڑے زمیندار تھے زمین کی نگرانی کے ساتھ اصلاحی کاموں میں سرگرم رہے۔ ایک مدت تک مدرسہ شمس العلوم سرائے ترین کے مہتمم رہے بحسن وخوبی اہتمام کی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں سرگرم رہے۔ آپ نے ۳ لڑکے اور چند لڑکیاں چھوڑیں ان میں قابل ذکر عابد خاں صاحب ہیں جو مدرسہ شمس العلوم میں ہمارے ہم عصر رہے۔

مولانا علاؤالدین

آپ قصبہ سیانہ سے سنبھل آئے اور محلہ دہلی دروازہ میں بود و باش اختیار کی۔ ان کی اولاد میں مولانا قطب الدین، فرید الدین، نجم الدین، حکیم مظفر اللہ تھے۔

مولانا عبد اللطیف سنبھلی صدر مفتی حیدر آباد

مولانا عبد اللطیفؒ بن اسحاق حنفی سنبھلی۔ ان کے والد اسحاق صاحب افضل گڑھ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ لیکن والد صاحب نے سنبھل آ کر بود و باش اختیار کر لی تھی۔ سنبھل کو وطن قرار دیا۔ آپ نے ابتدائی کتابیں حضرت مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے پڑھیں، متوسط کتابیں مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھیں مدرسہ شاہی ۱۳۰۴ھ کی روئیداد میں مرقوم ہے کہ آپ نے مشکوٰۃ شریف اور نور الانوار کا امتحان دیا۔ ایک عرصہ تک ضلع رائے بریلی میں تدریسی خدمت انجام دی پھر دار العلوم ندوۃ العلماء میں افتاء و تدریس پر تقرر رہا اور اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے بیعت کا شرف تھا

اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے خصوصی تعلق تھا۔ آپ حجاز تشریف لے گئے تین سال کے بعد جب واپسی ہوئی تو ایک مدت تک خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں قیام کر کے ان سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہے نیز درس وافادہ کے سلسلہ بھی جاری رہا۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں دینیات کی تدریس کے لئے تقرر ہوا اور اس شعبہ کی صدارت پر بھی فائز ہوئے، وہاں سے سبکدوش ہوکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات سے متعلق رہے اور علی گڑھ سکونت پزیر ہوئے۔

حضرت مولانا عبداللطیف سنبھلی نہایت جید الاستعداد اور فاضل شخص تھے۔ حدیث وفقہ میں بہت اچھی دستگاہ تھی۔

تصنیفات

شرح ترمذی، الشرح اللطیف کے نام سے، لطف الباری شرح تراجم ابواب البخاری اور تاریخ القرآن وغیرہ متعدد کتب غیر مطبوعہ تصنیفات ہیں مولانا سید سلیمان ندوی اور قدیم فضلاء ندوہ کی ایک بڑی تعداد کو شرف تلمذ حاصل ہے۔

مولانا عبدالحیؒ نے نزہتہ الخواطر میں اصول حدیث پر ایک کتاب اور مشکلات القرآن اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیرت۔ تذکرہ اعظم، صرف لطیف اور نحو لطیف اور کئی علمی رسائل کا ذکر کیا ہے، جو مولانا عبداللطیف صاحب کی تصانیف ہیں علی گڑھ ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۶/۱۱ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں وفات ہوئی۔ حق تعالیٰ اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے۔

(تاریخ شاہی ص ۵۳۱)

حضرت مولانا ابراہیم صاحبؒ

آپ کے والد کا نام غلام شاہ تھا۔ پیدائش ۱۲۷۴ھ ہے۔ ابتدائی تعلیم وطن سنبھل میں حاصل کی بعدہ ۲۲ سال کی عمر میں ۱۲۹۶ھ میں مرادآباد مدرسہ شاہی میں حصول علم کیلئے داخل ہوئے پہلے سال میں قطبی، شرح وقایہ، مختصر المعانی کتابیں پڑھیں۔

۱۲۹۸ھ میں ملا حسن، مسلم شریف اور کنز الدقائق، مقامات حریری کا امتحان دیا اور شرح عقائد اور حاشیہ جمالی انعام میں حاصل کیں، آپ علمی فضائل وکمال کے ساتھ اپنے دور کے مشہور ومقبول خطیب تھے۔ واعظ الاسلام سے پکارے جاتے تھے نیز ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۳۰ھ تک مدرسہ شاہی مرادآباد کے رکن شوریٰ بھی رہے۔

(روداد، رجسٹر داخل مدرسہ شاہی)

مولانا عبداللہؒ

آپ محلہ جھجھران سرائے ترین کے باشندہ تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن حاصل کی پھر حضرت مولانا عبدالوحید کے ساتھ رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ وحید المدارس میں درس دیا، خانگی امور کی وجہ سے وطن سے باہر نہیں جا سکے مفلسی کی حالت میں زندگی گزاری۔

آپ کم گو، اور حق گو تھے۔ دعوت وتبلیغ کیلئے کسی مقام ووقت کا انتظار نہیں کرتے جہاں ضرورت ہوتی بغیر خوف وخطرہ کے حق بات کہتے، گویا کہ حق گوئی آپ کا نمایاں وصف تھا۔ ۱۹۶۸ء میں انتقال ہوا۔ قبرستان ابوسعید میں سلادیئے گئے۔ حق تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے۔ ان کی اولاد میں محمد مسیح اللہ قابل ذکر ہیں۔

قاری مولانا عبدالمعید سنبھلی

آپ مولانا عبدالوحیدؒ کے صاحبزادے ہیں۔ محلہ جھجھران سرائے ترین سنبھل کی پیدائش ہے نام افتخار رکھا گیا۔ حضرت تھانوی مولانا اشرف علیؒ نے آپ کا نام عبدالمعید منتخب کیا۔ اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ آپ کے والد مولانا عبدالوحیدؒ اپنے وقت کے علامہ ومحقق تھے خاص کر علم ہیئت وفلسفہ ومنطق کے امام تھے۔ مولانا عبدالوحید صاحب نے مدرسہ شاہی مرادآباد، اور دارالعلوم مئو اعظم گڈھ، نیز مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور متعدد مدارس میں تدریسی خدمت انجام دی۔ قاری عبدالمعیدؒ کی تعلیم وتربیت والد محترم کی نگرانی

میں ہوئی۔ ریاست مینڈو ضلع علی گڑھ میں قاری صاحب کا بچپن گزراوہاں فارسی پڑھی،
والد محترم فتحپوری شاہی مسجد میں رہے قاری صاحب ۲ سال زیر تعلیم رہے آخر میں
دار العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ ۵ سال تک اکتساب علم کیا اور تجوید پڑھی دار العلوم مئو سے
۱۳۵۵ھ میں فراغت ہوئی۔

فراغت کے بعد دار العلوم میرٹھ تقرر ہواوہاں ایک سال تک درسی خدمت انجام
دی۔ پھر مدرسہ منبع العلوم قصبہ گلدوٹھی چلے گئے وہاں کے شاگردوں میں قابل ذکر
حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند ہیں نیز مدرسہ
امدادیہ مرادآباد اور مدرسہ سعیدیہ شاہجہاں پور وغیرہ مدارس میں درس دیا۔ مولانا عاشق الٰہی
بلند شہری مقیم مدینہ منورہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
نے مدرسہ مظاہر علوم کی درس وتدریس کے لئے فرمایا تھا۔ لیکن آپ آمادہ نہیں ہوئے۔

الفرقان، رسالہ جب بریلی سے نکلتا تھا اس وقت حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کے
ساتھ رہ کر اشاعت میں کام کیا ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی زد میں آکر بند ہو گیا تو قاری
صاحب ۲ سال اپنے وطن سنبھل میں رہے۔

۱۹۴۹ء میں بمبئی چلے گئے اور کھوکھا بازار مرکز والی مسجد میں امامت وخطابت کیلئے
تقرر ہوا ۳۵ سال امامت وخطابت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۸۵ء میں نقاہت کے
سبب مسجد کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر بمبئی ہی قیام رہا۔ یہاں تک قاریؒ صاحب کی
طالب علمی اور تدریسی سرگرمیوں کا بیان تھا۔

قاری صاحب نے مدرسہ سعیدیہ شاہجہاں پور کے قیام میں فن تجوید میں ایک کتاب
(مصباح النفع فی اصول قراۃ السبع) لکھی۔ اس وقت کے قراء وعلماء کی تقاریظ بھی درج ہیں
وہ کتاب اپنے فن میں نہایت عمدہ ہے قاری صاحب کے انتقال کے بعد اس کی طباعت
ہوئی۔ قاری صاحب ایک بڑے عالم کے بیٹے ہونے کے ساتھ خود بھی صاحب علم،
اور علم کے دلدادہ تھے، ان کو علمی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا۔ علمی فضائل وکمال

کے ساتھ تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ قاری صاحب کو ابتداً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ مہاجر مدنی سے شرف بیعت حاصل ہوا پھر اجازت بیعت سے سرفراز ہوئے خلافت کی سند پاکر حضرت شیخ کے خلیفہ ہوئے، قاری صاحب اوراد ووظائف کے پابند تھے، تقویٰ وطہارت میں آپ اپنی نظیر تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے بڑی کشادہ جبینی سے ملتے، اور غصہ گرمی کرنا، ڈپٹنا، تو جانتے ہی نہیں تھے۔ قاری صاحب انتہائی سنجیدہ مزاج، ہر دل عزیز، نمونہ اسلاف، ظاہر سنت کے مطابق اور فرشتہ صورت تھے قاری صاحب بمبئی سے ہر دو سال بعد مع اہل خانہ وطن سرائے ترین آتے اور ایک دو ماہ قیام کرتے ۱۹۸۹ء میں ۴ ماہ قیام کیا ۱۹۹۰ء میں قریب ایک سال قیام رہا۔ میں نے یعنی راقم الحروف (عبدالمعید) نے قاری صاحب کو اسی حالت پر دیکھا اور ان کی کمال نیکی کا اول دن سے معترف ہوں۔

وطنی ومعاشرتی مذاق کا اشتراک سبب محبت وارتباط ہے۔ قاری صاحب سے قرابت بعیدہ تھی لیکن یگانگت ومحبت کے تعلقات کسی عزیز وقریب سے کم نہیں تھے قاری صاحب نہایت شفقت ومحبت سے پیش آتے۔ ۱۹۸۱ء میں بحری جہاز سے عازم حج ہوا تو بمبئی میں قاری صاحب نے اپنا مہمان بنایا اور تواضع سے پیش آئے۔ قاری صاحب کی محبت وشفقت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں بندہ کے ٹانڈہ بادلی کے قیام کے دوران ملاقات کے لئے ٹانڈہ تشریف لائے اور بندہ کو مہمان نوازی کا شرف بخشا۔

وفات

قاری صاحب کی دلی خواہش تھی کہ سنبھل میں موت نصیب ہو لیکن ۱۹۹۲ء میں نوشتہ پروانۂ اجل لے کر بمبئی آپہنچا آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بمبئی میں سپرد خاک کیے گئے۔

مولانا عبدالرحیمؒ استاذ دارالعلوم دیوبند

مولانا عبدالرحیمؒ کی پیدائش ۱۹۴۵ء کی ہے۔ مولانا قاری بشیر احمد کے صاحبزادے ہیں، ایسے خاندان کے چشم وچراغ ہیں جس کے اجداد کرام میں بہت سے حضرات مرتبہ علم وکمال پر فائز ہوئے، اور وطن کا نام روشن کیا۔ اور یہ خاندان علم وادب کا گہوارہ رہا۔ ان کو اپنے والد سے علمی ذوق اور فن مہارت ورثہ میں ملی۔ والدہ مرحومہ بھی علمی گھرانہ کی نیک صالح خاتون تھیں۔ وہ ابتدا ہی سے ذکی الحس انسان تھے، ان کی ذات میں حیرت انگیز خصوصیات پائی جاتی تھیں دنیاوی امور میں ان کا انہماک نہ ہونے کے برابر تھا۔ طبیعت میں زہد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ان کے تبحر علمی سے معاصرین باخبر تھے۔ معاصرانہ حالات کے لئے پورے اعتماد کے لائق تھے۔

ابتدائی تعلیم

وہ سن شعور کو پہونچے تو تعلیم کا آغاز ہوا۔ علمی جوہر زمانہ طالب علمی میں کھلنے لگے تھے۔ وہ اپنے ہم درسوں اور ہم چشموں میں ہمیشہ نمایاں رہے ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم چلے گئے، وہاں وقت کے جید علماء سے اکتساب علم کیا۔ چھ سال وہاں رہے۔ ۱۹۶۶ء میں بخاری شریف مولانا سید فخر الدینؒ مرادآبادی شیخ الحدیث دارالعلوم سے پڑھیں۔ دارالعلوم کے ممتاز فضلاء میں سے آپ ایک تھے۔ اساتذہ کے نزدیک اول دن سے معتمد علیہ تھے۔ چند ماہ دارالافتاء میں رہے پھر حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ کے مشورہ سے فراغت کے بعد مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں تقرر ہوا۔ خادم الاسلام کے تمام ہی اساتذہ شعلم دوست وعلم کے دلدادہ تھے۔ سب ہی کو علم سے شغف تھا۔

مولانا عبدالرحیم اپنے عزیز طلبہ کی تعلیم وتربیت پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ان کے اندر عزت نفس، خود اعتمادی بلند کرداری اور ٹھوس علمی استعداد کا جوہر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور وہ اپنے طلبہ کو علم کے میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ نیز اساتذہ

میں بھی ٹھوس استعداد کا جوہر دیکھنا چاہتے تھے۔ بایں وجہ اساتذہ کو مخلصانہ ومفید مشورہ سے نوازتے۔ آپ کا جس سے تعلق ہوتا، اس کو فن وکام میں کمال تک پہونچانے کی کوشش وخواہش رہتی۔ جب تک وہ اپنے فن وکام میں کمال حاصل نہیں کرتا برابر مشورے دیتے، یہ وصف آپ میں اتم درجہ موجود تھا۔

جنھوں نے مولانا سے اکتساب علم کیا، مولانا کے اس وصف کے معترف ہیں۔ ان سے متعلق طلبہ آج بھی ممتاز ونمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر کو استاذ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا نے قریب تمام ہی کتب درسیہ کا درس دیا۔ نحو وصرف ومنطق کے تو آپ امام تھے۔

آپ کی تصنیفات۔ توضیح المنطق اور نحو قاسمی جس کی بین دلیل ہیں ترمذی شریف کا مثالی درس دیتے تھے، اور اس میں بڑی گہرائی تھی، کہ عجیب عجیب نکات بیان فرماتے۔ آپ کے اس ذوق میں برابر زیادتی ہوتی رہے۔ متاخرین میں بڑے صاحب علم وفضل تھے۔ ان چند اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت وفضیلت کے باوجود اپنی اعلیٰ استعداد کا سکہ بٹھایا۔ انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں، شمع انجمن بن کر رہے، اور ہاپوڑ کے لوگوں کو ایسا فیض پہونچایا کہ آج تک ان کی اوران کے کارناموں کی یاد تازہ ہے۔ ۱۸ سال تک علمی قابلیت وصلاحیت غیر معمولی دماغی قوت سے روشنی وتابانی بخشی۔ جامع مسجد میں جمعہ کے روز کبھی کبھار پُر مغز بیان بھی ہوتا۔ علمی کمال کے ساتھ علم طریقت سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہٗ خلیفہ حضرت تھانوی مولانا اشرف علی صاحبؒ سے ربط تھا حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہٗ خود ہاپوڑ مولانا عبد الرحیم کے مہمان بھی ہوئے، مولانا پتلے دُبلے تھے مگر نحیف جسم میں آہنی دل تھا۔ انتظامی صلاحیت بھی اتم درجہ موجود تھی۔ چنانچہ خادم الاسلام کے کتب خانہ کا نظم ونسق وتربیت واضح دلیل ہے۔

تصانیف

زمانہ قیام خادم الاسلام ہاپوڑ میں تصنیفی کام کا آغاز ہوا۔ مختلف فنوں میں آپ کو بڑی مہارت تھی خاص کر نحو وصرف و منطق کے تو امام تھے اصوف فقہ سے بھی لگاؤ تھا۔ ''نحو قاسمی'' نام سے علم نحو میں ایک تصنیف ہے۔ اس کے متعلق حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ استاذ ادب و معاون مہتمم دار العلوم دیو بند رقمطراز ہیں۔

''کہ مولانا عبد الرحیم صاحب سنبھلی نے اپنی قابل قدر تصنیف جدید نحو قاسمی کے ذریعہ اردو زبان میں عربی زبان کے طلبہ کے لئے ایک مفید اور دلچسپ و آسان مجموعہ قواعد کو نئے انداز پر مرتب کر کے فن نحو سے واقفیت کے لئے ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ جو انشاء اللہ ابتدائی درجات کے طلبہ کے لئے ہی نہیں بلکہ فن نحو کے محنتی طلبہ اور ابتدائی مدرسین کے لئے بھی ایک مشعل راہ ثابت ہوگی۔''

دوسری تصنیف ''توضیح المنطق'' ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں اپنی نوعیت کی عجیب کتاب ہے۔ منطق کے مضامین کو نہایت سہل و شستہ زبان میں انوکھے انداز اور مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ اس کتاب پر وقت کے جید علماء (۱) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ رئیس جامعہ دار العلوم دیو بند (۲) حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیو بند (۳) حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہ شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند (۴) مولانا محمد حیات صاحب شیخ الحدیث مدرسہ حیات العلوم مراد آباد (۵) مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدیؒ استاذ جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ قابل ذکر ہیں۔

دار العلوم میں تقرری

قریب ۱۸ سال تک خادم الاسلام میں تدریسی خدمت انجام دیں۔ اور آپ کا

درس شہرۂ آفاق ہو چکا تو آپ کے نحیف الجثہ ہونے کے باوجود دارالعلوم دیوبند میں آپ کے اساتذہ نے دارالعلوم کی تدریسی خدمت کے لئے بلالیا۔

شوال سن ۱۴۰۱ھ میں تقرر ہوا۔ وہاں پہنچتے ہی کار تعلیم میں لگ گئے اور چند ہی دن بعد تبحر علمی کا جوہر اور صلاحیتوں کا ظہور ہونے لگا۔ اور ایک مقبول ترین استاذ کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن آپ کی زندگی نے ساتھ نہیں دیا۔ مریض تو پرانے تھے۔ مرض نے مزید شدت اختیار کی پھیپھڑوں میں پانی آگیا۔ الغرض دہلی ہسپتال میں لے جایا گیا۔ بہترین علاج و تیمارداری کے باوجود ایک ہفتہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عقد

مولانا کا عقد ان کے چچازاد بھائی کی لڑکی سے ہوا، مولانا اطہر صاحب قاسمی سابق مہتمم دارالعلوم محمدیہ سنبھل آپ کے بھتیجے اور سالے ہونے کے ساتھ ہم سبق بھی تھے۔ مولانا سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ لاولد تھے۔ بس روحانی اولاد (شاگردوں) کو چھوڑا۔

مجھے (عبد المعید راقم الحروف) کو درس و تدریس ۵ سال تک ہاپوڑ کے قیام نے مولانا سے قریب تر کر دیا تھا۔ اس مدت میں مجھے ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا، ان سے قرابت تو نہ تھی، ہم وطنی تھی، لیکن محبت و یگانگت کے تعلقات کسی عزیز و قریب سے کم نہ تھے میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا۔ مولانا کم عمری میں بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، اب تو ایسے لوگ دیکھتے دیکھتے چل بسے۔ مولانا ہمت، مستعدی، بیدار مغزی اور کارکردگی میں اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے۔ جس مجلس میں خوب گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ اور نوبت ذاتیات کی آجاتی تو ثالث اکثر آپ ہی ہوتے دوستوں بلکہ دشمنوں تک کے کام آنے والی شخصیت غیروں اور اجنبیوں کو نفع پہونچانے اور خدمت خلق کو اپنا مذہب بنانے والی ذات آپ کی تھی۔

تاریخ وفات۔ ۹ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور سنبھل میں دفن ہوئے۔
اللہ ان کے مرتبہ کو بلند سے بلند کرے۔ اور خوب خوب ان پر رحمت کی بارش برسائے۔ آمین
مولانا عبدالرحیم صاحب نے مدرسہ خادم الاسلام میں رہتے ہوئے طلبہ میں عربی بولنے اور لکھنے کا ذوق پیدا کرنے کیلئے اپنے رفیق کار مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب سابق استاذ خادم الاسلام کے ساتھ مل کر ایک عربی انجمن ۱۳۹۸ھ میں النادی العربی کے نام سے قائم کی اس سال ۲۲ رجب کو النادی کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ادیب دوراں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب شیخ الادب دار العلوم دیوبند نے کی،
جلسہ میں دیگر پروگرام کے ساتھ ایک عربی نظم بطور تشکر و تہنیت کے پیش کی گئی۔ افادہ کی غرض سے پیش ہے۔ جو حضرت مولانا قاری مشتاق صاحبؒ نے تیار کی تھی۔

النادی

شکراً لربّ العلمین البادی
قام لنافی دارنا النادی
من فیض شیخ شیوخنا
فی دارنا شاع نداء النادی
یجری لنا یا ربنا نفع الذی
قدأسس عبدالرحیم الهادی
اعضاء نالم یبلغوا حدالعمل
متوسط منهم ومنهم بادی
یا معشر الاخوان اجتهدوا
هذا اَوان السعی والاجهاد
قوموا لدین الله واعتصموا به
هذا زمان الکفر والالحاد

اصلح لنا اعمالنا ولساننا
انت لنا یا صدر خیرالھادی
انا حضرنا عندک فی حفلة
کل امامک فی السرورحادی
ادع لنا التوفیق من حسن العمل
مناعلی کل یقال الھادی
وادع لنا من فضلک یاشیخنا
فی الدارمن ادب یسیل الوادی

حضرت قاری مشتاق احمد صاحب شیخ الحدیث ہاپوڑ نے مولانا عبدالرحیمؒ کے خادم الاسلام ھاپوڑ سے دارالعلوم دیوبند آنے پر یہ نظم لکھ کر روانہ کی۔

کیا سناؤں حال اپنا مولوی عبدالرحیم
درد باقی ہے ابھی تک مولوی عبدالرحیم
جسم میں تھا درد میرے مولوی عبدالرحیم
درد دل سے بھی نوازا مولوی عبدالرحیم
وہم تک میں بھی نہ آتی تھی کبھی میرے یہ بات
چھوڑ کر جائے گا مجھ کو مولوی عبدالرحیم
لیک قسمت کے لکھے سے ہر کوئی مجبور ہے
ہوگیا مجبور تو بھی مولوی عبدالرحیم
خط کے لکھنے میں یقیناً میں بہت ہی ست ہوں
پر گزارش ہے میری یہ مولوی عبدالرحیم
خط کے لکھنے میں نہیں تاخیر ہونی چاہئے
تاکہ دل کو ہو تسلی مولوی عبدالرحیم

بربناء ناز جو کچھ تو نے لکھا ہے مجھے
ہے مجھے منظور وہ بھی مولوی عبدالرحیم
اس میں کوئی شک نہیں دنیا نہیں دارقرار
ساتھ ہو جنت میں تیرا مولوی عبدالرحیم
ہے دعاء شوق محزوں اب یہی شام وسحر
ہوسکوں تم کو میسر مولوی عبدالرحیم
ہو افادہ عام تیرا طالبان علم کو
درس ہو مقبول تیرا مولوی عبدالرحیم
مدعاء شوق بس اس کے سوا کچھ بھی نہیں
یاد رکھنا تو دعا میں مولوی عبدالرحیم

طالب دعاء۔احقر مشتاق احمد غفرلہ

مفکر اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

سنبھل کی قابل فخر شخصیات میں آپ کا اسم گرامی سرفہرست ہے حضرت مولانا موصوف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔آپ ان چند اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت وفضیلت کے باوجود ملک اور برصغیر میں اپنی اعلیٰ استعداد کا سکہ بٹھایا۔آپ اپنے زمانہ کے مشاہیر میں سے ہی نہیں تھے بلکہ اکابرین میں سے تھے۔آپ کی علمیت، فہم وفراست، افکار ونظریات مذہبی شہ پاروں وتصانیف کی شہرت زمان ومکان کے فاصلوں سے بے نیاز ہوچکی تھی۔

آپ کی ذات والا صفات ہی باعث افتخار نہیں ہوئی بلکہ دینی علمی خدمات بھی قابل صد افتخار وناز ہیں مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی پیدائش محلّہ دیپا سرائے کے ایک علمی ومعزز ومعروف خاندان میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی آپ کے والد محترم کا نام صوفی احمد حسین

ہے ۱۹۴۸ء میں وفات ہوئی۔ وہ صوفی اور صوم صلوٰۃ کے پابند تھے۔ نیک لوگوں سے رغبت ومحبت اور عقیدت رکھتے تھے خاص کر اہل علم اور علم دین سے بے پناہ شغف رکھتے۔

مولانا نعمانی صاحب پر بچپن ہی سے دینی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز وطن مالوف سنبھل مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں میں ہوا۔ پھر مدرسہ عبدالرب دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڈھ میں حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ کے ساتھ رہ کر علوم دینیہ حاصل کئے۔ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم دیوبند گئے اور تقریباً دوسال کے بعد ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں دورہ حدیث کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے۔ بخاری شریف کے تین سوالات کے جواب مطلوب تھے مولانا نے تین سوالوں کو تفصیلی حل فرمایا تھا۔

ویسے تو ہر دور میں دارالعلوم کے اندر کامل اساتذہ وجید علماء رہے ہیں خاص کر اس وقت دارالعلوم بڑے بڑے علماء دین تعلیم وتدریس خاص کر علم حدیث وتفسیر کی تعلیم کا بے مثال نمونہ اور مرکز تھا۔ امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ علم کتاب وسنت وشریعت وطریقت کے جامع وکامل استاذ مسند تدریس کے زینت تھے۔ بہرحال حضرت مولانا منظور نعمانی نے اس وقت کے اساتذہ سے علوم قرآن وحدیث سے فراغت حاصل کی۔ نیز حضرت مولانا نے کریم بخش سنبھلی اور مولانا عبدالمجید سنبھلیؒ سے معقولات کی کچھ کتابیں دونوں حضرات سے پڑھیں۔

مدرسہ جامع مسجد امروھہ تقرر۔ دارالعلوم دیوبند اور معقولات کی تکمیل کے بعد تدریسی خدمت انجام دہی کیلئے مدرسہ جامع مسجد امروہہ تقرر ہوا، حسن وخوبی کے ساتھ ۳ رسال تک تدریسی خدمت میں مشغول رہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ امروہہ کے بعد بحیثیت شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تقرر ہوا اور ۴ رسال تک بخاری شریف کا درس دیا۔

الفرقان کا اجرا۔ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں بریلی سے الفرقان ماہنامہ

رسالہ جاری کیا جو الحمدللہ آج تک علمی و دینی خدمت انجام دے رہا ہے اور تشنگان علوم کو سیرابی بخش رہا ہے، ابتداءً اس رسالہ کا رخ مناظرانہ تھا پھر ۱۹۴۲ء سے خاص علمی و دینی مضامین کا حامل ہو گیا۔ عرصہ دراز تک حضرت مولانا موصوف کی ہی ذات پر الفرقان کی تمام تر ذمہ داریاں تھیں اب آپ کے چھوٹے صاحب زادے جناب خلیل الرحمٰن صاحب سجاد ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت سے وابستگی

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانیٔ جماعت تبلیغ کی صحبت ہی حاصل نہیں رہی تھی بلکہ ان کے رازدار اور مشیر کار رہے ہیں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے معتمد علیہ تھے خصوصی مجلسوں میں خاص باتیں مولانا سے فرماتے شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ملفوظات کتابی شکل میں جمع فرمائے تبلیغ سے ابتداء ہی سے وابستگی رہی۔

نیز آپ رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرمۃ کے بھی رکن تھے۔ آپ کی اشاعت اسلام و خدمت دین کے مختلف شعبوں سے وابستگی تھی اور مخلصانہ کارکردگی آپ کا نمایاں وصف رہا ہے۔

تصنیف و تالیف

مختلف شعبوں اور درس و تدریس کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ تصنیفی میدان میں آپ اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئے۔ کتابوں (تصنیف و تالیف) مضامین و مقالات اور تقریروں کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کا مقدس کام بھی جاری رکھا اور بین الاقوامی عزت و شہرت و مقام سے نوازے گئے۔ بقول سعادت علی صدیقی کہ حضرت مولانا منظور نعمانی کی تصنیفات اہل علم و دانش کی آنکھ کا سرمہ ہیں۔

مولانا اردو کے کامیاب مضمون نگار اور مصنف ہیں آپ کی تصانیف عام فہم ہیں۔ طرز نگارش سادہ سلیس اور شگفتہ ہے اور ہر طبقہ میں آپ کی کتابیں مقبول ہیں آپ کی

تصانیف میں سے "اسلام کیا ہے؟" "دین وشریعت" اور قرآن آپ سے کیا کہتا ہے۔"
"معارف الحدیث" جس کی متعدد جلدیں ہیں احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب اور شاہکار ہے
جس میں احادیث کی تشریح نیز اس دور کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے یہ معرکۃ الآرا
تصانیف ہیں۔

کارنامے

حضرت مولانا کی ابتدائی زندگی حصول علم و معقولات کی تکمیل اکابرین کی صحبت وخدمت میں گزری اسکے بعد آپ کی زندگی کا رخ وعظ، اصلاح وتقریر وخطابات، تبلیغ وترغیب اور مناظرے کی طرف رہا۔ ۶۰ سال سے الفرقان رسالہ کے ذریعہ ہر قسم کے مضامین سے تشنگان علوم کو سیرابی اور بے راہ انسانوں کو صراط مستقیم حاصل ہوا۔ اور اللہ ورسول کی فرمانبرداری، اتباع سنت وشریعت کی ترغیب ملی۔

رکنیت شوریٰ دار العلوم دیوبند

آپ ۱۹۴۳ء میں دار العلوم دیوبند کے مجلس شوریٰ کے رکن منتخب کیے گئے آپ اپنے وقت کے مجلس شوریٰ کے سب سے بڑے بزرگ اور ہمیشہ مجلس شوریٰ اور عاملہ کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اور گویا کہ آپ شوریٰ کے روح رواں رکن تھے۔ یہ سلسلہ آخری دم تک رہا۔

حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کی شخصیت ایسی جامع صفات شخصیت تھی کہ جو بیک وقت مفسر، محدث، مناظر، داعی اسلام، مدرس وخطیب اور درجنوں تصنیفات کی مصنف تھی۔
حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری سے بیعت وارادت کا تعلق بھی تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے بہتر سیاسی مستقبل کیلئے مسلم مجلس مشاورت کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔
اور دین متین کی خدمت کے لئے مناظرے بھی کئے اور عالم اسلام کے بہت سے ممتاز ومعروف اداروں اور تنظیموں کے رکن اور سرپرست تھے اور ان کے دم سے ان میں

رونق و بہار تھی۔ جب تک ان کے جسم میں قوت و ہمت باقی رہی اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اور قوم وملت کی خدمت کے لئے اپنے ہاتھ وزباں، اور قلم سے جدو جہد کرتے رہے اور علم و عمل سے بھرپور علمی زندگی گزار کر ایک طویل مدت تک علیل رہے۔ علالت کے دوران کبھی اپنے وطن مالوف سنبھل قیام رہتا تھا۔ آخر میں لکھنؤ ہی میں صاحب فراش تھے کہ ۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۴/ مئی ۱۹۹۷ء کو شام ۹/ بج کر چالیس منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے خالق سے جا ملے حضرت مولاناؒ نے ۱۹۹۵ء میں تاریخ سنبھل کے مسودہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا تھا اور دعا سے نوازا تھا نیز مبلغ ۱۰۰ اروپیہ طباعت کیلئے عنایت فرمائے تھے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا کی تاریخ وفات پوری زندگی جو نام نامی اسم گرامی ہر خاص و عام کی زباں پر رہا ہے وہی تاریخ وفات ہے "منظور نعمانی"

حافظ خدا بخشؒ

حافظ خدا بخشؒ سرائے ترین سنبھل کی معزز شخصیت تھی ان کی اولاد میں مولانا سلیمان تھے آپ محلہ پیلا کھدانہ کے باشندہ تھے مدرسہ شمس العلوم میں تادم آخر قرآن کریم کی تدریسی خدمت انجام دی سینکڑوں حفاظ آپ کے شاگرد ہوئے، آج جو ۶۰/ ۷۰/ سال کی عمر کے حافظ موجود ہیں ان کو حافظ خدا بخش سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ بایں وجہ ان کو استاذ الاساتذہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بستی سرائے ترین میں ان کا فیض جاری ہے۔ شمس العلوم میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۵۸ء میں انتقال ہوا۔ حق تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

حافظ عبدالمجیدؒ

حافظ صاحب سرائے ترین محلہ حوض کٹورہ نزد مرکز والی مسجد کے باشندہ تھے والد محترم کا نام رمضانی تھا۔ ہوش سنبھال کر تعلیم کا آغاز مدرسہ شمس العلوم سرائے ترین

سے ہوا۔ حافظ خدا بخش ؒ سے قرآن کریم حفظ کی تکمیل کی اور دینیات کی کتابیں مولانا عبد الرشید سنبھلیؒ سے پڑھیں۔

تعلیمی امور سے فراغت کے بعد درس وتدریس میں قدم رکھا۔ سنبھل، چھتاری، محمود پور، رمضان پور، موسیٰ پور، اور متعدد مقامات پر مدارس سے متعلق ہو کر تدریسی خدمت انجام دی۔ اور ساتھ ہی ساتھ امامت کے فرائض انجام دیئے۔ حافظ صاحبؒ کی طبیعت میں شروع ہی سے صلاح وتقویٰ کے آثار نمایاں تھے۔ سنبھل میں سب سے پہلے جماعت تبلیغ میں جانے والے قاری عبد المعیدؒ خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ اور حافظ عبد المجیدؒ ہیں۔

اور سرائے ترین میں سب سے پہلے امیر جماعت ہونے کا شرف بھی انھیں حاصل ہے، سنبھل وسرائے ترین میں جو دعوتی کام ہو رہا ہے اس میں حافظ صاحبؒ کی انتھک کوشش کو بڑا دخل ہے اور یہاں تبلیغی جتنے اجتماعات ہوئے وہ سب حافظ صاحبؒ کی مخلصانہ جدو جہد سے کامیاب ہوئے۔

حافظ صاحبؒ مرکز والی مسجد سرائے ترین کے متولی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ تولیت میں ۱۹۶۰ء میں ایک برآمدہ تعمیر کرایا جو اپنی نوعیت خوبصورتی وپختگی میں عجیب عمارت ہے، تعمیر کے بعد لوگ دور دراز سے دیکھنے آتے اور نگرانِ عمارت کی داد دیتے۔ مسجد میں اور بھی کئی عمارتیں آپ نے تعمیر کرائیں۔ حافظ صاحبؒ نہایت مخلص، ملنسار، ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والے، سنجیدہ مزاج متواضع۔ ہمارے محلّہ میں سب سے بزرگ، اور صاحب معلومات تھے۔ دینداری و دیانت داری کے ساتھ امور انتظامیہ میں مہارت رکھتے۔ راقم السطور سے محبت کے ساتھ شفیق استاذ و باپ کی طرح شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔

پتھری کا آپریشن ہوا حق تعالیٰ نے اس سے صحت عطا کی، اچانک درد گردہ ہوا

جو پیغام اجل لے کر آیا دس گھنٹے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ جم غفیر نے جنازہ میں شرکت کی اور ہمیشہ کے لئے قبرستان ابوسعید میں ۲۸؍دسمبر ۱۹۹۰ء کو سپرد خاک کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ درجات عطا کرے۔ آمین۔

مولانا عبدالسلامؒ

۱۳۲۱ھ میں سرائے ترین کے ایک معزز گھرانہ میں پیدائش ہوئی اور عبدالسلام نام رکھا گیا۔ بچپن ہی میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ بایں سبب سن شعور سے آغاز تعلیم ہوا۔ سرائے ترین ہی رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۴۶ھ میں مدرسہ اجمل العلوم چلے گئے وہاں ابتداً قرآن کریم حفظ کی تکمیل کی، دینیات کی کتابیں پڑھیں۔ زمانہ طالب علمی میں مولانا محمد اجملؒ جیسے محقق وفاضل کے زیر تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اور نو سال اجمل العلوم رہ کر علوم متداولہ کی تکمیل کی ۱۳۵۵ھ میں فراغت حاصل ہوئی۔ مولانا کو طریقہ سلوک سے بھی ربط تھا۔ دوران تعلیم ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا حامد رضا خاں صاحب سے شرف بیعت حاصل ہوا۔

فراغت کے بعد ۱۳۵۶ھ میں سرائے ترین میں ایک مدرسہ دار العلوم اہل سنت جامعہ اسلامیہ کے نام سے قائم کیا، اور ۱۴؍سال تک درس و تدریس اور امور انتظامیہ بحسن وخوبی انجام دیئے زمانہ کے نیرنگیوں کے سبب میرٹھ، پالن پور گجرات، وغیرہ، مختلف مدارس میں درسی خدمت انجام دی آخر میں ۱۳۸۱ھ میں سنبھل سرائے ترین آ کر اپنے قدیم مدرسہ کی اہتمام کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۸۱ء میں راقم الحروف عبدالمعید کا بحری جہاز سے مولانا کے ساتھ سفر حج ہوا۔

وفات: ۱۸؍مئی ۱۹۸۷ء ۱۹؍رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا اختر شاہ خان

والد محترم کا نام محمد منور شاہ خاں تھا۔ آپ زہد و تقدس میں متعارف تھے آپ کی عظمت و بزرگی سے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہوگا۔ کہ وہ علاقہ کے زندہ ولی کامل متبع سنت تھے۔ نیز آپ کی بزرگی وولایت کے دوسرے عقیدہ رکھنے والے بھی معترف تھے۔ انسانیت کے اعلیٰ اوصاف آپ کی ذات میں اعلیٰ واتم درجہ موجود تھے۔ اپنے وقت کے اہل دل، صوفی، جید عالم تھے۔ آپ کا تعلق ترین خاندان سے ہے نسب شاہ فتح اللہ ترین خلیفہ شیخ سلیم چشتیؒ سے جاملتا ہے۔ تعلیم کا آغاز مدرسہ شمس العلوم سے ہوا۔ یہاں قرآن کریم حفظ کیا اور دینیات کی کتابیں پڑھیں، فارسی، ابتدائی عربی حضرت مولانا عبدالرشید صاحب سے حاصل کی پھر سنبھل کے قدیم ادارے مدرسۃ الشرع میں متوسط کتب پڑھیں۔ مدرسۃ الشرع مولانا کے مکان سے ۵ رکلومیٹر کے فاصلہ پر ہے مولانا ہر روز پا پیادہ آتے جاتے آمد و رفت میں کافی وقت لگتا۔ تھک جاتے، دارالعلوم دیوبند چلے گئے، چند سال تک دارالعلوم دیوبند رہے اس وقت کے جید علماء و اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔

بقول مولانا وقاری ظہیر الدین بلندشہری مقیم بنگلہ والی مسجد مرکز تبلیغی جماعت کہ اختر شاہ صاحب درس بخاری شریف میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے سامنے بیٹھا کرتے۔ اور حضرت شیخ اختر شاہ صاحب ہی کو عبارت پڑھنے کا حکم کرتے۔ بخاری شریف حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی۔ دارالعلوم سے فراغت ہوئی قاسمی کہلائے۔

درس و تدریس

قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور مدرسہ میں آپ کا تقرر ہوا یہاں چھ سال تک تدریسی خدمت انجام دی۔ مشکوٰۃ شریف تک کتابیں پڑھائیں۔

معہد ملت مالیگاؤں میں تقرر

بقول حضرت مفتی حبیب الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند۔ کہ مدرسہ معہد ملت مالیگاؤں مہاراشٹر کے مہتمم صاحب نے ایک ہی مضمون کے تین عدد خط ۳؍حضرات کی خدمت میں روانہ کئے۔

(۱) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ

(۲) دوسرا خط حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

تیسرا خط حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی خدمت میں ارسال کیا:

کہ آپ ہمارے مدرسہ کی تدریسی خدمت انجام دہی کے لئے ایک قابل، متبحر، سنجیدہ استاذ کا انتخاب فرمادیں۔

اتفاق سے تینوں ہی حضرات نے اپنے معتمد علیہ عالم دین استاذ کا انتخاب کرکے استاذ کی حیثیت سے مدرسہ معہد ملت مالیگاؤں بھیجا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں نے ایک مولانا کو اور حضرت محدث اعظم حبیب الرحمٰنؒ صاحب نے مجھے یعنی حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند کو اور حضرت شیخ الاسلام نے مولانا اختر شاہ خاں کو بھیجا۔ (اگرچہ ایک استاذ کی ضرورت تھی) لیکن مہتمم مدرسہ (چونکہ تینوں عظیم شخصیات کے فرستادہ تھے) نے ہم تینوں کو تدریس کے لئے روک لیا مولانا اختر شاہؒ کا یہاں ۴؍سال قیام رہا اس دوران صحاح ستہ کتب حدیث کا بحسن وخوبی درس دیا۔

خانگی امور کی وجہ سے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی کے ارشاد کے مطابق مدرسہ چلہ امروہہ تقرر ہوا۔ یہاں ایک سال تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۹۶۰ء میں مدرسہ امدادیہ مرادآباد آگئے دوسرے سال بخاری شریف کا درس دیا اور صدرالمدرسین کے عہدہ پر فائز رہے۔ پھر ۱۹۶۲ء میں مدرسہ شاہی مرادآباد آپ کو بلالیا گیا۔ آپ نے

یہاں علیا کی اکثر کتابیں خاص کر ترمذی شریف کا درس دیا۔

آپ مدرسہ شاہی کے مقبول ترین استاذ۔اور طلبہ پر بے حد شفیق تھے۔ساتھ ہی شاہی مسجد میں قرآن کریم کی تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے۔تادم آخر مدرسہ شاہی کو حدیث شریف کے درس سے رونق بخشی اور ساتھ ہی افتاء کی ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔آپ شاہی میں شمع انجمن بن کر رہے۔

عمل بڑا واعظ ہے

آپ اپنی والدہ محترمہ کی مزاج پرسی وزیارت کے لئے ہر جمعرات کو سنبھل تشریف لاتے جمعہ کی شام کو واپسی ہوتی۔آپ کے مکان کے قریب محمد توفیق خاں عرف پیارے خاں کے مزدور سینگ کی دستکاری کرتے۔یہ کام عادتاً لوگ (ستر) گھٹنے کھول کر کرتے ہیں مولانا اختر شاہؒ کے انتقال کے بعد ایک صاحب نے مجھ (عبدالمعید) سے بیان کیا کہ ایک بار شاہ صاحب ادھر سے گذرے لیکن سلام نہیں کیا مجھے تعجب ہوا۔کچھ دیر بعد شاہ صاحب کا گذر پھر ہوا تو شاہ صاحب نے سلام کیا۔وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ پہلی بار جب شاہ صاحب گزرے تو میرے گھٹنے (ستر) کھلے ہوئے تھے دوسری بار جب گزرے تو گھٹنے ڈھکے ہوئے تھے تو سلام کیا۔تو شاہ صاحب نے عمل کے ذریعہ نصیحت کی۔

جامع مسجد دربار کی امامت

چونکہ آپ مرادآباد سے جمعرات کو تشریف لاتے اور جمعہ کی شام کو واپسی ہوتی۔ جامع مسجد دربار میں آپ ہی جمعہ کی نماز پڑھاتے، جب تک قیام رہتا پنجوقتہ نماز بھی آپ پڑھاتے نیز تراویح میں رمضان المبارک میں قرآن کریم پڑھتے۔تقریر کرتے ہوئے آپ کو کم دیکھا گیا گویا آپ کی خاموشی وعظ تھی، اور آپ کا عمل دعوت وتبلیغ تھا۔

ایک خاص وصف

جب کوئی صاحب آپ سے ملاقات کرتے تو ہر ایک ملاقات کرنے والے کو یہ محسوس ہوتا کہ آپ سب سے زیادہ مجھ سے تعلق ومحبت رکھتے ہیں اور جب تک وہ خود جدا نہ ہوتا تو آپ علیحدہ نہ ہوتے۔

بیعت وسلوک

حضرت شیخ الاسلامؒ سے شرف بیعت ہی حاصل نہیں تھی بلکہ بے حد عقیدت ومحبت تھی جو اس راہ سلوک میں انتہائی ضروری ہے اور شیخ الاسلامؒ سے بخاری شریف پڑھنے کا شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔

زیارت حرمین شریفین

مالیگاؤں کے زمانہ قیام میں آپ کے چند مخلص دوست تھے جیسے مفتی حبیب الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند اور محبت وتعلق رکھنے والے جیسے حافظ محمد الیاسؒ انچولی والے اور عقیدت مندانہ تعلق ومحبت رکھنے والے جیسے جناب محمد علی صاحب مالیگاؤنوی۔ آپ اپنے دوست جناب محمد علی کے ہمراہ حرمین شریفین کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ اس سفر کا اتنا اخفاء کیا کہ بعض احباب کو تو علم نہیں ہوسکا کہ فریضہ حج ادا کرنے گئے ہیں واپسی پر علم ہوا۔

۱۹۶۷ء میں ابتدائی عربی تعلیم کے لئے حیات العلوم مرادآباد میں بندہ عبدالمعید کا داخلہ ہوا۔ اس کے بعد جب شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ وہاں داخلہ ہوگیا ہے بہتر ہے۔ وہ بھی اپنا ہی مدرسہ ہے۔ شاہ صاحب کی خواہش تھی کہ شاہی میں داخلہ ہو آپ کی زبان سے کبھی دلشکن لفظ نہیں نکلتا تھا۔ چونکہ حیات العلوم میں حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوری صدارت کے عہدہ پر تھے اور صدر صاحب سے ہی پکارے جاتے

اور مفتی حبیب الرحمٰن صاحب اور شاہ صاحب کے درمیان والہانہ محبت تھی جس کا ایک اثر یہ تھا کہ ہفتہ میں سب ایک ساتھ کھانا ضرور تناول کرتے۔ اور کبھی کبھار عصر بعد چہل قدمی کیلئے جاتے بندہ عبدالمعید ہر پروگرام و مجلس میں شریک رہتا کیوں کہ حیات العلوم کے قیام میں حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوری اور مفتی حبیب الرحمٰن صاحب کی نیک صحبت میں قیام و طعام ہی نہیں تھا بلکہ ان کی شفقت بھی حاصل تھی۔ شاہ صاحب بھی محبت و شفقت فرماتے یہاں تک کہ جب میرے والد محترم سعد اللہ صاحب بیمار ہوئے، تیمارداری کیلئے والد کی خدمت میں گھر چند دن قیام رہا تو شاہ صاحب عیادت کیلئے میری دلجوئی کے سبب غریب خانہ پر تشریف لائے۔

وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین۔

عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے۔

اختر شاہ صاحب کی ہر شخص عزت کرتا خواہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ گویا کہ آپ اس آیت کریمہ کے مصداق تھے کہ عزت مومنین کیلئے ہے۔ چون کہ آپ علمی فضائل و کمال کے ساتھ عمل سے آراستہ تھے گویا کہ آپ کا ہر عمل سنت کے مطابق تھا۔

سفر آخرت

آپ حسب معمول جمعرات کو یکم ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ سنبھل تشریف لائے جمعہ کی شام کو عصر بعد واپسی پر بس اڈہ تک راقم الحروف عبدالمعید کو ہمراہ لیا۔ چودھری سرائے سے آگے بڑھ کر بازار والی مسجد میں نماز مغرب ادا کی۔ بس پر سوار کرا کے بندہ واپس غریب خانہ آ گیا۔ بروز اتوار تاریخ ۴؍ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ کو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب دار البقاء کو کوچ کر گئے۔ تھوڑی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور مولائے حقیقی سے جا ملے۔ حق تعالیٰ ان کے مراتب بلند تر فرمائے۔

قابل ذکر و باعثِ افتخار

ہماری بستی سرائے ترین کی دو عظیم الشان علمی و عملی شخصیتیں:

(۱) مولانا آفتاب علیؒ کا آخری کلام بندہ عبدالمعید سے ہوا کلمہ توحید پڑھتے ہوئے روح پرواز کر گئی اور ایسے ہی

(۲) اختر شاہ صاحب کا آخری کلام سنبھلی حضرات میں بندہ سے ہوا۔

مولانا راشد حسین خاں نواب زادہؒ

آپ نواب عاشق حسین خان کے صاحبزادہ ہیں۔ یہ خاندان انصاری خاندان سے متعارف ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر گذر چکا ہے۔ جس کے بانی میاں عزیز اللہ تلبنی ہیں۔ نواب امین الدولہ، شاہ مراد اللہ انصاری جیسے حضرات اس خاندان کے افراد ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس خاندان کو دنیاوی وجاہت کے ساتھ علمی وجاہت سے بھی نوازا ہے۔ نواب عاشق حسینؒ نے اپنی سب اولاد کو علوم دینیہ کی تعلیم دلائی نواب ساجد حسین خاں اگرچہ رسمی عالم نہیں تھے لیکن علم کچھ کم نہیں تھا۔ عالمانہ شان آپ کے اندر تھی۔ عابد، ذاکر، مصلح تھے نواب خالد حسین خاں نے درس نظامی مدرسۃ الشرع میں پڑھا۔ نواب محمود حسین خاں حافظ قرآن ہیں نواب حامد حسین خاںؒ نے درس نظامی کی تکمیل مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں میں کی۔ نواب راشد حسین خاں نواب زادہ ابتدائی تعلیم مدرسۃ الشرع سنبھل میں حاصل کرنے کے بعد دار العلوم دیو بند چلے گئے اور وہاں وقت کے جید علماء واساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ اس خاندان کا دار العلوم کے اکابرین سے ہمیشہ گہرا ربط رہا ہے۔

نواب راشد حسین خاںؒ نے دار العلوم سے فراغت حاصل کی اور قاسمی کہلائے۔ علمی وعملی کردار کا نمونہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ دونوں میدانوں میں سرگرم رہ کر ۱۹۶۴ء میں دائی اجل

کو لبیک کہا اور مولائے حقیقی سے جا ملے۔ حق تعالیٰ ان کے درجات کو بلند تر فرمائے۔

نواب زادہ مولانا حامد حسین خاںؒ

آپ بھی نواب عاشق حسین خاںؒ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے اپنے والد محترم کی نگرانی و سرپرستی میں رہ کر حصول علم کیا۔ اور پورا فائدہ اٹھایا نیز اساتذہ کی توجہ و شفقت حاصل رہی جس کی وجہ سے علوم متداولہ کی تکمیل مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں سے کی۔ اور عالم کہلائے۔ عالمانہ شان و شوکت کے ساتھ آپ نے زندگی گذاری۔ ۱۹۸۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ دار فانی سے دار البقاء کوچ کر گئے۔ حق تعالیٰ ان کے مراتب بلند تر فرمائے۔

مفتی محمد حسین نعیمیؒ

۲۱؍ مارچ ۱۹۲۳ء میں سنبھل آپ کی پیدائش ہے والد کا نام تفضل حسین تھا۔ درس نظامی سے فراغت دار العلوم جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۸ء میں فاضل عربی کا امتحان دیا ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہی فاضل فارسی کا امتحان دیا۔ نوشتہ محکمہ اوقاف پنجاب سے ۱۹۶۱ء میں فاضل علماء اکیڈمی کیا۔

تدریسی دور

دار العلوم حزب الاحناف، لاہور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک درس دیا دار العلوم نعمانیہ لاہور میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک تدریسی خدمت انجام دی۔

۱۹۵۳ء میں دار العلوم نعیمیہ لاہور قائم کیا۔ اور اس کے مہتمم بنے، مزید دار العلوم نعیمیہ ہی میں ۱۹۵۵ء تا ۱۹۸۵ء شیخ الحدیث والفقہ کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔

فتاویٰ

۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۵ء تک ۳۵؍ سال میں ہزاروں مسئلے فتاویٰ جاری کیے ۵۴؍

سال تعلیم وتدریس وتبلیغ میں ہمہ تن مشغول ومصروف رہے۔ اوراس دوران مختلف قومی اوربین الاقوامی کانفرنسوں، سیمیناروں اور مختلف جامعات، یونیورسٹیوں میں مختلف موضوعات پر لیکچرز دیئے۔ آپ ہر علمی لائن میں نمایاں خدمات انجام دے کر ۲۵/۸/۹۷ کو دنیافانی سے دارالبقاء کوچ فرما گئے۔

شیخ عبدالقادر بدایونی

اگر شیخ عبدالقادر کا ذکر نہ کیاجائے تو تاریخ سنبھل ناقص رہے گی آپ کا ذکر تاریخ سنبھل کے لئے جزء لاینفک ہے۔

آپ کے والد شیخ مملوک شاہ سنبھل کے ایک صوفی وعالم شیخ عبداللہ عرف پنجو کے مرید خاص اور شاگرد تھے فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں۔ عبدالقادر نے شیخ حاتم سنبھلی سے تحصیل علم کیا۔ ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ سنبھل تحصیل علم میں گزرا اور ابوالفضل کے ہم سبق تھے شیخ عبدالقادر امام اکبرشاہ کہلاتے تھے۔ اور علماء عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے۔ ترجمہ وتالیف میں اکبر کی فرمائشوں کو عمدہ طور پر انجام دیتے اسی خدمت کی بدولت ان کے جواہر معانی وصفائی بیاں کے ورقوں میں جگ مگائے۔ انھوں نے اپنی کثیر تصانیف میں عمدہ ونیا رنگ پیدا کیا۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمات سلطنت اور امور زمانہ کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ حقیقت میں مذہبی فاضل عالم تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور حدیث کو خوب حاصل کیا تھا تصوف سے طبعی تعلق تھا۔

پانچ سال کی عمر تھی کہ عبدالقادر سنبھل میں قرآن کریم پڑھتے تھے پھر کچھ روز نانا نے اپنے پاس رکھ کر ابتدائی تعلیم نحو وصرف پڑھائی۔

وہ خود لکھتے ہیں کہ ۹۶۱ھ میں ۱۲ برس کی عمر تھی کہ والد نے سنبھل آ کر شیخ حاتم سنبھلی اسرائیلی کی خدمت میں حاضر کیا شیخ حاتم کی خانقاہ میں رہ کر قصیدہ بردہ یاد کرلیا اور وظیفہ

کی اجازت حاصل کی۔ اور فقہ حنفی میں تبرکاً کنز الدقائق کے چند سبق پڑھے اور میں انھیں سے مرید ہوگیا۔

شیخ حاتم نے ایک دن میرے والد سے کہا کہ ہم تمہارے لڑکے کو اپنے استاذ میاں عزیز اللہ تلکبنی کی طرف سے بھی کلاہ و شجرہ دیتے ہیں تاکہ علم ظاہری سے بھی بہرہ ور ہوں، غالباً اسی کا اثر تھا کہ فن فقہ میں دسترس حاصل تھی۔ (دربار اکبری ص ۴۲۴)

ابو الفضل اور فیضی عبدالقادر بدایونی کے استاذ بھائی ہیں۔

ابن شیخ مبارک کے ہم عصر تھے

منتخب التواریخ

ملا عبدالقادر بدایونی کی فارسی تصنیف ہے۔ راقم الحروف عبدالمعید نے تاریخ سنبھل کی تیاری میں ورق گردانی کی۔ جو آپ کے تبحر علمی پر روشن دلیل ہے، علم موسیقی علم الفلکیات اور خاص کر علم تاریخ سے بڑا شغف تھا۔ آپ نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا اور کثیر تصانیف میں معرکۃ الآرا تصنیف منتخب التواریخ ہے۔

شیخ سعد اللہ نحوی

آپ فن نحو میں اپنے وقت کے بڑے متبحر عالم تھے، اس فن میں آپ کا ثانی نہیں تھا۔ اسی سبب سے نحوی آپ کے نام کا جز بن گیا تھا۔ بیانہ رہتے تھے۔ اس وقت عبدالقادر بدایونی سنبھل سے قرآن کریم اور دینیات پڑھ کر اپنے نانا مخدوم اشرف کے پاس چلے گئے تھے۔ موصوف سے کافیہ کتاب، پڑھی ان ہی ایام میں ہمیوں بقال نے سنبھل میں سر اٹھایا اور اس کے لشکر نے پشاور میں لوٹ مار کی عبدالقادر اس وقت سنبھل تحصیل علم میں مصروف تھے۔ جب تمام پشاور لٹ کر برباد ہوگیا خود کو بڑا افسوس ہوا۔ خود لکھتے ہیں کہ والد کا کتب خانہ بھی لٹ گیا۔ دوسرا ہی سال تھا کہ جو قحط کی مصیبت آئی جس سے بندگان خدا کی بدحالی نہ دیکھی جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوک سے مرتے تھے اور آدمی کو آدمی کھائے جاتا تھا۔ (دربار اکبری ص ۴۲۵)

شیخ مملوک شاہ

آپ ملاّ عبدالقادر بدایونی کے والد اور شیخ عبداللہ عرف پنجو سنبھلی کے مرید اور شاگرد رشید تھے عبدالقادر رقمطراز ہیں کہ ۹۶۹ھ میں میرے والد کا انتقال آگرہ میں ہوا۔ ان کی لاش پشاور میں لے گئے اور وہیں دفن کیا۔ تاریخ وفات لکھتے ہیں۔

سر دفتر افاضل دوراں مملوک شاہ
آن بحر علم معدن احساں وکانی فضل
چوں بود در زماں جہانے ز فضل ازاں
تاریخ سال وفات وے آمد جہاں فضل

تاریخ فاضل جہاں لکھی ہے۔ (دربار اکبری ص ۴۲۶)

محمد بہادر شاہ

محلہ دیپا سرائے آپ کی جائے پیدائش ہے۔ آپ علم دوست شخص تھے اگرچہ آپ عالم دین نہیں تھے۔ مگر آپ نے (حسنات العارفین) عربی کتاب کا سلیس بامحاورہ اردو زبان میں دلچسپ ترجمہ کیا ہے۔ راقم الحروف عبدالمعید نے خود اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب ذکر کے فضائل واقسام وغیرہ پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم محمد بہادر شاہ ایک صالح، ذاکر متصوف تھے۔ اس کتاب کے ترجمہ کی وجہ اپنے قلم سے مقدمۂ کتاب میں تحریر کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بندہ کو زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسالہ کے ظاہر کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اے بہادر اس فن کے شائقین کے فائدہ کے لئے علم تصوف کو بیان کر اور چند سطریں اہل تحقیق وتدقیق کے متعلق لکھ اور اسکی کوشش کر کہ اس کا فیض دنیا وآخرت میں حاصل کریں اور اس کی چاشنی سے مزہ اٹھائیں۔ صرف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جو کچھ اس ناخواندہ کی زبان نے یاری کی ان مجاہدات و مشاہدات کو جو اس مؤلف پر منکشف اور واضح ہوئے دوسروں کے فائدہ کی غرض سے لکھ دئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سنبھل آمد

منشی حمید الدین سنبھلی فرماتے تھے کہ حضرت مولانا نانوتوی (بانئ دارالعلوم دیوبند) سنبھل تشریف لائے پھر ایک بزرگ سے ملنے کیلئے ریاست رام پور تشریف لے گئے۔ ساتھ میں مولانا احمد حسین اور منشی حمید الدین تھے۔ مراد آباد سے اس طرح چلے کہ خود حضرت نانوتویؒ پیادہ پا ہوئے اور منشی صاحب کی بندوق اپنے کندھے پر رکھ لی اور منشی حمید الدین کو سواری پر بٹھا دیا۔ جس نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں فرما دیتے کہ منشی حمید الدین صاحب رئیس سنبھل ہیں گویا کہ اپنے کو ایک ملازم کی حیثیت سے ظاہر کیا تا کہ رام پور خفیہ طور سے پہنچیں۔

جب رام پور پہنچے تو وہاں وارد اور صادر کا نام اور پورا پتہ وغیرہ داخلہ شہر کے وقت لکھا جاتا تھا۔ حضرت نے اپنا نام (خورشید حسن تاریخی نام) بتایا اور لکھوا دیا اور ایک نہایت ہی غیر معروف سرائے میں مقیم ہوئے۔

جلالی بزرگ

سنبھل میں جہاں ہر دور میں علماء، صلحاء، صوفیاء اور کاملین کا وجود رہا ہے وہاں جلالی و جمالی بزرگوں سے سنبھل کا دامن خالی نہیں رہا اور اس قسم کے سینکڑوں حضرات اس کی زمین میں محو استراحت ہیں، سنبھل روڈ پر مراد آباد کے راستہ میں ایک جھاڑی تھی۔ اس کے اندر اینٹوں کا ڈھیر تھا اس میں ایک بزرگ محو استراحت تھے جن کے جلال کی کیفیت حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسمؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے بیان کی ہے

حضرت حجۃ الاسلام ایک بار نواب عاشق حسینؒ اور منشی حمید الدین کے ہمراہ سنبھل سے مراد آباد کیلئے بیل تانگہ پر سوار تھے۔ جب تانگہ جھاڑی کے سامنے پہنچا، تو حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ نے تانگہ کو روکنے کا حکم کیا۔ اتر کر اس ڈھیر کے قریب پہنچے اور مراقب ہو گئے۔ مراقبہ سے فراغت کے بعد تانگہ کی طرف جا رہے تھے اور زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے۔

"اللہ اکبر بہت جلالی آدمی ہیں"

اس واقعہ کے راوی جناب نواب عاشق حسین ہیں اور اس سفر میں ان کے ہمراہ نواب صاحب کے ماموں جناب منشی حمید الدینؒ بھی تھے۔ یہ دونوں حضرات مولانا قاسمؒ نانوتوی کے عشاق میں سے تھے۔ (سوانح قاسمی حصہ دوم ص ۳۰)

مولانا اسحٰق سنبھلی ایم پی

مولانا سیاسی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہ تھے۔ مولانا اسحٰقؒ مولانا احمد حسنؒ کے صاحبزادے ہیں مولانا اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ جن کے سامنے دوسروں کے چراغ ماند پڑ گئے تھے، اور تمام علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ علمی کمال و فضائل کے ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے اور حضرت تھانویؒ سے ارادی تعلق تھا۔ مولانا اسحاق صاحب کو علمی ذوق اپنے والد سے وراثت میں ملا تھا۔

مولانا اسحاق صاحب علمی ماحول میں پروان چڑھے، دینیات پڑھنے کے بعد علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ دار العلوم دیوبند میں علماء سے اکتساب علم کیا۔ وہ ابتدا ہی سے ذکی الحس انسان تھے اور ان کی ذات میں حیرت انگیز خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ جہاں تک شرافت، آدمیت، حسن اخلاق کا تعلق ہے۔ وہ ان میں بہت اچھا اور بے داغ تھا۔ وہ بڑے دلچسپ باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کی ذات گرامی اتنی بلند تھی جو نہ صرف سنبھل

بلکہ ہندوستان کے لئے وہ سرمایہ فخر وناز تھے۔

انھوں نے قوم وملک کیلئے جلیل القدر خدمات انجام دیں۔اور وہ عملی طور پر قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔مولانا اسحاقؒ کا شمار ملک کے بڑے چوٹی کے لیڈروں میں تھا۔

پارلیمنٹ ممبری

مولانا اسحٰقؒ نے آزادی ملک کے بعد حلقہ سنبھل سے پارلیمنٹ سیٹ سے الکشن لڑا، وہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔انھوں نے سیاسی میدان میں قدم رکھنے کے بعد پارلیمنٹ میں تہلکہ مچادیا تھا۔

ان کے ہاتھ میں قلم منہ میں زبان تھی

حق تعالیٰ نے انہیں قوت گویائی سے نوازا تھا ہر موضوع پر بہترین گفتگو کرتے انداز بیاں دلچسپ اور موثر تھا۔ ان کے ہاتھ میں قلم اور منہ میں زبان تھی انھوں نے سیاسی مجلسوں اور حلقوں میں تہلکہ مچادیا تھا۔ وہ جمہوریت کی جڑیں مضبوط دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی بقاء وترقی کی انتھک کوشش میں انھوں نے ۱۹۹۰ء ۱۱رنومبر قومی آواز میں ایک اخباری بیان دیا جس میں مولانا اسحٰقؒ نے کہا تھا کہ فرقہ وارانہ جماعتوں نے نفرت کا بیج بوکر اور مذہب کی آڑ میں اپنے سیاسی مفادات کیلئے اشتعال انگیز کاروائیاں کرکے سارے ملک کو تشدد اور فرقہ پرستی میں جھونک دیا ہے جس سے قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ملک کی سالمیت خطرہ میں پڑگئی ہے اور دنیا کے سامنے ہماری نگاہیں شرم سے جھکی جارہی ہیں۔اس صورت حال کے خاتمہ کیلئے اگر مخلصانہ کوشش نہ کی گئی تو سب تباہ وبرباد ہوجائے گا۔اور دیش کو آزادی دلانے کی خاطر دی گئی قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ان حالات میں سیکولزم ترقی پسند نظریات اور جمہوری آداب پر یقین رکھنے والے شہریوں پر اخلاقی وقومی فرض ہے کہ وہ ملک کی یکجہتی وسالمیت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار

رکھیں اور شر پسند عناصر کی سرگرمیوں کا تدارک کرنے کیلئے میدان عمل میں آئیں۔ انھوں نے دانشور طبقے سے اپیل کرتے ہوئے مزید کہا تھا کہ ادیبوں و شاعروں نے ہر دور میں اپنا فرض دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ صالح اقدار اور رواداری کے تحفظ کی خاطر خون جگر صرف کیا ہے۔ آج کی سنگین صورت حال کی آزادی کے لئے ان کا سرگرم عمل ہونا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

تبصرہ

جب آپ پارلیمنٹ کے اجلاس میں تقریر کرتے یا کچھ کہتے تو سب پر ایک سکتہ طاری ہوتا اور غور سے آپ کی بات سنتے۔ بی بی سی لندن آپ کی تقریر پر تبصرہ کرتا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی

جمعیۃ علماء ہند کے آپ سرگرم رکن تھے۔ اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہٗ کے مشیر خاص تھے جمعیۃ کا کوئی اجلاس ایسا نہ ہوا جس میں آپ کی شرکت نہ ہو۔ ہر اجلاس میں روح پھونکنے اور اجلاس کو کامیاب بنانے میں آپ کا نمایاں کردار ہوتا تھا۔

انتقال

رمضان المبارک بروز جمعہ ۱۴۲۰ھ مطابق جنوری ۲۰۰۰ء کو آپ کا انتقال ہوا سنبھل میں تدفین ہوئی۔

حق تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرما کر اپنی شایان شان جزا عطا فرمائے۔

مرزا مظفر حسین

سلاطین اسلام نے اپنے عہد حکومت میں جہاں خطابات سے نوازا وہاں بہت سی شخصیات کو جاگیریں عطا کیں، ان شخصیات میں سے قابل ذکر مرزا مظفر حسین صفوی

ہیں شہنشاہ اکبر نے ۱۰۰۳ھ میں مرزا مظفر حسین صفوی کو پنج ہزاری منصب پر سرفراز فرما کر سنبھل کا علاقہ جو قندھار کے علاقہ سے بڑا ہے عطا کیا، فارسی عبارت۔ ۱۰۰۳ھ عرش آشیانی مرزا را بہ منصب پنجہزاری واقطاع سنبھل کہ افزوں از قندھار است سرفراز ساخت۔

مرزا علی

شہنشاہ اکبر کے بعد اس کے بیٹے سلیم جہانگیر بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد مرزا علی اکبر شاہی کو جو دہلی کے خاندان متوسلین شاہی میں سے ہیں چہار ہزار منصب دے کر سرکار سنبھل کا علاقہ ان کی جاگیر میں عنایت کیا۔

(بحوالہ فارسی تاریخ امروہہ)

احمد اللہ خان

محلہ کچھواہان سرائے ترین میں آپ کا دولت خانہ تھا۔ اور قبیلہ خٹک سے تعلق تھا۔ آپ کثیر جائیداد اور بڑے زمیندار تھے مکان سے مکین کا پتہ چلتا ہے۔ حاجی عطاء اللہ صاحب پٹواری جس مکان میں رہتے ہیں جو چھوٹی اینٹ کی دومنزلہ عمارت ہے اور اس کے متصل ایک عالیشان (ہال) مضبوط عمارت جس کا صدر دروازہ (پھاٹک) آج بھی قائم ہے یہ سب جناب احمد اللہ خان کی ملکیت تھی یہ آثار قدیمہ عمارت اپنی شان سے اپنے مکین کی شان وشوکت کا پتہ دے رہی ہے۔

احمد اللہ خان نے اپنی عمارت کے ایک حصہ میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام مدرسہ علوم شرعیہ رکھا یہ اپنے وقت کا بڑا مدرسہ تھا، اس میں حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی اور حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد حیاتؒ بانی حیات العلوم نے تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ اور اس مدرسہ کے فیض یافتہ قابل ذکر مولانا محمد صادق صاحب پشاوری ہیں جو مولوی ریل کے نام سے متعارف تھے اس تاریخ سنبھل میں ان کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

احمد اللہ خان شان وشوکت، کثیر جائیداد والے تھے، آثار قدیمہ ان کی عظمت اور متدین ہونے کا پتہ دے رہے ہیں چونکہ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی انھوں نے زمین، باغ، وغیرہ وقف علی الخیر کردی تھی۔ انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ آرام کی نیند سو گئے۔

سمیع اللہ خان

سمیع اللہ خان سرائے ترین کی معزز شخصیت تھی، نہایت دلچسپ، باغ و بہار بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ان کے ہم عصروں کو کچھ بھی شکایتیں ہوں لیکن جہاں تک شرافت، آدمیت، حسن اخلاق کا تعلق ہے وہ بہت اچھا اور بے داغ ہے۔ وہ کمزوروں اور مظلوموں کے ملجاء یار و مددگار تھے۔ دوسروں کا کام نکالنے میں ہر وقت مستعد و آمادہ رہتے تھے۔ آپ نے اپنے ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز زندگی گزاری۔ وہ صاف گو اور انصاف پسند تھے، حق اور سچی بات کے خلاف کوئی بات گوارہ نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ غالب رہے عزت کی باوقار زندگی گذاری ان کی بہادری کے واقعات زبان زد ہیں سمیع اللہ خاں کے والد اکرام اللہ خان ابن سعد اللہ خاں تھے۔ سمیع اللہ خاں کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف ایک لڑکی تھی جس کا عقد عبدالقیوم خاں سابق چیرمین سے ہوا تھا وہ بھی چند سال کے بعد دار فانی سے دار البقاء کوچ کر گئیں۔ آصف خاں عرف مچھو خان آپ کے عزیز قریب رشتہ دار تھے سمیع اللہ خاں کی وفات ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔

آصف علی خاں عرف مچھو خان

آپ سمیع اللہ خان کے قرابت دار تھے آپ علم دوست شخص تھے، بارعب و باوقار تھے، آپ کی چال میں متانت تھی سنبھل نگر پالیکا اور دیگر جگہوں پر بڑے عہدوں پر رہ کر مخلوق خدا کو نفع پہنچایا۔ آخر میں شہر رام پور O.C او، سی کے عہدہ پر فائز تھے۔ رام پور

ہی قیام پزیر ہوئے وہیں ۱۹۹۸ء میں وفات پائی رام پور ہی مدفن ہوا۔

سعد اللہ ابن حبیب اللہ

آپ راقم الحروف عبدالمعید کے والد محترم ہیں۔آپ کی پیدائش سرائے ترین محلہ جھجران ہے، والد کا نام حبیب اللہ تھا آپ کے جداعلیٰ کا محمود پور معافی وطن تھا۔وہاں سے ہجرت کر کے سرائے ترین بودوباش اختیار کی۔ان کی تیسری نسل میں سعد اللہ ہیں، آپ سلیم الطبع، متدین، خوش اخلاق، صابرو مستقل مزاج انسان تھے۔آپ کے یہاں تجارت کے ساتھ سینگ کی دستکاری بھی ہوتی تھی۔آپ بارعب وشجاع تھے کہ خوف کبھی آپ کے نزدیک نہیں آیا آپ کی شجاعت کے چند واقعات مشہور وزبان زد ہیں۔ آپ وعدہ کے پکے اور بات میں سچے تھے۔آپ نے اپنی سب اولاد کو تعلیم دلائی۔

اوصاف

آپ کا جسم بہت چوڑا قد لانبا تھا۔چہرہ وجیہ بارعب تھا، لوگ پہلوان کہتے تھے۔ اکثر تہبند زیب تن فرماتے۔ستر سال کی عمر پائی ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔قبرستان ابوسعید میں دفن ہوئے۔اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔آمین

پسماندگان میں

ایک اہلیہ یعنی میری والدہ محترمہ مسماۃ شہزادی تھیں وہ اسم بامسمیٰ ہونے کے ساتھ عابدہ زاہدہ تھیں طبیعت میں نظافت وطہارت کا ایک خاص وصف تھا۔ پیرانہ عمر کے باوجود پردہ کا بہت اہتمام تھا۔ ۲۹/اکتوبر سنہ ۱۹۹۸ء بروز جمعہ ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔اور والد محترم کے قریب سپرد خاک کیا گیا۔

اور پسماندگان میں ایک لڑکی خیر النساء اور پانچ لڑکے عبدالمجید، عبدالعزیز، عبدالحمید، عبدالمعید، محمد نبیہ ہیں سب ہی بقید حیات ہیں۔اب ۶۸ اڑسٹھ افراد پر سعد اللہ

صاحب کی نسل مشتمل ہے۔ یہ خاندان سعدی کے خاندان سے پکارا جاتا ہے۔

برادرم حاجی محمد نبیہ صاحب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھائی بھائی کا بازو ہوتا ہے۔ میرے بھائی بھی اس کا مصداق ہیں۔ خاص کر بھائی محمد نبیہ صاحب جنھوں نے والد محترم کے انتقال کے بعد سے تمام تر ذمہ داریوں کا بار اٹھایا۔ اور والد محترم کی حیات میں جو آرام و آزادی اور بے فکری سے میری تعلیم کا سلسلہ جاری تھا انتقال کے بعد بھی اسی نہج پر میری تعلیم جاری رکھی اور مزید سہولیات فراہم کیں۔ ہم دونوں کے درمیان ایسی محبت ہے جیسے ایک روح دو قالب کا مصداق ہو موصوف ہم زلف بھی ہیں اور میرے گھر کی ترقی اور بچوں کی تعلیم اور دوسری ضروریات اور امور خانہ داری کی فکر ان کو دامن گیر رہتی ہے۔ ادھر بھائی عبدالحمید صاحب کے لڑکے سے میری بچی کا عقد ہے، گویا بھائیوں سے باہم کئی قرابتیں جمع ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سب بھائیوں پر اپنا خصوصی کرم فرمائے آمین۔

پیارے خاں مع پسران

جناب پیارے خاں صاحب آج کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں سنبھل سرائے ترین کا بچہ بچہ آپ سے واقف ہے زمانہ کا دستور ہے کہ بیٹے کا پتہ باپ کے نام سے روشن ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ بڑا مبارک باپ ہے جو خود کمال سے صاحب برکت ہو اور بیٹوں کی ناموری اس کے نام کو زیادہ روشن کرے۔

جناب پیارے خاں بھی اس کا مصداق ہیں خود آپ باکمال و جمال اور حساس ہیں مگر بیٹوں نے آپ کے جمال کو اجاگر کر کے چار چاند لگا دیئے آپ بستی کے رئیس ہیں اور دولت مندوں میں شمار ہوتے ہیں آپ کی پیدائش ۱۲/اپریل ۱۹۲۷ء کو سرائے ترین میں ہوئی آپ کا اصل نام محمد توفیق خاں ہے اور والد محترم کا نام محمد صدیق خاں تھا۔

آپ بمبئی والے کے نام سے مشہور و معروف ہیں آپ کے یہاں سینگ کی

کنگھیوں کی سوداگری ہوتی تھی نیز سینگ کی دست کاری کا کارخانہ بھی تھا جس میں متعدد کاری گر کنگھیاں تیار کرتے تھے۔

پیارے خاں کثیر الاولاد ہیں اول سے ہی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ رہی ہے سب ہی کو تعلیم میں لگا دیا جس وقت راقم الحروف جناب استاذ محترم حافظ فرید الدین خاں صاحب سے قرآن کریم پڑھتا تھا تو اس وقت میں میاں ندیم اختر اور پرویز خاں بھی اس درسگاہ میں قرآن کریم کا درس لیتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ استاذ محترم نے ان دونوں کو بلوانے بھیجا ہے چونکہ یہ دونوں اس وقت کم سن تھے پیارے خاں نے اپنے کاروبار میں اپنی اولاد سے تعاون نہ لیا، بلکہ تمام تر ذمہ داریوں کو خود ہی برداشت کیا، اولاد کی تعلیم و تربیت میں ٹھوس و مؤثر قدم اٹھایا۔

پیارے خاں اخراجات کی زیادتی اور آمدنی کی کمی کے سبب مقروض ہو گئے تھے پیارے خاں ان حالات میں بھی ثابت قدم رہے۔ ذرا جنبش نہیں ہوئی پہاڑ کی طرح جمے رہے اس دور میں انابت الی اللہ میں گویا کہ غرق تھے جامع مسجد دربار آپ کے محلہ کی مسجد ہے اکثر وقت مسجد میں گذرتا فرائض کے کیا معنی نوافل میں بھی مشغول رہتے اشراق، چاشت، اوابین، تہجد کے علاوہ تلاوت میں مستغرق رہتے۔ پنجوقتہ اذان ہی نہیں دیتے بلکہ مسجد کی صفائی کا بہت خیال رکھتے۔ مسجد میں رات کا قیام اور گولک کی نگرانی بھی فرماتے۔ جو ایک مومن کی شان ہے کہ اس کا دل مسجد میں معلق رہے وہی شان و کیفیت موصوف کی تھی کہ مسجد میں محو عبادت رہتے تھے شب و روز کا اکثر وقت مسجد میں گزرتا حق تعالیٰ سے قبولیت کی امید کرتے ہوئے دعا کرتے رہے اور بچوں کی تعلیم جاری رکھی پرویز خاں اور ندیم اختر وغیرہ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن سرائے ترین میں حاصل کی پھر رامپور مرکزی درسگاہ میں داخل ہو کر تعلیم و تربیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا پیارے خاں اپنی اولاد کو یکے بعد دیگرے رام پور، پھر علی گڈھ یونیورسٹی داخل کراتے رہے۔ یہاں تک کہ بچوں کی تعلیم

وتربیت کی غرض سے ایک مستقل مکان علیگڈھ میں ہے. جس میں ان کے فرزند جناب شاہ نواز خاں مستقل سکونت پزیر ہیں۔

یونیورسٹی سے فراغت وتکمیل کے بعد سعودی عرب چلے گئے وہاں ابتداء ایک شیخ کے ساتھ کام کیا۔ پھر مستقل طور سے ریاض میں کام کرتے ہیں۔ ۵؍دسمبر ۱۹۸۰ء سے ندیم اختر کا سعودیہ میں قیام ہوا۔

جناب ندیم اختر خاں صاحب کی قابل قدر خدمات

جناب ندیم اختر صاحب پیارے خاں کے تیسرے صاحب زادے ہیں یہ بات گوش گذار ہو چکی ہے کہ وہ سعودی عرب میں کاروبار کرتے ہیں ان کے اندر خدمت خلق اور تعلیم عام کرنے کا جذبہ موجزن رہتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ جہالت کی جگہ علمی روشنی آئے اس وجہ سے ہر کار خیر مکاتب واسکولوں نیز ملی اور رفاہ عام کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں چنانچہ انھوں نے علی گڈھ یونیورسٹی کو ڈھائی کڑوڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی۔ نیز دربھنگہ بہار کے ایک خیراتی اسپتال اور نرسنگ ٹریننگ سینٹر کے قیام کیلئے ۷۵ بیگہ زمین خرید کردی، سنبھل میں ایک اسکول کیلئے ۴۳ بیگہ زمین فراہم کی اس طرح کے سماجی ورفاہی خدمات میں پیش پیش ہیں۔ نیز عائشہ پبلک اسکول ڈبائی روڈ علی گڈھ میں قائم کیا۔

ان کی خدمات کے باعث ان کے والد جناب پیارے خاں اور بڑے بھائی جناب محمد شفیق عرف کوثر خاں کو صرف تعارف ہی حاصل نہیں بلکہ عام شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر ریاض الدین سنبھلی

ڈاکٹر ریاض الدین ابن شیخ محمد لیاقت اللہ، آپ سنبھل محلہ چودھری سرائے کے

ایک مہذب وعلمی خاندان میں پیدا ہوئے جب ہوش سنبھالا تو سنبھل ہی میں تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی گئی۔ آپ نے باقاعدہ درس نظامی کی تکمیل تو نہیں کی۔ لیکن علماء، صلحاء، کی صحبت اوران کی توجہ ونظر سے اتنی لیاقت وصلاحیت پیدا ہوئی کہ آپ نے دو کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ طریقہ سلوک میں حضرت حاجی حافظ سید وارث علی شاہؒ سے منسلک ہوئے اوران کے فیض باطن سے نکات تصوف سمجھنے کی استعداد کے ساتھ قوت مطالعہ اتنی بڑھی کہ "ریاض معرفت" نام سے کتاب تصنیف فرمائی جو درحقیقت چند کتابوں کا ماخذ ہے۔ جس کو مولانا روم علیہ الرحمہ کی مثنوی کا ترجمہ دفتر اول شرح سے موسوم کیا۔

انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ سنبھل بدایوں دروازہ میں دفن کیے گئے۔ آپ کی اولاد میں آج بھی اہل قلم موجود ہیں اور علمی گھرانہ ہے۔

الحاج جناب سیٹھ عبداللہ پاکستانی

جناب عبداللہ صاحب کی شخصیت سے اہل سنبھل متعارف ہیں۔ آپ کا تعلق سنبھل کے ایک معزز خاندان سے ہے۔ آپ کی پیدائش محلہ کوٹ غربی سنبھل میں جناب نمبردار مشیت اللہ کے گھر ہوئی اور سنبھل ہی میں نشوونما ہوئی۔

الحاج عبداللہ نے ملک کی آزادی کے بعد سنبھل سے پاکستان کراچی ہجرت کی وہاں پہنچ کر خوش حالی ہی نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے ظاہری وباطنی ترقیات سے نوازا۔

موصوف اپنی دریا دلی وفیاضی اور شجاعت کے باعث شمع انجمن بنے وہ غیروں اور اجنبیوں کو نفع پہنچانے والے خدمت خلق ہی کو اپنا مذہب بنانے والے، بے غرض خدمت گذاری کا پتلا تھے۔ لوگوں کو کاروبار سے لگوانے والے، غریب وغربا کا بڑا خیال رکھنے والے تھے۔

موصوف جب اپنے وطن سنبھل آتے تو لوگوں کا تانتا بندھا رہتا آپ کی فیاضی

وسخاوت اور قربانیاں اور کارنامے سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔آپ نے مایہ ناز خدمات انجام دے کر اہل سنبھل پر احسان عظیم کیا ہے۔

ان کی شخصیت جہاں ان کے گھر والوں کے لئے قابل ناز ہے وہاں شہر سنبھل کیلیے قابل فخر ہے، آپ خوش اخلاق، مستقل مزاج، ہر حال میں خوش رہنا ان کی زندگی کا نمایاں وصف تھا۔

وطن کی محبت

ہر شخص کو اپنے وطن عزیز سے محبت ہوتی ہے جناب الحاج عبداللہؒ کا وطن سنبھل اور جائے پیدائش ہے اسی کے آغوش میں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی اور ان کے آباء واجداد کا مسکن رہا ہے اور وہ اسی کی خاک میں محو استراحت ہیں۔عبداللہؒ کو اپنے شہر سنبھل سے صدق دل سے محبت تھی، معمولی علالت کے بعد کراچی میں ۱۹۹۸ء میں انتقال ہوا۔

سنبھل کے مجاہدین آزادی

(۱) منشی معین الدینؒ (۲) مولانا محمد اسمٰعیلؒ (۳) حافظ نور الحسنؒ (۴) نذر محمد (مدالہ) (۵) عبد السلام (مدالہ) (۶) چودھری بدر الدین (بلال پت) (۷) قاری عبد الحق سرائے ترین (۸) مولانا عبد القیوم صاحب (۹) مولانا عبید اللہ محلّہ دیپا سرائے (۱۰) مولانا مقصود حسین ترکی محلہ میاں سرائے (۱۱) حافظ علی حسین حاتم سرائے (۱۲) چودھری ریاست علی خاںؒ محلّہ چودھری سرائے (۱۳) مولانا سلطان احمد صاحب محلّہ دیپا سرائے (۱۴) چندو لال (۱۵) پنڈت وجے نند پرشاد (۱۶) پنڈت بانسدیوے (۱۷) پنڈت جے نارائن (۱۸) بابو چیتن سروپ (۱۹) لالہ جے پال (۲۰) رام کشور (۲۱) راجے کشن (۲۲) پریم پال (۲۳) گرونند پرشاد۔

جہاں ملک وملت کی خاطر ملک کے باشندوں نے ملک آزاد کرانے کیلئے جیلوں کو بھر دیا وہاں مجاہدین سنبھل ملک وملت کی خاطر جیل گئے، ان مجاہدین میں سے بعض ایک دفعہ ہی جیل گئے اور بعض دو دفعہ اور بعض نے تین دفعہ جیل کی صعوبتیں برداشت کیں اور قربانیاں دیں جس کے نتیجہ میں ہمارا ملک آزاد ہوا۔ اب سب ہی دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔

مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی

تاریخ آزادی کے ہیرو، وطن عزیز کے بہادر فرزند تھے مجاہدین آزادی کی ایک طویل فہرست ہے اور اس میں مختلف لوگوں نے مختلف کارہائے نمایاں انجام دے کر ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں حصہ لیا ان حضرات میں چند ایسے ہیں جن کے خون جگر کا ذکر تحریک آزادی کی تاریخ میں مل جاتا ہے انہی میں سے مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی ہیں وہ جنگ آزادی کے مخلص اور جانباز سپاہی تھے ملک آزاد کرانے کے ساتھ اس کی

بقاء اور ترقی کے لئے اہم رول ادا کیا۔ اپنے وقت کے جید عالم اور الجمعیۃ کے سرگرم رکن تھے ۔ اور حضرت علامہ کشمیریؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کا تعلق ترک برادری سے تھا خاندانی عظمت کے بموجب تعلیم وتربیت کا امیرانہ انداز میں آغاز ہوا۔ ابتدائی کتابیں سنبھل میں پڑھیں ۱۹۲۱ء میں دارالعلوم جاکر داخل ہوگئے یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا۔ ایک انقلابی دور شروع ہوا حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد ملک میں ایک طوفان برپا ہوا تھا۔ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل کو حق تعالیٰ نے علمی صلاحیتوں اور دینی وملی جذبات کے ساتھ طلاقت لسانی اور تقریر وخطابت میں کافی صلاحیت عطا کی تھی۔ اور تقریر کے میدان کے بادشاہ تھے، اور ایک سرگرم ملکی لیڈر تھے۔

میں نے بھی حضرت مولانا کی ایک تقریر محلّہ دیپا سرائے میں سنی جب کہ مولوی منور صاحب کی گرما گرم تقریریں ہورہی تھیں۔ جس کے سبب محلّہ دیپا سرائے میں اختلافی صورت حال پیدا ہوئی۔ محلّہ دیپا سرائے میں باہم شدید اختلاف نے ہیجانی کیفیت اختیار کرلی تھی۔ اور منازعات ومشاجرات تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ اس وقت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھل کے بہت بڑے عالم شمار کئے جاتے میرا تعلیمی ابتدائی زمانہ تھا۔ مجھے اپنے استاذ کا مقولہ یاد ہے کہ اس وقت مولانا اسمٰعیل صاحب بڑے جید عالم ہیں۔ اس وقت مولانا کی تقریر کا اعلان ہوا اہل سنبھل جوق در جوق آئے اور مولانا کی تقریر صدر جلسہ کی حیثیت سے تھی یہ پہلی اور آخری تقریر تھی جو میں نے سنی یہ تقریر نہایت پُر مغز مدلل تھی، اور بڑے شائستہ انداز میں تھی آپ نے حنفی مسلک کو واضح کیا اب تک جو اختلافی حالت پیدا ہوئی تھی وہ مولانا کی تقریر سے کافور ہوئی اور حنفی المسلک کے لوگ بڑے دلدادہ ہوگئے آپ خطابت کے بادشاہ تھے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ہی تقریر وخطابت کے میدان میں دوڑنے لگے تھے مولانا کی اقتدا میں ایک جمعہ

پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا جو خطبہ دیا تھا وہ موجودہ حالات حاضرہ کے مطابق مرتب کیا تھا وہ تعطیل میں جب دیوبند سے اپنے وطن سنبھل آئے ہوئے تھے تب سنبھل ہی میں تحریک خلافت سے متعلق ایک جلسہ میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف ایک جوشیلی تقریر کی جو موثر بھی ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں گرفتار بھی کئے گئے۔ مقدمہ چلا دو سال کی قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ مولانا ضلع مراد آباد کی ہی جیل میں رہے یہ وہ منحوس دور تھا۔ جب ہندوستان کی جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بھی اخلاقی مجرموں چوروں ڈاکوؤں کی طرح سخت مشقت کے کام لئے جاتے تھے اور ان کو پہننے کیلئے انہی جیسے کپڑے دیئے جاتے تھے مولانا کی دو سالہ مدت قید اس طرح سخت مشقت کے کاموں میں گزری مولانا منظور نعمانی رقمطراز ہیں کہ ان ایام میں چکی بھی پیسی بیلوں کی طرح کولھو بھی کھینچا جس سے اتنا پسینہ بہتا تھا کہ زمین کے جس دائرہ پر کولھو کا چکر چلاتے تھے وہ پورا چکر پسینہ سے ایسا تر بتر ہو جاتا تھا جیسے کہ بارش ہوتی ہے اور اس پر ان کے پاؤں پھسلنے لگتے اس طرح قید کی پوری مدت ختم ہونے پر رہائی ہوئی اس کے بعد بسلسلہ تعلیم کچھ عرصہ تک جامعہ ملیہ میں بھی قیام رہا۔ گرفتاری اور قید کی وجہ سے تین سال سے زیادہ مولانا کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ پھر مولانا درسیات کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے مدرسۃ الشرع میں حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی جو صدر المدرسین کی حیثیت سے تھے ان سے منطق، فلسفہ، اصول فقہ، کی آخری کتب میر زاہد، ملا جلال، اور حاشیہ بحر العلوم، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، توضیح تلویح تمام کتب پڑھیں۔ رمضان المبارک کی تعطیل میں مولانا عبد المجیدؒ سے امور عامہ، شمس بازغہ پڑھیں۔ مولانا نے شوال ۱۹۴۳ء میں دار العلوم دیوبند جا کر دورہ حدیث کی تکمیل کی حضرت علامہ کشمیری سے بخاری شریف پڑھی فراغت کے بعد اسی سال ۱۹۴۴ء میں مدرسہ شاہی مراد آباد تدریسی خدمت کے لئے تقرر ہوا علمی استعداد کا جوہر ظاہر ہوا۔ آپ

کے اس ذوق میں ترقی ہوتی رہی حدیث کا مثالی درس دیتے اور اس میں عجیب عجیب نکات بیان فرماتے بیس سال تک نمایاں تدریسی خدمات انجام دے کر ایک بلند مقام حاصل کیا آپ ان چند اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجے کی جامع قابلیت وفضیلت واستعداد کا سکہ بٹھایا نہایت وقار اور حشمت کے ساتھ خدمت انجام دی۔ مدرسہ شاہی کی درس وتدریس کے دوران بھی کئی بار جنگ آزادی کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور مختلف جیلوں میں رہے۔ آخری دفعہ اس وقت گرفتار ہوئے جب دوسری جنگ عظیم کے درمیان کانگریس نے ہندوستان چھوڑو کا نعرہ بلند کر کے آزادی کی آخری فیصلہ کن جنگ چھیڑی جمعیۃ علماء کے تقریباً سب ہی اکابر اور کانگریس کے تمام وہ لیڈر جو روپوش نہیں ہوئے تھے گرفتار کر لئے گئے۔ اس وقت مولانا کو بھی گرفتار کر کے غیر معینہ مدت کیلئے مرادآباد جیل میں نظر بند کر دیا گیا ایک سال بعد رہائی ہوئی۔

سیاسی سرگرمیاں

مدرسہ شاہی کے تدریسی زمانہ میں پہلی بار ۱۹۳۶ء میں الیکشن لڑا اس میں مولانا طفیل سنبھلی کی سیٹ پر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے جس میں اس وقت جمعیۃ علماء بھی شریک تھی۔ دوسری دفعہ ۱۹۴۶ء میں جنرل الیکشن میں جو برطانوی حکومت کے دور کا آخری الیکشن تھا مولانا کانگریس کے ٹکٹ سے کھڑے ہوئے تھے اس الیکشن کے بعد مولانا کو کمپیٹیشن لڑنا پڑا اور دوبارہ الیکشن ہوا مولانا کامیاب ہوئے اور انہیں دنوں میں ملک غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہوا۔

اس سلسلہ کی مصروفیتیں اتنی بڑھ گئیں کہ مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد کی تدریسی ذمہ داری سے سبکدوشی کا فیصلہ کرنا پڑا ۱۹۵۲ء میں جب اسمبلی کی ممبری کی مدت ختم ہوگئی تو پھر قدیم درس وتدریس اور تقریر ووعظ کی اپنی لائن اختیار کی اور قریب بیس سال کے

عرصہ میں گجرات آنند کے مدرسہ میں اور امروہہ مدرسہ چلہ اور مختلف مدرسوں میں شیخ الحدیث کے حیثیت سے حدیث شریف کا درس دیتے رہے۔

بیعت

زمانہ تدریس کی ابتداء سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہوئے، مولانا محمد اسمٰعیل کو شیخ الاسلام سے ابتدأ عقیدت نہیں تھی۔ مولانا کا خود بیان ہے کہ ایک دفعہ شیخ الاسلام کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا ایک شخص ہمارے قریب سے لیٹرین میں گیا اور جھانک کر واپس آ گیا شیخ الاسلام لیٹرین گئے اور چند منٹ بعد باہر تشریف لائے اپنی جگہ پر آ کر فرمایا آپ قضائے حاجت کے لئے گئے تھے فارغ ہو آئے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ لیٹرین گندی ہے، غلاظت پھیلی ہوئی ہے، طبیعت نے گوارہ نہیں کیا آپ نے فرمایا کہ وہ تو صاف ہے جا کر دیکھیں جب اس شخص نے دیکھا تو واقعی لیٹرین صاف تھی شیخ الاسلام نے اس شخص کی خاطر گندگی خود صاف کی۔

مولانا محمد اسمٰعیلؒ کا بیان ہے کہ مجھے شیخ الاسلام کے اس عمل سے عقیدت ہوئی اور اتنی عقیدت وارادت سے تعلق اتنا بڑھا کہ بیعت کے اجازت سے بھی سرفراز ہوئے (خلافت ملی) ۷۵ رسال کی عمر ہوگئی تو گھر (اپنے وطن) ہی قیام کا فیصلہ کر لیا مطالعہ اور تصنیف وتالیف کو اپنا مشغلہ بنا لیا تھا۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے اول بیعت ہوئے پھر بعد میں اجازت سے بھی سرفراز ہوئے مولانا علمی کمالات اور سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک مصلح بھی تھے آپ سے اصلاحی تعلق رکھتے کثیر تعداد خاص کر موانہ کلاں ضلع میرٹھ میں سینکڑوں مریدین تھے جناب صوفی عبدالرزاق صاحب آپ کے خلیفہ ومجاز ہیں۔

آخر مولانا ایک سفر سے مریض ہو کر واپس ہوئے یہ بیماری نشیب وفراز کے ساتھ طویل ہوگئی۔ بہترین علاج ومعالجہ کے بعد مرض نے شدت اختیار کی اس لئے بغرض

علاج مرادآباد لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے اپنی جانب سے بہت کوششیں کیں مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی آخرکار سنبھل لے آئے اور وقت موعود آپہنچا ۲۳ر نومبر ۱۹۷۵ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام خدمات کو قبول فرما کر ان کے درجات بلند سے بلند کرے اور انھیں کے طفیل ہم ہیچ مدانوں کو سمیٹ لے۔

قاری عبدالحق سنبھلی

سنبھل کی ممتاز اور مشہور شخصیات جن کا فیض ہند سے گزر کر عرب تک پہونچا اور عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو اکابر اور اسلاف کا نمونہ تھے۔ ان میں سے ایک حضرت قاری عبدالحق ہیں۔ آپ سرائے ترین کے بہترین امانتدار اور متدین تاجر حاجی عبداللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ عبداللہؒ جو حج کے لئے مکۃ المعظمہ تشریف لے گئے تھے وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ ایک فقیر آپ کے دروازے پر پڑا رہتا تھا۔ اس نے آپ کے انتقال کی خبر دی تھی۔ اس کو نوری شاہ کہتے تھے۔

یہ شخص مجذوب تھا۔ یہاں تک کہ کپڑوں میں جوئیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ قاری صاحب کی والدہ محترمہ بھی ایک نیک عابدہ زاہدہ حافظہ تھیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا اول دن ہی سے لحاظ رکھا گیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور وظائف سے آپ کو بڑا شغف تھا۔ ایک مربی اور معلم کی طرح تعلیم و تربیت کی۔ قاری صاحب شروع ہی سے علم کے دلدادہ اور ہونہار تھے۔ اگرچہ آپ درس نظامی کی تکمیل تو نہیں کر سکے حصول علم کے لئے مولانا حبیب احمد صاحب شاہجہاں پوری کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے تھے۔ حضرت مولانا حسین مدنیؒ کا آپ ذکر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا شاہجہاں پوری اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ دونوں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے۔ مولانا موصوف کی کتابیں میں نے ایک دن ادھر ادھر کر دیں

مولانا دیکھ کر غصہ میں بھر گئے اور فوراً ایک طمانچہ رسید کیا، طالب علمی کا زمانہ تھا اسلئے تحمل نہیں کر سکے اور گھر آ گئے۔ چونکہ اہل اللہ سے تعلق و محبت آپ کے دل میں تھی اسی تڑپ میں بزرگوں کی تلاش میں رہے۔ ادھر تعلیم بھی ادھوری تھی۔ قرآن کریم حفظ کیا اور کچھ فارسی پڑھی، قاری حمید اللہ سنبھلی سے تجوید پڑھی جو قاری عبد اللہ مراد آبادی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔

قاری حمید اللہ میرٹھ شہر گھنٹہ گھر والی مسجد میں ایک مدت تک امام رہے جب بھی قاری عبد الحق صاحب میرٹھ تشریف لے جاتے تو موصوف کے یہاں قیام فرماتے بندہ مؤرخ بھی کئی بار حضرت قاری صاحب کے ہمراہ حاضر ہوا ہے۔

مراد آباد میں ایک بزرگ تھے جن کا نام عبد الرحمٰن تھا آپ کو ان سے عقیدت ہو گئی آپ حضرت سائیں توکل شاہ انبالویؒ کے خلیفہ تھے۔ اور سائیںؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء میں سے تھے۔ اب ان کے مقبرہ پر انبالے میں بغیر قوالی کے بڑی شان و شوکت سے عرس منایا جاتا ہے۔ شہر سنبھل کے جناب نواب عاشق حسین خاں اور دیگر بہت سے حضرات ان کے حلقہ عقیدت میں داخل ہو کر مرید ہوئے۔ اور وہ سنبھل سرائے ترین اپنے حلقہ مُریدین میں آمد و رفت فرماتے۔ آپ اپنے وقت کے متبع سنت و درویش صفت انسان تھے۔ اس مدت میں سنبھل سے مراد آباد جانے کے لئے کسی سواری کا انتظام نہیں تھا۔ قاری صاحب پیادہ سفر کرتے تھے۔ کبھی سائیکل بھی استعمال کی ہے۔

جب بیت اللہ کی زیارت کا شوق بڑھا تو آپ نے اپنے پیر کی اجازت حاصل کی اور حج کا عزم کیا۔ پیر نے محب الدین مکی کے نام ایک خط لکھا جو حاجی امداد اللہ کے خلیفہ تھے اور اپنے وقت کے قطب عالم تھے۔ مکہ میں ایک سال قیام رہا۔ دوران قیام حزب البحر کا علم حاصل کیا اور پورے طور سے عامل بن کر وطن سنبھل واپسی ہوئی۔

جب آپ مکۃ المکرّمہ تشریف لے گئے تھے تو اپنی چھ ماہ کی صاحبزادی کو توکل علی اللہ پر چھوڑ گئے تھے۔

فن عملیات

مکہ سے واپسی میں شہر بمبئی میں بہت سے عملیات کا آپ سے ظہور ہوا۔ مثلاً آپ نے ایک عمل پڑھا جس کے نتیجہ میں سمندر سے ایک عجیب قسم کا جانور ظاہر ہوا۔ جس کو ان کے دوست نیاز اللہ خاں نے سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اُرد کے دانے پڑھ کر جب اس پر مارے تو وہ اندر داخل ہوگیا۔

قیام مکۃ المکرمہ

جب مکہ میں مقیم تھے اس وقت کا ایک واقعہ ہے کہ آپ نے شیخ محب الدین سے جو کشف میں مشہور تھے عملیات سیکھنے کا شوق ظاہر فرمایا تو انھوں نے جزب البحر کا عمل بتایا کہ وہ مسجد خیف منیٰ میں پڑھا جائے گا۔ چنانچہ آپ نے ایک خچر اسی غرض سے خریدا۔ آپ خچر پر سوار ہوکر مسجد خیف عمل پڑھنے کے لئے جاتے۔

مدرسہ صولتیہ

مکہ معظمہ میں حرم شریف کے قریب مدرسہ صولتیہ ہے اس میں کچھ ایام تدریسی خدمت انجام دی۔ طلبہ سے خچر کے لئے سناء مکی کافی مقدار میں خرید کر منگاتے جو وہاں خچر عام طور سے کھاتے ہیں۔

صولتیہ کی تدریس میں آپ بہتر استاذ ثابت ہوئے۔ قاری صاحب فرمایا کرتے کہ جب میں مکہ میں کسی راستہ سے گزرتا تو مقامی طلبہ کھجوریں اور زمزم پیش کیا کرتے تھے۔ اور جتنے طلبہ کا مکان درمیان میں پڑتا تو وہ طالب علم ایک طشتری میں کھجوریں اور زمزم پیش کرتا یہ اسوقت کا ایک دستور تھا۔

تعلیم عمل

عمل سیکھنے کے دوران چند واقعات پیش آئے۔ شیخ محبّ الدین نے جو طریقۂ عمل بتایا تھا اسی کے مطابق حصار کیا تو محسوس ہوا کہ مسجد میں کچھ لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔ حضرت شیخ سے آکر تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ جنات تھے اور آئندہ کیلئے مجھے نصیحت فرمائی کہ حصار سے ہرگز باہر مت آنا اگرچہ تم کو محسوس ہو کہ میں وہاں ہوں تو فی الحقیقت میں نہیں ہوں گا بلکہ وہ میری صورت میں ایک جن ہوگا۔ جو تمہیں بہکانے کی کوشش کرے گا۔ اگر تم ہٹ گئے تو تمہارا عمل باطل ہو جائے گا۔ اور تم کو دبا کر ہلاک کر دے گا۔

فرمایا کہ ایک دن مسجد کے دروازے پر آکر ایک شخص نے دستک دی، ایسا محسوس ہوا کہ حضرت شیخ ہیں۔ آواز دی عبدالحق عبدالحق، اور فوراً خیال آیا کہ کنڈل سے فوراً باہر آجاؤں مگر حضرت کی وہ نصیحت یاد آئی میں آنے سے باز رہا۔

ایک روز دیکھا کہ سنبھل گھر میں چھ ماہ کی جولڑکی چھوڑ کر گئے تھے وہ مرگئی ہے اور لوگوں نے جنازہ لاکر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس طرح کے واقعات پیش آئے آپ نے گیارہ دن میں عمل پورا کیا۔

فرمایا کہ بیت اللہ کے قریب ایک منارہ ہے جہاں غوث اعظمؒ نے ایک مدت تک اس انتظار میں وہاں قیام کیا کہ بیت اللہ کا طواف کرنے والا جس روز کوئی نہیں ہوگا اس روز میں طواف کروں گا۔

ایک روز بہت تیز کی آندھی آئی اس وقت کوئی طواف کرنے والا نہیں تھا، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک اژدہا اپنا پھن اٹھائے بہت تیزی سے بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے۔

فرمایا کہ زمزم کے قریب ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی آنکھیں بڑی بڑی لحیم شحیم آدمی تھے۔ انھوں نے مصافحہ کیا اور یکا یک غائب ہو گئے، تلاش کرنے پر جب نہ ملے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی غوث تھے جو ملاقات کر کے غائب ہو گئے۔ آپ نے غار حرا کا سفر

پیادہ کیا اور مکۃ المکرمہ سے مدینہ منورہ پیادہ گئے۔

ایک مرتبہ غار ثور کی بلندی پر چڑھے وہاں کوئی اور غار تھا اس میں گر گئے کچھ بدوی لوگ جو اُدھر سے گذر رہے تھے انہوں نے نکالا۔ اور پھر بدوؤں نے راستہ میں زدوکوب بھی کی۔

آپ جب عازم حج ہوئے اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں تھا صرف توکل علی اللہ پر گھر سے نکلے اور بمبئی پہونچے وہاں ایک انگریز بے ہوش تھا اس پر آپ نے منتر پڑھا تو اس کو ہوش آیا اس نے ایک بڑی رقم آپ کو دی جس سے بقیہ سفر طے کر کے منزل مقصود تک پہونچے جب ایک سال مکہ قیام کے بعد واپسی ہوئی تو حافظ عبدالرحمٰن مرادآبادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ پھر آپ نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کا تعلق قائم کیا۔

جنگ آزادی

جہاں ہندوستان کی آزادی میں مجاہدین کی بڑی فہرست ہے وہیں قاری عبدالحق نے بھی حضرت شیخ الاسلام کے دوش بدوش رہ کر نمایاں کام انجام دیئے۔ اور کانگریس اور جمعیۃ علماء سے منسلک رہ کر کام کیا۔ حکومت کی سول نافرمانیاں بھی کیں۔ قاری صاحب گھماؤلی سے گرفتار ہوئے مرادآباد جیل میں ۹ رماہ رہے حضرت شیخ فخر الدینؒ بھی ساتھ تھے۔

مجاہد آزادی

جس طرح پورے ملک کے مجاہدین کو ہماری گورنمنٹ وظیفہ دیتی تھی۔ قاری صاحب کو بھی آخر عمر تک وظیفہ ملا اور تمغہ بھی حاصل ہوا تھا۔

دستکاری

سنبھل سرائے ترین سینگ کی دستکاری ہوتی ہے۔ قاری صاحب نے ابتدأ

سینگ کی کنگھی بھی بنائی ہے۔

مدرسہ شمس العلوم

آپ نے ایک مدت تک مدرسہ شمس العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی۔ چونکہ قاری صاحب کا فیض طول وعرض میں پھیل چکا تھا۔ عملیات میں ہزاروں شاگرد ہو چکے تھے اور ہر چہار سمت مقبولیت عامہ ہوئی تو مدرسہ کی تدریسی ذمہ داری کو ترک کر کے اپنے گھر پر مکتب کی صورت میں طلبہ کو قرآن کریم پڑھاتے اور آپ کے داماد سینگ کی دستکاری کے ساتھ قرآن کریم کا درس دیتے آپ کے نواسہ حافظ خلیق احمد صاحب نے ایسے ہی حفظ کیا۔ مدرسہ کی تدریس کے بعد آپ کا قیام گھر پر رہتا اور مدرسہ شمس العلوم کے آپ سرگرم رکن و ناظم اعلیٰ تھے۔ گویا مدرسہ آپ ہی سے تھا اور تمام نظم ونسق آپ ہی فرماتے اس وقت شمس العلوم کی تعلیم کا معیار بہت بلند تھا۔

قاری عبدالحق صاحب کا قیام وطن میں تعویزات کا سلسلہ شدومد کے ساتھ شروع ہوا ہر روز سینکڑوں مریض دور دراز سے عقیدت لے کر آتے اور شفاء ہوتی۔ جس طرح ایک حاذق طبیب کے یہاں ازدحام رہتا ہے قاری صاحب کے پاس بھی مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جب تک طاقت رہی نماز جمعہ کے بعد سفر فرماتے ۳ ریوم تک باہر رہتے۔ جب ضعف ہوا تو سفر بہت کم کر دیا جوں جوں ضعف طاری ہوا تو سفر بند کر دیا جہاں جاتے ایک جم غفیر جمع ہو جاتا۔ اور دعا و تعویذ طلب کرتا۔

آپ کی مجالس

آپ کی مجلس اکابرین کا نمونہ تھی ہر کام میں سنت کا اہتمام تھا۔ آپ کے وقت سے سنبھل سرائے ترین میں ایسی مجلس آج تک نہیں پائی گئی۔ بڑے بڑے علماء، وصلحاء آپ کے یہاں آتے حضرت مونالا ابرارالحق صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ بھی تشریف

لائے ہیں۔ اکثر علماء آپ کے یہاں حاضر رہتے۔ حضرت مولانا اختر شاہ صاحب ہر جمعرات کو مدرسہ شاہی مرادآباد سے آتے تو آپ سے ملاقات ضروری تھی۔

بندہ بھی طالب علمی کے زمانے میں برابر حاضر ہوتا۔ اور حضرت بہت شفقت فرماتے۔ آپ کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ آپ سے ملاقات کیلئے جو بھی آتا اس کو چائے ورنہ ایک کھجور ضرور عطا کرتے۔ خاص کر نماز جمعہ کے بعد ایک مجلس ہوتی جس میں اہل علم اور مقتدا حضرات شریک ہوتے حضرت نماز کے بعد کھانا تناول فرماتے۔ علمی مذاکرے ہوتے۔ اور بعد میں چائے کا دور چلتا۔

شاگرد

عملیات میں آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں۔ کوئی مقام شہر ایسا نہ ہوگا جہاں آپ کا کوئی شاگرد نہ ہو۔ آپ کو شیخ الجن سے یاد کرتے تھے۔ آسیب کا کیسا ہی مریض آیا اس کو بحکم خدا شفاء ہوتی۔ آپ کی ایک خاص بیاض تھی جس میں حضرت حاجی امداد اللہ مکی اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ کے عملیات وتعویزات تھے وہ اپنے شاگردوں کو املا کراتے اور بعض تعویذ کی زکوٰۃ نکلواتے اور تعویذ دینے کی اجازت دیتے۔ بندہ مؤرخ کو بھی عملیات کی پوری بیاض نقل کرائی۔ اور بعض تعویذ کی زکوٰۃ دی۔ حضرت نے بندہ کو عملیات کی اجازت عطا کی۔ الحمد اللہ آج بھی وہ تعویذ جس کی زکوٰۃ دی تھی۔ جس کو دیا جائے شفاء ہوتی ہے۔ مجرب ہے۔

نکاح

آپ نے چار شادیاں کیں۔ چودہ اولاد لڑکے لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ سب ہی فوت ہوگئے صرف ایک صاحبزادے عبدالخالق اور ایک صاحبزادی چھوڑی۔ آپ نے اپنی حیات میں دونوں کو جائداد تقسیم کر دی تھی۔ اب ہر دو اپنے حصہ پر قابض ہیں۔

قاری عبدالحق صاحب کی وفات بروز پیر ۴؍ذی الحجہ میں ۱۴۰۲ھ کو ہوئی اور بروز منگل دس بجے جامع مسجد میں نماز جنازہ ہوئی۔ بندہ مؤرخ کو نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سرائے ترین قبرستان ابوسعید کے قریب دفن کیے گئے۔

مجاہد آزادی مولانا عبدالوحید

مولانا عبدالوحید صاحب سنبھل کے ایک علمی گھرانہ کے چشم وچراغ تھے اور ترک خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے والد محترم مولانا عبدالمجیدؒ ایک معروف ومشہور جید عالم دین تھے۔ اوراس وقت کے ممتاز علماء میں شمار تھا۔ دوردراز کے بہت سے تشنگان علوم کو فیض یاب کیا ہے۔

۱۸۹۸ء میں عبدالوحیدؒ کی پیدائش ہے۔ مولانا عبدالوحید نے علمی ماحول میں آنکھ کھولی اوراسی میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم مولانا عبدالمجیدؒ سے حاصل کی۔ پھر سنبھل کے قدیم مدرسہ سراج العلوم میں داخل ہوکر اکتساب علم کیا۔ اس کے بعد علمی تشنگی بجھانے کے لئے مظاہر العلوم سہارنپور چلے گئے۔ علوم متداولہ کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند آگئے۔ دارالعلوم کے جید علماء واساتذہ سے فیض یاب ہوکر اپنی علمی تشنگی بجھائی اور فارغ التحصیل ہوکر قاسمی کہلائے۔

دوران تعلیم قوم وملت کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ پروان چڑھتا رہا۔ مولانا موصوف ایک بڑے زمیندار تھے کاشتکاری آبائی کام کے باوجود انھوں نے علوم دینیہ کی اشاعت اور خدمت دین وخدمت خلق ووطن کو اپنا شعار بنایا۔ اس دور میں برطانوی سامراج کے خلاف پورے ملک ہندوستان میں نفرت پھیلتی جارہی تھی۔ دوسرے محب وطن وسرفروشوں کی طرح مولانا عبدالوحید صاحب بھی میدان عمل میں آگئے ملک کے قائدین ورہنماؤں سے روابط قائم رکھتے ہوئے ان کی قیادت میں انہوں نے آزادی کی ترغیب دینے اور تحریک کو مزید تقویت پہنچانے کی غرض سے مالٹا، رنگون، اور برما کے سفر کیے

ادھر برطانوی حکمراں مولانا کی یہ مجاہدانہ سرگرمیاں اور حب الوطنی کیسے گوارہ کر سکتے تھے۔ موصوف کو ۱۹۳۰ء میں جیل بھیج دیا۔ جیل میں مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ مولانا نے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کیا ذرا جنبش نہیں ہوئی اپنے مشن پر قائم رہ کر قدم آگے بڑھاتے رہے۔ چار ماہ کی قید بامشقت برداشت کرنے کے بعد رہائی کا پروانہ ملا۔ رہائی کے بعد پھر اپنے مشن میں سرگرم ہو گئے۔ اور حصول آزادی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا عبدالوحید صاحب نے آزادی حاصل ہونے کے بعد گوشہ تنہائی اختیار کی اور ۱۸ ار اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اس مجاہد آزادی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آبائی قبرستان پختہ باغ حسن پور روڈ میں سپرد خاک کیے گئے۔

مجاہد آزادی حافظ نور الحسن رحمہ سنبھلی

حافظ نور الحسنؒ کے والد محترم کا نام شیخ امانت اور دادا کا نام کریم اللہ تھا۔ یہ بڑے زمیندار گھرانہ کے شمار کیے جاتے تھے اور ترک برادری سے تعلق تھا۔ ۱۹۱۰ء میں شیخ امانت اللہ کے گھر آپ کی پیدائش ہوئی۔ خاندان کے افراد میں دینی ماحول تھا۔ آپ کے دو بھائی آپ سے بڑے تھے اور دونوں حافظ قرآن تھے۔

حافظ صاحب کی ابتدائی تعلیم

قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد فارسی پڑھنے کا آغاز ہی ہوا تھا کہ سنبھل کے بچے تحریک آزادی میں سرگرم تھے وہاں حافظ صاحب بھی میدان میں اتر پڑے۔ مادر وطن کو غلامی سے نجات دلانے کی تحریک میں اور مذہب وملت کی خدمت کی خاطر حریت وانقلاب کی ترغیب میں پیش پیش ہو گئے۔

اردو زبان

حافظ صاحب اپنی تحریر میں رقم طراز ہیں کہ میری زندگی میں اردو زبان کو خاص

دخل رہا ہے اس کی ترقی کیلئے مالی امداد بھی کی۔ نیز تحریک آزادی کے دور میں سیاسی نظمیں لکھوائیں اور آگے لکھتے ہیں کہ میرے محلّہ کے بزرگ حاجی رحیم بخش تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں چند نظمیں لکھیں۔ ایک نظم کے ایک شعر یاد ہے وہ پیش خدمت ہے۔

الٰہی سلطنت برطانیہ برباد ہو جائے
غلامی دور ہووے ہند آزاد ہو جائے

یہ انقلابی دور تھا سنبھل کے سرفروشوں کے ساتھ حافظ صاحب بھی شریک کار ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے شاردا بل کے خلاف امروہہ میں ایک عظیم الشان جلسہ مولانا معین الدین اجمیریؒ کی زیر صدارت ہوا۔ جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری اور علماء ملت بھی شریک تھے۔ حافظ نورالحسن صاحب نے اس جلسہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ شرکت کی۔ جلسہ میں جو قرارداد طے ہوئیں ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے منہمک ہو گئے، نیز حافظ صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کانگریس کی جڑیں مضبوط کرنے اور پیغام حریت کو گھر گھر پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

پانچ جوان

حافظ نورالحسن صاحب کے خاص پانچ نوجوان ساتھیوں کے بارے میں ایک نظم گلی گلی گونج رہی تھی۔

عزیز، افتخار، شیر، سعادت، نور کے صدقے
بڑوں کو شرم آنا چاہئے ان پانچ کے صدقے

گرفتاری۔

۱۹۳۰ء میں سنبھل کے نوجوانوں نے ایک جلوس نکالا جو کوتوالی تک گیا۔ اس کی قیادت حافظ نورالحسن صاحب نے کی تھی۔ کوتوال، جلوس اور تقریر کے خلاف تھا۔ بایں

وجہ اس ہجوم پر لاٹھی چارج کرنے کا حکم دیا۔ مار پیٹ کی نوبت آئی، حکومت نے اس کو بلوا قرار دیا اور غداروں کا الزام لگاتے ہوئے تین سو سے زائد افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اس موقعہ پر حافظ نورالحسن کو معافی مانگنے پر مجبور کیا گیا مگر انھوں نے ظلم برداشت کیا معافی نہیں مانگی۔ مقدمات میں الجھادیئے گئے۔ چھ ماہ کی سزا اور پچاس روپیہ جرمانہ عائد کیے اور اس کے علاوہ بلوا کرانے کا جرم عائد کرتے ہوئے چار ماہ کی سزا دی گئی۔ حافظ صاحب کو ''سی'' کلاس میں رکھا گیا اور سخت ترین مشقت کے کام لئے جاتے تھے ۱۹۴۲ء کی تحریک میں حافظ صاحب کو ڈیڑھ سال کی سزا ہوئی اور دو سو روپے کا جرمانہ ہوا۔ اس بار انہیں ''بی'' کلاس میں رکھا گیا۔ قریب دس سال تک ضلع پریشد کے رکن اور شہر کانگریس کمیٹی کے مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ اترپردیش حکومت نے انھیں وظیفہ آزادیٔ وطن دیا جوتاحیات جاری رہا۔

خدمات

سنبھل شہر کے تبلیغی جماعت کے آپ امیر تھے۔ مرکز میں برابر تشریف لاتے خاص کر ہفتہ واری اجتماع پروگرام کا مشورہ آپ کی موجودگی میں ہوتا اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دیا اور دم آخر تک امارت کے منصب پر فائز رہے۔

محلہ میاں سرائے میں ایک مکتب قائم کیا جس کا نام حمایت الاسلام رکھا گیا۔ آپ آخری دم تک مہتمم کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ آج وہ حمایت الاسلام ایک ادارے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور قرآن کریم کی تعلیم اور علوم دینیہ کی اشاعت وفروغ میں سرگرم ہے۔

عبادات

آزادی کے بعد سے حافظ صاحب نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور

یکسوئی کی زندگی گزارنے کوترجیح دی تنہائی کو پسند کر کے عبادات میں سرگرم ہو گئے۔
فرائض کے کیا معنی نوافل کی پابندی فرماتے شب میں تہجد ادا کرنے کیلئے مسجد آتے
تو صبح اشراق کے بعد مسجد سے باہر تشریف لاتے۔ حافظ صاحب وعدہ کے پکے عمل میں
مخلص حسن سیرت، حسن خلق سے آراستہ، بامروت شخص تھے۔ خدمت خلق اور خدمت
دین کے ساتھ محبّ وطن تھے۔

وفات

۶ نومبر ۱۹ء بروز اتوار کو داعی اجل کو لبیک کہا اور سپرد خاک کیے گئے۔

مجاہد آزادی مولانا سلطان احمدؒ صاحب

حضرت مولانا محلّہ دیپا سرائے کے باشندے تھے۔ اور ترک برادری سے تعلق تھا
قریب ۱۹۱۰ء میں پیدائش ہے۔ والد محترم کا نام جمیل احمد تھا۔ اور آپ کے ایک بھائی
حضرت مولانا محمد عثمانؒ تھے آپ نے ابتدائی تعلیم سنبھل میں حاصل کی۔
مولانا سادگی، شرافت نفسی، منکسر المزاجی اور متانت کے پیکر تھے۔ جرأت و بےباکی
، صداقت اور صاف گوئی کے علم بردار تھے۔ پرخلوص خدمت کا جذبہ رکھنے والے۔
غیر معمولی صلاحیت وقوت والے۔ وطن کی خاطر قربانی کا جذبہ ان میں موجزن تھا۔
۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے امروہہ میں شار دا ایل کے خلاف مولانا اجمیریؒ
کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا۔ اس میں سنبھل کے چند نوجوان شریک
ہوئے اس کے بعد سے سنبھل کے نوجوان تحریک میں سرگرم ہو گئے۔ اور کانگریس کی
جڑیں مضبوط کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ اور برطانوی حکومت کے خلاف ایک جلوس
نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اسے عملی جامہ پہنایا۔ اس جلوس میں سنبھل کے نوجوان کے ساتھ
مولانا سلطان احمدؒ شریک کار تھے۔ جلوس سے ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔ اور تحریک میں ایک

نئی جان پڑ گئی تھی۔ اس میں مولانا پیش پیش تھے۔ اس موقع پر جہاں سنبھل کے قریب سوافراد گرفتار ہوئے وہاں مولانا سلطان احمد بھی گرفتار ہوئے۔ پولس سے مقابلہ بھی کیا۔ پولس کی مار بھی کھائی۔ جس میں سخت زخمی ہوئے، مرتے دم تک چوٹ کے نشانات ان کے مجاہدانہ کارناموں اور حکومت برطانیہ کے مظالم کی یاد تازہ کرتے رہے اس مرد مجاہد نے پولس کی گرفت سے بچنے کے لئے دہلی کوچ کیا۔ اور دہلی سکونت پزیر ہوئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں فتویٰ نویسی اور مسجد خوں بہا میں قرآن کریم کا درس دینے میں مشغول ہوگئے۔ چونکہ مسلمانوں کو تحریک آزادی میں ترغیب دینا ان کا نصب العین بن چکا تھا۔ وہ خاموش نہیں بیٹھے۔ موجودہ حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور مسلمانوں کو متحد کرنے میں مشغول رہے۔ چیف کمشنر دہلی نے ۱۹۳۳ء ماہ جون میں مولانا سلطان احمد کو شہر دہلی سے بدر کرنے کا حکم نافذ کیا۔ پولس کی گاڑی میں شام کے وقت ان کو بٹھا کر ۱۲ ؍میل دور ایک ویران مقام پر چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے وطن سنبھل پہنچے۔ حکومت کے مظالم ان کو اپنے مشن و تحریک کی دعوت سے نہیں روک سکے۔ سنبھل واپسی کے بعد تحریک کی دعوت دوسرے علاقوں میں لے کر پہنچے۔ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

۱۹۳۷ء میں شہر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنے دور صدارت میں متعدد جلسے کرائے جس سے مسلمانوں میں کانگریس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مولانا سلطان احمدؒ نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے مسلم و ہندوؤں کے درمیان اتحاد کی انتھک کوشش کی، اور ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ آپ کی کوشش کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے کانگریس میں شامل ہو کر تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد مولانا نے سرگرم سیاست سے کنارہ کشی کی اور درس و تدریس وقرآن کی تعلیم انجام دہی میں مصروف ہوگئے آخر وقت تک کانگریس کے نظریات کے حامی رہے۔

وفات

۱۳ راگست ۱۹۸۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔

مجاہد آزادی چودھری ریاست علی خان

سنبھل کے مجاہدین آزادی و سرفروشوں میں چودھری ریاست علی خان کا نام قابل ذکر و اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کا تعلق سلطان پور عرف چودھری سرائے کے ایک معزز خاندان سے ہے۔ ۱۸۹۴ء میں چودھری ممتاز علی خاں کے گھران کی پیدائش ہوئی۔ جن کا تعلق مسلم راجپوت سے تھا او شہر سنبھل کے عمائدین میں شمار تھا۔ ریاست علی خان کو خاندانی عظمت و شرافت ورثہ میں ملی۔ اوران کی ذات گرامی خود بھی بلند تر تھی گویا کہ وہ اسم با مسمّٰی تھے۔

ایک زمیندار گھرانہ میں آنکھ کھولی، عیش و عشرت کے ماحول میں پروان چڑھے۔ وطن سنبھل میں تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ تحریک آزادی میں مجاہدین آزادی کے ساتھ دوش بدوش رہے۔

دستورِ ہند کے دفعہ ۱۷ر کے تحت گرفتار کر لئے گئے مرادآباد جیل میں قید کئے گئے ۱۸ راپریل ۱۹۲۳ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ رہائی کے بعد وہ خاموش نہیں بیٹھے بلکہ پھر اپنے مشن میں جڑ گئے۔ اور تحریک آزادی کو منظم کرنے، انگریزوں کے خلاف ہندوستان چھوڑو تحریک میں سرگرم عمل جاری تھا کہ ۲۶ را کتوبر ۱۹۲۳ء کو دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور دوسال قید خانہ میں سخت سزا، چکی چلانے اور باند بٹنے کا کام سپرد کیا گیا۔ طرح طرح کی جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ دوسال کی بامشقت قید سے رہائی حاصل ہونے بعد ریاست علی خان نے پرسکون زندگی گذارنے کو ترجیح دی اور ۷۵ سال کی عمر میں مارچ ۱۹۶۹ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو گئے۔

مولانا عبدالقیوم مجاہد آزادی

آپ کے والد کا نام منشی کفایت تھا محلہ دیپا سرائے ترک برادری سے تعلق تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا عبدالقیومؒ کی پیدائش ہے، آپ کے تعارف کے لئے اتنا کافی ہے کہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیلؒ کے برادر خورد ہیں۔ ان کے گھر کا علمی ماحول تھا اس میں ان کی تربیت و تعلیم ہوئی اپنے بھائی اور والدہ ماجدہ کی نگرانی میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر سنبھل کی ایک قدیم درس گاہ سراج العلوم ہلالی سرائے میں داخل ہوئے، بعدہ مدرسہ شاہی مراد آباد چلے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۴ سال تھی۔ ۱۹۲۰ء میں مراد آباد ہندو کالج میں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر نے خطاب کیا تو وہ بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے جلسہ میں شریک ہوئے یہیں سے ان کے دل میں تحریک آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ ملک کی آزادی کے لئے میدان عمل میں آگئے اور مراد آباد، کاشی پور اور قرب وجوار کے علاقوں میں جوشیلی تقریر کے ذریعہ عوام میں جذبہ حریت بیدار کرنے لگے۔

جب تحریک آزادی زور پر آئی تو ۱۹۲۲ء میں مولانا عبدالقیوم کو دیگر تین اشخاص کے ساتھ مراد آباد جیل میں قید کر دیا گیا دو سال کی قید کاٹی۔ پھر اس کے بعد مولانا نے درس نظامی کی تکمیل کے لئے قدم بڑھایا ۱۹۲۴ء میں فتح پوری مدرسہ دہلی میں داخل ہوئے چار سال حصول علم میں منہمک رہے، فراغت کے بعد وطن سنبھل آگئے۔ ۱۹۲۹ء میں پھر عملی جہاد میں شریک ہو گئے اور نیشنل کانگریس کی تنظیمی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

۱۹۵۵ء تک مختلف طریقوں و حیثیتوں سے کام کرتے رہے، بھودان تحریک کے رکن بھی ہوئے، پارٹی کے مختلف عہدوں پر فائز ہوئے اور عام کارکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا بہت سی بار ناخوش گوار حالات

اور نامساعد ماحول کا بھی مقابلہ کیا لیکن قدم پیچھے نہیں ہٹا۔ ملکی وقومی کاموں اور تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے گھر کے مسائل کی طرف توجہ کم رہی ۱۹۷۲ء میں فریضہ حج بھی ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ریاستی حکومت نے ۲۵۰ روپیہ ماہوار سیاسی پنشن منظور کی ۱۹۷۴ء سے مرکزی حکومت کی جانب سے بھی وظیفہ جاری ہوا اور ۱۹۷۴ء میں ریاستی حکومت کی جانب سے مجاہد آزادی کا ''نام پتر'' بھی دیا گیا۔ کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا۔

سنبھل کے حاذق ونامور اطباء وحکماء

ہندوستان ایک قدیم اور بڑا ملک ہے، ہر دور میں اس کے دامن میں جہاں ہر فن کے ماہرین کا وجود رہا ہے وہاں ہزاروں اطباء نے علمی وعملی دنیا میں فنی قابلیت کے لحاظ سے بڑی شہرت وعزت حاصل کی جو الجھے ہوئے امراض کی تشخیص اوران کے علاج میں خاص دسترس کے مالک تھے اور ایسے مایوس کن امراض کا علاج کیا جن کے سمجھنے اور دفع کرنے سے بڑے بڑے ڈاکٹر اور سرجن عاجز تھے۔ ایسے حکماء واطباء کا ہندوستان کے شہر شہر وقریہ قریہ میں وجود پایا گیا۔ آج ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ کے ماہر ڈاکٹروں اور مشینوں کے ذریعہ مرض کی تشخیص اور ایکسرے سے اندورنی حال کی خبر دینے کے باوجود یونانی علاج ومعالجہ کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ بلکہ اصل علاج ہی یونانی علاج ہے جس سے مرض کی جڑ ختم ہوتی ہے جس کا ثبوت قرآن کریم وحدیث نبویؐ سے ملتا ہے نیز ادویہ کے اجزاء پاک وصاف ہوتے ہیں، اور علاج سے مریض کے جسم میں قوت حاصل ہوتی ہے۔

الحمدللہ ہمارے شہر سنبھل میں ہر دور میں شہرہ آفاق حاذق اطباء رہے ہیں اور شہر میں بھی یونانی علاج ومعالجہ کا مزاج رہا ہے، آج بھی انگریزی علاج کے مقابلے میں یونانی علاج وادویہ کو ترجیح دیتے ہیں حال کے چند حکماء واطباء کا تذکرہ بھی ضروری ہے تاکہ تاریخ سنبھل نامور حاذق، وشہرآفاق حکماء سے خالی نہ رہے۔ ایسے اطباء جن کی حذاقت اور فنی صلاحیت کی داستان آج تک اس خاک کو خطہ یونانی کی ہمسری کا فخر عطا کررہی ہے ان اطباء میں سے قابل ذکر جناب حکیم رئیس احمد صاحب وغیرہ ہیں۔

جناب حکیم رئیس احمد صاحب

آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ تک پہونچتا ہے۔ آپ سنبھل کے

انصار خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور ملک کے ان چند اشخاص میں سے ہیں. جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی فنی صلاحیت وحذاقت کے باوجود ملک میں اپنی اعلیٰ صلاحیت کا سکہ بٹھایا ہے۔ حکیم صاحب کے جد اعلیٰ میاں عزیز اللہ تلبنی ہیں جو قریب محلہ میاں سرائے کٹرہ میں آپ کا دولت کدہ اور مطب ہے نیز آپ شان وشوکت کے مالک ہیں حکیم صاحب کی نبض شناسی کے عجیب وغریب واقعات سنتے آئے ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تجویز دونوں میں مہارت ہے ہندوستان بھر میں ان کی تشخیص وتجویز کا علاج ومعالجہ ومطب کی شہرت ہے دور دراز سے لوگ سفر کر کے ان کے مطب میں آتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔ مئی وجون میں دو ماہ خاص کر نینی تال گذارتے ہیں۔ دونوں جگہ مریضوں کا ہجوم رہتا ہے آپ کی تشخیص میں گویا غلطی نہیں ایکسرے میں غلطی ممکن ہے حکیم صاحب کی تشخیص عموماً بالکل صحیح ودرست ثابت ہوتی ہے اسی وجہ سے ہندوستان کے بڑے بڑے ہسپتالوں کے لاعلاج مریض آپ کے یہاں مایوسی کی حالت میں آتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں کیوں کہ ہسپتالوں میں مریض کی تشخیص نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے تجویز نہیں ہوتی اور علاج سے محروم رہتے ہیں الحمدللہ جناب حکیم صاحب کے یہاں دونوں چیزیں تشخیص وتجویز بالکل صحیح ہوتی ہیں بایں وجہ بیرونِ ملک اور ملک کے ہر چہار سمت کے مریض آتے ہیں مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

آپ اپنی فنی صلاحیت وحذاقت سے مایہ ناز خدمت خلق انجام دے کر شہر سنبھل کا نام روشن کر رہے ہیں آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں بلکہ آپ کی وجہ سے سنبھل متعارف ہو رہا ہے۔

شروع ہی سے ان کی ذہانت وفطانت نمایاں ہے موصوف اپنی خداداد فراست اور دور اندیشی کے سبب ہر طبقہ فکر کے لوگوں میں مقبول ہیں۔ آپ بزم اطباء گویا شمع انجمن ہیں۔ حق تعالیٰ نے دولت علم وفنی صلاحیت سے نوازا ہے۔ ان کی تواضع بلندی ہے

اور خاموشی گویائی ہے۔ موصوف نہایت باوضع آدمی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے فیض کوتادیر قائم رکھے۔

مولانا حکیم نصیر احمدؒ

آپ اپنے وقت کے ایک جید عالم ہی نہیں بلکہ حاذق حکیم بھی تھے آپ کا مکان سنبھل تھا۔ مولانا حبیب احمدؒ شاہ جہاں پوری کے دور اہتمام میں مدرسہ شمس العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی ہے بعد میں مطب کے ذریعہ خدمت خلق میں مشغول ہوئے، سرائے ترین کے بازار میں ان کا مطب تھا۔ فجر بعد سے آپ مطب میں تشریف فرما ہوتے پورے علاقہ کے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا، اپنے وقت کے نباض وحاذق حکیم تھے، مریض شفایاب ہوتے تھے، دربار کے محمد عمر صاحب جو بعد میں حکیم محمد عمر اللہ والے کے نام سے متعارف ومشہور ہوئے، حکیم نصیر احمدؒ کے یہاں عطار تھے دوا دیا کرتے تھے، حکیم نصیر احمدؒ سے یہ فن ان کی صحبت اور تجربہ کی بنیاد پر حاصل ہوا تھا۔ حکیم نصیر احمدؒ ایک متقی، اسلاف کا نمونہ تھے اس فن کے ذریعہ مخلوق خدا کو نفع پہنچاتے ہوئے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔

حضرت مولانا حکیم محمد احسن صاحبؒ

آپ ایک ایسے علمی گھرانہ کے چشم وچراغ ہیں، جو علم کا گہوارہ ہے، اور اس وقت سب سے زیادہ علماء اس خاندان میں ہیں۔ کیوں کہ آپ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے برادر خورد اور حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی مقیم لندن کے حقیقی چچا نیز خسر ہونے کا رشتہ بھی قائم ہے ڈاکٹر مولانا خالد صاحب قاسمی اور مولانا عبدالمؤمن صاحب ندوی کے والد محترم ہیں۔ آپ بچپن ہی سے ذہین وذکی تھے قدرت نے

انہیں غیر معمولی فطانت وصلاحیت عطا کی تھی۔

قاسمی منزل

قاسمی منزل کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو آپ کا تعارف ناقص رہے گا۔ کیوں کہ یہ قاسمی منزل جو آپ کا گھر ہے، بہت بڑی حویلی ہے، جس کا ایک صدر دروازہ ہے۔ ایک حصہ میں آپ مریضوں کو دیکھتے تھے اور ایک حصہ میں دواخانہ ہے۔ یہ منزل مہمانوں کے آمد کی جگہ ہی نہیں بلکہ آپ کے خاندانی حضرات کی نشست گاہ وآماجگاہ ہے۔ جو علمی سرگرمیوں کا بڑا مرکز اور علماء دیوبند کے مسلک کی ایک ڈھارس ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جائے کہ یہ صدر مقام ہے، کیوں کہ یہاں علمی شگوفے کھلتے ہیں۔ مسائل پر تبصرہ وتحقیق کے ساتھ تنقید وتردید بھی ہوتی رہتی ہے۔

تعلیم

آپ کی تعلیم کا آغاز سنبھل سے ہی ہوا۔ متوسط کتب تک پڑھ کر دارالعلوم دیوبند چلے گئے وہاں اس وقت کے جید علماء واساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف پڑھ کر دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ کالج (فن طب) میں داخل ہوکر اس فن سے پورا فائدہ اٹھایا۔

مطب

لکھنؤ سے فن طب سے فراغت کے بعد آپ اپنے وطن سنبھل تشریف لے آئے اور قاسمی منزل میں جو آپ کا دولت خانہ تھا مطب کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے ذریعہ خدمت خلق میں مشغول رہے۔ دور دراز سے مریض آتے اور شفا ہوتی۔ آپ مریضوں سے اخلاق سے پیش آتے۔ اگر کسی مریض کے پاس دوا کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو بغیر قیمت کے دوا دیتے۔ بعض مریضوں کا اپنی جیب خاص سے انتظام فرماتے۔

مریض کیلئے ہر طرح کی سہولت مہیا فرماتے۔ نیز آپ حاذق حکیم تھے آپ کی حذاقت پر بہت سے واقعات دلالت کرتے ہیں۔

عبادت

چونکہ آپ کا دینی و علمی مزاج تھا۔ فرائض کے کیا معنی، نوافل میں بھی محو رہتے تھے۔ مسجد بایزید (پچھایوں) والی جو آپ کے محلّہ کی مسجد ہے، اس میں قریب آپ نے ۴۰ رسال تک للٰہ فرائض امامت کے ساتھ قرآن کریم کی تفسیر اور حدیث شریف کا درس دیا ہے۔ راقم الحروف کو ۳ سال ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۱ء تک مذکورہ مسجد میں فرائض امامت کے ساتھ قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ حضرت حکیم صاحب اس مسجد میں نماز ادا فرماتے تھے۔

مجھے اس وقت سے حضرت حکیم صاحب سے واقفیت ہی نہیں بلکہ قرب حاصل رہا۔ آپ کی متانت، کردار، وگفتار، شرافت، حسن اخلاق، عبادات کا بخوبی علم ہے۔ حق تعالیٰ نے علمی وجاہت کے ساتھ دنیاوی وجاہت سے نوازا تھا۔ آپ بارعب شخص ہی نہیں تھے بلکہ آپ کے چہرے سے نورانیت مترشح ہوتی تھی۔ گویا کہ آپ باجمال وکمال تھے مہمان نواز، دلچسپ بہادر، بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔

زندگی میں محبوب عمل

زمانہ قدیم سے سنبھل کے علاقہ میں شکار دستیاب ہوتا رہا ہے۔ آپ کی زندگی کا شکار ایک محبوب عمل تھا۔ آپ شکار کے دلدادہ تھے۔ شکار پکڑنے میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔ آپ کے ہمراہ شکار کرنے میں خاندان کے افراد شریک ہوتے۔ شکار سے دعوت، مہمانوں کی ضیافت کا اہتمام ہوتا تھا۔ آج بھی آپ کی اولاد اور خاندان کے افراد شکار کے دلدادہ ہیں اور ان کا یہ محبوب ترین شغل ہے۔

یادگار

مدرسہ انجمن معاون الاسلام جس کی تاریخ آپ پڑھ چکے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں تعمیر کا آغاز ہوا جس کے بانی حضرت مولانا مبارک حسین صاحب ہیں۔ البتہ حکیم صاحب نے اس کی آبیاری کر کے جڑوں کو مضبوط کیا ہزاروں دشواریوں اور نامساعد حالات ومشکلات کا مقابلہ کیا۔ اوران حالات میں جمے رہے۔ حکیم صاحب نے مدرسہ کو اپنی خداداد ذہانت وقابلیت وصلاحیت سے اغیار سے بچا کر محفوظ کیا۔ اور دوراندیشی سے بتدریج ترقی کی راہ پرلائے ،اور پروان چڑھایا۔ اور آپ تاحیات اس ادارہ کے ناظم اعلیٰ ومتولی رہے۔ یہ مدرسہ انجمن معاون الاسلام علاقہ کا بڑا مدرسہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اہم شاخ ہے۔

مدینہ مسجد

حکیم صاحب کی یادگار میں انجمن کی مدینہ مسجد ہے۔ جو شہر کی جامع مسجد کے بعد دوسری بڑی مسجد ہے۔ اوراپنی نوعیت وطرز کی نئی مسجد ہے۔ یہ مسجد انجمن معاون الاسلام کی آراضی میں واقع ہے۔

وفات

مولانا وحکیم محمد احسن صاحب نے قریب ۸۲ رسال کی عمر میں تھوڑی سے علالت کے بعد ۵ رمئی ۱۹۹۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مولائے حقیقی سے جاملے۔ حق تعالیٰ اعلیٰ درجات سے نوازے۔

حضرت مولانا حکیم ومفتی محمد آفتاب علی خاں صاحب

آپ کے والد محترم کا نام محمد علی خاں ہے۔ پیدائش ۱۹۱۹ء کی ہے۔ آپ کا تعلق سرائے ترین کے ترین خاندان سے ہے۔ اس خاندان کے جدامجد شاہ فتح اللہ ترین ہیں، جو شیخ سلیم چشتیؒ کے بڑے خلیفہ ہیں۔ اپنے شیخ کے ایماء پر سنبھل سرائے ترین محلّہ

دربار میں قیام پذیر ہوئے اور وفات کے بعد دربار میں مدفون ہوئے۔ شاہ صاحب کی شخصیت کے پیشِ نظر کئی بیگھہ آراضی پر چہار دیواری کے اندر قبر ہے۔ قبر پر ایک بڑا مضبوط خوب صورت گنبد بنا ہوا ہے۔ اس خاندان کے بعض حضرات اپنے نام کے ساتھ لفظ ترین لکھتے ہیں، حضرت مولانا آفتاب علی خاں بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے۔

آغاز تعلیم

حضرت مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں رہ کر اپنے ماموں حضرت مولانا الطاف حسین خاں صاحب سے حاصل کی۔ پھر حضرت مولانا عبدالرشید سنبھلیؒ سے مدرسہ شمس العلوم میں اکتساب علم کیا۔ یہاں کی تعلیم پوری ہو جانے پر دارالعلوم دیوبند چلے گئے، دارالعلوم میں متوسط کتب میں داخلہ ہوا۔ سات سال مسلسل دارالعلوم دیوبند میں حصولِ علم میں سرگرم رہے۔ علوم متداولہ منطق، فقہ، معانی، بیان، ادب، فلسفہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر و اصول تفسیر کی تکمیل کی۔

بخاری شریف حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی۔ آپ کو اپنے اساتذہ خاص کر حضرت شیخ الاسلام سے والہانہ محبت و عقیدت تھی۔ آپ کے ساتھیوں میں قابلِ ذکر حضرت مولانا قاری فضل الرحمٰن امروہویؒ اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ العالی ہیں۔ ۱۳۶۸ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل ہوئی۔ فراغت کے بعد فن طب میں داخلہ لے کر ایک سال میں بقیہ کتبِ طب کی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد وطن آئے اور مدرسہ سراج العلوم سنبھل میں تدریسی خدمات پر تقرر ہوا۔ یہاں مشکوٰۃ شریف وہدایہ وغیرہ کا درس دیا۔ مدرسہ وحید المدارس کے ذمہ داروں نے اپنے یہاں بلا لیا۔ تقرر کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ پھر مدرسہ ضیاءُ العلوم

سرائے ترین چلے گئے۔ وہاں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔

مدرسہ شمس العلوم میں تقرر

حضرت مولانا عبدالرشید صاحب سنبھلی صدرالمدرسین شمس العلوم اور دوسرے ذمہ دار حضرات نے حضرت مفتی آفتاب علی خاں صاحب کو علمی صلاحیت، قوت حافظہ وتدریسی صلاحیت کے پیش نظر مدرسہ شمس العلوم بلالیا۔

حضرت مولانا عبدالرشید صاحب کے انتقال کے بعد صدرالمدرسین کے عہدے پر فائز کیا گیا، نیز حضرت مولانا غلام مرتضیٰ صاحب مہتمم مدرسہ شمس العلوم کے انتقال کے بعد آپ مہتمم قرار دیئے گئے۔ آپ نے حسنِ نظم وحُسنِ تدبیر سے صدرالمدرسین واہتمام کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

تدریسی خدمات

پچاس سال سے عربی کے ساتھ اُردو، دینیات کا بھی درس دیتے رہے۔ اس مدت میں آپ کے بہت سے شاگرد اور فیض یافتہ ہوئے۔ راقم الحروف عبدالمعید سنبھلی کو بھی حضرت سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ جہاں فیض حاصل کرنے والوں کی بڑی تعداد ہے وہاں قابلِ ذکر حضرت مولانا محمد نور صاحب مدظلہ، مولانا قاری ظریف احمد قاسمی، مولانا اطہر شاہ صاحب قاسمی ہیں۔ خاص کر جن کی تعلیم کا آغاز حضرت مفتی صاحب سے ہی ہوا اور دارالعلوم جانے سے قبل تمام تر کتب حضرت سے پڑھیں وہ جناب حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی استاذ دارالعلوم دیوبند ہیں جن کے بارے میں حضرت مولانا محمد نور صاحب سنبھلی نے حضرت مفتی صاحب کے تعزیتی جلسے میں مفتی صاحب کا مقولہ نقل فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے معلوم کرے گا کہ آفتاب علی تم کیا لائے ہو" تو میں عبدالخالق کو پیش کردوں گا۔" مولانا عبدالخالق صاحب کی ابتدائی وبنیادی تعلیم کا آغاز

آپ ہی سے ہوا۔ آپ ہی کے زیرِ تعلیم وتربیت وشفقت میں رہ کر ٹھوس بنیاد قائم ہوئی۔ شرح جامی وغیرہ کتب حضرت سے پڑھ کر دارالعلوم دیوبند گئے۔ عبدالخالق صاحب بڑے مطیع وفرماں بردار، ہر وقت تعمیلِ حکم کیلئے مستعد رہتے تھے۔ شروع ہی سے اپنے اساتذہ کا ادب واحترام کیا جو آپ کی سعادت مندی کا بیّن ثبوت ہے۔

خدمتِ خلق

حضرت مفتی صاحب کارِ تعلیم کے ساتھ طب یعنی علاج معالجے کے ذریعہ خدمتِ خلق میں مصروف تھے۔ محلّہ دربار بنگلہ کے ایک ہال میں صبح ۹ ربجے تک اور خارجی اوقات میں علاج ومعالجہ ودرس میں مشغول رہتے۔ حضرت اقدس قاری عبدالحق مرحوم سابق صدر المدرسین مدرسہ شمس العلوم اور دوسرے ذمہ دار حضرات ارکانِ شوریٰ کی جانب سے مدرسہ کے اوقات میں سے ۹ ربجے تک کا وقت خدمت خلق کے لئے دیا گیا تھا۔ گویا کہ یہ مدرسہ کا ایک شعبہ تھا۔ سنبھل جہاں ہر دور میں ماہرین وحذاق اطباء وحکماء کا مرکز رہا ہے وہاں حضرت مفتی صاحب کا بھی حاذق طبیبوں میں شمار تھا۔

افتاء

سنبھل کے باون سرائے چھتیس پورے کے طول وعرض میں افتاء کے فرائض کی خدمت بے لوث انجام دیتے تھے۔ پیچیدہ مسائل میں علماء اپنی تشنگی کو دور کرتے، نیز عوام وخواص مسائل میں حضرت مفتی صاحب کی طرف رجوع کرتے اور جواب صواب سے مستفید ہوتے۔ آپ کی مسائل فقہیہ پر گہری نظر تھی۔ علمی فضائل وکمال کے ساتھ متصف تھے۔ آپ کے تمام فتاویٰ کا اندراج ہے۔ نظر ثانی وترتیب کے بعد منظر عام پر آسکتے ہیں۔

خطابت

سکندر لودھی کے عہد کی محلّہ دربار میں ایک بڑی مضبوط مسجد ہے جو اسی بستی کی

جامع مسجد ہے، حضرت مولانا مفتی آفتاب علی خاں مرحوم اس مسجد میں دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد سے خطیب تھے۔ نماز جمعہ سے قبل ہمیشہ قرآن کریم کی تفسیر یا مناسب حال کوئی مضمون اختیار فرماتے۔ نیز عیدین کے موقع پر بھی خطاب وتقریر فرماتے۔ ہمیشہ منبر کو اپنے ناصحانہ وعظ سے زینت بخشی۔

آخری تقریر

وفات سے چار دن قبل جمعۃ الوداع ۲۶ رویں رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۹ء کو آخری تقریر وخطاب فرمایا۔

جامع مسجد دربار کا برآمدہ

جامع مسجد جو سکندر لودھی کی تعمیر کردہ ہے وہ بڑی خوبصورت، مستحکم، عالی شان، مضبوط ستون پر بلند عمارت ہے۔ ہر موسم میں نمازیوں کے لئے آرام دہ ہے لیکن نمازیوں کی کثرت وزیادتی کے سبب ناکافی تھی۔ حضرت مفتی صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ برآمدہ تعمیر ہوتا کہ نمازیوں کی تکلیف خاص کر جمعہ کے دن دھوپ کی تپش سے بچاؤ ہو۔ **لھذا** حضرت کی آرزو، دعا اور انتھک کوشش کے نتیجے میں ۱۹۸۴ء میں اسی جامع مسجد دربار میں ۱۲ رصف پر مشتمل ایک برآمدہ تعمیر ہوا۔ ۱۹۸۴ء سے ابھی تک کچھ نہ کچھ تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔

دنیا بہر حال دنیا ہے

یہاں ہر ایک کو خوشی وسرور، رنج وتلخیاں پیش آتی ہیں۔ حضرت مولانا کے تین بھائی اور تھے۔ اور تینوں عمر میں حضرت مولانا سے چھوٹے تھے۔ تینوں شادی شدہ تھے۔ ایک بھائی کا قیام بمبئی تھا۔ اللہ کی مرضی کہ تینوں بھائی یکے بعد دیگرے دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور تینوں بھائیوں میں صرف بمبئی والے بھائی کے اولاد ہے۔

حضرت مفتی صاحب بھی لاولد تھے کسی بھائی کے اولا دنہیں۔ چاروں بھائیوں کی اہلیہ محترمہ (بیوائیں) حیات ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اپنی جسمانی معذوری اور نحیف الجثہ مع اہلیہ محترمہ کے ایک بڑی حویلی میں تنہا رہتے تھے۔

وفات کا عجیب سانحہ

حضرت مفتی صاحب ہمیشہ سے رمضان المبارک کے آخر عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے۔ یہ اعتکاف جامع مسجد میں فرماتے۔ نیز آپ کے ساتھ بستی کے معزز حضرات بھی معتکف ہوتے۔ آپ کے علمی فیض وصحبت سے مستفید ہوتے۔ پورے عشرے ذکر وتلاوت قرآن سے مسجد گونجتی۔ امسال بھی حضرت معتکف تھے۔ نیز قریب ۳۰ رسال سے ہر سال رمضان المبارک کی ۲۷ ویں شب میں جناب حضرت استاذ محترم حافظ فریدالدین خاں صاحب مدظلہ العالی کی جانب سے تمام معتکفین حضرات کے افطار ودعوت کا معمول ہے۔ یہ دعوت پُر کیف وپُر لطف ہوتی ہے۔ نیز ساتھ ہی محلہ پینٹھ التوار کی مسجد کے معتکفین بھی اس دعوت میں مدعو ہوتے ہیں۔ ان کو کھانا وہیں پہنچایا جاتا ہے۔ حضرت استاد محترم اس دعوت میں بندے کو بھی برابر یاد فرماتے رہے ہیں۔

الحمدللہ حسب معمول امسال بھی ۲۷ رشب جمعۃ الوداع کے روزہ کے افطار کی دعوت تھی۔ معمول کے مطابق سب ہی اس دعوت میں شریک ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کی طبیعت اجتماعی موقع پر خوب کھلتی اور سب کی دلجوئی فرماتے اور سب کا خیال فرماتے۔ آپ نے اپنی عادت کے مطابق اس دن بھی فرحت ومسرت کے ساتھ کھانا تناول کیا اور دوسروں کو کھلوایا۔ حق تعالیٰ کی مرضی اس مجلس کے بعد اسی شب میں حضرت کو تکلیف ہوگئی۔ تکلیف اتنی بڑھی کہ اعتکاف ترک کرنے پر مجبور ہوگئے۔ شب کے ایک بجے اعتکاف ترک کر کے مکان تشریف لے گئے۔ ضعف کے ساتھ طبیعت زیادہ نازک ہوگئی، علاج

معالجہ جاری تھا کہ ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ پیر کی شام کو افطار کے بعد ۷ بجے جب لکھنؤ سے رویت ہلال اور منگل کی صبح کو عید منانے کا اعلان کیا گیا، نیز دہلی سے بھی ۸ بجے عبداللہ صاحب بخاری کی جانب سے منگل کی صبح کو عید منانے کا اعلان ہوا تو مولانا ظریف احمد صاحب قاسمی سنبھلی اور راقم الحروف نے حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بتائی (چونکہ ۷ بجے سے بستی کے علماء جامع مسجد میں جمع ہو چکے تھے) مشورہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ مدرسہ شاہی مراد آباد اور دار العلوم دیوبند کے اعلان پر تم اعلان کرا دینا۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا چونکہ حضرت مفتی صاحب ۲۹ رمضان المبارک کی شام کو بہت اہتمام فرماتے۔ بستی کے علماء کو یاد فرماتے۔ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوتے رویت و خبروں سے متعلق بحث چھڑ جاتی۔ بہرحال امسال ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ کی شام کو بستی کے علماء جمع ہیں۔ لوگ جوق در جوق آ رہے ہیں۔ رویت و خبروں سے متعلق بحث جاری ہے لیکن حضرت مفتی صاحب کی کمی کے سبب امسال مجلس سونی تھی چوں کہ آپ سب کے بڑے صاحب رائے اور مفتی و امیر تھے۔ ہر مجلس کی زینت آپ تھے۔ حضرت مفتی صاحب کے حکم کے مطابق سوا گیارہ بجے عید الفطر منانے کا اعلان کیا گیا۔ بعض محلوں کے لوگوں نے اعلان کو غیر معتبر سمجھا۔ صبح تک آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ صبح ملاقات پر حضرت نے فرمایا کہ جو اعلان ہو چکا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ نظر ثانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ نیز جناب مولانا اطہر شاہ صاحب قاسمی سے فرمایا کہ جو اعلان کیا گیا ہے اب کسی سے متاثر و مرعوب نہ ہونا۔

حضرت مفتی صاحب کی عالی ہمتی

حضرت مفتی صاحب اپنی جسمانی کمزوری و معذوری اور نحیف الجثہ وضعف اور مرض کے باوجود بلند ہمت و حوصلہ تھے۔ جب کہ حضرت سے شدت مرض و تکلیف کے باعث بات تک نہیں ہو رہی تھی لیکن شوق اور دینی ضرورت واہمیت کے پیش نظر

کہنا چاہتے تھے۔ زبان سے صاف بات ادا نہیں ہو رہی تھی۔ اسی حال میں عید الفطر کی صبح نمودار ہوئی۔ عید الفطر کی (دوگانہ) نماز کا اعلان دس بجے کا تھا۔ آٹھ بجے صبح ملاقات پر مجھ سے فرما رہے تھے کہ ابھی کپڑے بدل کر ۹ بجے تک مسجد پہنچ رہا ہوں۔ حال یہ تھا کہ بستر پر آرام فرماتے، سخت تکلیف تھی، نزدیک ہو کر آواز سنی جا رہی تھی۔ آپ کی عالی ہمتی پر قربان جائیے کہ آپ نے عید الفطر کی نماز کے لئے تیاری فرمائی اور اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ آج تم مجھے اپنے ہاتھ سے دولہا بناؤ اور مولوی عبد الخالق (استاذ دار العلوم دیوبند) نے رمضان سے قبل ملاقات پر جو عطر دیا ہے وہ لگاؤ۔

آپ دولہا کی طرح نئے کپڑے زیب تن فرما کر ایک طالب علم (حافظ مستقیم) کے ساتھ چھڑی کے سہارے ۹ بجے جامع مسجد تشریف لے آئے، چوں کہ جب سے آپ نے جمعہ اور عیدین کی نماز سے قبل خطابت (تقریر و وعظ) کا آغاز کیا تھا کبھی معمول میں فرق آ کر ترک کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ کبھی کبھار مہمان کے اعزاز میں مہمان کو تقریر وخطبہ کا موقعہ دیا گیا۔

حضرت مولانا منبر کے نزدیک تشریف فرما ہیں ادھر مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی ہے لوگوں کا ایک سمندر مسجد کے اندر موجزن ہے۔

جیسے ہی بندہ مسجد میں داخل ہوا، مائک میں میرا نام پکارا جا رہا ہے کہ عبد المعید منبر کے قریب آ جائیں، فوراً لبیک کہتا ہوا اندر داخل ہو کر حضرت مفتی صاحب کے پاس جا بیٹھا۔ معلوم کیا "حضرت کیا حکم ہے؟"...... فرمایا...... "کچھ سمجھا دو (بیان کر دو)" میں نے درخواست کی کہ حضرت ہی بیان فرمائیں، فرمایا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

الامر فوق الادب تعمیل حکم کرتے ہوئے منبر پر قدم رکھا تو حضرت نے لفظ "اللہ" کہا حضرت کی عادت تھی کہ جب کسی کام یا گفتگو سے فارغ ہو کر دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے اللہ کہہ کر دوسرے کام میں مشغول ہوتے۔ اس وقت زبان

مبارک سے کچھ اور پڑھنے کی آواز آئی۔ ادھر بندے نے تقریری خطبہ پڑھ کر بات شروع کی تو حضرت کو اونگھ سی آئی۔ گردن جھکی، قریب میں حکیم نورالدین صاحب تھے، انھوں نے حضرت کو سنبھالا، میں بھی منبر سے اترا، حضرت کو فوراً لٹایا گیا اور ہاتھ پاؤں سیدھے کیے گئے۔ اور حافظ اشرف علی صاحب فوراً آ پہنچے۔ سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ بندہ نے شہادتین کی تلقین کی۔ ڈاکٹر اکرام علی خاں صاحب کو مائک سے پکارا گیا۔ چوں کہ بہت دور تھے نہیں پہنچ سکے۔ البتہ ڈاکٹر محمود حسن صاحب موقع پر آ پہنچے۔ منبر پر چڑھ کر حضرت کے لئے دعا کرائی۔ صورت حال کے پیش نظر حضرت کو چارپائی کے ذریعہ مکان منتقل کیا گیا۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ حضرت کو مرض اور ضعف کے سبب دورہ سا ہو گیا ہے۔ تمام حاضرین سب باتیں سن رہے ہیں اور سر کی آنکھوں سے منظر دیکھ رہے ہیں۔ حضرت کو مجمع کے درمیان سے منتقل کئے جانے کے بعد پھر دوبارہ حضرت کیلئے دعاء کرائی۔ دعائیہ کلمات سے بعض لوگ سمجھ گئے تھے کہ حضرت کا وصال ہو گیا ہے۔ جیسا کہ بعض احباب نے نماز کے بعد اظہار کیا۔

بہرحال تقریر جاری رہی۔ آخر میں نماز کی نیت وترکیب بتائی۔ دوگانہ نماز عید ادا کی گئی۔ حضرت کا مکان مسجد کے نزدیک ہے نماز کے فوراً بعد یہ آواز گونج گئی کہ حضرت کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجِعُوْنَ۔

حقیقتاً وصال تو اسی وقت ہوا جب تقریر کیلئے فرما کر آپ کی زبانِ مبارک سے ''اللہ'' ادا ہوا اور بھی کلمات زبان سے پڑھنے کی آواز آئی۔

مسجد سے منتقل ہونے سے قبل ہی روح پرواز ہو چکی تھی۔ بڑا مجمع تھا۔ حضرت کو دیکھنے کی ہر ایک کی خواہش تھی۔ اپنی جگہوں سے اٹھ اٹھ کر دیدار کے لئے آ رہے تھے۔ ان کو روکا جا رہا تھا۔ ادھر تقریر بھی جاری تھی۔ مجمع کے منتشر ہونے کا خطرہ تھا۔ حق تعالیٰ

کا بڑا فضل ہوا کہ نظم باقی رہا۔ حضرت کو مکان منتقل کر دیا گیا اور زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہیں ادا ہوا جو انتقال پر صراحتاً دلالت کرتا، حق تعالیٰ کا بڑا انعام یہ بھی ہوا کہ سامنے حضرت کی روح پرواز ہو رہی ہے ادھر دعا کرائی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی مجمع کو روکا جا رہا ہے اور تقریر بھی جاری ہے۔

انتقال کی خبر گونج گئی

عید کے دوگانہ نماز کے فوراً بعد حضرت کے انتقال کی خبر فضا میں گونج گئی۔ نمازیوں کا رخ بجائے قبرستان اور اپنے مکان کو جانے اور عید مبارک پیش کرنے کے حضرت مفتی صاحب کے دیدار کیلئے مکان کی طرف ہو گیا۔ یہ مجمع سمندر کی طرح جوش مار رہا تھا۔ عید کی خوشی رنج و غم سے بدل گئی اور کہرام سا برپا ہو گیا۔ ازدحام قابو سے باہر تھا۔ جذبات جوش میں تھے۔ لوگوں کے جذبات کی قدر بھی ضروری تھی۔

حضرت مفتی صاحب سے جس کو جس قدر تعلق و محبت تھی، اسی قدر اس کے چہرے سے رنج و غم کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور اشک بار تھا۔ یہ لوگوں کا سمندر رفتہ رفتہ دیدار کر کے کم ہوا تو پھر مستورات کا سلسلہ شروع ہوا۔ چوں کہ حضرت مفتی صاحب سے بستی کے بچے، بوڑھے، جواں، مرد، عورتیں، عوام و خواص واقف ہی نہیں بلکہ سب ہی کسی درجے میں فیض یافتہ، وابستہ و متعلق تھے۔ کیوں کہ پچاس سال سے تدریس، افتاء و خطابت، تقریر و وعظ، طبابت و حکمت، دعا و تعویذات، تعبیر خواب، مفید مشوروں وغیرہ سے حضرت خدمت انجام دے رہے تھے۔

نمازِ جنازہ و تدفین

ساڑھے چار بجے تک مرد و عورتوں اور ہر طبقہ کے افراد صلحاء واتقیاء، سیاسی لوگوں اور حکام کا دیکھنے کے لئے تانتا بندھا رہا۔ بعد نماز عصر نماز جنازہ ادا کی گئی۔ قریب

۲۰ رہزار لوگوں نے شرکت کی۔ شاہ فتح اللہ ترین محلہ دربار کے قبرستان میں قبر کھودی گئی۔ جامع مسجد کے بہت قریب ہونے کے سبب مسافت بہت کم تھی۔ کاندھا لگانے کی نوبت نہیں آئی، بلکہ لوگوں نے اپنے ہاتھوں پر مسہری کو اوپر اٹھالیا۔ حضرت کے جسم مبارک کو قبر میں اُتارنے کیلئے میں اندر اُترا۔ قبر گہری کھودی گئی تھی۔ ادھر قبر پر لوگ امنڈ رہے تھے۔ خوف طاری ہوا کہ میں قبر میں دب جاؤں گا، باہر آ گیا۔ ابھی جنازہ دور تھا۔ جب جنازہ قبر پر آ گیا دوبارہ ہمت ہوئی۔ قبر میں اُترا اور حضرت کے جسم مبارک کو قبر میں اتارا۔ ساتھ میں بھائی شجاعت علی خاں تھے۔ آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ ازدحام کے باعث کچھ ہی حضرات مٹی دے سکے اور اکثر محروم رہے۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی تمام تر خدمات کو قبول فرما کر اپنی شایانِ شان حضرت مفتی صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجہ مرحمت فرمائے۔

طالبِ دُعا

حضرت مفتی صاحب کی چند سال سے یہ عادت تھی کہ ہر شخص سے ملاقات پر آپ یہ فرماتے کہ آپ سے صرف ایک درخواست ہے کہ خاتمہ ایمان کی دعا فرما دیں اور کچھ نہیں۔ مخاطب سے وعدہ کراتے۔ لہٰذا حضرت کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔ (الحمدللہ)

زندگی میں محبوب جگہ مسجد تھی

حضرت کا اکثر وقت مسجد میں گزرتا۔ منبر کے نزدیک آپ تشریف فرما ہوتے۔ وہی جائے نماز و جائے عبادت وذکر تھی۔ وہی جائے تدریس وافتاء، وہی جائے مشورہ، وہی جائے خطابت، تقریر وعظ، وہی جائے ملاقات، وہی جائے سوال وجواب تھی، وہیں سے روح پرواز ہوئی۔

اوصاف

آپ جید عالم وفاضل تھے۔ آپ کے اندر عالمانہ شان تھی۔ تمام علوم کے عارف، بلند کردار اخلاق سے متصف تھے۔ خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خاموشی میں محبوبیت کی شان تھی۔ شجاعت کا رنگ غالب تھا، ہمت کے پہاڑ تھے۔ دین کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے۔ فکر ونظر کی تنگی ان کے یہاں نہیں تھی۔ بے مثال تبحر علمی، بے نظیر قوت حافظہ رکھتے تھے۔ زندگی سنت کا نمونہ تھی۔ آپ سنبھل کے جید عالم ہونے کے ساتھ بڑے مفتی وخطیب وحکیم تھے۔

رنگ خوب کھلا ہوا گورا تھا۔ پستہ قد، جسمانی اعتبار سے کمزور ہی نہیں بلکہ نحیف الجثہ اور معذور بھی تھے۔ چھڑی کے ذریعے چلتے۔ آپ ہمیشہ خدمت خلق میں مشغول رہے۔ بہت سے بڑے کام انجام دیے۔

چار دن کی بیماری کے بعد ذکر کی حالت میں جامع مسجد میں عید الفطر کے دن اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۹ ½ بجے یکم شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹ جنوری ۱۹۹۹ء بروز منگل حضرت کا وقت موعود آپہنچا۔ آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

دعا

اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے بلند سے بلند تر کرے۔ اور انہی کے طفیل میں ہم ہیچ مدانوں کو بھی سمیٹ لے۔ (طالب دعا۔ عبد المعید سنبھلی)

مولانا حکیم محمد یوسف صاحب

حکیم محمد یوسف صاحب ایک علمی اور اطباء وحکماء کے خاندان کے چشم وچراغ ہیں آپ جناب محترم حکیم عنایت اللہ مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ سنبھل محلہ دیپا سرائے میں تقریباً ۱۹۱۰ء میں آپ کی پیدائش ہے۔ آپ اپنے والد محترم کے زیر سایہ تعلیم

وتربیت میں پروان چڑھے، اوراپنے والدمحترم سے علمی ذوق وفنی مہارت ورثہ میں حاصل ہوئی۔ حکیم محمد یوسف صاحب نے ابتدائی تعلیم سنبھل کے قدیم ومشہورادارہ مدرسۃ الشرع میں حاصل کی، فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں شرح جامی تک کی کتب اس وقت کے اساتذہ سے پڑھیں۔ بعدہ مظاہرعلوم سہارنپور متوسط کتب میں داخلہ لیااور وہاں کے قابل قدر اساتذہ کی سرپرستی میں علوم متداولہ حاصل کئے اوردرس نظامی کی تکمیل کی مظاہرعلوم سے صحاح ستہ بخاری شریف وغیرہ پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد تکمیل الطب کالج لکھنؤ چلے گئے وہاں فن طب میں داخل ہوکر مسلسل ۴ رسال تک بڑی محنت وکوشش ولگاؤ سے طب کی تکمیل کی اور ۱۹۴۲ء میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے فراغت حاصل کی۔

تکمیل الطب سے فراغت کے بعد طبابت کا کام شروع کیا لیکن طبیعت نے ساتھ نہیں دیا آپ سخت مریض ہوگئے یہاں تک کہ زندگی سے مایوسی ہونے لگی۔ حق تعالیٰ نے شفاوصحت کی دولت سے نوازا پھر مطب کا سلسلہ شروع کیا۔ فن طب کے ذریعہ خدمت خلق میں مشغول ہیں۔ آپ کا مطب محلہ نخاسہ سنبھل میں ہے۔ جو اپنی نمایاں خدمات کے سبب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ تشخیص مرض اور تجویز دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں آپ کے نبض شناسی کے عجیب وغریب واقعات سننے میں آتے ہیں۔ دور دراز سے مریض آتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں نیز قرب وجوار کے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ حکیم صاحب کا سنبھل کے حاذق حکیموں میں شمار ہے۔ آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بچہ بچہ آپ سے متعارف ہے۔

حکیم صاحب فنی ذوق شروع ہی سے رکھتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کو اس فن میں مہارت ودستگاہ حاصل ہے۔ حاذق طبیب ہونے کے باوجود ایک جید عالم دین

ہیں تقویٰ طہارت آپ کی زندگی کا نمایاں وصف ہے۔ صوم وصلوٰۃ کیا معنی نوافل اور بکثرت ذکر میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ آپ اسلاف اطباء وحکماء کا نمونہ ہیں۔ نازک طبیعت ومزاج ہیں تصنع سے خالی طبیعت کی پاکیزگی کے ساتھ ظاہری صفائی بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے ہاتھ میں شفاء عطا کی ہے۔

حکیم محمد ثاقب اللہ خاں

محلہ کوٹ غربی جامع مسجد کے عقب میں آپ کا دولت خانہ ہے اسی کے ایک حصہ میں مطب تھا۔ آپ کے بعد سے آپ کے صاحب زادے اسی مطب میں رونق افروز ہوکر خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ حکیم ثاقب اللہ خان سنبھل کے ایک بڑے نامور طبیب وحکیم تھے، آپ کی حذاقت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ فجر بعد سے آپ علاج ومعالجہ میں مشغول ہوتے۔ دور دراز سے مریض علاج کے لئے آتے، خاص کر موتی جھلا کے مرض کا بہت عمدہ علاج تھا اس مرض کے علاج میں آپ اپنی نظیر تھے۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آپ شان وشوکت اور دبدبہ کے حکیم تھے۔ مرض کی تشخیص وتجویز دونوں میں مہارت حاصل تھی۔ فنی کمال کے ساتھ حق تعالیٰ نے جسمانی وجاہت بھی عطا کی تھی۔

حکیم محمد ظفر ومحمد نصر صاحبان

یہ دونوں حضرات جناب حکیم رئیس احمد صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ زمانہ کا دستور ہے کہ بیٹے کا پتہ باپ کے نام سے روشن ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ بڑا مبارک باپ ہے جو خود کمال سے صاحب برکت ہو اور بیٹوں کی ناموری اس کے نام کو زیادہ روشن کرے۔ یہ دونوں بھائی اس کا مصداق ہیں۔
(الولد سرّ لابیہ) بیٹا اپنے والد کا پرتو ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بھائی اس عربی مقولہ کا

بھی مصداق ہیں ان دونوں بھائیوں کی بھی نبض شناسی کے عجیب وغریب واقعات سننے میں آتے ہیں۔ تشخیص مرض اور تجویز دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں ان کے مطب کی شہرت ہے دور دور سے لوگ ان کے مطب میں آتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔ مریضوں کا ہجوم رہتا ہے۔ آپ ان چند اشخاص میں سے ہیں جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی فنی مہارت، جامع قابلیت، اعلیٰ استعداد، اور حذاقت کا سکہ بٹھایا ہے۔ آپ دونوں ارتقاء کے دلدادہ، نہایت صابر، مستقل مزاج ہیں۔ ہر حال میں خوش رہنا ان کی زندگی کا نمایاں ترین وصف ہے۔ مہمان نواز وفیاضی میں مشہور ہیں۔ مزید یہ ہے کہ مریضوں کو آپ سے تسلی واطمینان ہی نہیں بلکہ شفا ہوتی ہے۔

ان کے خاندان میں اطباء، یونانی کا سلسلہ جاری وساری ہے جن کی حذاقت اور فنی صلاحیتوں کی داستانوں نے اس خاکِ سنبھل کو خطہ یونان کی ہمسری کا فخر عطا کیا ہے۔ ان ہی اطباء میں سے جناب حکیم رئیس احمد صاحب اور ان کے دونوں صاحب زادے ہیں جو دوستوں بلکہ دشمنوں کے کام آنے والے اور اجنبیوں اور غیروں کو نفع پہنچانے والے ہیں مطب کے ذریعہ خدمت خلق میں سرگرم ہیں۔ خدمت خلق کے لئے حق تعالیٰ ان کی زندگی میں اور زیادہ برکت عطا فرمائے۔

مولانا حکیم ظہور الدین عیش انصاری

آپ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کی علمی تابانی اور درخشانی کو سنبھل کی علمی ومذہبی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے۔ اس خاندان میں ذی علم بڑی حیثیت، علماء، اطباء، اُدبا، ڈاکٹر، وکلاء، شعراء، نقاد، فنکار پیدا ہوتے رہے ہیں اس خاندان نے علم وفن وتصنیفات کے ذریعہ ملک وقوم کی مایہ ناز خدمات انجام دے کر شہر سنبھل کا نام روشن کیا ہے۔ اور علمی وادبی محفلوں کو اپنی ذہانت وقابلیت، غیر معمولی

دماغی قوت اور پر خلوص ادبی خدمات سے تابانی بخشی ہے۔

ظہور الدین عیش انصاری متعدد زبانوں پر عبور رکھنے والے عالم، کامیاب شاعر، سخن فہم، جامع حیثیات اور باوقار انسان تھے۔

ان کی ولادت ۱۹۰۲ء میں ہے آپ کے والد حمید الدین انصاری بیخود اور دادا محترم امام الدین ہادی انصاری ہیں۔ آپ نے ایسے وقت میں آنکھ کھولی جب کہ آپ کا گھر مجاہدانہ سرگرمیوں کا آماجگاہ تھا اور دادا منشی امام الدین ہادی کی شہادت رنگ لاچکی تھی۔ ان کا خاندان قومی سیاست میں بھی پیش پیش رہا ہے کہ جہاد آزادی میں اس خاندان نے تاریخ ساز کردار ادا کیا اور عدیم المثال کارنامہ انجام دے کر قوم وملک کا نام روشن کیا۔ نیز آزادی سے قبل انصاری بلڈنگ قومی سیاست کا اہم ترین مرکز تھی۔ سنبھل میں تحریک آزادی کی شمع یہیں سے روشن ہوئی۔ حکیم ظہور الدین عیش نے تحریک حریت کے ماحول میں پرورش پائی تھی جس کے اثر سے آپ خیالات اور نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے بایں وجہ آپ قوم کے سچے سرپرست اور خیر خواہ تھے۔

مولانا ظہور الدین عیش انصاری صاحب جہاں ایک طرف علمی فضائل وکمال سے متصف تھے وہاں حکیم بھی تھے اور حکمت وطبابت کے ذریعہ خدمت خلق کا سلسلہ آپ کے خاندان میں رہا ہے۔ آپ کے حقیقی خالو جناب حکیم فرید احمد عباسی مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ عیش صاحب نے ان سے فیض اٹھایا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں مختلف مقامات جیسے مرادآباد، گڑھ مکٹیشور، حسن پور، جمشید پور، ٹاٹانگر وغیرہ کے سفر کیے اور قیام رہا لیکن اصل مذاق آپ کا ادب سے لگاؤ تھا۔ ایک کتاب بھی تصنیف کی۔

الافادات لتسهيل المقامات (الحريری)

مقامات حریری عربی ادب کی ایک اہم کتاب ہے جو درس نظامی میں داخل نصاب ہے۔ آپ نے اس کا ترجمہ اور شرح الافادات کے نام سے لکھا ہے۔ محرم ۱۳۵۱ھ مطابق جون ۱۹۳۱ء کی طباعت ہے۔ یہ شرح از حد مقبول و مفید ہے اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔ اساتذہ حضرات بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں نیز آپ نے ایک رسالہ کائنات بھی جاری کیا تھا۔ جس کے چند شمارے شائع ہوئے تھے۔

مولانا حکیم ظہور الدین عیش انصاری۔ جہاں آپ ایک جید عالم مصنف اور ساتھ ہی ایک حاذق طبیب ہیں وہاں ایک شاعر بھی ہیں اور عیش تخلص ہے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر کلام کرنے میں قدرت حاصل تھی۔

نمونۂ کلام

شراب ناب حرام ست بالیقین حرام
بہ دست دوست حرام ست گفتگو ایں جاست

کہاں کٹتے ہیں روز و شب جانتا ہوں
میں واعظ کے حالات سب جانتا ہوں

مسرت و عیش و شادمانی ہیں چند الفاظ بے معنی
تمام عالم میں خاک چھانی کہیں کسی کا پتہ نہیں ہے

نہ جانے وہ کیا کہہ رہے تھے عدو سے
میں پہنچا تو طرز خطابت بدل دی

ٹھوکریں کھاتے ہوئے جھومتے دیوانے سے
حضرت عیش چلے آئے ہیں میخانے میں

اپنے وقت کے جید عالم، و حکیم حاذق، مصنف، و شاعر نے ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور مولائے حقیقی سے جا ملے۔ حق تعالیٰ ان کے مراتب بلند سے بلند تر فرمائے۔

شبیر علی کاظمی سنبھلی

شبیر علی کاظمی صاحب کا سنبھل کے ایک علمی خاندان سے تعلق تھا، علمی ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے۔ سنبھل ہی میں تربیت و تعلیم حاصل کر کے کمال تک پہنچے۔ آپ کی علم دوست شخصیت تھی اور ادبی ذوق تھا۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد آپ لاہور چلے گئے۔ وہاں ناساعد و ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ علمی و ادبی مجلسوں سے بعد ہوا جو آپ کی طبیعت پر گراں گذرا۔ لاہور کے قیام کے بعد آپ بنگلہ دیش چلے گئے۔ وہاں چند سال قیام کیا یہاں پر بھی سکون حاصل نہیں ہوا۔ علم دوست لوگوں کی صحبت سے محرومی رہی اگرچہ آپ وہاں بھی علمی کاموں میں مصروف رہے۔ پھر آپ پاکستان کراچی منتقل ہو گئے۔ اور تا آخر دم مقیم رہے۔ یہاں اپنی علمی و ادبی خداداد صلاحیتوں سے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا اور سنبھل کا نام روشن کیا۔ حق تعالیٰ نے آپ کو زور قلم سے نوازا تھا ہر موضوع پر آپ نے مضامین لکھے جو اخبارات و رسائل میں چھپے۔

آپ نے کراچی سے ایک اخبار جاری کیا (اخبار جنگ کراچی) کے نام سے یہ اخبار مقبولیت سے نوازا گیا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس کا ایک نسخہ ۱۶ مئی ۱۹۷۸ء کا جناب اعجاز وارثیؒ نے بندہ کو دیا تھا۔ جس میں عالمی خبروں کے ساتھ شبیر علی کاظمیؒ نے سنبھل کی تاریخی حیثیت لکھی تھی۔ وہ رقم طراز ہیں کہ سنبھل ۶ چھ ہزار برس پرانا شہر ہے جو ۴ ہزار سال قبل مسیح علیہ السلام آباد ہوا۔ میرے مخلص علمی دوست جناب سعادت علی صدیقیؒ نے ایک مضمون شبیر علی کاظمی سنبھلیؒ پر لکھا تھا اور آپ کے دوسرے مضامین کی طرح یہ مضمون بھی قومی آواز میں شائع ہوا تھا۔ لیکن بہت کوشش کے بعد بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔

شبیر علی کاظمی سنبھلی علم دوست شخص تھے ان کو اپنے وطن سنبھل سے سچی محبت تھی یہاں سے منتقل ہونے کے بعد بھی فراموش نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی زبان وقلم کے ذریعہ سنبھل کا تعارف کرایا۔اور قلم وزبان سے خدمت خلق میں مشغول رہ کر کراچی میں جاں بحق ہوئے۔حق تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرما کر اپنی شایانِ شان جزاعطا فرمائے۔

اعجاز وارثی

جناب الحاج اعجاز وارثی صاحب آپ کا نام اعجاز ہے وارثی حضرت وارث علی شاہؒ کی طرف نسبت ہے والد محترم کا نام احمد حسین انصاری ہے۔ جہاں سنبھل کی زمین نے گراں قدر ہستیاں وعظیم شعراء ادباء پیدا کئے۔ان میں سے ایک جناب اعجاز وارثی صاحب ہیں جو سنبھل شہر کے شاعر گزرے ہیں۔یوں تو سنبھل میں بہت سے نامور انسان پیدا ہوئے جنھوں نے سماج،علوم وفنون اور ادبی خدمات میں اپنا نام ومقام پیدا کیا۔ایسے لوگوں میں جناب اعجاز صاحب کا نام اہمیت رکھتا ہے۔آپ سنبھل کی ادبی وتاریخی ایک بلند قامت شخصیت تھے۔آپ ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔آپ نے اپنی خدمات کے ذریعہ سنبھل کو تابانی بخشی۔شروع سے ان کی ذہانت وفطانت نمایاں رہی ہے۔آپ صرف صاحب علم اور علم دوست ہی نہیں تھے بلکہ انتظامی صلاحیت وقابلیت اور دنیوی سوجھ بوجھ بلا کی رکھتے تھے۔ یہ دو چیزیں بہت کم ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔آپ تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ پولس سے وابستہ ہو گئے اور پولس انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہو کر انتظامی امور وذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا سب ہی لوگ خوش رہے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی سرکوبی اور مجرموں کی بیخ کنی کی نذر کیا اور قاتلوں اور مجرموں کو گرفتار بھی کیا۔مظلوموں اور بے گناہوں کو آزادی بخشی ۔اہم اوصاف بیک وقت جمع تھے۔۲ رصفر ۱۳۲۹ھ بروز جمعہ

مطابق ۳ر فروری ۱۹۱۱ء کو آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کے والد جناب احمد حسین انصاری جو اسٹیشن ماسٹر تھے۔ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اولاد کی دعا کی اور عہد کیا جب حق تعالیٰ فرزند عطا کرے گا۔ تو وہ اپنی محبوب چیز اس کی خوشی میں چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ جب اعجاز وارثی صاحب کی ولادت ہوئی تو جناب احمد حسین صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور اعجاز کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اعجاز صاحب جب کہ طالب علم تھے۔ ۱۶ر ۱۷ سال کی عمر سے ہی شاعری کی ابتدا کی اور ۱۹۳۳ء میں علامہ احسن مارہروی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پولس ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن مالوف سنبھل آئے تو شاید یہاں کچھ تلخیوں سے واسطہ پڑا۔ اور انسپکٹری کے زمانہ میں بھی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا جس کے نتیجہ میں طنزیہ، مزاحیہ شاعری سے دلچسپی ہوئی بہر حال طنز و مزاح آپ کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ اس موضوع پر فی البدیہ کلام پر دسترس حاصل تھی۔ لوگوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس موضوع پر مجموعہ کلام پر انعام پایا۔ اور آپ کی شخصیت اجاگر ہوئی آپ اس موضوع میں کسی تعارف کے محتاج نہیں گویا طنز و مزاح ان کی شاعری جبلت تھی۔ اس کے ذریعہ دنیا میں ایک شہرہ آفاق ہوئے اور باعزت مقام حاصل کر لیا تھا۔ نظم، رباعی، قطعہ، وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اصناف سخن کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ آپ کامیاب و نیک نام پولس افسر رہے تھے۔ اور نہایت مہذب و سنجیدہ، معقول انسان و ممتاز و معروف شاعر تھے۔ اور اہل فن و اساتذہ میں آپ کا شمار تھا۔ آپ کا مطالعہ بہت عمیق و وسیع تھا۔ اور مردم شناس تھے۔ آپ کی ذاتی لائبریری تھی۔ اعجاز وارثیؒ کا بندہ شکر گزار ہے کہ بندہ نے جب تاریخ سنبھل پر قلم اٹھایا تو سنبھل میں پہلی ملاقات موصوف سے ہوئی میں نے اظہار خیال کیا تو میری ہمت افزائی فرمائی جب بھی سنبھل حاضری ہوتی تو خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کام کی نوعیت اور قلمبند شدہ مضامین دکھاتا تو سراہتے۔ گویا آپ

تاریخ سنبھل لکھنے میں منہمک ہیں۔ ان کتابوں کے آپ مصنف بھی ہیں۔

(۱) گل صحرا (۲) بیش دستی (۳) سخن پارے۔ آپ کو ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ (نذر اعجاز) سے کیا جاسکتا ہے۔ جو آپ کے شاگردوں نے ترتیب دی ہے آپ کے اوصاف جمیلہ بیان کیے ہیں۔ اور سینکڑوں خطوط تہنیت اور خراج تحسین پر مشتمل ہیں۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

ڈاکٹر سعادت علی صاحب ایک علم دوست انسان اور علوم عصریہ سے واقف تھے۔ ان کی شخصیت علمی حلقے میں کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ صحافیات سے کوئی بھی واقف کاران کی شخصیت سے ناآشنا نہ تھا۔ حق تعالیٰ جب کسی کو کسی خصوصیت اور وصف سے نوازتا ہے تو اس کی اصل وجہ توفیق الٰہی ہے لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ اس توفیق سے وہی شخص نوازا جاتا ہے جو اپنے اندر اس توفیق کا مرکز بننے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعادت علی صدیقی نے علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں شروع ہی سے علمی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اندر بھی علمی صلاحیت و ٹھوس استعداد پیدا کی تھی۔ جس کے سبب عصر حاضر کے قلم کاروں میں ایک تھے۔

ان کا وطن اگرچہ سنبھل نہیں تھا۔ بسلسلہ تدریس سنبھل کے قیام سے انھیں اس سے جو وابستگی و محبت ہوئی وہ وطن سے کم نہیں تھی۔ ابتدأ اخبارات ورسائل و ریڈیو کے ذریعہ آپ کے کلام کے شائع ونشر ہونے کے مواقع فراہم ہوئے اور کتابی شکل میں کلام منظر عام پر آیا جو مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مذکورہ وجوہ کے ساتھ سنبھل کی مٹی ہر ایک کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور اپنے دامن کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ باہر سے آنے والی بہت سی شخصیات نے سنبھل کو اپنا وطن قرار دیا اور صدیوں سے وہ اس کی خاک میں محو استراحت ہیں۔ اور ایسے حضرات کے ساتھ باشندگان سنبھل کا دامنِ اخوت

کشادہ تر ہو جاتا ہے اور معاملہ مثل اخوت وقرابت کے ہوتا ہے۔ جس کے سبب باہر سے آنے والا شخص خود کو سنبھل کا ہی ایک فرد خیال کرتا ہے اور اس کو وہی محبت ہو جاتی ہے جو وطن سے ہوتی ہے۔ اور اسی کو وطن قرار دیتا ہے۔

زمانہ قدیم وزمانہ قریب میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے سنبھل کو وطن قرار دیا اور اپنی یادگاریں چھوڑیں۔ اور ان کی نسل در نسل آج تک چلی آ رہی ہے۔ جیسے میاں عزیز اللہ تلبنی جو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سنبھل آئے انھی کی نسل سے نوابان سنبھل ہیں اور ان کے علمی فیض کا سلسلہ حاتم سنبھلی وغیرہ سے روشن ہوا جس کی تابانی آج تک پائی جاتی ہے۔ ایسے ہی شاہ فتح اللہ ترین اکبر اعظم کے زمانہ میں سنبھل آئے۔ سرائے ترین کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔ اور محلّہ دربار میں ترین خاندان کے افراد آج بھی موجود ہیں اور سنبھل کی اکثر سرائیں باہر سے آنے والی شخصیات کے نام پر آباد ہوئیں اور اسی نام سے موسوم ہیں۔

اس عہد کی ایک شخصیت میرے کرم فرما ومحسن جناب ڈاکٹر سعادت علی صدیقی تھے جو ۱۹۷۱ء میں سنبھل آئے اسی وقت سے سنبھل نے اپنے دامن میں سمیٹ کر ایسا جذب کیا کہ وہ یہاں کے ایک فرد ہوئے۔ اور اہل سنبھل کا معاملہ ان کے ساتھ ہم وطن وقرابت دار سے کہیں زیادہ تھا اور موصوف کو بھی سنبھل کی در ودیوار سے وہی محبت ہو گئی تھی جس کا بیّن ثبوت آپ کی گراں قدر تصنیفات ہیں جس میں سنبھل کی گمنام شخصیات کو روشناس کرایا ہے۔

آپ نے انتھک کوشش وجدوجہد سے ثابت کر دیا تھا کہ سنبھل میرا وطن ہے۔ اور باشندگان سنبھل نے اپنا ادبی رہنما وسرپرست تسلیم کر کے سنبھل کی شخصیات سے متعلق مضامین واحوال وکوائف ومواد کی فراہمی میں جو رول ادا کیا وہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا سعادت علی صدیقی متعدد زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ادبی معاصرانہ حالات

کیلئے پورے اعتقاد کے لائق، سخن فہم، باوقار انسان تھے۔ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور ان تھک کوششوں سے ادبی محفلوں وحلقوں میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اور ہر علمی وادبی محفل کی زینت تھے۔ پر خلوص ادبی خدمات وذہانت وقابلیت سے ادبی محفلوں کو روشنی وتابانی بخش رہے تھے۔ چنانچہ سنبھل زمانہ قدیم کی طرح آج بھی علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

سعادت علی صدیقی ۱۵ر مارچ ۱۹۴۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے والد کا نام شجاعت علی سندیلوی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کی سرپرستی میں حاصل کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اسپیشل، نیز لکھنؤ ہی میں پی ایچ ڈی کی۔ بسلسلہ تدریس ۱۹۷۱ء سے سنبھل قیام ہوا۔ مہاتما گاندھی کالج میں تدریسی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے۔ مختلف فنون وموضوعات پر آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اور تمام کتابیں اپنے موضوعات پر نہایت عمدہ ہیں۔ اور تصنیفات میں نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ طرز تحریر عمدہ ہے۔ ہر گل را رنگ وبوئے دیگر است۔ اور سب اہم معلومات پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی صاحب ذیل کی کتابوں کے مصنف تھے۔

(۱) حبیبہ غالب۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ (۲) ادبی جائزے (۳) ادبی آئینے (مجموعہ مضامین) (۴) حدیث محبت (۵) چند ممتاز شعراء سنبھل (۶) آئینہ نثر اردو یہ مختلف یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے (۷) شرح ادب پارے۔ برائے انٹرمیڈیٹ۔ (۸) بچوں کی لوک کہانیاں۔ (۹) وہ جب یاد آئے (۱۰) سنبھل کے چند اکابر علماء ومجاہدین آزادی۔

سعادت علی صدیقی کے تصنیفی کارنامے یادگار رہیں گے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر حسب حال مضامین، اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ حال ہی میں جنوری ۱۹۹۱ء بندہ کی کتاب ''تاریخ ٹانڈہ'' پر چند حرف کے عنوان سے

ایک تقریظ تحریر کی جو موصوف کی تبحر علمی اور علم تاریخ پر عبور کی واضح دلیل ہے۔ اور اس سے کتاب کی اہمیت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

عاشق لائبریری

سعادت علی صدیقی علمی فضائل کے ساتھ ساتھ امور انتظامیہ سے بھی خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ اگر موصوف کے متعلق یہ کہا جائے کہ جس میدان میں قدم اٹھاتے پوری طرح اٹھاتے اور جہاں تک راہ ملتی بڑھتے ہی جاتے کوئی کام بھی ہوتا تو بے محل نہ ہوتا۔

ان کے کارناموں میں سے ایک عاشق لائبریری ہے جو ان کی انتھک کوششوں کے نتیجہ میں اتر پردیش کی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس کے متعلق مستقل عنوان کے تحت خود سعادت علی صدیقی نے تحریر فرمادیا ہے۔ بایں وجہ میں قلم کو حرکت نہیں دیتا۔ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ عاشق لائبریری علمی اثاثہ کی بنا پر اہل علم میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جارہی ہے یہ سب کچھ سعادت علی صدیقی کے علمی اثاثہ و تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔ انھوں نے لائبریری کی باضابطہ تنظیم جدید کی بنا پر فرنیچر اور کتابوں کے لئے الماریاں بنوائیں۔

سعادت علی صدیقی میرے کرم فرما تھے اور مفید مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ علمی، ادبی، تصنیفی، معاشرتی، مذاق کا اشتراک بندہ سے محبت وارتباط کا باعث ہوا تھا۔ سعادت علی صدیقیؒ کے کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ نوجوان حضرات کی حوصلہ افزائی فرما کر انھیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ انھوں نے سنبھل میں ۲۳ رسالہ قیام کے دوران درجنوں شعراء اور ادباء کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے کلام و تخلیقات کو کتابی شکل میں محفوظ کریں ان کی مخلصانہ ہمدردی و کشش کے نتیجہ میں سنبھل کے قلمکار بڑھے اردو ادب میں قریب دو درجن کتابوں کا اضافہ ہوا۔ اور منظر عام پر آئیں۔ انتقال ۱۹۹۳ء میں ہوا حق تعالیٰ ان کے درجات کو بلند تر فرمائے اور ان کی خدمات قبول فرما کر ان کو اجر جزیل سے نوازے۔

شعرائے سنبھل

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے جہاں قوموں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کا علم ہوتا ہے وہاں بعض دلچسپ کرداروں اور عجیب وغریب شخصیتوں سے واقفیت بھی ہوتی ہے اور انہیں عجیب وغریب تاریخی شخصیتوں کی طویل فہرست میں شعراء بھی شامل ہیں تاریخ سنبھل میں جہاں علماء صلحاء صوفیہ، حکماء، صحافی، اتقیاء، وغیرہ کے تذکرہ تاریخ سنبھل کا جزو ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہاں شعراء سنبھل کا تذکرہ بھی ضروری ہے، ورنہ مورخ کی دیانت کے خلاف ہوگا، کہ بعض شخصیتوں کو اجاگر کیا اور بعض کو نظر انداز کر دیا سنبھل روہیلکھنڈ کا علمی وتاریخی شہر رہا ہے اور سنبھل علم وادب کا مرکز رہا ہے وہیں اس کی سرزمین پر نامور شعراء بھی پیدا ہوئے ہیں جنہیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور ان کے شاگردوں کا وسیع حلقہ رہا ہے اور شاعری میں یدی طولیٰ رکھتے تھے ان کا کلام زندہ ہے اور انہیں نقش قدم پر شعراءِ حال اپنے کلام وافکار کو جس صورت میں پیش کررہے ہیں اس کی سرزمین پر شعر وادب کی بیش بہا خدمات انجام دی گئیں اور ہر دور میں کاملین فن وقلم نے اپنی جولانی قلم سے اردوادب کو اجاگر کیا ہے۔ بہر حال شعراء کا ذکر اہمیت کا حامل ہے ہمیں یہاں اس بات کی اجازت ہر گز نہیں کہ ہم شعر اور شاعری کی تعریف وتفصیل بیان کریں اس سے مضمون طویل ہوگا، جو فن تاریخ کے بھی خلاف اور ناظرین کے لئے اکتانے کا باعث ہوگا چونکہ ہمارا موضوع صرف تاریخ ہے اور اس میں شعراء کا ذکر ضمناً کیا جارہا ہے، اور تمام ہی شعراء سنبھل کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک طویل فہرست سے چند مشہور وممتاز شعراء سنبھل سے ہم متعارف کراتے ہیں اور اس تذکرہ میں ان شعراء کا تذکرہ ہوگا۔ جو سنبھل کی میونسپل حدود سے پانچ کلومیٹر تک کسی بھی مقام میں پیدا ہوئے یا سنبھل میں پرورش پانے کے سبب خود کو سنبھلی لکھتے ہیں، سنبھل میں شعراء سنبھل کا تذکرہ اخبار ورسائل میں آتا رہا ہے اور حال میں چند کتابیں منظر عام پر آئیں۔ جو شعراء وادباء سنبھل کے تذکرے پر مشتمل ہیں اور میں

نے بھی انھیں کتابوں سے اقتباس کیا ہے۔

جیسے (۱) گل صحرا، (۲) سخن پارے، (۳) سخن وران سنبھل۔ (۴) نذر اعجاز۔

(۵) چند ممتاز شعراء سنبھل۔ (۶) خزینہ سخن۔ (۷) جرس گل

سنبھل کے شعراء جن کے کلام کی افادیت عام اور شاگردوں کا وسیع حلقہ ہے۔

اور جن کی کاوش سے گمنام قدیم شعراء متعارف ہوئے ان میں سرفہرست جناب اعجاز وارثی (آپ چند کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا تفصیل ذکر مستقل عنوان کے تحت آتا ہے) معجز سنبھلی، قمر سنبھلی۔

معجز سنبھلی: نام معجز حسین معجز تخلص ہے محلہ نوریوں سرائے سنبھل ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے والد کا نام سید جواد حسین تھا شیعی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی ہمہ گیر شخصیت علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں گویا ادب وشاعری کا ایک بلند ستون تھے اور ایسی شمع تھے کہ جس کی شعائیں دور دراز تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ کے مستفیدین و شاگردوں کا وسیع حلقہ ہے۔ اہل سنبھل آپ کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے آپ نے ابتدائے کلام کی اصلاح یادگارِ داغ حضرت باغ سنبھلی سے لی ان کے انتقال کے بعد مولوی سید تقی حسین سرسوی سے فیض حاصل کر کے خود ایک بڑے استاذ کی حیثیت رکھتے تھے۔ معجز صاحب کی زیر تربیت ورہنمائی مین رہ کر سیکڑوں ادیبوں وشاعروں نے فیض حاصل کیا ہے سنبھل کی ادبی وثقافتی حلقوں محفلوں کے روح رواں تھے آپ کے بغیر محفل سونسان قادر الکلامی کا سکہ بٹھا رکھا تھا، جہاں ہوتے صدر کی حیثیت رکھتے ان کے بے شمار کلام واشعار اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے اور تہنیت وخراج تحسین حاصل کی حکومت اتر پردیش سے تمغے حاصل کئے جذبات معجزؔ کے نام سے نعتیہ کلام چھپ کر منظر عام پر آیا جس سے اسلامی ادب میں گونا گوں اضافہ ہوا ہے۔ (خزینہ سخن ص ۱۴۷)

اتنی کتابوں کے مصنف ہیں نمونہ کلام

احساس آدمیت گر ہو نہ آدمی میں
بے موت مر چکا وہ انسان زندگی میں

آتی ہے ایک ساعت ایسی بھی زندگی میں
کرتا ہے حسن سجدہ دربار عاشقی میں

کہنا نہ تھا جو قصہ دنیا کو کہہ سنایا
کچھ آپ نے خودی میں کچھ میں نے خودی میں

بربادیوں پر اپنی ہنستا نہیں ہے کوئی
میں ہنس کے ہو رہا ہوں شامل تری خوشی میں

تنکے کئے مرتب بجلی سی ایک چمکی
بس یہ بہار دیکھی دو دن کی زندگی میں

گر آگ لگ رہی ہے لگنے دو آشیاں کو
تقدیر کا لکھا تو پڑھ لوں گا روشنی میں

اوروں کی کیا شکایت ہوتا نہ ہوتا کوئی
تم تو شریک ہوتے معجز کی بے بسی میں

باغؔ سنبھلی: نام محمد فضل رب ابن مولوی عزت عباسی ہے باغؔ تخلص ہے عباسی النسل ہیں ۱۸۷۱ء میں پیدائش ہے۔ آپ کے والد مولوی عزت سنبھل کے بڑے زمیں دار شخص تھے۔ ابتدائی تعلیم سنبھل میں والد محترم کی نگرانی میں جید علماء سے حاصل کی جب اس میدان میں قدم رکھا تو حضرت داغؔ دہلوی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کر کے اصلاح کلام لی اس طرح شرف تلمذ حاصل کر کے کمال حاصل کیا۔ اپنے وقت کے شعراء پر فوقیت رکھتے تھے۔ استاذ کے انتقال کے بعد جانشینی کے لئے مقرر کئے گئے، ہر مجلس میں آپ کی عدم شرکت خلاء محسوس کی جاتی اور شرکت کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی۔ ۲۰ راگست ۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام ؎

دل چرا کر نظر چراتے ہوتے
داد دیتا ہوں اس صفائی کی

(سخنوران سنبھل ص ۱۵)

کامل محفوظی منشی محمد رفیق عباسی کامل:

آپ محلہ چاہ نانک سرائے ترین میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے ابتدائی عمر میں ہی شعروسخن کی آبیاری کرنے لگے اور حضرت محفوظ سنبھلی کے تلامذہ میں شامل ہوئے تو کامل محفوظی کے نام سے معروف ہوئے، درس وتدریس کا پیشہ اختیار کرنے کے باعث مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ مطالعہ نے ذوق وشوق کو جلا بخشی انہوں نے ایک مطبوعہ مثنوی اطہرعشق، اور اپنے کلام پر مشتمل مجموعہ کلام کامل، یادگار چھوڑا ہے مرادآباد کے خونیں حادثہ ۱۹۸۰ء سے متاثر ہوکر تقریباً تین سو (۳۰۰) اشعار پر مشتمل دوطویل نظمیں لکھیں جوان کے ماہرفن ہونے کا ثبوت ہیں، متعدد ومختلف اصناف سخن حمد ونعت سلام غزل، اور درجنوں سہرے، رخصتیاں اور تہنیتی منظومات وقطعات لکھ کر جولانی طبع کے جوہر دکھائے۔ نظم نگاری پر خاص توجہ دی تقریباً ۶۵ رسال کی عمر میں ۸ر اپریل ۱۹۸۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

قمر سنبھلی : ہندوپاک کے معروف شاعر قمر سنبھلی سنبھل کے معزز خاندان اور ایک علمی شخصیت قاری حمید الدین کے یہاں ۲۲ رستمبر ۱۹۴۲ء کو آنکھیں کھولیں والدمحترم نے ان کا نام سلطان الدین رکھا قمر تخلص ہے یہ تخلص اتنا عام ہوگیا ہے کہ لوگ اب اسے اصل نام سمجھتے ہیں قمر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ۱۹۵۸ء تک ان کے والدمحترم نے انہیں تعلیم وتربیت سے نوازا قمر صاحب کے والد ان محترم ہندوستان کے گنے چنے قراء علماء میں سے تھے جن کی قدرومنزلت ملک وبیرون ملک میں بھی تھی۔ موصوف مدرسہ صولتیہ مکۃ المکرّمہ کے فن تجوید کے فاضل تھے، قمر صاحب نے اپنے والدمحترم سے حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ فن قراءت بھی حاصل کیا جس کی تکمیل انہوں نے اپنی ذہانت سے بہت کم عمری میں کرلی تھی۔ بعدازاں سنبھلی اور دہلی کی بہت سی درسگاہوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۶۰ء میں قمر صاحب اپنے بڑے بھائی مولانا برہان الدین سنبھلی کے پاس دہلی چلے گئے، مولانا برہان الدین جو آج کل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں استاذ وشیخ التفسیر ہیں ان دنوں شہر دہلی مدرسہ

عالیہ عربیہ میں استاد تھے قمر صاحب دہلی جا کر وہیں کے ہو گئے دہلی کے ادبی ماحول اور مطالعہ کے جنون نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی اور یہ ان کی خوش قسمتی کہیے کہ انہیں راہبر حیدری مرحوم جیسے ماہر فن استاد کے شاگرد بننے کا شر تعلیم وتربیت اور سر پرستی کی ذمہ داری ان پر چھوڑ کر فروری ۱۹۸۳ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئیں غم کی اس منزل میں شریک حیات کا ساتھ چھوڑ کر چلے جانا ایک بڑا سانحہ۔ ہے۔ جو قابل برداشت نہیں ہوتا، مگر یہ دل اور پھر شاعری کا دل بہت وسعت رکھتا ہے بہ مشکل قمر صاحب نے یہ صدمہ برداشت کیا قمر صاحب شاعری میں کسی مسلک کے قائل نہیں وہ روایت کا تزین اور اس کے تیور کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں انہوں نے قدیم وجدید کے درمیان سے ایک الگ اور نیا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے جس پر ان کا شعر جاری ہے۔ اور وہ اپنی منزل کی طرف بہت تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں۔

ماضی بعید میں علماءِ سنبھل سے فیضیاب ہونے والی مشہور شخصیات:

ابوالفضل، فیضی، مولانا مملوک شاہ، عبدالقادر بدایونی صاحبِ منتخب التواریخ، شیخ بنگالی۔

ماضی قریب میں فیضیاب ہونے والی شخصیات: سید سلیمان ندوی صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب، سید فخر الحسن صاحب صدر مدرس دار العلوم دیو بند۔ محدث اعظم حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا محمد حسین بہاری استاذ دار لعلوم دیو بند، مولانا نذیر احمد صاحب خیر آبادی، مولانا محمد صادق صاحب پشاوری معروف بہ مولوی ریل۔

شیخ ابوالفضل وفیضی: علماء سنبھل سے استفادہ حاصل کرنے والی شخصیات میں قابل ذکر ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائی ہیں ابوالفضل شیخ مبارک کے گھر ۶ محرم ۹۵۸ھ میں اسلام شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے باپ نے اپنے استاد کے نام پر ابوالفضل نام رکھا۔

شیخ حاتم سنبھلی سے ابوالفضل اور فیضی نے سنبھل میں اکتساب علم کیا بایں وجہ شیخ عبدالقادر بدایونی کے استاد بھائی ہیں۔ غالباً شہنشاہ اکبر کے دربار میں شیخ ابوالفضل سب

عبد القادر بدایونی کے استاد بھائی ہیں۔ غالباً شہنشاہ اکبر کے دربار میں شیخ ابو الفضل سب پر فضیلت رکھتے تھے یہ ایک مورخ اور شاعر تھے۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازہ تھا آپ کے تجر علمی پر مشہور تاریخی کتابیں، آئین اکبری اور اکبر نامہ شاہد ہیں۔

سنبھل کے نامور علماء

یوں تو ہندوستان میں بہت نامور انسان پیدا ہوئے جنہوں نے سیاست وسماج علوم وفنون اور ادبی خدمات میں اپنا نام ومقام پیدا کیا۔ لیکن سنبھل کی تاریخ میں کئی بلند تر قامت شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے سنبھل کا نام روشن کیا۔

زمانہ قدیم کے علماء میں جیسے شیخ اللہ بخش، شیخ تاج الدین، عزیز اللہ تلبنی، شیخ حاتم، جنہیں اپنے وقت کا ابو حنیفہ کہا گیا۔ شیخ پنجو، شیخ ہلالی، شیخ حمید الدین جنہوں نے ہمایوں کے ایران سے واپسی پر کابل میں اس کا خیر مقدم کیا۔ شیخ خواجہ، مولانا قدرت اللہ، مولانا مراد اللہ جنہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ کیا جو تفسیر مرادی سے مشہور ہوا۔ شمس العلماء مولانا خلیل احمد صاحب، قاضی ابوذر، مولانا سعید احمد، مولانا محمد حسن اسرائیلی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

زمانہ قریب کے علماء:

مولانا عبد الوحید، قاری حمید الدین، مولانا عبد الکریم، مولانا عبد المجید، مولانا مبارک علی، مولانا حبیب احمد استاد دار العلوم دیوبند، مولانا محمد اسماعیل، شیخ الحدیث محمد حیات بانی حیات العلوم مراد آباد، مولانا اجمل صاحب مولانا عبد الرحیم صاحب، مولانا منظور نعمانی، مولانا و مفتی آفتاب علی۔ مولانا و حکیم محمد احسن صاحب، مولانا محمد اختر شاہ خان صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

سنبھل کی قابل فخر موجودہ شخصیات:

حضرت مولانا برہان الدین صاحب، مولانا محمد عارف صاحب، مولانا محفوظ الحسن

صاحب، مولانا عبدالخالق صاحب، مولانا زکریا صاحب، مولانا عتیق الرحمٰن مقیم لندن، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد، مولانا عبدالستار سلام، مولانا عبدالمومن ندوی مدظلہم العالی۔

مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی

''شخصیت اور علمی خدمات''

از قمر سنبھلی

نام: محمد برہان الدین سنبھلی ابن مولانا حافظ قاری حکیم محمد حمید الدین صاحب قاسمیؒ۔

تاریخ پیدائش: ۴رذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۵رفروری ۱۹۳۸ء

وطن: سنبھل ضلع مرادآباد، صوبہ اترپردیش (ہند)

ابتدائی تعلیم ودرسگاہوں کی تفصیل: ابتدائی تعلیم حفظ قرآن کریم، تجوید وقرأت (روایت حفص کی تکمیل) نیز ابتدائی عربی وفارسی کی ضروری تعلیم اپنے والد محترم (مولانا قاری محمد حمید الدین صاحب سنبھلیؒ) سے انھیں کے قائم کردہ، مدرسہ حمیدیہ تجوید القرآن سنبھل میں حاصل کی اس کے بعد مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے سنبھل، مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خاں سنبھل، اور مدرسہ دارالعلوم المحمدیہ دیپا سرائے سنبھل میں نحو وصرف اور دیگر علوم متداولہ مثلاً منطق وفلسفہ سے لے کر فقہ اور اصول فقہ، نیز تفسیر وحدیث کی کتب متوسطات تک میں ان مدارس کے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ابتدائی اساتذہ میں والد محترم کے علاوہ حضرت مولانا حبیب احمد صاحب اسرائیلی، اور مولانا محمد عابد خلش خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ بالخصوص مولانا حبیب احمد صاحب، کہ موصوف کی خاص شفقت اور توجہ تام حاصل رہی۔ فارسی کی تعلیم میں مولانا افتخار حسین صاحب سنبھلی سے اور ہندی وحساب میں منشی مقصود حسین صاحب سے استفادہ کیا۔

دارالعلوم دیوبند داخلہ: وطن میں متوسطات بلکہ بعض اعلیٰ کتب تک تعلیم حاصل کرنے کے

بعد شوال ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم میں بغرض حصول تعلیم اور تکمیل علوم، داخلہ ہوا یہاں پہلے سال، مشکوٰۃ، ہدایہ آخرین، ملاحسن، جیسی کتابیں پڑھیں اور دوسرے سال دورۂ حدیث میں شرکت ہوئی، بحمد اللہ پوری مدت تعلیم نہایت اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل ہوتی رہی کبھی کسی کتاب میں ناکامی نہیں ہوئی بلکہ متعدد کتب میں پورے دارالعلوم کے تمام طلبہ سے زیادہ نمبر حاصل کئے اس لئے انعامات پائے۔ (اس وقت تک دارالعلوم میں درجہ بندی نہیں ہوئی تھی بلکہ تمام کتابیں ہی درجات کے تعیین کے قائم مقام تھیں) ۷۷-۱۳۷۶ھ مطابق ۵۸-۱۹۵۷ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل ہوئی اور یہی سن فراغ ہے۔

دارالعلوم کے اساتذہ جن سے استفادہ کیا: اس وقت دارالعلوم دیوبند ممتاز ترین اساتذہ اور ماہرین فن جلیل القدر علماء سے آباد تھا، ان میں سرفہرست بلکہ گل سرسبد حضرت شیخ الاسلام سیدنا ومولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ تھے یہ بڑی خوش بختی اور سعادت کی بات ہے کہ آپ کو حضرت موصوف سے (ان کی وفات کے سال) درس بخاری شریف میں استفادہ کا موقع ملا۔ کہ یہی سال آپ کے دورۂ حدیث کا سال تھا۔ بعد ازاں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری کی تکمیل کی (کہ حضرت مدنیؒ کی وفات کی بعد موصوف نے ہی بخاری کی تکمیل کرائی تھی) ان جلیل القدر استادوں کے علاوہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ، مولانا محمد جلیل صاحبؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحبؒ، مولانا محمد ظہور صاحبؒ دیوبندی، مولانا معراج الحق صاحب (صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) اور مولانا محمد حسین صاحب بہاری سے استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمۃ سے بھی ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں نیز حدیث الاسودین، وغیرہ کی سماعت واجازت میں تلمذ حاصل ہوا۔ اور مولانا سید حسن صاحبؒ مولانا عبدالاحد صاحبؒ مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے بھی محدود استفادہ کا موقع ملا۔

"حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب علیہ الرحمۃ سے تلمذ"

دورۂ حدیث کے ہی سال رجب ۱۳۷۷ھ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ سے "احادیث مسلسلات" (مظاہر علوم سہانپور میں) پڑھ کر اجازت وسند نیز تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔

علمی ودینی خدمات: تحصیل علوم سے رسمی فراغت کے بعد دو مہینے اپنے وطن سنبھل کے مشہور اور قدیم ترین عربی مدرسہ سراج العلوم، میں تدریسی خدمات انجام دیں اس کے بعد دہلی کے مشہور ترین مدرسہ، مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری، میں مسلسل بارہ سال تک تمام کتب درسیہ کا درس دیا اور اسی زمانہ میں شہر دہلی کی ایک ممتاز اور بڑی مسجد میں تقریباً تیرہ سال درس حدیث وقرآن میں (عوام کے لئے) بھی مشغولیت رہی۔

بعد ازاں شوال ۱۳۹۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۰ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی دعوت پر) دار العلوم ندوۃ العلماء آ گئے اور اس وقت سے یہیں حدیث وتفسیر ودیگر متعدد علوم عالیہ کی تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں چند سال قبل دار العلوم ندوۃ العلماء میں شعبہ تفسیر کے صدر کا منصب بھی تفویض ہوا۔ نیز ابتداء سے مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کے نظامت کے فرائض بھی ذمہ رہے۔ جس کی وجہ سے (تدریسی خدمات کے علاوہ) عصر حاضر میں پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل کا علمی وتحقیقی شرعی حل دریافت کرنے کی نازک خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس مدت میں تقریباً ایک صد (عربی واردو) علمی وتحقیقی مضامین لکھے۔ ان مضامین کا ایک معتد بہ حصہ ملک وبیرون ملک کے متعدد مشہور علمی وتحقیقی جرائد ورسائل میں شائع ہوا۔

"تصنیفات وتالیفات"

علاوہ ازیں اس درمیان حسب ذیل مستقل کتابیں اور سالے (۱) رویت ہلال کا مسئلہ۔

(۲) معاشرتی مسائل، (۳) بینک انشورنس اور سرکاری قرضے، (۴) جدید میڈیکل مسائل، (۵) اثرات وخطرات، (۶) جہیز، اور عربی تصنیف (۷) قضایا فقہیہ معاصرۃ۔ شائع ہوکر عوام وخواص میں قبولیت اور اعتماد واستناد کا درجہ حاصل کرچکی ہیں کتابوں کا مختصر تعارف ذیل میں پیش ہے۔

(۱) ''قضایا فقہیۃ معاصرۃ'' (عربی) : ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء کے اواخر میں عالم عرب کے مشہور ترین اشاعتی ادارہ ''دار القلم دمشق'' (جس کی ایک شاخ دارۃ العلوم، بیروت میں بھی ہے) نے عربی میں یہ اہم کتاب نہایت خوبصورت ٹائپ، اعلیٰ گلیزڈ کاغذ اور بہترین طباعت کے ساتھ شائع کی جس میں عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل مثلاً بینکنگ سسٹم، حق تصنیف وتالیف کی خرید وفروخت، انسانی خون اور اعضاء کا استعمال، ہلکی زادہ، جہیز اور تلک کا مطالبہ، رویت ہلال کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل علمی انداز میں بحث کرکے ان کا شرعی حل پیش کیا گیا ہے۔

(۲) ''رویت ہلال'': یہ کتاب عصر حاضر میں خبر رسانی کے جدید ترین وسائل، مثلاً، ریڈیو، ٹیلی ویژن، تار، وائرلیس وغیرہ کے ذریعہ چاند کی آنے والی خبر کی حیثیت شرعی کے تحقیق وبیان پر مشتمل ہے، جس میں پچاس سے زیادہ معتبر ومستند قدیم وجدید مآخذ اور حوالوں کی روشنی میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور مسئلہ کے تقریباً تمام گوشوں کا احاطہ کرکے ان کا شرعی حکم بیان کیا گیا ہے (پہلا ایڈیشن ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، سے شائع ہوا)

(۳) ''معاشرتی مسائل'' اس کتاب میں موجودہ دور کے خاص فتنہ۔ تمام احکام شرعیہ بالخصوص اس کے معاشرتی احکام کے بارے میں (دین فطرت کی روشنی میں) غلط فہمیاں پیدا کرکے ان کے ناقابل عمل، نقصان دہ، بلکہ ظالمانہ ہونے کا پروپیگنڈہ اور انہیں بزور قانون مٹانے کی کوشش کا موثر علمی وتحقیقی انداز میں توڑ کیا گیا ہے۔ نیز تقابلی مطالعہ

کرنے کے بعد تجدد پسندوں کے قبلہ ہدایت مغرب (یورپ وامریکہ) کے بعض حقیقت پسند محققوں کے اقوال پیش کر کے اور سو سے زیادہ علمی و تحقیقی کتابوں کی روشنی میں اسلامی قوانین معاشرہ (مثلاً نکاح، طلاق، تعدد ازدواج، وراثت) کا فطرت انسان کے عین مطابق اور حقیقی عدل وانصاف کے تقاضوں پر مبنی ہونا ثابت کیا گیا ہے، کتاب کی مقبولت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مختصر مدت میں کئی ایڈیشن ملک و بیرون ملک میں شائع ہو چکے ہیں (پہلا ایڈیشن ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء میں مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۴) ''بینک انشورنس، اور سرکاری قرضے'': کتاب کا موضع نام سے ظاہر ہے، موجودہ دور کا اقتصادی نظام عموماً ان ہی تین بنیادوں پر قائم ہے ان تینوں کے ہی شرعی احکام، نہایت تحقیقی و علمی انداز میں معلوم کرنے کی ایک اہم کوشش کی حیثیت سے یہ کتاب منظر عام پر آئی اور بہت جلد اہل علم وارباب فکر ونظر کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہے (پہلا ایڈیشن ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں مجلس تحقیقات اسلامی حیدر آباد سے شائع ہو کر مقبول ہوا اور بہت جلد ختم ہو گیا)

(۵) ''جدید میڈیکل مسائل ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں اسی ادارہ (مجلس تحقیقات اسلامی حیدر آباد) نے نہایت اہتمام سے اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا جس میں عصر حاضر کے طبی (میڈیکل) مسائل، مثلاً اعضاء کی پیوند کاری، انسانی خون کا استعمال، نلکی زادہ، ضبط ولادت، اسپرٹ، الکحل، سے مخلوط ادویہ، انسانی دودھ کی خرید وفروخت پر بھرپور اور مدلل گفتگو کر کے ان کا شرعی حکم بتایا گیا ہے۔

(۶) ''اثرات وخطرات'': ۸۶-۱۹۸۵ء میں ہندوستانی مسلمانوں کو سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کے نتیجہ میں بڑی شدید آزمائش سے گزرنا پڑا اس سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اجتماعی، سیاسی وغیر سیاسی، کوششوں کے علاوہ علمی محاذ پر بھی علماء کو لوہا لینا پڑا اسی سلسلہ میں یہ ''رسالہ'' مسلم پرسنل لا بورڈ کی یوپی ایکشن کمیٹی کی طرف سے ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۵ء

میں شائع کیا گیا جس میں مولانا موصوف نے مسئلہ کا علمی جائزہ لے کر حکم شریعت کے بارے میں، ناواقفوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ سنجیدہ علمی طریقہ پر کرنے کے علاوہ سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ سے پیدا ہونے والے دوررس خطرناک اثرات کی طرف متوجہ کیا ہے۔

(۷) ''جہیز'': ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نہایت قبیح اور خطرناک رسم جہیز اور تلک کے مطالبہ کی شرعی، اجتماعی اور اخلاقی خرابیوں کو نمایاں کر کے اس سے بچنے کی طرف متوجہ کرنے کیلئے یہ رسالہ بنام ''جہیز یا نقد رقم کا مطالبہ، شرعی احکام او تجربات کی روشنی میں'' لکھا گیا جس میں قرآن و سنت نیز معتبر کتب فقہ و فتاویٰ کے حوالوں سے اس رسم بد کا حکم شرعی بیان کیا گیا اور اس کے دینی و دنیاوی خطرناک نتائج و عواقب سے آگاہ کیا گیا ہے یہ رسالہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں کیمپ آفس صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ (ندوۃ العلماء) نے شائع کیا۔

''مقالات و مضامین''

موصوف نے تقریباً ایک صد مقالات، مختلف موضوعات پر، جو زیادہ تر فقہی اور عصری مسائل پر ہیں، اردو عربی میں، ملک و بیرون ملک کے مؤقر ترین علمی و دینی رسائل و جرائد مثلاً عربی میں "مجلة المجمع الفقهي" اور "رابطة العالم الاسلامي" (مکہ مکرمہ) "البعث الاسلامي" "الرائد" (لکھنؤ) "الداعي" "الدراسات الاسلامية" (دارالعلوم دیوبند) "الصحوة الاسلامية" (حیدرآباد) نیز اردو میں ''معارف'' (اعظم گڈھ) ''برہان'' (دہلی) ''الفرقان'' ''صدق جدید'' ''تعمیر حیات'' (لکھنؤ) ''تذکرہ'' ''دارالعلوم'' (دیوبند) ''بینات'' (کراچی) ''زندگی'' (رام پور) ''بحث و نظر'' (پٹنہ) ''اسلام اور عصر جدید'' (نئی دہلی) ان کے علاوہ دیگر بہت سے رسائل شائع ہو کر علمی و فکری حلقوں میں اصحاب علم و ارباب فکر و نظر کی توجہ کا مرکز بنے۔

یہاں ان میں سے چند ہی مخصوص مضامین کے عنوانات ذکر کیے جاتے ہیں۔

(عربی) نظام لعدل في الاسلام، حول مشكلة لحوم الاضاحي، الاساليب الخداعة

لانکار الحدیث، نظام الارث فی الاسلام، أسوة الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی حقوق المرأة ومکانتہا، نظرة خاطفة الی علم الفقہ۔

(اردو) اسلام کا نظام عدل اور تصور مساوات، کردار سازی میں مدارس کا حصہ، قرآن فہمی کیلئے چند اصول، مسلم پرسنل لاپر فیضی کے مقالہ کا جائزہ، اسلام میں خلافت کا مقام۔ شرعی قوانین میں عورت کی رعایت۔ اسلام کا عائلی نظام، غیر معتدل الایام علاقوں میں اوقات نماز وروزہ کا مسئلہ، اسلام کا حکیمانہ نظام وراثت، کیا مغصوبہ زمین پر مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے؟ دنیاوی علوم میں مہارت پیدا کرنا بھی دینی کام ہے۔ حرم کے مسافروں اور ساکنوں سے تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کی ضرورت، طبقاتی کشمکش کا علاج حکمت نبوی میں۔

”بیرون ملک میں علمی ودینی سفر“:

علمی مضامین کی اشاعت، اور بعض دیگر اسباب کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک منعقد ہونے والی علمی مجالس اور تحقیقی مذاکروں میں شرکت کیلئے بکثرت دعوت نامے موصوف کو ملے لیکن قلت فرصت اور مشاغل کی کثرت کی وجہ سے سب جگہ جانا ناممکن نہیں ہوا بس کچھ مخصوص اہم علمی مجالس میں شرکت کر سکے ان میں سے اکثر میں علمی مقالات پیش کئے نیز بحث ومباحثہ میں حصہ لیا، بیرون ملک جن مجالس میں شرکت ہوئی ان میں ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء کے اندر سعودی عرب کے مشہور شہر ”جدہ“ میں البنك الاسلامی کے صدر کی دعوت پر منعقد ہونے والی علمی مجلس میں اور ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء میں الجزائر میں ہونے والی کانفرنس ”الملتقی العلمی للفکر الاسلامی“ میں۔

کانفرنس کے داعی اور ملک الجزائر کے اس وقت کے مرکزی وزیر امور مذہبی شیخ عبدالرحمان شیبان کی دعوت پر شرکت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد انگلینڈ کے بعض اہم مقامات (لندن وغیرہ) کا سفر بھی ہوا، جہاں علمی مجالس واجتماع میں شرکت اور گفتگو کا موقع ملا، ان میں خاص طور پر لندن کے اسلامک سینٹر اور لندن سے تقریباً سومیل کے

فاصلہ پر واقع خوبصورت ٹاؤن، نینی ٹن، میں ایک علمی مجلس کے اندر شرکت قابل ذکر ہے
۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں پھر "البنك الاسلامی" (جدہ سعودی عرب) کی دعوت پر ایک
علمی اجتماع میں شرکت کی، جس میں، "لبنک الاسلامی" کی طرف سے اجتماعی قربانی کے
ایک خاص مسئلہ پر بحث و مذاکرہ میں حصہ لیا اور مقالہ پڑھا، ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں
ملیشیا کے شہر "پنیانگ" میں "عالمی اسلامی کلنڈر" کے موضوع پر ایک عالمی طرز کا (تر بجنل)
سیمنار ہوا جس میں تقریباً ۲۵ رملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی، ہندوستان سے مولانا
موصوف نے شرکت کی اور اس میں مقالہ بھی (عربی) میں پڑھا اور بحث میں حصہ لیا،
علاوہ ازیں ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں حج کے موقعہ پر سعودی حکومت کی "وزارت اوقاف
حج" کی خصوص دعوت پر (ایک اہم وفد کے ساتھ جس میں رابطہ الحج کے رکن کی حیثیت
سے ہندوستان کے متعدد علماء و مشاہیر شامل تھے) سعودی عرب تشریف لے گئے اور حج کی
سعادت سے مشرف ہوئے الحمدللہ اس سے قبل بھی دوبار حج کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔

"اندرون ملک علمی اجتماعات وسیمناروں میں شرکت"

اندرون ملک بے شمار علمی و دینی مجالس اور سیمناروں میں شرکت کے دعوت نامے
موصول ہوتے رہتے ہیں، مگر مستقل علمی مصروفیات کی وجہ سے کچھ ہی اجتماعات میں شرکت
فرما سکے تھے، اس کے باوجود ایسے اجتماعات اور سیمناروں کی تعداد کہ جن میں شرکت فرمائی
اور مقالات پیش کیے اتنی زیادہ ہے کہ سب کا احاطہ مشکل ہے، ان میں سے چند کے ذکر پر
اکتفا کیا جا رہا ہے۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی طرف سے دسمبر ۱۹۷۶ء میں
منعقدہ "اسلام کی تشکیل جدید" کے موضوع پر سیمنار (جس کا افتتاح اس وقت کے صدر
جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد نے فرمایا تھا) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبہ
اسلامیات کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں سیمنار (منعقدہ علیگڈھ) اسلامک اسٹیڈیز کانفرنس

(علیگڈھ کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں سیمنار دار العلوم حیدر آباد کی طرف سے حیدر آباد میں منعقد ہونیوالے ۸۸-۸۷-۱۹۸۶ء کے اندر تین سیمناروں میں شرکت "مرکز البحث العلمی" پٹنہ کی طرف سے منعقدہ علمی و فقہی اجتماع ۱۹۸۵ء (منعقدہ پٹنہ) رد قادیانیت پر سیمنار دار العلوم دیوبند ۱۹۸۶ء جامعہ سلفیہ بنارس کی طرف سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر سیمنار ۱۹۸۷ء (منعقدہ بنارس) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر سیمنار ۱۹۸۸ء (منعقدہ دہلی) خدا بخش لائبریری پٹنہ کی طرف سے "قرآنیات کے عربی وفارسی مخطوطات" کے موضع پر سیمنار ۱۹۸۹ء (منعقدہ پٹنہ) ان کے علاوہ در العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہونے والے بکثرت سیمناروں وغیرہ میں شرکت فرمائی اور متعدد بار قیمتی مقالات پڑھے اور عملاً بحث وگفتگو میں شرکت فرمائی۔

ان علمی مذاکروں اور سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالات میں سے بہت سے مقالے، سیمنار منعقد کرنے والے اداروں کی طرف سے شائع ہونے والے خصوصی مجلّوں میں شامل اشاعت ہوکر افادۂ عام کا سبب بنے۔اور بعض مقالات ملک کے مؤقر جرائد ورسائل میں بھی شامل ہوئے۔

علمی ودینی اداروں کی خدمت ورکنیت:

موصوف کو ہندوستان کے متعدد علمی اور دینی وملی اداروں کی خدمت ورکنیت کا شرف بھی حاصل ہے، مثلاً آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمت کا تاسیس کے دن سے (بلکہ اس سے قبل سے) شرف حاصل ہے اس کے تاسیسی ممبر اور ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ) کے بھی رکن ہیں، علاوہ ازیں دینی تعلیمی کونسل کی مجلس عاملہ اور کونسل کے بھی رکن ہیں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی ترقی کے لئے بنے مشاورتی بورڈ کے ممبر بنائے گئے اس کے علاوہ بھی بعض اور دینی علمی اور ملی اداروں وتحریکوں کی مختلف النوع خدمات کا بھی موقعہ ملتا رہتا ہے، مثلاً مرکزی دارالقضاء (یوپی) کی قاضی کونسل کی صدارت (قاضی القضاۃ) کا منصب بھی حاصل ہے۔

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی:

آپ حضرت مولانا نعمانیؒ صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں اور حکیم محمد احسن کے داماد، علمی گھرانہ اور علمی ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے، بچپن ہی سے ذہین وذکی ہیں قدرت نے انہیں غیر معمولی دماغی قوت وصلاحیت عطا کی ہے اپنے والد محترم کی زیر تربیت ونگرانی میں رہ کر تحصیل علم سے پورا فائدہ اٹھایا اور علوم میں دسترس حاصل کی، آپ اس وقت کے بڑے زبردست عالم ہیں اور ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے اسلامی علوم کا کوئی بھی واقف کار ان کی شخصیت سے نا آشنا نہ ہوگا، وہ اس وقت لندن میں مقیم ہیں حق تعالیٰ نے ان کو قلم میں توانائی کے ساتھ زور بیانی سے نوازا ہے۔ حق تعالیٰ خدمت دین کے لئے ان کی زندگی میں مزید برکت عطا فرمائے۔

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد صاحب سنبھلی:

آپ حضرات مولانا منظور نعمانیؒ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد دار العلوم دیوبند فنون کی تکمیل کے لئے گئے اس کے بعد الجامعۃ الاسلامیہ "المدینۃ المنورۃ" چلے گئے وہاں علمی کمال وفضائل سے آراستہ ہوئے اور خاندانی عظمت وشرافت اور علمی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے ۱۹۷۵ء سے وہ علمی وادبی محفلوں کو اپنی ذہانت، قابلیت، صلاحیت، اور غیر معمولی دماغی قوت اور پر خلوص علمی وادبی خدمات سے روشنی وتابانی بخش رہے ہیں متعدد زبانوں پر درک رکھتے ہیں بے پناہ تخلیقی فعال صلاحیتوں اور سرگرمی سے محفلوں میں تہلکہ مچا رکھا ہے اور بیان وزبان سے مجلسوں کو رونق بخش رہے ہیں اس زمانہ میں اپنی نظیر آپ ہیں علمی فضائل وکمال کے ساتھ آپ وعظ وتبلیغ میں بھی یکتائے روزگار ہیں محفلوں مذہبوں کے لوگ طرح طرح کے اشکالات پیش کرتے ہیں اور آپ ان کے نہایت عمدہ طریقہ پر جواب دیتے ہیں۔
قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں وہ علمی طور پر قومی یکجہتی کے علم بردار ہیں ادب

وصفحات، تقریر و تبلیغ کے میدانوں میں پوری سرگرمی جانفشانی کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ جس میدان میں قدم اٹھاتے ہیں پوری طرح اٹھاتے ہیں اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔

الفرقان: جس کے بانی آپ کے والد محترم ہیں یہ ماہانہ رسالہ لکھنؤ سے نکلتا ہے۔ آپ اپنے والد محترم کی حیات سے ہی مدیر ہیں آپ مختلف فنون اور موضوعات پر لکھتے ہیں آپ کے مضامین نہایت عمدہ ہوتے ہیں اور نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ مقبول اور نفع بخش ہیں۔ آپ لکھنؤ مقیم ہیں۔ آپ کی ذات گرامی اتنی بلند ہے کہ جو نہ صرف سنبھل بلکہ ہندوستان کے لئے سرمایہ فخر وناز ہے حق تعالیٰ مزید زور قلم اور زور بیانی سے نوازے اور خدمت دین کے لئے زندگی میں مزید برکت عطا فرمائے۔

مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی استاذ دارالعلوم دیوبند:

سنبھل کے محلّہ سرائے ترین جھجران میں ۴ر جنوری ۱۹۵۰ء کو پیدائش ہے۔ والد محترم کا نام نصیر احمد ہے جو میرے والد محترم سعد اللہ کے حقیقی بھتیجے ہونے کے ساتھ ان کی شفقت وتربیت میں پروان چڑھے اور تعلیم حاصل کی۔

ایک باوقار زندگی گزاری، خوش اطوار، خوش مزاج، رقیق القلب، متواضع، سادگی پسند، تمکنت سے خالی انسان تھے، کلام صاف ستھرا، شریفانہ، دلچسپ اور دل آویز ہوتا تھا، کیا بوڑھے کیا جوان کیا مرد کیا عورتیں سب ہی سنتے اور سناتے تھے آپ شاعر بھی تھے جوانی میں مشاعروں اور شعری نشستوں میں شرکت فرماتے۔ آپ ہر دلعزیز اور مقبول خاص وعام تھے، خاندان کے لئے باعث فخر ہونے کے ساتھ مجھے عمزاد عزیز ترین بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے، بایں وجہ مولانا عبدالخالق صاحب مجھے چچا کہتے ہیں مولانا عبدالخاق صاحب بھائی نصیر احمد کے تیسرے صاجزادے ہیں، مولانا عبدالخالق صاحب تو اول دن سے میرے ہم سبق رہے، مجھ سے ڈیڑھ دو سال چھوٹے ہونے کے باوجود خداداد ذہانت اور تیزی میں آگے تھے، لڑکپن کا ایک بڑا حصہ وطن میں ساتھ رہ کر گزرا، میں نے ان کی خلوت وجلوت کا مشاہدہ کیا اور نشست وبرخاست کا شریک بھی رہا قرابت کے

ساتھ بے لوث دوست کی دوستی بھی تھی اور بے نیاز محبت بھی۔

آغاز تعلیم: محلہ کے مدرسہ وحید المدارس میں تعلیم کا آغاز ہوا جب کہ حضرت مولانا مفتی محمد آفتاب علی خان صاحب وہاں مدرس تھے کچھ ہی دن بعد حضرت مفتی صاحب وہاں سے شمس العلوم منتقل ہوگئے تو مولانا بھی وہیں چلے گئے۔ مدرسہ شمس العلوم میں حضرت الاستاذ حافظ فرید الدین خاں صاحب مدظلہ سے قرآن کریم حفظ کی تکمیل کی اور دوسرے اساتذہ سے اردو، ہندی وغیرہ دینیات کی تعلیم حاصل کی، فارسی اور ابتدائی عربی سے شرح جامی تک کی تمام کتب حضرت الاستاد مولانا مفتی محمد آفتاب علی خاں صاحب سے پڑھیں اور پھر ۱۹۶۸ء میں دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔

بچپن ہی سے قدرت نے انہیں غیر معمولی دماغی قوت وصلاحیت عطا کی ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں دارالعلوم پہنچ کر علمی گوہر کھلنے لگے تھے۔ بایں سبب وہ اپنے ہم درسوں اور ہم چشموں میں نمایاں اور ممتاز رہے۔ دارالعلوم دیوبند میں علوم متداولہ کی تکمیل کی بخاری شریف شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ مرادآبادی سے ومولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مولانا مفتی محمود حسن صاحب اور مولانا شریف الحسن صاحب سے پڑھی۔ ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ دورۂ حدیث کے ہم سبق ساتھیوں میں تیسرے نمبر سے کامیاب ہوئے۔ اول دن سے علم ادب دلچسپ موضوع رہا اور ہمیشہ امتحان کے جواب عربی میں لکھے۔ فراغت کے بعد ایک سال تکمیل ادب میں رہ کر حضرت مولانا وحید الزماں صاحب سے خصوصی استفادہ کیا۔ ۱۹۷۳ء میں مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں تقرر ہوا اور یہاں محقق عصر مولانا عبدالرحیم صاحب سے گھل مل گئے، سنبھل کی ان دونوں علمی شخصیتوں کے خادم الاسلام میں جمع ہونے سے علمی ماحول میں ترقی کو چار چاند لگے وہ علمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اور دونوں نے اپنے اثرات چھوڑے۔

مولانا عبدالخالق صاحب نے یہاں علیا تک کی کتابیں پڑھائیں ان کی تبحر علمی اور انہماک فی العلم کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی (عبدالرحیم وعبدالخالق صاحب) دارالعلوم دیوبند کے استاد ہوئے مولانا عبدالخالق صاحب نے چھ سال تک خادم

الاسلام ہاپوڑ میں تدریسی خدمات انجام دیں اور شمع انجمن بن کر رہے۔
خادم الاسلام کے شاگردوں میں مولوی احتشام الحق مقیم ریاض، مولوی مفتی مقصود احمد قاسمی مولانا ظہیر احمد صاحب، مولانا کمال الدین صاحب، مولانا نعیم اللہ اساتذہ خادم الاسلام ہاپوڑ قابل ذکر ہیں ۱۹۷۹ء میں مراد آباد مدرسہ جامع الہدیٰ کی خدمات کے لئے منتخب کئے گئے ۳ سال تک بحسن خوبی تدریس میں مشغول رہے اور جلالین اور سراجی مشکوٰۃ شریف تک پڑھائیں (اس وقت وہاں دورہ قائم نہیں تھا)

پھر ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند تقرر ہوا

دارالعلوم دیوبند میں سنبھل کے تین عالموں کو استاد ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے (۱) مولانا حبیب اللہ صاحب (۲) مولانا عبدالرحیم صاحب (۳) مولانا عبدالخالق صاحب ہیں موصوف کا علمی ذوق اور فنی مہارت، حاضر جوابی و مولانا عبدالرحیم صاحب کی رہنمائی آپ کو دارالعلوم لے گئی مولانا کی علم ادب میں اچھی خاصی نظر ہے عربی زبان میں بے تکلف لکھنے اور بولنے دونوں پر قادر ہیں وہ استاذ فقہ وادب سے متعارف ہیں ان کا شمار ہندوستان کے موجودہ چوٹی کے ادیبوں میں ہونا چاہئے۔

اپنے عزیز طلبہ کی تعلیم و تربیت پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور ان کے اندر علمی استعداد کے جوہر دیکھنا چاہتے ہیں اور علم کے میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ دفتر تعلیمات دارالعلوم دیوبند کی رپورٹ میں اس کا ثبوت ہے (حتی کہ کچھ دن کے بعد ہی درجہ ادنی سے وسطیٰ میں بعدہ وسطیٰ الف میں لے لیا گیا طریقہ تعلیم اور افہام و تفہیم کا انداز نہایت اچھا ہے۔ جس کے تمام طلبہ مداح ہیں، ظرافت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے دوستوں بلکہ دشمنوں کے کام آنے والا غیروں اور اجنبیوں کو نفع پہنچانے والا بے غرض خدمت گزاری کا پتلا خوش اطوار، خوش مزاج، رقیق القلب رحم دل متواضع ایسے شخص میری نظر سے کم گذرے ہیں ان کے دارالعلوم جانے سے بُعد مکانی کے سبب عدم ملاقات پر جب

ان کی یاد آتی ہے تو بہت سی خوشگواریوں کے جھرمٹ اپنے ساتھ لے کر آتی ہے، وہ میرے صلح و مشورہ کے شریک ہی نہیں بلکہ علمی ادبی معاشرتی ارتباط کا باعث ہیں مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں ایسی محبت کرنے والے نصیب ہی سے نصیب ہوتے ہیں اور ہم لوگوں کے تعلقات یوں بھی عزیزانہ ہیں اور پشتوں سے چلے آرہے ہیں لیکن ان کی ذات سے اور بھی زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے بڑے بھی ان کو اپنا بے تکلف دوست سمجھتے ہیں ان کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی صرف دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات انجام دہی میں نہیں بلکہ علمی ادبی اور فلاحی کاموں میں بھی گذر رہی ہے چنانچہ روہیلکھنڈ کے بہت سے مدارس اسلامیہ آپ سے مربوط ہیں اور نمائندگی بھی حاصل ہے مدارس کے امتحانات کے لئے بھی بلائے جاتے ہیں علمی کمالات کے ساتھ تقریر پر بھی قدرت ہے۔

تصانیف: آپ قلم کاروں میں سے ایک ہیں دارالعلوم جاکر ان کے قلم میں مزید توانائی آگئی ہے ہر موضوع پر لکھا ہے، تقاریظ لکھیں تصحیح کا کام کیا، ترجمے کئے مقالات لکھے فتاویٰ عالم گیری جز ۱۵ر (کتاب الایمان) کا ترجمہ کیا، تحسین المبانی فی فن علم المعانی میں ضمیمہ کا اضافہ کیا جو منظر عام پر آیا نیز عبدالمجید عزیز الزندانی الیمنی کی کتاب التوحید کا ترجمہ کیا جو تقریباً ۵۰۰ر صفحات پر مشتمل ہے اور ۵ر حصوں پر مشتمل ردمودودیت پر محاضرہ تیار کیا جس کو دارالعلوم دیوبند نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گئے اور فریضہ حج ادا کیا تلامذہ کا وسیع حلقہ ہے، جو بیرون ممالک میں بھی پھیلے ہوئے ہیں اس سفر حج میں متعلقین اور متعارف حضرات نے خاص کر تلامذہ نے ہر جگہ پر خیر مقدم کیا۔

چند سال سے مولانا عبدالخالق صاحب دارالعلوم دیوبند کے امتحانات کیلئے اکثر ناظم طباعت منتخب کئے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ خدمت دین کیلئے مزید قوت سے نوازے۔ آمین۔

حضرت مولانا زکریا صاحب:

آپ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، محلہ دیپا سرائے کے باشندہ ہیں، آپ نے ابتدائی تعلیم سنبھل حاصل کی بعدہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے وہاں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادب کی تکمیل کی، حضرت مولانا منظور نعمانی کے برادر زادہ ہونے کے ساتھ آپ داماد بھی ہیں موصوف کے ایما پر باندہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ کے مدرسہ باندہ میں تقرر ہوا، وہاں تدریسی خدمت انجام دی، بعدہ ندوۃ العلماء لکھنؤ آپ کو بلالیا گیا ایک مدت سے بحسن وخوبی تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں خوش اخلاق مہمان نواز، اور بڑے دلچسپ باغ وبہار کے عالم ہیں، خاندانی عظمت وشرافت اور فن کا ان کو ورثہ میں زیادہ حصہ ملا ہے، علمی فضائل وکمال کے ساتھ نہایت پاکیزہ طبیعت ہیں، ہمیشہ علمی کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد عارف صاحب مدظلہ:

محلہ دیپا سرائے سنبھل کے باشندہ ہیں اور حضرت مولانا منظور نعمانی کے بھتیجے ہیں اس وقت کے جید عالم دین ہیں، فراغت کے بعد سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، مدرسہ انجمن معاون الاسلام میں تدریسی خدمت انجام دی، بعدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آپ کا تقرر ہوا وہاں ایک مدت سے تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں اور مقبول ترین اور ممتاز استاد ہیں نیز آپ صاحب تصنیف بھی ہیں مزاج میں بہت سادگی ہے، حق تعالیٰ خدمت دین کے لئے ان کی زندگی میں مزید برکت عطا فرمائے۔

مولانا اختصاص الدین:

مولانا ایک علمی گھرانے کے چشم چراغ ہیں علمی ماحول میں مولانا الشاہ محمد اجملؒ کے گھر آنکھیں کھولیں اور اپنے والد محترم کے نقش قدم پر گامزن ہیں اور الولد سرلابیہ کے مصداق ہیں، اور والد کی طرح امور انتظامیہ میں بڑا دخل ہے ان کے مذاق میں لطافت اور شگفتگی کے سب ہی قائل ہیں، علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ جب سن شعور کو پہنچے

تو علوم متداولہ سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے والد مولانا محمد اجمل شاہؒ کے انتقال کے بعد مدرسہ اجمل العلوم کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد یونس مقرر ہوئے ان کے انتقال کے بعد ۱۹۷۳ء میں مولانا اختصاص الدین ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے نیز سرائے ترین میں اجمل العلوم کی شاخ مدرسہ رستم خان والی مسجد کے ناظم بنے۔ دونوں مدرسوں کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

حضرت مولانا سعید عالم سنبھلی:

مولانا سعید عالم ولد مفتی خلیل عالم ابن مفتی حبیب عالم ایک جید عالم اور تبحر تھے انھوں نے اپنی کتاب گلزار دانش میں اپنا حسب نامہ تحریر فرمایا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سعید ابن خلیل ابن حبیب است ☆ مصنف را کہ وی بس خونصیب است

حبیب از بسکہ مقبول خدا بود ☆ پدر او را خلیل با صفا بود

ورا بودہ پدر چوں بدر عالم ☆ نمودہ دیں و دنیا را فراہم

زدین سیدا شتے از بس سروکار ☆ بیرون از دل شدے دنیائے مکار

ورا عبدالحیٔ ابن احمد ☆ پدر بودہ خوش از صہبائے سرمد

ورا شاہ کبیر الدین پدر بود ☆ رخ او تافتہ ہمچو بود

☆☆☆☆☆

عبدالمعید سنبھلی

مؤرخ تاریخ سنبھل

سرائے ترین سنبھل میں ۱۹۵۲ء کی پیدائش ہے، والد محترم کا نام نامی سعد اللہ ابن حبیب اللہ ہے، والدہ محترمہ کی شفقت اور والد محترم کی نگرانی میں طفولیت کے دور سے گذر کر جب ہوش آیا تو تعلیم کا آغاز مدرسہ وحید المدارس سے ہوا بعدہ مدرسہ شمس العلوم میں حضرت

الاستاذ حافظ فریدالدین خان صاحب کے پاس قاعدہ بغدادی بعدہ قرآن کریم ناظرہ پھر قرآن کریم حفظ کی تکمیل کی نیز دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ الحمدللہ حفظ کی تکمیل کے بعد سے آج تک ہر سال تراویح میں رمضان المبارک میں قرآن کریم پڑھنے کی توفیق حاصل ہے۔

آغاز تعلیم:

فارسی وعربی تعلیم کا آغاز حیات العلوم مرادآباد سے ہوا، حضرت شیخ مولانا محمد حیات صاحبؒ نے بندہ کو حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبا کپوری جو اپنے وقت کی جید عالم ہی نہیں بلکہ علماء ساز اور استاذ الاساتذہ تھے اور حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی مدظلہ (جو دارالعلوم دیوبند کے شعبہ دارالافتاء میں مؤقر منصب پر فائز ہیں) ان دونوں بزرگوں کی صحبت وخدمت میں رہنے پر مامور کیا، ان حضرات کے ساتھ خورد ونوش ہی نہیں بلکہ شفقت ونگرانی میں تعلیم جاری رہی، ان حضرات کی سرپرستی تریاق ثابت ہوئی، اس دوران والدمحترم مریض ہوگئے تو تیمارداری کے سبب وطن سنبھل رہنا ہوا، اسی مرض میں والدمحترم رحلت فرماگئے تو اس سال کی بقیہ کتب تکمیل مدرسہ دارالعلوم الحمدیہ میں حضرت مولانا عابد حسین صاحبؒ امام فارسی کے پاس شرح جامی تک ہوئی اسی اثنا میں الہ آباد بورڈ سے مولوی کا امتحان دیا، دوسرے سال عالم کا امتحان دیا۔ ۱۹۷۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، وہاں چار سال مسلسل حصول علم میں منہمک رہا اس وقت کے جید علماء سے اکتساب علم کیا قابل ذکر اساتذہ کرام میں حضرت مولانا نعیم احمد صاحب، حضرت مولانا خورشید عالم صاحب صاحبزادہ حکیم الاسلام حضرت مولانا سالم صاحب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ صدر المدرسین حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب صدر المدرسین، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب شیخ الادب حضرت مولانا وحید الزماں صاحب اور حضرت مولانا قمرالدین صاحب مدظلہ، بخاری شریف جلد ثانی مکمل حضرت مولانا مفتی محمود حسنؒ سے اور جلد اول حکیم الاسلام

حضرت قاری محمد طیب صاؔ اور سید فخر الحسن صاؔ اور شیخ شریف الحسن صاؔ سے پڑھ کر ۱۹۷۳ء میں دار العلوم سے فراغت ہوئی۔

تدریس:

۱۹۷۴ء میں حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب نے حافظ محمد الیاسؒ کے مدرسہ انچولی میرٹھ میں عربی درس وتدریس کے لئے بھیج دیا، یہاں ایک سال تک عربی ابتدائی کتب کا درس دیا پھر حضرت مولانا عبد الرحیم سنبھلی نے ہاپوڑ مدرسہ رحمانیہ کیلئے مامور کردیا پانچ سال تک یہاں تدریسی خدمت انجام دی اور مختصر المعانی تک کتب پڑھانے کی سعادت کے ساتھ مسجد خدا بخش میں امامت کے فرائض اور قرآن کریم کی تفسیر کا موقعہ حاصل ہوا، پھر حضرت مولانا عبد الرحیمؒ نے مولانا و منشی معین الدین انصاری کے ایماء پر مدرسۃ الشرع کٹرہ موسیٰ خان سنبھل روانہ کردیا یہاں ۳؍سال تک مشکوٰۃ تک کتب پڑھانے کے ساتھ دیپا سرائے چوک والی مسجد میں امامت اور قرآن کریم کی تفسیر بیان کی یہاں خاص کر حضرت مولانا حکیم محمد احسنؒ کی صحبت حاصل رہی۔

۱۹۸۲ء میں ٹانڈہ رام پور میں تدریس کیلئے اور جامع مسجد میں خطابت وامامت پر تقرر ہوا، یہاں ۱۹۹۷ء تک مشکوٰۃ شریف تک تدریس کتب میں مشغول رہا اور جامع مسجد میں خطابت وامامت کے ساتھ بعد نماز فجر قرآن کریم کی تفسیر ۱۹۸۲ء سے شروع ہوکر پہلی بار ۲۹؍اکتوبر ۱۹۸۸ء میں پوری ہوئی (الحمد للہ) دوسری بار سنبھل آکر ۱۹۹۸ء میں مرکز والی مسجد سرائے ترین میں تفسیر وترجمہ پورا ہوا۔

تصانیف:

ٹانڈہ کے قیام کے دوران رضا لائبریری میں مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا جس کے سبب تاریخ سنبھل کے مضامین جمع ہوئے نیز تاریخ ٹانڈہ ۲۶۶؍صفحات پر لکھی گئی اور طباعت ہوکر منظر عام پر آئی، توبہ کیا ہے؟ اور اہمیت ذکر ودعاء کتابیں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں جامع مسجد دربار میں حضرت مولانا حکیم محمد آفتاب علی خان کے انتقال کے بعد

قریب ایک سال جمعہ سے قبل خطاب وتقریر کا سلسلہ جاری رہا۔

وطن قیام:

۱۹۹۷ء سے اپنے وطن سنبھل میں قیام ہے، مدرسہ ناشر العلوم میں تدریسی خدمات جاری ہیں اور مرکز والی مسجد میں فجر بعد تفسیر قرآن کریم نصف ہفتہ اور نصف ہفتہ مشکوٰۃ شریف کا درس اور امامت وخطابت کا سلسلہ جاری ہے۔

بیعت: حضرت شیخ مولانا مسیح اللہ خانؒ (خلیفہ اجل حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ تھانوی) کے یہاں بندہ کی دار العلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی ہی سے حاضری رہی اور ۱۹۸۲ء میں رمضان المبارک خانقاہ میں گذارا حضرت سے محبت وعقیدت کے ساتھ بیعت کا شرف بھی حاصل ہے۔

حج: ۱۹۸۲ء میں حاجی محمد عادلؒ سنبھلی کے ہمراہ بحری جہاز سے حرمین شریفین حاضری ہوئی اور فریضہ حج کی ادائیگی ہوئی۔ الحمد للہ دوسری بار ۱۹۸۳ء میں ہوائی جہاز سے حج کیلئے دیار پاک میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی بفضلہ تعالیٰ بندہ (عبد المعید قاسمی) اپنے چار بھائیوں عبد المجید صاحب عبد العزیز صاحب عبد الحمید عرف بابو صاحب، حاجی محمد نبیہ صاحب اور ایک ہمشیرہ کے ساتھ بصحت وعافیت ہے۔

اولاد: سات لڑکیاں اور ایک لڑکا محمد طیب (جس کو اللہ پاک نے حفظ قرآن کا شرف بخشا) موجود ہیں نیز رفیقہ حیات بھی حیات ہیں۔

دور حاضر کے علماء کرام کے اسمائے گرامی

جن کا تفصیلی تذکرہ نہیں ہوسکا

(۱) حضرت مولانا محفوظ الحسن صاحب قاسمی مدظلہ مقیم دہلی۔

(۲) حضرت مولانا معاذ الاسلام صاحب قاسمی سنبھلی بانی مہتمم جامعۃ البنات مراد آباد

(۳) حضرت مولانا سہیل احمد صاحب قاسمی مدظلہ، دیپا سرائے سنبھل۔

(۴) حضرت مولانا مطلوب احمد صاحب قاسمی دیپا سرائے سنبھل۔

(۵) حضرت مولانا اطہر صاحب قاسمی مدظلہ سابق مہتمم دار العلوم المحمدیہ دیپا سرائے۔

(۶) حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب قاسمی مدظلہ دیپا سرائے سنبھل۔

(۷) حضرت مولانا حامد صاحب قاسمی سنبھلی مقیم دہرہ دون۔

(۸) حضرت مولانا اسعد صاحب اسرائیلی قاسمی استاد ضیاء العلوم سرائے ترین

(۹) حضرت مولانا سبحان آصف قاسمی صاحب دیپا سرائے۔

(۱۰) حضرت مولانا عمران ذاکر صاحب قاسمی دیپا سرائے۔

(۱۱) حضرت مولانا خالد صاحب قاسمی مہتمم انجمن معاون الاسلام۔

(۱۲) حضرت مولانا محمد میاں صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے۔

(۱۳) حضرت مولانا عبد المؤمن ندوی ناظم اعلیٰ مدرسۃ العلوم انجمن معاون اسلام

(۱۴) حضرت مولانا شاکر صاحب قاسمی دیپا سرائے۔

(۱۵) حضرت مولانا مملوک الرحمٰن صاحب دیپا سرائے۔

(۱۶) حضرت مولانا وسیم صاحب ندوی دیپا سرائے۔

(۱۷) حضرت مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی دیپا سرائے۔

(۱۸) حضرت مولانا حبیب احمد صاحب قاسمی دیپا سرائے۔

(۱۹) حضرت مولانا توحید عالم صاحب قاسمی دیپا سرائے۔

(۲۰) حضرت مولانا اسعد قاسم صاحب قاسمی استاد جامعہ امدادیہ مرادآباد۔

(۲۱) حضرت مولانا بلال احمد صاحب قاسمی ناظم اعلیٰ مدرسۃ الشرع کٹرہ موسی خاں

(۲۲) حضرت مولانا نور الاسلام صاحب قاسمی استاذ مدرسہ حمایت السلام

(۲۳) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قاسمی محلہ امان خیل سرائے ترین۔

(۲۴) حضرت مولانا محمد نور قاسمی محلہ کوٹلہ استاد چشمۂ رحمت مدرسہ سرائے ترین

(۲۵) حضرت مولانا قیام الدین صاحب قاسمی محلہ بڑا محرم سرائے ترین

(۲۶) حضرت مولانا ظریف احمد صاحب قاسمی استاد مدرسہ کاشف العلوم بریلی

(۲۷) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب قاسمی آزاد مقیم دہلی۔

(۲۸) حضرت مولانا عبدالستار صاحب قاسمی سلام مقیم دہلی

(۲۹) حضرت مولانا مختار احمد صاحب قاسمی محلہ کوٹلہ سرائے ترین استاد مدرسہ شمس العلوم

(۳۰) حضرت مولانا اطہر شاہ صاحب حیاتی محلہ حوض کٹورہ سرائے ترین۔

(۳۱) حضرت مولانا مہر الٰہی صاحب قاسمی مدظلہ استاد ناشر العلوم سرائے ترین۔

(۳۲) مولانا عریف صاحب قاسمی برکھیریان سرائے ترین۔

(۳۳) مولانا سلطان صاحب قاسمی جھجران سرائے ترین۔

(۳۴) مولانا مفتی عثمان صاحب قاسمی جھجران سرائے ترین۔

(۳۵) مولانا محمد فاضل صاحب قاسمی برکھیریان سرائے ترین۔

(۳۶) جناب مولانا شمس الحق صاحب قاسمی موسیٰ پور

(۳۷) جناب مولانا شفیق احمد صاحب قاسمی موسیٰ پور۔

(۳۸) جناب مولانا نعمت اللہ صاحب قاسمی موسیٰ پور۔

(۳۹) حضرت مولانا جمیل احمد صاحب قاسمی موسیٰ پور۔

(۴۰) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی دیپا سرائے۔ خطیب جامع مسجد بھساول

(۴۱) حضرت مولانا عابد صاحب اسرائیلی قاسمی مقیم احمد آباد

(۴۲) حضرت مولانا قاری جمال الدین صاحب قاسمی نئی سرائے سنبھل۔

(۴۳) جناب مولانا محمد یاسین صاحب قاسمی

(۴۴) مولانا شان الحق صاحب قاسمی سنبھلی

(۴۵) حضرت مولانا رفاء الحق صاحب قاسمی سنبھلی

(۴۶) جناب مولانا قاری مطیع الرحمٰن صاحب قاسمی سنبھلی۔

(۴۷) حضرت مولانا وحکیم محمد یوسف صاحب قاسمی سنبھلی

(۴۸) حضرت مولانا عبدالغفور صاحب سنبھلی قاسمی معین مدرس دارالعلوم دیوبند

(۴۹) حضرت مولانا منہاج الحق صاحب سنبھلی قاسمی مقیم مرادآباد۔

(۵۰) مولانا ڈاکٹر محمد خالد صاحب قاسمی سنبھلی۔

(۵۱) مولانا فرقان صاحب سنبھلی

(۵۲) جناب مولانا زکریا صاحب قاسمی دیپا سرائے سنبھل۔

(۵۳) جناب مولانا محب الرحمٰن صاحب قاسمی

(۵۴) جناب مولانا محمد صابر صاحب قاسمی

(۵۵) جناب مولانا محمد نجیب صاحب قاسمی مقیم المدینۃ المنورہ۔

(۵۶) حضرت مولانا طاہر صاحب قاسمی میاں سرائے۔

(۵۷) مولانا وسیم اصغر صاحب ندوی

(۵۸) مولانا محمد ساجد صاحب ندوی

(۵۹) مولانا عیاض انور صاحب

(۶۰) مولانا شمشاد صاحب

(۶۱) مولانا شفیق حمد صاحب قاسمی

(۶۲) مولانا امجد صاحب۔

(۶۳) مولانا مجیب الرحمٰن صاحب۔

(۶۴) مولانا سلمان صاحب۔

(۶۵) مولانا شہروز عالم صاحب۔

(۶۶) مولانا شاہنواز عالم صاحب۔

(۶۷) مولانا مقیم الرحمٰن صاحب۔

(۶۸) مولانا محمد عارف صاحب۔

(۶۹) مولانا صلاح الدین صاحب۔

(۷۰) مولانا عبد المؤمن صاحب پکاباغ کھیڑا۔

(۷۱) مولانا مفتی محمد احمد صاحب قاسمی مقیم دہلی

(۷۲) مولانا حامد صاحب قاسمی کھیڑہ

(۷۳) مولانا حماد صاحب قاسمی

جو کتابیں تاریخ سنبھل کی تیاری میں زیر مطالعہ رہیں

مراجع وماخذ

کتاب	مصنف
تاریخ فرشتہ	مصنفہ مولوی محمد قاسم فرشتہ
ترجمہ گلشن ابراہیمی	
نزہۃ الخواطر	مولانا عبدالحی حسنیؒ
احسن التواریخ	مولانا غلام احمد صاحب شوق
آئینہ سنبھل	حکیم چھمن نرائن رئیس میرٹھ
ایوان مقفل	نثار الملک منشی عبدالصمد
تاریخ سنبھل سروے	
سنبھل تیرتھ	
سنبھل مہاتمے	
آب کوثر	مولوی اکرام
موج کوثر	مولوی اکرام
رود کوثر	مولوی اکرام
سفینۃ الاولیاء	دارا شکوہ
تذکرہ علماء سندھ	
ہندوستان کا شاندار ماضی	مولانا سید محمد میاں دیو بندیؒ
تاریخ دار العلوم دیو بند	سید محبوب حسن رضویؒ
محمود غزنوی	

رسالہ سید سالار مسعود غازی	
سیرت سید احمد شہیدؒ	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ صاحب
تاریخ مرادآباد	
تاریخ امروہہ	
تاریخ بدایوں	
شاہان اسلام اور ان کے رجحانات	
علم وعلم ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں	مولانا عبدالقادر رام پوری
مختصر تاریخ ہند	
تزک بابری	
آئین اکبری	
علماء حق	مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
منتخب التواریخ	مولانا عبدالقادر بدایونیؒ
روشن مستقبل	طفیل احمد علی گڑھی منگلوری
تاریخ فیروزشاہی	خواجہ ضیاء الدین برنی
انسائکلوپیڈیا	
تاریخ ٹونک	
شہیدان وطن ضلع مرادآباد	مولانا امداد صابری
تذکرہ کاملان رامپور	حافظ احمد علی شوق
امیر نامہ	نواب امیر احمد ٹونک
رسالہ معارف (ماہانہ)	از ندوۃ المصنفین اعظم گڑھ
چند شعراء سنبھل	سعادت علی صدیقی صاحب

مسلمانوں کا روشن مستقبل

۱۸۵۷ء کے چند مجاہد آزادی

خزینہ سخن — منصور سبزواری

سخن وران سنبھل — جلال افسر سنبھلی

گل صحراء — اعجاز وارثی

نذر اعجاز — حکیم شکیل احمد

ہندوستان کی عظمت ورفعت — مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

اخبارات ورسائل

اخبار الصنادید — مولانا عبد الغنی صاحب

تاریخ رامپور

تاریخ حریت اسلام

ظہیر الدین محمد بابر

ہندوستان پر مغلیہ حکومت

تذکرہ علماء فرنگی محل — مولانا عنایت اللہ انصاریؒ

مرزا مظہر جانِ جاناں

مفتاح الخزائن — سید شاہ نثار علی ترتیب پروفیسر نثار احمد فاروقی

جامع مسجد دربار سرائے ترین سنبھل کا صدر دروازہ
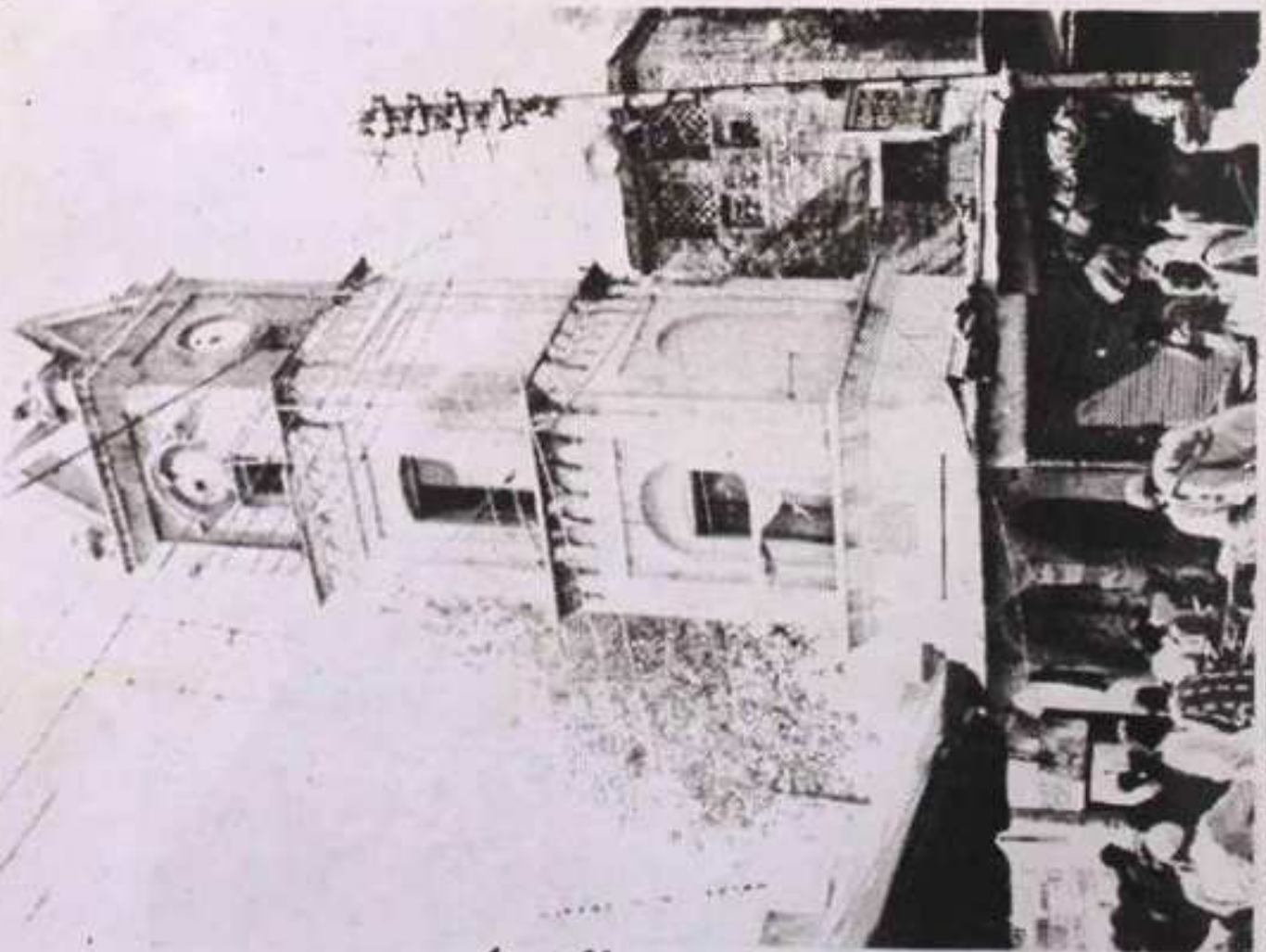
سنبھل کا گھنٹہ گھر

باری کنواں۔
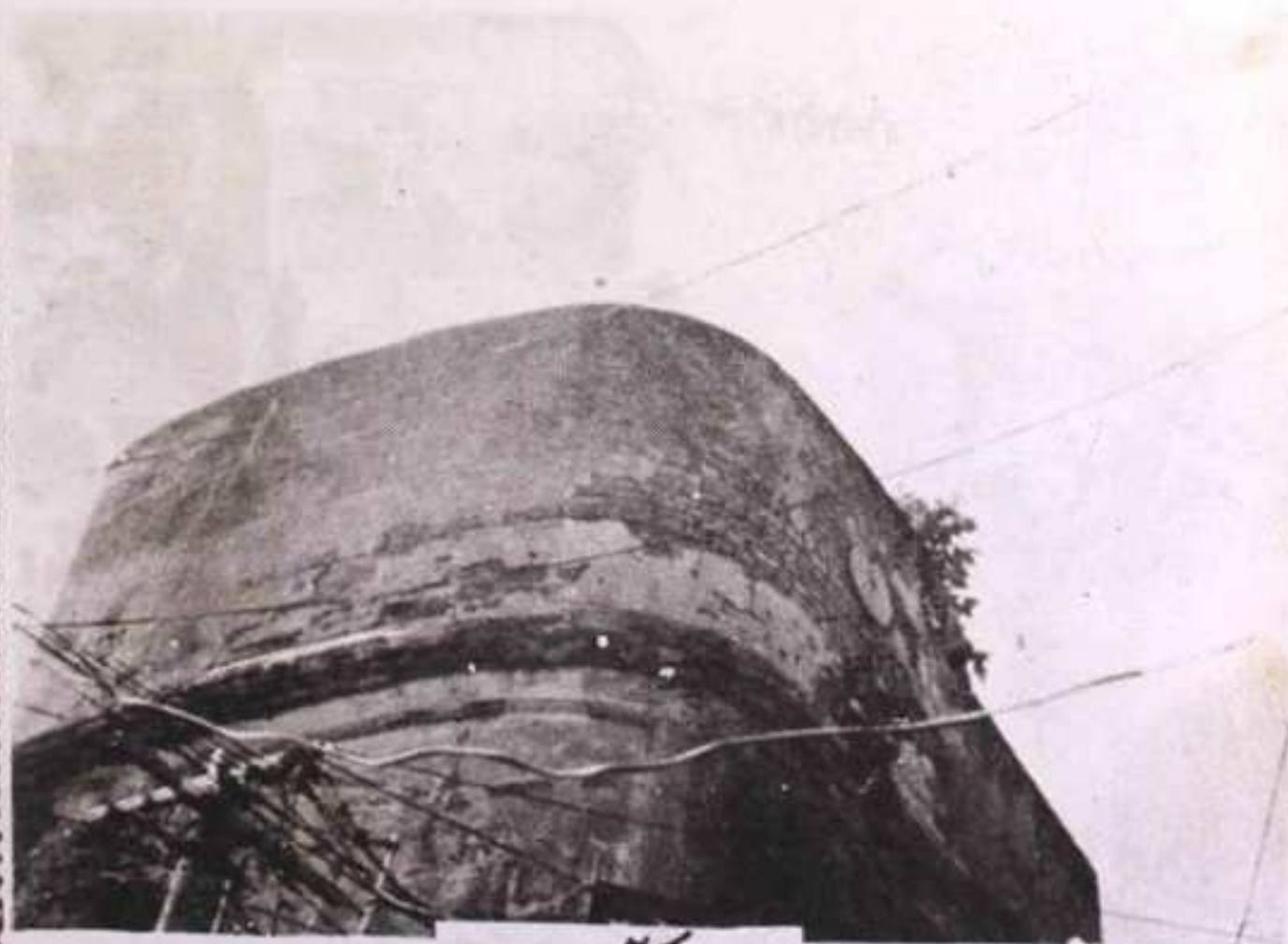
چکی کا پاٹ

طوطا مینا کی قبر
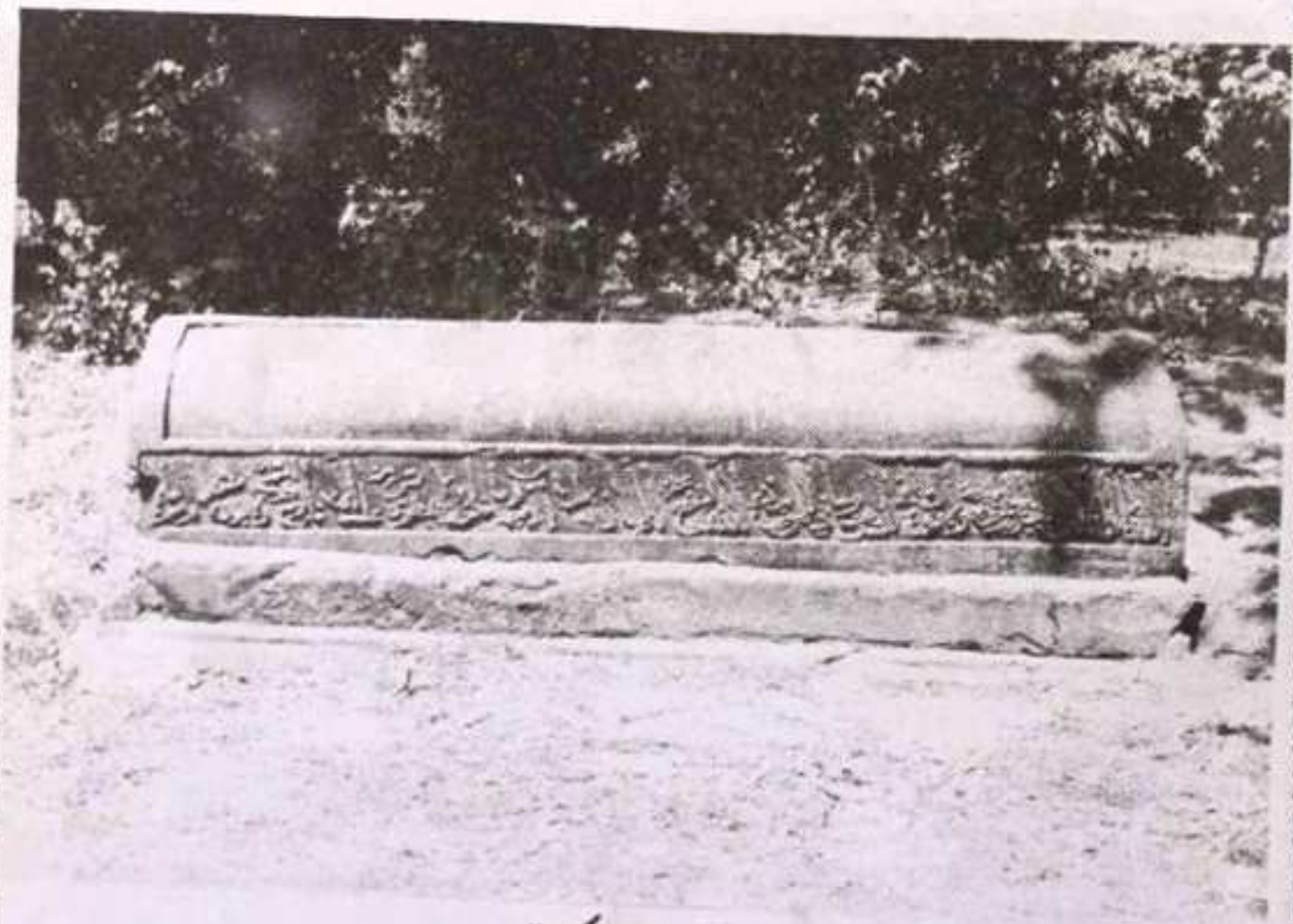
طوطا مینا کی قبر
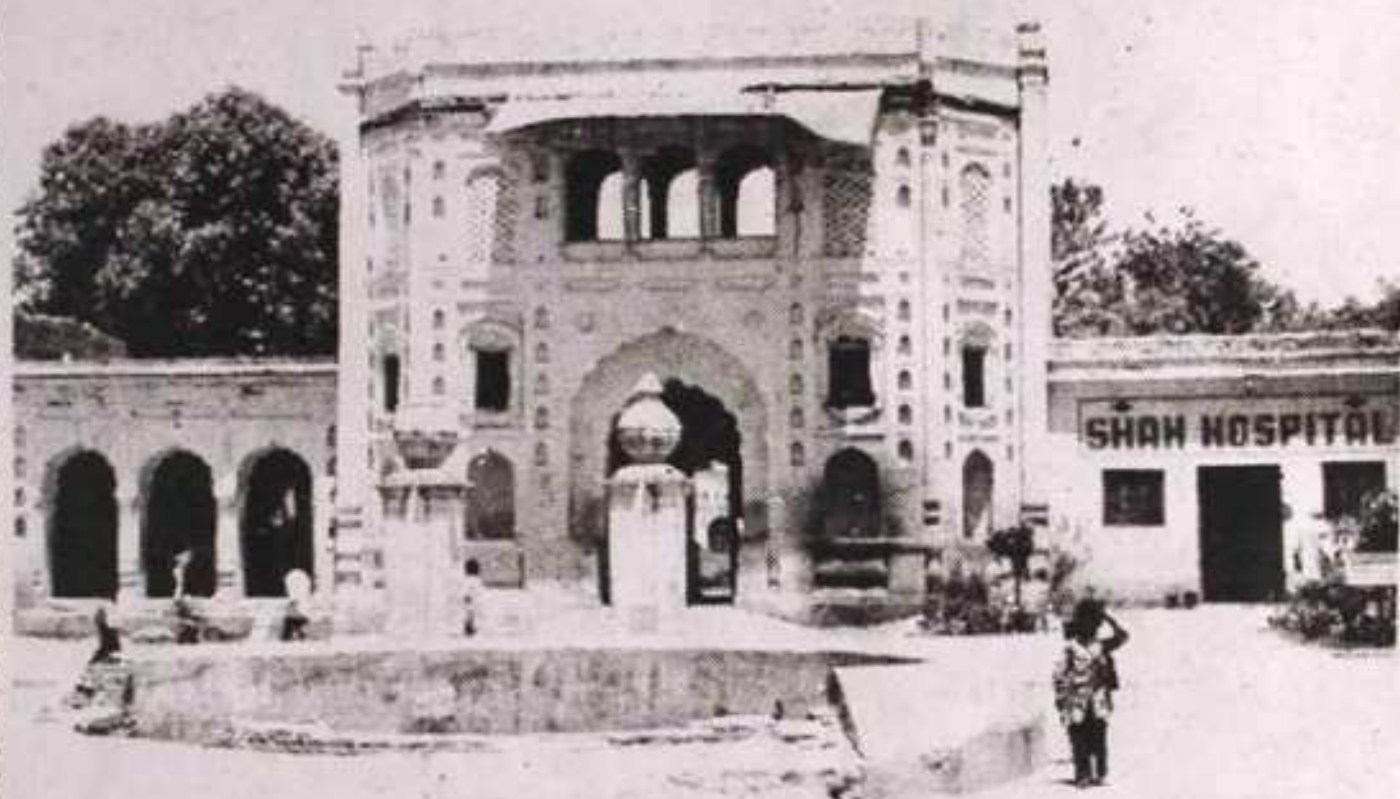
مزار حضرت شاہ فتح اللہؒ کا صدر دروازہ۔ محلہ دربار سرائے ترین سنبھل
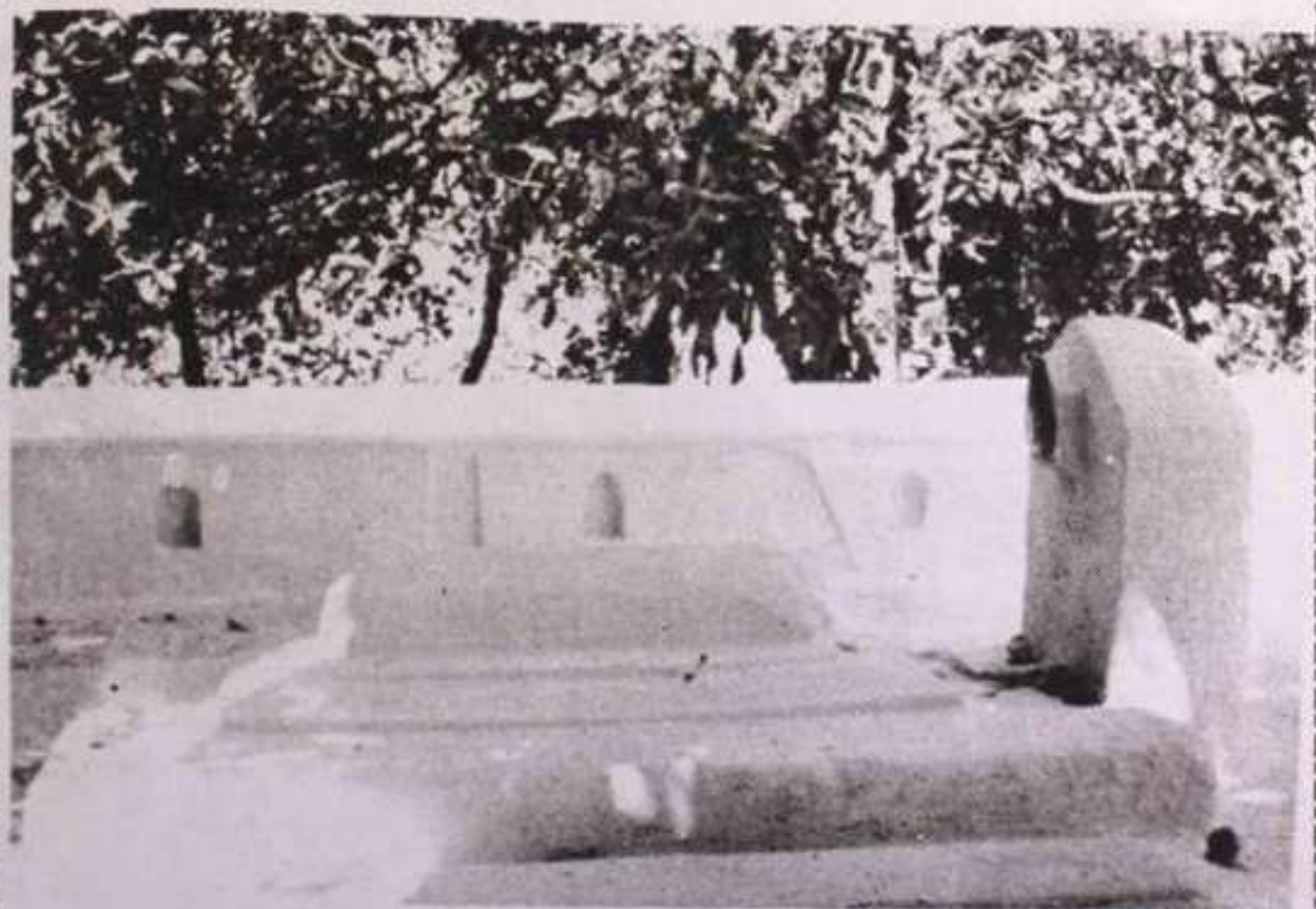
مزار حضرت عثمان شاہ بنگالیؒ

تالیفات مولانا عبدالمعید سنبھلی

۱- توبہ کیا ہے؟	(مطبوعہ)
۲- اہمیتِ ذکرودُعا	(//)
۳- تاریخ ٹانڈہ بادلی (رام پور)	(//)
۴- سوانح حضرت مولانا آفتاب علی خاں	(//)
۵- مصباح التواریخ یعنی تاریخِ سنبھل	(//)
۶- حقیقتِ صبر	(غیر مطبوعہ)
۷- اہمیتِ نکاح	(//)
۸- تحفۃ السالکین تذکرہ مفتی عبدالرحمٰن نوگانوی	(//)
۹- خلاصہ تاریخِ اسلام (پانچ حصے) درجہ اوّل تا پنجم کے طلبہ کے لئے	(//)
۱۰- ہمارے اسلاف واکابرین کیا ہیں؟	(//)
۱۱- تقلید فطری چیز ہے	(//)
۱۲- مقامِ علماء	(//)

تالیفاتِ مولانا عبدالمعید سنبھلی

۱۔ توبہ کیا ہے؟	(مطبوعہ)
۲۔ اہمیتِ ذکرودُعا	(//)
۳۔ تاریخ ٹانڈہ بادلی (رام پور)	(//)
۴۔ سوانح حضرت مولانا آفتاب علی خاں	(//)
۵۔ مصباح التواریخ یعنی تاریخِ سنبھل	(//)
۶۔ حقیقتِ صبر	(غیرمطبوعہ)
۷۔ اہمیتِ نکاح	(//)
۸۔ تحفۃ السالکین تذکرہ مفتی عبدالرحمٰن نوگانوی	(//)
۹۔ خلاصہ تاریخِ اسلام (پانچ حصے) درجہ اوّل تا پنجم کے طلبہ کے لئے	(//)
۱۰۔ ہمارے اسلاف واکابرین کیا ہیں؟	(//)
۱۱۔ تقلید فطری چیز ہے	(//)
۱۲۔ مقامِ علماء	(//)

M. K. Printers, Delhi, M. :- 9899393580.